ماہنامہ
نئے افق
کراچی

قیمت=/50رو

ابتدائیہ

متفرق کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فریدہ چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

سلسلے وار ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 برائے مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

جانے پھر موقع ملے کہ نہ ملے......!

ایک صحافی اور ایک فوجی سپاہی میں کئی قدریں مشترک ہوتی ہیں۔فوجی سپاہی ملکی سرحدوں کی حفاظت و چوکسی کرتا ہے۔تو صحافی بھی اپنے ملک و قوم کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی تعمیر و ترقی بھی کرتا ہے۔ایک سپاہی کا ہتھیار اگر اس کی تلوار' بندوق اس کا اسلحہ ہے تو ایک صحافی کا کاغذ و قلم اس کا اسلحہ ہوتا ہے۔ایک سپاہی کا جواں مردی' حب الوطنی' شجاعت و جرأت زیور ہوتا ہے تو ایک صحافی کا قلم اس کا علم و تجربہ اس کی ذہانت دیانت داری و باریک بینی دوربینی اس کا ہنر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سپاہی اپنے اسلحہ کے استعمال کا ماہر ہوتا ہے ایسے ہی ایک صحافی اپنے قلم کا ماہر ہوتا ہے سپاہی تو صرف سپاہی ہوتا ہے لیکن ایک حقیقی صحافی' صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سپاہی بھی ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سپاہی کی کئی طرح کی ذمہ داریاں اور فرائض ہوتے ہیں ایسے ہی ایک صحافی کی بھی ذمہ داریاں اور فرائض ہوتے ہیں۔

جس طرح ایک سپاہی کی تربیت کی جاتی ہے ایسے ہی ایک صحافی کی تربیت کی جاتی ہے اسے بھی بھٹی میں تپنا ہوتا ہے تب جا کر کہیں وہ کندن بنتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی' مولانا ظفر علی' مولانا شوکت علی اور بہت سے نام ور صحافی اہلِ قلم یوں ہی راتوں رات یا ایک دن میں پیدا نہیں ہو گئے تھے۔انہوں نے علم کے ساتھ ساتھ وقت کے بڑے رگڑے کھائے تھے لیکن آج کے دور میں ہر طرف ہر طرح سے چاہے وہ تجارت ہو نوکری ہو تعلیم ہو کہ سیاست ہر کوئی راتوں رات اپنی منزل پالینا چاہتا ہے طالب علم ہو کہ استاد دونوں ہی شارٹ کٹ کے پھیر میں رہتے ہیں استاد کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علم بانٹنے' پھیلانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ نوٹ سمیٹنے کی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے اور شاگرد جلد از جلد بغیر پڑھے لکھے ڈگریاں حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ پہلے کے زمانے میں چاہے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنا ہو یا کسی کو ملازمت دینا ہو یا دوستی اور دشمنی کا تعلق قائم کرنا ہو اس کے لیے مدمقابل کے حسب نسب کے بارے میں جان کاری حاصل کی جاتی تھی اب تو لوگ اپنے بیٹا' بیٹی کے رشتوں کے لیے بھی چھان پھٹک کرنا تو دور کی بات اکثر معمولی پوچھ تاچھ تک نہیں کرتے بس چٹ منگنی پٹ بیاہ رچا دیتے ہیں۔

کسی تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک بار ملکہ ہندوستان نور جہاں لال قلعے کے جھروکے سے نئے تربیت پانے والے فوجی افسران کو میدان میں شمشیر زنی' گھڑ سواری' نیزہ بازی کی مشق کرتے دیکھ رہی تھی کہ تب ہی اس کی نگاہ ایک فوجی جوان پر پڑی یوں تو سب ہی جوان پسینے میں شرابور ہو رہے تھے لیکن وہ بڑے سلیقہ اور اہتمام سے اپنی قمیص کی جیب سے رومال نکال کے اپنا پسینہ پونچھتے تھے اور رومال واپس اپنی جیب میں رکھ لیتے لیکن ایک جوان جیسے دیکھ کر ملکہ چونک گئی تھی اپنے بازو کو اپنے چہرے پر لے جا کر اپنی قمیص کی آستین سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا ملکہ کو بڑی تشویش ہوئی اس نے فوج کے سالار کو طلب کیا اور اس سے دریافت کیا کہ اس نوجوان کا خاندانی پس منظر کیا ہے اس کا تعلق کس کنبے کس خاندان سے ہے سالار نے مہلت مانگی اور کچھ دن بعد جب اس کی تحقیق مکمل ہو گئی تو وہ ملکہ کے روبرو حاضر ہوا اور بیان کیا کہ اس نوجوان کا پردادا نان بائی تھا اور تندور پر روٹیاں پکاتا تھا۔ملکہ نے اس نوجوان کو فوج کی ذمہ داری کے لیے نااہلِ قرار دیتے ہوئے اسے فوج سے رخصت کر دیا۔ سالار سے کہا ہمیشہ یاد رکھو کہ تخم کی تاثیر اچھی صحبت سے نہیں

بدلتی اگر یہ جوان فوج میں رہتا تو اپنی چھوٹی نسبی سوچ کے باعث کسی لشکر کی سالاری کا اہل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی کسی بڑے معرکے کو سر کرنے کا اہل ہوتا فوج کے نظم و ضبط اور قوانین کو بغیر کسی لحاظ کے توڑتا رہتا اور سمجھتا کہ جو میں کر رہا ہوں وہی درست ہے کیونکہ جب اس سے اپنی آستین سے پسینہ پونچھنے کی بابت پوچھا گیا تو اس نے بڑی حیرانی سے کہا تھا کہ اس میں کیا حرج ہے کیا ضروری ہے کہ رومال سے ہی پسینہ خشک کیا جائے۔

یہی حال آج ہماری صحافت اور اہل صحافت کا بھی ہو چکا ہے صحافت کو ایک مقصد ایک تحریک کے بجائے اب ایک صنعت ایک کاروبار میں بدل دیا گیا ہے تمام اخلاقی سماجی مذہبی اقدار کا اب صحافت سے تعلق ٹوٹ چکا ہے صحافت کو اب ذریعۂ آمدن بنالیا گیا ہے۔ اب اہل صحافت کے سب نہیں مگر اکثر لوگ صحافت اس لیے اپناتے ہیں کہ صحافت کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں صحافت کے نام پر لوگوں سے ناجائز طریقوں پر کام نکلواتے اور دولت کماتے ہیں اب صحافت کے لیے اقدار کی کوئی قید نہیں اب جس کا جی چاہے وہ صحافی بن جاتا ہے حد تو یہ ہے کہ بے ضرر ختنہ کرنے والا جراح' راج مزدوری کرنے والا ہو یا قصاب' نان بائی' بس تھوڑا سا لکھ پڑھ لیتا یا پھر کچھ لوگ جو کالج اور یونیورسٹی کی کینٹین میں بیٹھ کر کسی طرح ڈگری حاصل کر لے۔ میدان صحافت میں اتر آتے ہیں وہ پھر قلم نہیں تلوار چلاتے ہیں نہ کسی بڑے کی آبرو کا خیال ہوتا ہے نہ کسی چھوٹے کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تعلیم نے بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اکثر تو تعلیم ایسے لوگوں کو مزید خراب کر دیتی ہے کیونکہ انہیں جہالت کا خوف نہیں ہوتا بلکہ قابلیت کا ہیضہ ہو جاتا ہے اور ایسے جیالے کھیلنے کو قلم نہیں بلکہ چاند مانگنے لگتے ہیں۔ ایسے بہت سے خود کو صحافی کہتے سمجھتے ہیں جنہیں خود اپنے نسب تک کی خبر نہیں ہوتی وہ اوروں کی خبر لے اور لگا رہے ہوتے ہیں۔

ایسے ہی آج کے دور میں اخبار نکالنا قوم کی خدمت کرنا ملک و قوم کی نظریاتی حدشوں کی حفاظت کرنا نہیں رہا بلکہ اخبار کے زور پر حکمران اور حکومت سے اپنے آڑے ترچھے کاموں پر پردہ ڈلوانا اور کالے کرتوتوں سے دولت کمانا ہو گیا ہے اب تو آہستہ آہستہ وہ وقت آ رہا ہے کہ حقیقی نام ور اہلِ صحافت رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور ٹھیکیدار' چوکیدار' چوبدار قسم کے حضرات اپنے سرمائے کے بل بوتے پر دو نمبر کی دولت سے اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ پوشی کے لیے کوئی اخبار کوئی جریدہ نکال رہا ہے ان کی اصل تجارت کچھ اور ہوتی ہے اور نمائشی تجارت کے لیے اخبار یا ٹی وی چینل کا اجرا کر لیتے ہیں' لیکن حقیقی اور دیانت دار اہلِ قلم اہلِ صحافت بھی میدان عمل میں ابھی موجود ہیں جن کے راستے کٹھن اور دشوار ہوتے جا رہے ہیں۔ لوٹ مار کرنے والے بلیک میل کرنے والے اپنے راستوں کی رکاوٹوں کو ہر قیمت ہر طرح سے ہٹانے کی کوششیں کرنے سے دریغ نہیں کرتے مقابلے کی دوڑ میں آج حقیقی صحافت حقیقی صحافی بہت پیچھے رہ گئے دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ زر کی ہزاروں دولت کی چمک سے سورج کی روشنی کو بھی ماند کرنے اور سمجھنے والے بڑھتے جا رہے ہیں جو صحافت سے ایک قدم آگے بڑھا کر سیاست میں داخل ہی نہیں ہوتے بلکہ حکومت اور حکمرانی کے سنہرے خواب کی تعبیر پانے میں بھی لگ جاتے ہیں۔ درحقیقت لوگوں کو بے وقوف بنانے اور سمجھنے والے خود کس قدر عقل مند ہوتے ہیں اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے اخباری تنظیموں میں گھس کر ان پر قابو پانا چاہتے ہیں پھر اس کی آڑ میں حکمرانوں کو بلیک میل کرتے اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور حکمرانوں کی خوشامد درآمد کر کے ان کے نام پر لوگوں کو لوٹ کر راتوں رات دولت کے ڈھیر جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ پھر موقع ملے کہ نہ ملے ابھی جو ملتا ہے سمیٹ لو۔

گفتگو

عمران احمد

''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ بہت کم ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ جس میں امانت نہیں اس کا ایمان (کامل) نہیں اور جس میں عہد (کی پابندی) نہیں اس کا دین (کامل) نہیں۔'' (البیہقی فی الایمان)

عزیزان محترم..... سلامت باشد

دسمبر کا شمارہ یعنی عیسوی سال کا آخری نئے افق حاضر مطالعہ ہے آپ قارئین نے جس طرح خوفناک کہانی نمبر ون اور ٹو کی پذیرائی کی اس نے ہمارے خون اور حوصلوں میں چار گنا اضافہ کر دیا ہے۔ شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ۔ اب دسمبر میں آنے والا شمارہ یعنی سال نو کا پہلا نئے افق دلچسپ کہانی نمبر ہوگا۔ اس کے لیے تیاریاں جاری ہیں قارئین سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس حوالے سے اپنی تحریریں، روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے دلچسپ واقعات کی روداد جلد سے جلد ارسال کر کے اپنی شرکت کو یقینی بنائیں، یاد رکھیں آپ کا بے لوث تعاون ہی نئے افق کی ترقی اور حسن کا ضامن ہے۔

ملک کے حالات جوں کے توں ہیں، کراچی سونامی طوفان سے کنوں سے بچ گیا، عجیب حوصلہ مند ہیں یہ عوام، ذرا بھی تباہی سے نہ گھبرائے۔ بلکہ ہم نے دیکھا کہ بجائے اپنے بچاؤ کی تدابیر کرنے کے لوگ جوق در جوق طوفان کا استقبال کرنے ساحل کا رخ کر رہے تھے۔ شاید اللہ تعالیٰ کو عوام کی یہی ادا پسند آ گئی ہو جس نے اسے طوفان کا رخ موڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہی حال لاہور میں واہگہ بارڈر پر دیکھنے میں آیا۔ ایک دن دہشت گردوں نے خودکش دھماکے میں ستر معصوم شہریوں کی جان لے کر عوام کے حوصلوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن اگلے روز اس سے بھی بڑی تعداد میں عورتیں، بچے مرد اور بزرگ انہیں چیلنج کرنے کے لیے وہاں موجود تھے۔ اس عوام میں قربانی، ملک کے لیے جان دینے، جدوجہد کرنے کا جذبہ تو موجود ہے بس اسے ایک مخلص دیانت دار قیادت کی ضرورت ہے۔ جوان کے ارادوں اور قربانی کے جذبوں کو درست سمت دے سکے۔ جس دن ایسی قیادت لوگوں نے تیار کر لی تو عوام کا یہ بے ہنگم انبوہ کثیر ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائے گا جسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ کیونکہ عوام کا ہجوم اس وقت تک کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتا جب تک وہ ایک قوم کی صورت اختیار نہ کر لے۔ ہم عوام سے ایک قوم میں کس طرح تبدیل ہو سکتے ہیں؟ فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحے کشید کر کے اس پہلو پر ضرور سوچیے گا۔ اللہ رب العزت ہمیں اپنی حالت بدلنے کا حوصلہ اور توفیق عطا فرمائے، آمین۔

قارئین نوٹ فرمالیں

جنوری میں	دلچسپ نمبر
مارچ میں	سیاسی جرائم نمبر
مئی میں	طنزومزاح نمبر
جولائی میں	آپ بیتی نمبر
ستمبر	خوفناک و پراسرار نمبر

اب آئیے اپنے خطوط کی طرف

ریحانہ سعیدہ ......لاہور۔ محترم عمران صاحب السلام علیکم۔ ملک آج کل دھرنے دینے اور دھرنے اُٹھانے کی لپیٹ میں ہے قادری صاحب نے دھرنا اٹھا دیا مجھے دکھ معصوم عوام پر ہوتا ہے جو ان مفاد پرست بازی گروں کی باتوں میں آ کر ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں ان دھرنوں میں جب آنسو گیس اور صرف ربر کی گولیاں استعمال ہوئیں اور ہمارے کاغذی لیڈر انقلاب کا نعرہ لگانے والے خود بلٹ پروف گاڑیوں میں اور کنٹینرز میں چھپ گئے اور بے چارے عوام زخمی ہو کر اسپتالوں میں پہنچ گئے ان دھرنوں اور کھلاڑی عمران کے میوزیکل کنسرٹ کی وجہ سے کئی خواتین کو طلاق ہوئی یہاں تک کہ ان دھرنوں میں بچوں کی پیدائش ہوئی اور ہمارا ملک ان لوگوں کی وجہ سے پوری دنیا میں تماشا بن کر رہ گیا اب ایک صاحب نے پیسے لے کر ڈیل کر لی یا سیٹ لے کر یہ اللہ بہتر جانتا ہے لیکن دو ماہ سے عوام کا جو نقصان ہوا ہے اس کا تاوان کون دے گا......؟ یہ لمحہ فکریہ ہے ان دھرنوں اور جلسوں کا حصہ بننے والے لوگوں کے لیے، اللہ ان کو شعور دے۔ اب ہو جائے کہانیوں کی بات، سرورق پر رات کا اندھیرا ہوتا تو ہارر لگتا آپی شہناز آپ نے بتایا نہیں کہ آپ بیمار ہیں۔ گٹ ول سون کا کارڈ بھیجتی اور آپ کی صحت یابی کے لئے دُعا بھی کرتی۔ خورشید صاحب کی مستقبل ساز زبردست جا رہی ہے زریں صاحبہ کی ایوریج کہانی تھی شہنی صاحبہ کی کہانی کا اختتام اچھا نہیں لگا کیونکہ مسلمانوں میں نن بننے کا تصور نہیں دین کی ترویج شادی کر کے بھی کی جا سکتی ہے سلمیٰ کی کہانی کی اہم بات یہ ہے کہ انسان گناہ کر کے دنیا سے بچ سکتا ہے پر اپنے ضمیر سے نہیں اور جس کا ضمیر پچھتائے اسے اللہ بھی معاف کر دیتا ہے ارشد صاحب کی دیدبان ختم ہو گئی اچھا اور مختصر پیغام تھا خلیل جبار کی کہانی کا موضوع پرانا تھا امجد صاحب کی قلندر ذات دلچسپ جا رہی ہے رفعت صاحبہ کی کہانی اچھی ہے کیونکہ اللہ جب ظالم کی رسی دراز کرتا ہے تو اسے وہ اپنی کامیابی سمجھتا ہے جبکہ انجام برائی کا برا ہی ہوتا ہے اقبال صاحب کی کہانی دلچسپ تھی جاوید صاحب کہانی پر تھوڑی محنت اور کرتے تو زیادہ دلچسپ ہو سکتی تھی شمیم صاحب جگا اب پنجاب کے بعد بھارت میں بھی ڈاکے ڈالنے لگا ہے بیچارہ کب تک ڈاکو بنا رہے گا آپ سب لوگ جو نئے افق کے قاری اور لکھاری ہیں اور میری شاعری پسند کرتے ہیں اُن کی میں مشکور ہوں عمران صاحب کہانی بھیجی ہے اُس بیچاری کو بھی تھوڑی سی جگہ دے دیں اب اجازت چاہوں گا دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ریاض حسین قمر ...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب سلام شوق،

نومبر کا نئے افق پیش نظر ہے ٹائٹل جھیل سیف الملوک کا منظر پیش کر رہا ہے مگر ایک خونخوار ریچھ نے خوفزدہ کر دیا۔ بہرحال مصور کو داد دینی چاہیے کہ اتنا پیارا ٹائٹل بنایا جس سے نئے افق کی انفرادیت کو چار چاند لگ گئے۔ لائق صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی نے دستک میں دہشت گردی کے بارے میں جو حقائق بیان فرماتے ہیں وہ روز روشن کی طرح ہیں ان کے لکھے کسی ایک لفظ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کاش ہم باشعور ہوں تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں عمران بھائی گفتگو کے آغاز میں آپ نے حسب سابق بڑی پیاری حدیث بیان فرمائی ہے جس میں جھوٹے انسان کی پہچان بیان فرمائی گئی ہے اپنی بات میں آپ نے نئے افق کو سنوارنے میں اپنی سعی کاملہ کے بارے لکھا ہے جو حرف حرف سچ ہے گفتگو میں کرسی صدارت پر اس بار آپی شہناز بانو متمکن بلکہ جلوہ افروز تھیں ان کی محفل سے طویل غیر حاضری کی وجہ بڑی معقول ہے شکر ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرمائی خدا انہیں ہمیشہ صحت مند رکھے، آمین۔ شہناز آپی آپ کے بیٹے اور بہو کا سفر حج ان کو اور آپ کو مبارک کرے اللہ کریم اپنے پیارے گھر اور اپنے پیارے حبیب کے در پر ان کی حاضری کو شرف قبولیت بخشے اور وہاں مانگی گئی ان کی ہر دعا کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔ آپی آپ اب محفل میں تشریف لاتی رہیں آپ نے یہ سچ فرمایا بہت سے پرانے ساتھی محفل سے مسلسل غیر حاضر رہنے لگے ہیں جس سے محفل کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے کاش وہ سب لوٹ آئیں تو محفل کا پرانا رنگ لوٹ آئے اور رونقیں بحال ہو جائیں۔ محترمہ طاہرہ جبیں تارا صاحبہ ایک اچھے اور بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں شکر ہے پرانے ساتھیوں میں سے کوئی تو واپس لوٹا۔ پلیز اب باقاعدگی کے ساتھ تشریف لاتی رہیں پیارے بھائی ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کا خط بہت خوب صورت تھا۔ بھائی آپ کی بات بالکل درست ہے کہ اصلاح اپنے گھر سے شروع ہونی چاہیے کہتے ہیں کہ تم برائی چھوڑ دو اور سمجھو کہ دنیا میں ایک برے بندے کی کمی ہو گئی ہے اصلاح اپنے گھر سے شروع کریں گے تو یہ بار آور ہوگی آپ نے میرے شاعری کو پسند فرمایا آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ خدا آپ کو شاد و آباد رکھے، آمین۔ ملتان شریف سے بھائی مجید احمد جائی صاحب تشریف لائے ہیں بھائی موسٹ ویلکم آپ نے محفل کی رونق کو دوبالا کیا ہم شرکا محفل آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں تشریف آوری میں ناغہ نہیں ہونا چاہیے آپ نے جن نیک خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ادیب سمیع چمن صاحب کے طویل خط نے مزہ دیا۔ انہوں نے کھری کھری باتیں سنائی ہیں ان کے علاوہ انجم فاروق ساحلی اسلم جاوید اور عبدالمالک کیف صاحب اپنے مختصر خطوط کے ساتھ محفل میں تشریف لائے اس بار انتخاب نظم نثر خوب رہا۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ نومبر کا پرچہ 22 اکتوبر کی شام کو ملا۔ سرورق حسب معمول منفرد اور قابل دید ہے جس کے لیے بنانے والے ہاتھ تعریف کے مستحق ہیں فہرست پر نظر ڈالی تو اپنی کاوش موجود پا کر خوشی ہوئی آپ کا بہت شکریہ اور مہربانی۔ کوشش تو یہی ہوگی کہ ہر ماہ ایک کہانی لکھ کر ارسال کروں ان شاء اللہ۔ آگے بڑھے تو مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک سنائی دی بہت خوب، آپ نے یہ لکھ کر کہ پولیس کا نعرہ بدل گیا ہے۔ جو یہ ہے کہ پولیس کا فرض ہے مرمت آپ کی۔

پولیس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی ہے جو یا تو ہاتھی کے کان میں سوئی ہوئی ہے یا جان بوجھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لی ہیں کراچی کے حالات پر ہر پاکستانی کی آنکھ اشکبار ہے اب بڑھتے ہیں اپنی پیاری محفل کی طرف۔ بہن شہناز بانو کافی عرصہ کے بعد محفل میں آئی ہیں اور اپنی غیر حاضری کی وجہ بھی بتائی ہے۔ بہن اللہ بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کے ہاتھ کی تکلیف دور کرے، آمین۔ بھائی کو یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ طاہرہ جبیں تارا بھی کافی عرصہ بعد تشریف لائی ہیں اور اپنے دلچسپ تبصرے سے محفل کی شان بڑھاتی ہے۔ آپ کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ غیر حاضر بہن بھائی جلد از جلد محفل میں حاضر ہوں۔ ریاض حسین قمر بھائی کیسے ہو؟ دیکھیں آپ بہن بھائیوں کی دعاؤں سے دوبارہ اعتراف جرم کے نام سے کہانی لکھی ہے جو اس شمارے میں موجود ہے۔ اس کو پڑھ کر رائے ضرور دیجیے گا میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ جاوید احمد صدیقی بھائی یاد کرنے کا بے حد شکریہ، مہربانی اور نوازش اس بار آپ کی کہانی پسند آئی۔ دعا ہے آپ اسی طرح لکھتے رہیں گے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہیں مجید احمد جائی کا خط بھی اچھا ہے ادیب سمیع چمن فرام حیدرآباد بھائی آپ نے بالکل سچی باتیں لکھی ہیں لیکن پتا نہیں برف کب پگھلے گی۔ عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے ہم اگر صرف یہ سوچیں کہ ہم سب سے پہلے پاکستانی ہیں اس کے بعد باقی کچھ ہیں تو کافی مسئلے حل ہو سکتے ہیں عبدالمالک کیف، محمد اسلم جاوید اور انجم فاروق ساحلی کے مختصر خط بھی محفل میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ اب بات ہو جائے باقی سلسلوں کی، خوشبوئے سخن میں سب کی کاوشیں اور انتخاب اچھا ہے ریاض حسین قمر، قدیر رانا عمر فاروق ارشد اور ریحانہ سعیدہ ٹاپ پر ہیں۔ ذوق آگہی میں اس بار دلنواز شاہ، ساریہ چوہدری، مختار احمد اور فرح زینت کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ کتر نیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف جگت سنگھ کی سولہویں قسط حسب معمول زبردست تھی۔ خورشید پیرزادہ کی مستقبل ساز ایک اچھی کاوش ہے۔ غزہ کی سسکیاں کے کیا کہنے۔ زریں قمر نے خوب لکھا۔ سلمیٰ غزل کی زخم دل بھی پسند آئی۔ آسمان کی ٹھوکر ایک سبق آموز کہانی ہے یہاں یہ مثال صادق آتی ہے کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، باقی کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکا اب اجازت یار زندہ صحبت باقی۔

مبارک حسین ..... چیچہ وطنی محترم عمران بھائی' السلام علیکم۔ اللہ سے دعا ہے کہ تمام لوگ بخیر و عافیت ہوں۔ اب تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے ملک کے حکمرانوں کو نیک ہدایات اور آخرت میں جواب دہی کا خوف عطا فرمائے، آمین کیونکہ اللہ تعالیٰ جتنی بڑی ذمہ داری عطا کرتا ہے حساب بھی اسی طرح لیا جائے گا۔ نومبر کا نئے افق اپنے مقررہ وقت پر مل گیا تھا۔ ٹائٹل ہر بار کی طرح اس بار بھی منفرد تھا۔ گفتگو کی محفل میں تمام ساتھیوں نے خوب لکھا۔ ہر کسی کی تحریر اپنی جگہ اچھی تھی۔ انجم فاروق ساحلی آپ کی کہانیاں پڑھے ہوئے کافی دن ہو گئے۔ ریاض بٹ اب آپ کے مہروں کی تکلیف کا کیا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ فقیر لنگاہ صاحب کافی دنوں سے محفل سے غائب ہیں، ان سے گزارش ہے کہ جلد از جلد حاضری لگوائیں۔ اب آتے ہیں اپنے نئے افق کی جانب دستک

ؤں جناب مشتاق قریشی صاحب نے بہت بہترین بات کی ہے۔ اقرا میں بھی طاہر احمد قریشی نے بہت اچھی باتیں کیں۔ کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ سلسلے وار میں جگت سنگھ بہت خوب جارہی ہے، مستقبل ساز بھی خورشید پیرزادہ کی بہترین کاوش ہے۔ قلندر ذات کے تو کیا ہی کہنے۔ روحانی علاج کے ذریعے حافظ شبیر احمد جس طرح دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں اللہ سے دعا ہے کہ ان کو اس کام کا بھرپور اجر عطا فرمائے۔ خوش بوئے سخن میں تمام لوگوں کا کلام بہت خوب تھا۔ عمران صاحب سے گزارش ہے کہ ذوق آ گہی کے صفحات بڑھائیں تاکہ قارئین کو زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوسکے۔ آخر میں اللہ بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ ہم سب پر رحم فرمائے ہمیں امان والی زندگی اور ہمارے حکمرانوں کو ہدایت اور جذبہ حب الوطنی عطا فرمائے۔ آمین

عبدالرحمان...... کراچی۔ محترم جناب عمران بھائی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ اللہ کرے سب لوگ خیریت سے ہوں اس مرتبہ نئے افق مہینے کے آخر میں ملا۔ ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ گفتگو کی محفل میں تمام ساتھیوں کے تبصرے خوب تھے۔ محترمہ شہناز بانو کافی دنوں بعد محفل میں تشریف لائیں۔ اللہ پاک ان کی کاوشوں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ ارشد اور ان کی زوجہ محترمہ کو حج کی سعادت حاصل کرنے پر ڈھیروں مبارک باد۔ اس کے علاوہ طاہرہ جبیں تارا کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ریاض قمر، ابن مقبول، مجید احمد جائی محفل کی رونق بنے۔ ادیب سمیع چمن صاحب بھی خوب دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے پائے گئے۔ بھائی پاکستان کو اگر نیک اور مخلص قیادت نصیب ہوجائے تو تمام فساد ہی ختم ہوجائے لیکن نیک حکمران صرف نیک رعایا ہی کو نصیب ہوتے ہیں اس لیے سب سے پہلے ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانکنا ہوگا، اب بڑھتے ہیں رسالے کی طرف تو دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ واقعی آج کل غنڈہ گردی اور پولیس میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ ڈاکو چھپ چھپا کر لوگوں کو لوٹ رہے ہیں جبکہ پولیس والے دن دھاڑے شہریوں کا خون چوسنے میں لگے رہتے ہیں۔ جگہ جگہ پولیس ناکے دہشتگردی کی روک تھام کے لیے لگائے جاتے ہیں مگر وہاں صرف غریب شہریوں کو نت نئے حربوں سے تنگ کیا جاتا ہے۔ اللہ پاک ہماری پولیس فورس کو ہدایت نصیب فرمائے۔ متفرق کہانیوں میں مستقبل ساز خورشید پیرزادہ کی انتہائی بہترین کاوش ہے۔ زریں قمر نے بہت اچھا انداز تحریر اپنایا۔ شہنی ارشاد کی انوکھا استاد بھی اچھی رہی۔ ایک نام دو فنکار نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ اس کے علاوہ زخم دل، بھیڑیا، اعتراف جرم، آسمان کی ٹھوکر، گوشہ مسرت اور وضع دار بھی اچھی تحریریں تھیں۔ سلسلے وار ناول میں سب سے پہلے دیدبان پڑھی اختتامی قسط توقع کے مطابق بہت بہترین تھی۔ قلندر ذات کی قسط بھی اچھی رہی۔ جگت سنگھ بھی تیزی کے ساتھ اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے۔ مستقل سلسلوں میں حافظ شبیر احمد کی خدمات قابل قدر ہیں۔ خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی کا تمام انتخاب بہت خوب تھا۔

زین الحین شانی...... کراچی۔ نئے افق نومبر 2014ء اپنے خوب صورت اور دلکش ٹائٹل سے مزین تھا مگراتنے حسین منظر میں آپ نے بھیڑیے کے خون خوار تیوروں سے بھی آگاہ کردیا۔ مشتاق احمد قریشی اپنی قابل فہم گفتگو کے ساتھ حاضر تھے۔ ہم نے اپنی ناقص عقل، کم علمی پر قابو پانے کے لیے

قریشی صاحب کے لکھے کو بہت غور سے پڑھ کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کراچی میں جرائم کی شرح میں اضافہ وقت پر جرم کی روک تھام نہ ہونا پولیس کی نااہلی ہے۔ قابل اور فرض شناس نوجوان دھکے کھانے پر مجبور ہیں۔ جبکہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں کالی بھیڑیں صرف اپنے مفاد کی خاطر کام کر رہی ہیں۔ کسی کی مجبوری بے بسی سے فائدہ اٹھانے کے رویے سے کراچی کیا پورے پاکستان کے حالات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ لوٹ مار میں ان لوگوں نے سب کو شکست دے دی ہے۔ اللہ انہیں ہدایت نصیب فرمائے، آمین۔ اب چلتے ہیں محفل یاراں کی جانب۔ ابتدائیہ میں جو حدیث بیان کی گئی اس نے دل و دماغ کے دروا کر دیے۔ شہناز بانو صاحبہ کافی دنوں بعد محفل میں تشریف لائیں مگر اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ کے ساتھ۔ اللہ پاک ان کی خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ شہناز بانو کے صاحبزادے ارشد علی اور ان کی اہلیہ کو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے پر ڈھیروں مبارکباد۔ محفل سے بہت سے ساتھی غیر حاضر رہے تمام لوگ ہر ماہ حاضری کو یقینی بنائیں، کیونکہ جتنے لوگ ہوں گے اتنی ہی محفل میں رونق رہے گی۔ باقی تمام ساتھیوں کے خطوط بھی بہت اچھے تھے۔ اللہ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دیدبان کا آخری حصہ پڑھا۔ ارشد علی ارشد نے بہت عمدگی کے ساتھ کہانی کا اختتام کیا۔ قلندر ذات امجد جاوید صاحب کا بہت بہترین ناول ہے۔ جگت سنگھ کا اب اختتام کر دینا چاہیے۔ مستقبل ساز خورشید پیرزادہ کی بہترین کاوش ہے۔ زریں قمر نے بہت اچھے طریقے سے غزہ کی سسکیاں قلم بند کی۔ شہنی ارشاد کی انوکھا استاد کچھ ماورائی سی لگی۔ آسمان کی ٹھوکر اور ایک نامور فنکار کے مصنفین اتنی اچھی تحریروں کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ بھیڑیا، زخم دل، گوشہ مسرت، وضع دار تمام تحریریں بہت اچھی تھیں۔ اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت، اللہ حافظ۔

محمد شفا...... لاہور۔ السلام علیکم! عمران بھائی امید ہے کہ آپ اور آپ کی ساری ٹیم نئے افق کے تمام قارئین بخیریت ہوں گے گفتگو میں سب کے تبصرے اچھے تھے۔ نئے افق کا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے بہت اچھی احادیث کا انتخاب کیا جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ اور مضبوط ہو گیا۔ کہانیاں تمام ہی اچھی تھیں جس کے لیے تمام رائٹرز کو مبارک باد۔ جگت سنگھ میری فیورٹ ہے۔ انوکھا استاد کی کچھ کچھ سمجھ آئی۔ خوشبوئے سخن میں تمام شعراء کی غزلیں نظمیں اچھی تھیں۔۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

عثمان عبداللہ...... کراچی۔ تمام قارئین اور محترم مشتاق احمد صاحب کو خلوص بھرا سلام عرض کرتا ہوں۔ اس سال ملک کے جو حالات دیکھنے اور مختلف اخبار و جرائد میں پڑھنے میں آئے اس سے قلبی طبیعت ناساز رہی اور ہم سب یہ ہی سوچتے رہے کہ اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے مگر سال کا آخری مہینہ شروع ہو کر سال کو اپنے اختتام کی طرف لے آیا ہے اور اونٹ ہے کہ بیٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ میری طرح اور کتنے ہی لوگ ان بے حس حکمرانوں کو غیر مناسب الفاظ سے نوازنے کے ساتھ ان کے ہاتھوں بے وقوف بننے پر پچھتا رہے ہیں۔ خیر دعا اور امید ہے کہ آنے والا سال ہمارے لیے خوشیاں اور

ہمارے لیے بہتری لے کر آئے گا۔ خاص کر ان نوجوانوں کے لیے جو ذریعہ معاش کے لیے پریشان ہیں۔اب آتے ہیں گفتگو کی طرف تو جناب کسی بھی ادارے میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں اس لیے تنقید تو نہیں کر سکتا اور تعریف بھی سوچ سمجھ کر ہی کروں گا۔ ماہنامہ نئے افق پر جب نظر پڑی تو خوب صورت ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی بھیڑیے پر نظر پڑی تو تھوڑا سا خوف آیا کیونکہ جو منظر دن کی روشنی میں جس قدر خوبصورتی کا مرکز ہوتا ہے رات کے اندھیرے میں اتنا ہی خوفناک بھی لیکن جب ابتدائیہ پر نظر کی اور ساتھ ہی خلیل جبار کی کہانی بھیڑیاں پر نظر پڑی تو احساس ہوا کہ آپ نے یقیناً ان کی کہانی کا بھیڑیا ہی ٹائٹل پر دیا ہے۔ (مذاق) خیر یہ تو مذاق کی بات ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بھیڑیا پڑھی۔ موضوع پرانا ضرور تھا لیکن خلیل بھائی نے بہت خوبصورتی سے لکھا اس لیے پڑھنے میں مزہ آیا۔ انوکھا استاد بہت خوب صورت انداز سے لکھی گئی تھی اور کاش ایسا استاد ہر ایک کو نصیب ہو جو دین سے غافل لوگوں کو ترغیب دے غزہ کی سسکیاں، زخم دل، ایک نام دو فنکار اعتراف جرم آسمان کی ٹھوکر، گوشہ مسرت وضع دار سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خوشبوئے سخن میں محمد اسلم جاوید کی غزل اور رقیہ نسیم کی ماں کی عظمت پر لکھے گئے اشعار دل کو چھو گئے، اگلے ماہ تک کے لیے اجازت، اللہ حافظ۔



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ "گفتگو" کے لیے آپ کو خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

مؤلف مشتاق احمد قریشی

اللّٰہ

اللہ

تفسیر:۔ آیتِ مبارکہ کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انسانیت کو آگاہ کیا ہے، سمجھایا ہے کہ وہ ذاتِ عالی ہر ہر جگہ حاضر وناظر ہے یہاں جس تعداد کا تذکرہ آیا ہے وہ اپنی عددی قوت کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مقصد انسان کو صرف اس قدر سمجھانا، بتانا ہے کہ انسان چاہے جیسی بھی خلوت میں یا جلوت میں ہو، کیسی ہی سرگوشیوں میں بات کررہا ہو یا بلند آوازوں سے، شہروں میں ہو یا جنگلوں، صحراؤں، بیابانوں میں، آبادیوں کے درمیان ہو یا بے آباد پہاڑوں کے غاروں میں، غرض جہاں کہیں بھی ہوگا اللہ ہر اس جگہ موجود ہوگا چاہے انسان کتنا ہی چھپنا چاہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے چھپ نہیں سکتا۔ انسان زمین وآسمان میں، خلا میں، سمندر کے نیچے، جہاں کہیں بھی ہوگا وہ اللہ کی دسترس میں ہوتا ہے۔ اللہ اس سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ اپنے اسی علم اور خبر کو وہ ہر انسان کے سامنے روزِ حشر حساب کتاب کے وقت رکھ دے گا، اسے بتادیا جائے گا کہ وہ دنیا کی مختصر زندگی میں کے کھلے چھپے کیا کچھ کہتا، کرتا رہا ہے۔ اسی بات کو ایک اور جگہ اللہ نے اس طرح فرمایا ہے۔

ترجمہ:۔ زمین وآسمان کی ہر ہر چیز کا اُسے (پورا پورا) علم ہے، جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، سب اس کو معلوم ہے، اور وہ تو دلوں کا حال تک جاننے والا ہے۔ (التغابن۔۴)

تفسیر:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی ایسی خوبیوں اور صفاتِ الٰہیہ کی حامل ہے وہ صرف خالق ومالک اور پروردگار مدبر ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایسی ذات وصفات کی مالک ہے کہ وہ ان اعمال کو بھی بخوبی جانتا ہے جو سب سے پوشیدہ اور خفیہ ہوتے ہیں، وہ انسان کے ظاہر اعمال کو ہی نہیں جانتا، بلکہ وہ تو یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کے کس عمل کے پیچھے اس کے کیا ارادے اور نیت ومقصد کارفرما ہے، جو کچھ اس انسان نے کیا اس کے پیچھے حقیقت کیا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس پر غور وفکر اگر کیا جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی عدالت روزِ آخرت میدانِ حشر میں لگے گی، وہیں میزانِ عدل نصب ہوگی، اس روز وہاں ایسا انصاف ہوگا کہ سب دودھ کا دودھ، پانی کا پانی سامنے آجائے گا۔ دنیا میں انسان چاہے جیسے بھی جرائم و اعمالِ بد کرتا پھرے اس پر کتنے ہی پردے ڈالے رکھے، چاہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی ہو لیکن اللہ تعالیٰ جو انسانوں کی ہی نہیں بلکہ زمین وآسمان کی تمام مخلوقات کی ہر ہر چیز اور ان کے ہر ہر عمل سے چاہے وہ کتنے ہی پوشیدہ کیوں نہ ہو، پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ پروردگارِ عالم کی ذات ایسی باخبر ذات ہے کہ وہ نہ صرف ہمارے ظاہر و باطن سے آگاہی رکھتی ہے بلکہ وہ تو ہمارے دل ودماغ میں آنے والی سوچوں وسوسوں تک سے پوری طرح آگاہی رکھتی ہے۔

دنیا کی تمام عدالتیں، انصاف، مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے جن شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرتی ہیں، اکثر ان

فیصلوں میں وہ ٹھوکر کھا جاتی ہیں کیونکہ ان کے سامنے پیش کردہ شواہد جو کہتے ہیں وہ اس کی روشنی میں فیصلہ کرتے ہیں ان شواہد کی اصل تک ان کی دسترس نہ ہونے کی وجہ سے اکثر فیصلے درست نہیں ہوتے کیونکہ مجرم اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنے کے لئے حقائق کو بدل کر توڑ موڑ کر پیش کرتا ہے عدالت ان حاضر شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی فیصلہ صادر کرتی ہے۔ لیکن اللہ کی عدالت میں جب عدل ہوگا تو وہاں نہ کوئی مجرم اپنے جرائم پر کسی طرح پردہ ڈال سکے گا نہ ہی اس کی کوئی چالاکی ہوشیاری اس کے کام آ سکے گی۔ کیونکہ احکم الحاکمین کی عدالت میں جب جس جس کی پیشی ہوگی اس کے ساتھ ہی اس کی فردِ جرم اور تمام حقائق و شواہد پیش ہوں گے جو نہ صرف انسانوں کے ظاہری یا باطنی اعمال پر مشتمل ہوں گے بلکہ انسان نے دنیا میں جو اچھا برا سوچا ہوگا' نیت کی ہوگی ان سب کی تفصیل اس کے سامنے آ کھڑی ہوگی کسی کو کسی طرف بھاگنے کی نہ فرصت ہوگی نہ ہی موقع ملے گا۔ عدل کرنے والی باخبر ہستی کی نگاہ سے انسان جیسی ذمہ دار مخلوق کا نہ کوئی فعل چھپا ہوگا نہ نیت' نہ سوچ و فکر چھپی ہوگی۔ اس آیتِ مبارکہ سے انسان بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کیسی عالی مرتبت اور بااختیار ذات ہے۔

ایسی سوچ و فکر رکھنے والے جو یہ جاننا چاہتے ہیں سمجھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کون ہے؟ کیا ہے؟ انہیں قرآنِ حکیم پر حکمِ الٰہی کے مطابق تدبر کرنا چاہیے' تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کیا ہے' کیسی ہے اور کیوں ہے؟ ذیل کی آیات یہی دعوتِ تدبر دے رہی ہیں یوں تو پورا قرآنِ پاک اللہ کے وجود پر گواہی دے رہا ہے۔ سورۃ الروم ایسی ہی سوچ والوں کی ہدایت کا سامان مہیا کر رہی ہے' خصوصاً الروم کی آیت ۶ سے لے کر ۵۱ تک کی آیات دعوتِ فکر دے رہی ہیں' یہاں صرف درمیان کی تین آیات پیش کی جا رہی ہیں۔

ترجمہ:۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ وہ تمہیں ڈرانے اور امیدوار بنانے کے لئے بجلیاں چمکاتا ہے' اور آسمان سے بارش برساتا ہے اور اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے' اس میں (بھی) عقل مندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (الروم۔ ۲۴)

بجلی کی چمک اور بادلوں کے گرجنے سے انسان فطری طور پر ڈر جاتا ہے کہ کہیں بجلی گر نہ پڑے لیکن ساتھ ہی سے امید بندھ جاتی ہے کہ بارش ہوگی' فصلیں تیار ہو جائیں گی' اس کے ساتھ اسے یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ کہیں طوفانی بارشیں نہ ہوں جو سب بہا کے لے جائے' اگر غور کیا جائے تو یہ حیات بعد الموت کی نشان دہی بھی ہے اور اس حقیقت کی عکاسی بھی کہ اس سارے نظام کو چلانے والا' قائم رکھنے والا' اللہ کا وجود ہی ہے جو تمام مخلوقات کا خالق ہی نہیں پروردگار بھی ہے۔ کائنات میں چاروں اطراف اللہ کے ہونے اور ہر چیز پر ہر طرح سے قادر ہونے کا اظہار بھی ہے۔

(جاری ہے)

تخلیق زدہ

ساحر جمیل سید

بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں جن کا طشت از بام ہونا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ قلم کار جب اپنے تخیل اور اپنی سوچ کو پروان چڑھاتا ہے تو بعض اوقات کچھ ایسے حقائق سامنے آجاتے ہیں کہ وہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

لفظوں کے کھلاڑی ایک قلم کار کا احوال وہ اپنے ہی الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنس گیا تھا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ کیسی شدت کی منحوس گھڑی تھی جب ہم نے نجیب احمد نجمی کی باتوں میں آ کر ناول نگار بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ نہ صرف فیصلہ کیا بلکہ آغاز بھی اسی روز کر دیا تھا۔

ہمارے وہ خیر خواہ جو ہر ملاقات پر زمانے کی اونچ نیچ اور زندگی کے نشیب و فراز پر ہمیں لیکچر پلانا اپنے اپنے مسلک کا بنیادی رکن سمجھتے تھے، اس روز نجانے کہاں جا مرے تھے کہ کسی الو کے پٹھے نے آ کر ہمیں نہیں سمجھایا کہ بھائی یہ کام نہیں کرنا، اس میں یہ نقصان ہے، وہ مصیبت ہے، فلاں قباحت ہے، فلاں مسئلہ ہے، اس دھندے سے توبہ کر لو، یہ تمہارے کرنے کا کام ہے ہی نہیں، مگر کوئی بیچارہ آتا بھی کیسے جب ہماری اپنی تقدیر ہی کھوٹی تھی۔

ابا میاں اکثر ہم سے کہا کرتے تھے "برخوردار! جب انسان کا برا وقت شروع ہوتا ہے تو بھلائی کے فرشتے بھی اس سے کوسوں دور چلے جاتے ہیں۔" ہمارا تو خیال ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا تھا، اچھائی کے فرشتے کبھی ہماری صحبت سے فیض یاب ہوئے ہی نہیں۔ بہرحال مٹی ڈالیں اس قصے پر، ہم بات کر رہے تھے اس منحوس گھڑی کی..... ایسا کرتے ہیں کہ اس منحوس گھڑی کے ذکر سے پہلے ہم آپ لوگوں کو تھوڑا سا اپنے متعلق بتائے دیتے ہیں۔

حالات حاضرہ میں تو ما بدولت اس دنیا میں تنہا ہیں مگر کسی زمانے میں ایک عدد بڑی بہن بھی تھی اور ابا حضور بھی تھے، ابا حضور سے ہی سنا ہے کہ ہماری ایک عدد اماں حضوراں بھی ہوا کرتی تھیں، مطلب یہ کہ ہم اس مظلوم عورت کے دیدار سے محروم ہی رہے۔

اماں حضوراں کے لیے مظلوم کی اصطلاح ہم اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ وہ بیچاری ہمارے اثرات سے لاعلم تھیں اور اسی لاعلمی میں ان سے ہمیں جنم دینے کی غلطی سرزد ہو گئی اور نتیجتاً وہ اس جہان فانی کو چھوڑ کر کسی اور جہان کے سیر سپاٹے پر روانہ ہو گئیں۔ ابا حضور بھی عقل سے پورے تھے کہ صورت حال کی سنگینی اور معاملے کی نزاکت کو سمجھ نہ سکے اور بڑے فخر سے ہماری ذات پر "بلند بخت" کے نام کی مہر لگا دی حالانکہ اس بھلے مانس کو ہمارا نام بلند بخت نہیں بلکہ "بلند بد بخت" رکھنا چاہیے تھا۔

ہم نے تھوڑا ہوش سنبھالا تو بہن سے انسیت ہو گئی، ہمیں ان سے انسیت کیا ہوئی اسے ایک رات سرسام ہو گیا، صبح ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تو وہ حضرت آدمی بولا۔

"اسے واپس لے جاؤ۔ تم لوگوں نے بہت دیر کر دی ہے۔"

ابا حضور ایک عرصہ ہماری شخصی برکات سے محروم رہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اول اول تو کافی عرصہ ہمارا مدرسے میں گزرا، اور یہ "کافی عرصہ" امن و سکون سے گزرا، وجہ شاید یہ رہی ہو کہ نہ ہم نے کسی سے پھڈا لام قاف کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی دوسرے کو توفیق ہوئی، اور آخر کار مدرسے کے مولوی صاحب کو ہمارے مزاج کی یہ بے نیازی متاثر

کر گئی' ہم کو ان کے شاگرد خاص ہونے کا اعزاز مل گیا اور ملوی صاحب کے دلدر دور ہو گئے۔ وہ یوں کہ چالیس سال عمر ہونے کے باوجود ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی' مگر ہمارے سائے تلے آتے ہی ان کی زندگی میں رنگ اتر آئے۔ انہیں ہمسایوں کی بیوہ پسند آ گئی' اور بیوہ کو مولی صاحب کی سیاہ گھنگھور داڑھی میں' ساون کی گھٹاؤں کی تمام سحر خیزیاں نغمہ طراز ہوتی دکھائی دینے لگیں۔ یہ الگ بات کہ وہ گھٹائیں آرٹی فیشل تھیں یعنی ''خضاب گرو گوند'' کی احسان مند' دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا البتہ بیوہ کے مسٹنڈے بھائیوں کی آنکھیں شاید ''ککروں'' کی زد میں تھیں جو انہیں وہ طلسماتی گھٹائیں دکھائی نہیں دیں' اور انہوں نے سختی سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا' نتیجہ یہ رہا کہ مولوی صاحب اپنی بیوہ...... ہمارا مطلب ہے اس بیوہ خاتون کو لے کر ایسے رفو چکر ہوئے کہ مدرسے پر تالے پڑ گئے اور ہمیں ابا حضور نے ایک دوسرے شہر اسکول میں دھکیل دیا۔

اسکول کے بعد ایک کالج کا ہوسٹل بھی ہم سے فیض یاب ہوا' اور آخر کار کئی سال ابا سے دوری کے بعد ہم اردو لٹریچر میں ماسٹر کرنے کے بعد دوبارہ ان کے قدموں میں حاضر ہو گئے' یہ الگ بات کہ ابا جی اپنے قدم قبر میں لٹکائے بیٹھے تھے' سو ہماری واپسی کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی ابا حضور بھی روانہ ہو گئے اور ہمارے لیے ایک دو کمروں کا مکان' کچھ نادر و نایاب قسم کا فرنیچر' ایک بھینس' دو بکریاں' چند مرغیاں اور کچھ بطخیں بطور وراثت چھوڑ گئے۔

شروع شروع میں ہم نے بہت کچھ کرنے کا سوچا مگر جلد ہی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہمیں خدا نے محض بیٹھ کر راج کرنے کی غرض سے پیدا کیا ہے' سو ہم تمام فکر و تردد کو جھٹک کر گھر بیٹھ گئے۔

بھینس اور بکریوں کا دودھ اور مرغیوں' بطخوں کے انڈے کافی ہو جاتے تھے' ضرورت سے اضافی جو ہوتا وہ بیچ دیتے۔ ان کے راشن پانی کا انتظام قدرتی طور پر ہو جاتا' آخر خدا کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ بقاء کا مسئلہ پالنے والے نے بڑی فراخدلی سے سلجھا دیا تھا' البتہ لایعنی فراغت سے کبھی کبھی شدید اکتاہٹ ہونے لگتی تھی' اور مزید اکتاہٹ تب ہوتی جب اردگرد والے خدائی فوجدار بن کر ہمارا احتساب کرنے چلے آتے۔ زمانہ یوں ہے۔ زندگی کو اس ڈھب سے نہیں گزارتے۔ معاشرہ یہ کرتا ہے' انسانیت وہ کہتی ہے' خدا یہ کہتا ہے۔'' کمال ہو گیا بھئی' بندہ خدا تم اپنی جیسے مرضی گزارو' مجھے اپنی گزارنے دو۔

مگر ڈھیٹ تھے سب۔ سو ''ہم'' ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے نکال دیتے۔

کچھ ایسے ہی بے ترتیبی کے دن تھے جب ایک روز وہ الو کا چرخہ بھی آ ٹپکا۔

ہمارا کالج فیلو تھا' جرنلزم میں ماسٹر کرنے کے بعد اس نے ایک کثیر الاشاعت اخبار کے دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ ہمارے پاس بھی اس روز وہ ایک پرکشش جاب کی آفر لے کر آیا تھا' مگر ہم نے نہایت اطمینان سے معذرت کر لی کیونکہ ملازمت کرنے میں ہمارے لیے بہت سی قباحتیں تھیں' آخر کافی دیر کی بحث و تکرار کے بعد اس نے ہمیں افسانہ نگاری کی دعوت دے ڈالی۔ ایک دو فکشن میگزین اور ڈائجسٹ کے مالک اس کے جاننے والے تھے' جن سے وہ ہمارا رابطہ کرا سکتا تھا۔ ہمیں فراغت کا ایک بہترین مصرف ملتا تھا' ہماری تعلیمی قابلیت زنگ آلود ہونے سے محفوظ ہوتی تھی۔ فیلڈ بھی ہماری پسند کی تھی اور پھر رائلٹی کے طور پر کچھ نہ کچھ انکم کا انتظام بھی ہوتا تھا۔

اس نے کچھ ایسے نکات ہمارے سامنے رکھ دیے کہ اس کی یہ پیشکش ہم نے فوراً قبول کر لی اور وہ بے غیرت انسان ہمارے ہاتھ میں قلم تھما کر چلتا بنا۔ کاش اس وقت ہمیں کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ وہ ہمارے ہاتھ میں قلم نہیں' ایسا کلہاڑا تھما کر جا رہا ہے جو ہمارے اپنے ہی پیروں میں لگے گا تو ہم اس کمینے کا ٹینٹوا دبا دیتے۔

اس ذلیل کے چلے جانے کے بعد ہم بہت دیر تک مختلف آئیڈیاز پر سوچتے رہے کہ آغاز کس آئیڈیے سے کیا جائے' آخر کار کئی گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد ہم نے

ایک شارٹ فکشن اسٹوری کا تانہ بانہ ترتیب دے لیا یہ ایک جن زادے کی آپ بیتی تھی جو انسانی شکل وصورت میں آکر اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے۔ اسٹوری کا خاکہ ترتیب دے کر ہم نے اپنے نام کے متعلق سوچا' بلند بخت' جب کسی اینگل سے بھی ہمیں اس نام میں ایک ادیب نظر نہیں آیا تو ہم نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر" آفاق بزمی" کے نام سے قلمی سفر شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی رات خدا کا نام لے کر اپنی پہلی تخلیق کا آغاز بھی کر دیا۔

آئندہ ماہ ہماری پہلی اسٹوری شائع ہوئی۔ رائلٹی کے ساتھ ہی مدیر کی طرف سے پسندیدگی کا خط بھی موصول ہوا۔ اس تعریفی خط نے ہمارے حوصلے اور ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز لگا دی اور ہم نے باقاعدہ نثر نگاری کا تہیہ کر لیا۔

ہمارے اس تخلیقی آغاز کے ساتھ ہی ہماری تباہی کا آغاز بھی ہو گیا۔ جس روز آفاق بزمی صاحب کو مدیر کا خط موصول ہوا یہ اس سے اگلے روز کا واقعہ ہے۔

معمول کے مطابق ہم چھنو' ہنو (ہماری دو بکریاں) اور رجو (بھینس) کے ہمراہ برگد والے جوہڑ کی طرف چہل قدمی کرنے کی غرض سے نکلے ہوئے تھے۔ دراصل اس روزانہ کی واک سے ہماری سہیلیوں کی طبیعت بھی ٹھیک رہتی تھی اور وہ اپنی پسند کی خوراک بھی خود ہی ڈھونڈ لیتی تھیں۔

واپسی پر ہم نے انہیں صحن کے مخصوص حصوں میں باندھا اور خود اپنے کمرے میں آ گئے۔ مسہری کے قریب پہنچتے ہی ہم ٹھٹک کر رک گئے۔ وجہ وہ سفید لفافہ تھا جو ہمارے تکیے پر استراحت فرمائے ہوئے تھا۔

اس پر سبز رنگ سے موٹا موٹا "منظر کرم آفاق بزمی" لکھا ہوا ہمیں واضح دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لحظہ میں ہمارے مغز ناتواں نے سینکڑوں نکات کی تفتیش و تحقیق کرتے ہوئے یہ رپورٹ بھی پیش کر دی کہ کچھ دیر قبل ہماری عدم موجودگی میں کسی انسان شریر کی کوئی اولاد بد اختریہ کارروائی فرما کر یہاں سے فرار ہوئی ہے۔ ہم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے آگے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھایا اور مسہری پر نیم دراز ہوتے ہوئے اسے کھول لیا۔ لفافے سے برآمد ہونے والا سفید ملائم کاغذ تقریباً ڈھائی فٹ لمبا تھا لیکن اس پر درج تحریر صرف ڈھائی جملوں پر مشتمل تھی۔

محترم! آپ کا انداز تحریر نہایت جاندار ہے۔

براہ کرم آئندہ کسی اور موضوع پر لکھیے گا مثلاً اہرامیات لے لیجیے۔

خلوص کار

فیاض لدھڑ

وہ ڈھائی جملے پڑھنے کے بعد ہم نے کچھ دیر فیاض لدھڑ کے متعلق سوچا مگر فیاض نام کا کوئی مہربان ہمارے جان کاروں میں نہیں پایا جاتا تھا اور پھر لدھڑ' بڑا عجیب تخلص تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق تو لدھڑ ایک بھدی سمندری مخلوق کا نام تھا۔ ان حضرت نے جانے کیا سوچ کر اپنا نام فیاض لدھڑ رکھا ہو گا اور پھر ان کا طریقہ واردات' بہرحال ہم نے زیادہ ذہن نہیں کھپایا۔

"باصلاحیت لوگوں کے بڑے بڑے جنونی مداح بھی ہوا کرتے ہیں اور ابھی تو ابتدا تھی آگے نجانے کتنے سرپھرے ہمارے مداح بننے والے تھے۔

ہم نے یہ سوچ کر اپنے کرلاتے ذہن سے فیاض لدھڑ کو جھٹک دیا ویسے بھی ہمارا ذہن فوری طور پر اہرامیات میں الجھ گیا تھا کیونکہ ایک طویل عرصہ ہم خود ذہنی طور پر اہراموں کے سحر میں جکڑے رہے تھے اور ان کی تعمیر کے اسرار سمجھنے کے لیے نجانے ہم نے سوچوں کو کہاں کہاں بھٹکایا تھا اور ان کی ترکیب تعمیر کے متعلق کئی ایک مدلل نظریات بھی قائم کیے تھے۔ اب لدھڑ صاحب نے ہمیں دوسری کہانی کا آئیڈیا دے دیا تھا۔

آئندہ ماہ ہماری دوسری کہانی "اسرار ہرم" کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں ہم نے اپنے اس نظریے کو تفصیلاً پیش کیا کہ اہراموں کی تعمیر میں انسانوں کا نہیں بلکہ جنات کا عمل دخل ہے۔ جناتی فن تعمیر کے حوالے سے ہم نے مسجد اقصیٰ کا ریفرنس بھی دیا کہ حضرت سلیمانؑ نے کس طرح جنات سے وہ مسجد تعمیر کرائی تھی۔

گزشتہ بار کی طرح اس دفعہ بھی ہمیں میگزین کی اعزازی کاپی اور رائلٹی موصول ہوئی اور اس سے اگلے روز جب ہم واک سے واپس آئے تو تکیے پر ایک لفافہ ہمارا منتظر تھا اس بار لفافے اور کاغذ کا رنگ زرد تھا اور عبارت کچھ اس طرح تھی۔

محترم! آپ نہایت نامعقول قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں' اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری بات آپ کی عقل دانی میں سما نہیں سکی' آئندہ کسی بد روح پر طبع آزمائی فرمائیے گا۔

خلوص کار

فیاض لدھڑ

اس گستاخانہ انداز تخاطب پر ہمارے پیٹ میں کافی مروڑ اٹھے مگر ماسوائے ضبط کے کوئی چارہ نہ تھا۔ لدھڑ صاحب کے متعلق خاصی قیاس آرائیوں کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہو نہ ہو یہ اس خبیث نجمی کی شرارت ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ ہم نثر نگاری کا آغاز کر چکے ہیں۔ ہمارے معمولات سے بھی وہ بخوبی واقف ہے' سو جب ہم واک کے لیے نکلتے ہیں وہ کمینہ دیوار پھاند کر لفافہ یہاں رکھ جاتا ہے۔ ہم نے بیٹھے بیٹھے زنانہ القابات سے نوازا اور خط پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

ہماری تیسری کہانی کا موضوع ایک ایسا ''دہرا قتل'' تھا جس کا کوئی سراغ نہیں ملتا کیونکہ قاتل کوئی انسان نہیں بلکہ ایک جن ہوتا ہے۔ توقع کے عین مطابق مخصوص دن' مخصوص وقت اور مخصوص مقام پر ہم نے لفافہ موجود پایا' اس بار کاغذ سرخ تھا' اور تو اور اس دفعہ لفافے کے اوپر ہمارا اصل نام درج تھا۔ ''بلند بخت''، ہم نے کاغذ نکالا اور پڑھنے لگے' مضمون میں بھی اس بار ہمیں باقاعدہ نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

بلند بخت! تم ہمیں کسی شوریدہ سر گدھے کی غلطی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہو' بات تمہاری عقل میں تشریف فرما نہیں ہوئی' کچھ اور نہیں لکھ سکتے تم؟ باز آؤ' سدھر جاؤ

فیاض لدھڑ

''تیرے لدھڑ خانے کی ایسی کی تیسی''، مضمون پڑھتے ہی ہمارے تو تن بدن میں آگ ہی لگ گئی ہم نے جوتا اتارا اور اس کاغذ کے ٹکڑے کو ہی لدھڑ تصور کر لیا۔ جو منہ میں آیا بکتے گئے' کاغذ پھٹ گیا' سانس پھول گئی مگر ہمارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا' آخر ہم نے لدھڑ کا وہ زخم زخم لاشہ اٹھایا اور لے جا کر گوبر میں دفن کر دیا تب کہیں جا کر قدرے سکون ہوا۔

دو روز تک ذہن اس قدر پراگندہ رہا کہ کچھ سوچا ہی نہیں آخر تیسرے روز ہم نے چوتھی کہانی کا آغاز کر دیا۔ اس میں ہم نے ایک آسیب زدہ عمارت کو موضوع بنایا۔ اس عمارت میں جنات کا ایک پورا خاندان آباد ہوتا ہے اور وہ خاندان کسی انسانی خاندان یا انسان کو اس عمارت میں دو چار دن سے زیادہ ٹھہرنے نہیں دیتا۔

کہانی شائع ہونا تھی سو ہو گئی البتہ اس دفعہ ہم نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ اس بار نجمی کو رنگے ہاتھوں پکڑیں گے اور وہ خاطر تواضع کریں گے کہ وہ جہنمی ہمیشہ یاد رکھے گا سو مخصوص اوقات میں ہم نے گھر کے باہر تالا ڈالا اور خود گھر کے اندر ہی دبک رہے۔ وقت گزرتا گیا مگر اس روز نجمی نہیں پہنچا' انتظار کی شدت نے ہمیں اتنا مضطرب کیا کہ ہمارے معدے میں اینٹھن ہونے لگی لہٰذا فیصلہ کیا کہ چائے کا اہتمام کر لیا جائے۔ چائے تیار کرنے کا تمام سامان کمرے میں ہی موجود تھا البتہ دودھ کا بندوبست کرنا تھا اور یہ کوئی پریشانی والی بات نہ تھی' گھر کی کھیتی والا معاملہ تھا۔ سامنے ہی صحن میں بکریاں بندھی ہوئی تھیں ہم نے دیگچی اٹھائی اور دودھ دوہنے باہر نکل آئے۔ دودھ دوہنے کے دوران ہمارا ذہن نجمی کے متعلق سوچتا رہا۔ ممکن ہے کسی ضروری کام میں پھنس گیا ہو' بھول گیا ہو' اس مذاق سے اس کا دل بھر گیا ہو یا اسے کسی طرح معلوم ہو گیا ہو کہ آج ہم گھر میں اس کی گھات لگائے بیٹھے ہیں' وجہ کچھ بھی رہی ہو اس بات کا ہمیں یقین ہو گیا کہ آج نجمی نہیں آئے گا۔

زیادہ سے زیادہ پانچ یا سات منٹ صرف ہوئے ہوں گے ہم دودھ کی دیگچی اٹھائے کمرے میں واپس آ گئے۔

اس روز ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ایک ''کرنٹ'' ایسا

بھی ہوتا ہے جو بجلی کے تار سے تو نہیں لگتا لیکن ہوتا بہت جان لیوا ہے۔ وہ کرنٹ آنکھوں کے رستے ہمارے وجود میں اترا اور ہمارے تن من کو جھنجوڑ گیا۔ ڈیچی نے ہمارے ہاتھوں سے چھلانگ لگائی اور دائیں پیر کے انگوٹھے پر سجدہ ریز ہوگئی۔ بلبلا ہی تو اٹھے تھے ہم۔ مگر ہماری آنکھیں تکیے پر پڑے زرد لفافے سے چمٹی رہیں۔ ذہن نے ایک لمحے میں حتمی رپورٹ پیش کردی۔

پانچ منٹ قبل یہاں کسی لفافے کا نام ونشان نہیں تھا' میں کمرے کے سامنے ہی بیٹھا دودھ دوہ رہا تھا کمرے میں تو کیا پورے گھر میں باہر سے کوئی پرندہ تک نہیں آیا پھر یہ لفافہ یہاں؟ ''یہ فوق الانسان کارروائی ہے'' دماغ میں ایک ساتھ کئی الارم چیخ اٹھے۔ ہم نے لاشعوری طور پر پورے کمرے میں نظر دوڑائی اور آگے بڑھ کر حیرت و بے یقینی سے وہ لفافہ اٹھالیا۔ وہی زرد رنگ لفافہ اور زرد رنگ کا غذ البتہ اس بار تحریر گہرے سرخ رنگ کی تھی۔

بلند بخت! تم ہماری سوچ سے زیادہ کمینہ خصلت انسان ہو۔ اگر اب بھی تم باز نہ آئے تو ذلیل وخوار ہو کر مروگے۔ یہ آخری تنبیہہ ہے۔

فقط تمہاری بربادی

فیاض لدھڑ

مضمون پڑھتے ہی ہمارے کلیجے میں آتشیں بھانبڑ جل اٹھے۔

''موا' کمینہ' جہنمی لدھڑ' ذرا میرے سامنے تو آ...... تیرے ہاتھوں پہ فالج گرے' تجھے دو دو منہ والے کیڑے پڑیں' ذلیل وخوار ہو کر تو مرے' تیرے ہوتے سوتے مریں۔'' ہم نے چیخ چیخ کر اسے گالیاں دینا شروع کردیں۔ کافی دیر تک یونہی بے نتیجہ چیختے رہے چلاتے رہے اور جب تھک گئے تو مسہری پر کم لیٹ ہو کر لفافے کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ گو کہ ہم لفافے کی اس انہونے انداز میں موجودگی کے متعلق کوئی بھی عقلی جواز تلاش نہ کرپائے اس کے باوجود اس واقعے کو کسی غیر انسانی مخلوق سے منسوب کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھے حالانکہ ہمارا لاشعور اپنا پورا زور لگائے ہوئے تھا کہ ہم شعوری طور پر اسے جناتی کارروائی تسلیم کرلیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم جنات کے وجود پر یقین بھی رکھتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ذرا ذرا سی بات ان سے منتھی کرنا شروع کردیں اور پھر جنات کیا اتنے ہی فارغ البال ہیں کہ اس طرح کی گھٹیا اور فضول حرکتیں کرتے پھریں انہیں کوئی اور کام نہیں ہوتا کیا؟

ہم سوچتے رہے' الجھتے رہے مگر کسی خاطر خواہ نتیجے تک نہیں پہنچ سکے۔ وقت گزرتا گیا' مگر یہ واقعہ ہمارے لیے ایک معمہ بن کر رہ گیا اور ہم نے ''لدھڑ نامہ'' لکھ ڈالا' اس کہانی میں ہم نے ایک ایسی دوشیزہ کو مرکزی کردار بنایا جس پر ایک لیچڑ قسم کا جن عاشق ہوجاتا ہے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اس بار کہانی میں جن کا کردار ہم نے شعوری طور پر ڈالا تھا اور اس کا نام بھی مکمل سوچ بچار کے بعد ''فیاض لدھڑ'' رکھا اور پھر ایک صاحب کرامت بزرگ کے ہاتھوں لدھڑ کی وہ مٹی پلید کروائی کہ بس...... اپنے اندر کا سارا غبار نکال ڈالا تھا ہم نے۔

جس روز ہمیں میگزین کی کاپی موصول ہوئی ہم نے کئی بار اپنی وہ کہانی پڑھی اور ہر بار ''لدھڑ'' کی ذلالت وخواری والے پیراگراف پڑھتے ہوئے ہمیں تازہ قلبی تسکیم کا احساس ہوتا رہا۔

یہ اسی روز شام کا واقعہ ہے' طبیعت نہایت بشاش تھی بھی ارض تخیل ان چند ماہ میں اچھی خاصی زرخیز ہوچکی تھی۔ لہٰذا ہم کمرے میں اپنی تین پائے والی رائٹنگ ٹیبل پر کاغذات کا پلندہ پھیلائے' چھٹی کہانی کا تانا بانا ترتیب دینے میں محو تھے کہ ہمیں بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ زنجیر تو ہم عموماً چڑھاتے ہی نہیں تھے آنے جانے والے اردگرد کے مفتی محتسب قسم کے چند مخصوص افراد ہوتے تھے جو کچھ دیر ہمیں ''دانش وحکمت کے جام'' پلانے کے بعد دال فے عین ہوجایا کرتے تھے سو اس روز بھی ہم نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا' البتہ یہ ارادہ کرلیا کہ کوئی بھی ہو آج عدم کا یہ شعر

مفتی شہر کو جب کوئی مشغلہ نہ ملے
تو نیک بخت گلے میرے آن پڑتا ہے

سنا کر چلتا کریں گے' کیونکہ آج ہم اپنے مزاج کی حلاوت میں کسی قسم کے پند و نصائح کی کڑواہٹ برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

ہم نے بن بلائے مہمان کو نظر انداز کرنے کی غرض سے قلم اٹھایا اور ٹیبل پر جھک کر بلا مقصد کاغذ پر یونہی بے معنی جملے لکھنا شروع کر دیے۔ آنے والا کمرے کے دروازے پر پہنچ آیا مگر ہم نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس کو شاید ہماری یہ بے نیازی کچھ زیادہ ہی گراں گزری جو اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب ٹائپ کی چیز ہمارے سامنے ٹیبل پر کھینچ ماری۔ اس بدتہذیبانہ حرکت پر ہماری کھوپڑی میں کوڈیالا ناگ پھنکار اٹھا۔ ارادہ تو تھا کہ سارا لحاظ بالائے طاق کر آنے والے کی شان میں رنگین قسم کی قصیدہ گوئی شروع کر دیں مگر جب ہماری نظر اس مہمان پر پڑی تو خود بخود ہماری زبان کو بریک لگ گئے۔

وہ صورت' وہ وجود تو ہمارے لیے قطعی ناآشنا تھا' اوپر سے موصوف کا حلیہ بھی ایسا کلاسیکل ٹائپ کا تھا کہ فوری طور پر ہمارے تاثرات میں تبدیلی واقع ہوئی' ہمارے غصے اور ناگواری کی جگہ حیرت و استعجاب نے لے لی۔

پیروں میں مغل شاہی کھسہ' چوڑی دار سفید پاجامہ' سفید سلک کی شیروانی' سر پہ کشتی نما سفید ٹوپی' ٹھوڑی پر پہاڑی بکرے جیسی نوک دار خشخشی داڑھی' ہونٹوں پر پان کی سرخی' دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں' آنکھیں قدرتی طور پر اتنی سیاہ تھیں کہ ان میں سرمہ یا کاجل کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ عمر کے لحاظ سے حضرت چالیس پینتالیس کے پیٹے میں رہے ہوں گے۔ البتہ صحت کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ مناسب الفاظ میں وضاحت مشکل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ قادر مطلق نے اپنی قدرت سے وہ پاجامہ اور شیروانی اس بانس پر چڑھا دیے تھے۔ چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد اعلیٰ حضرت کو مزید بانس ثابت کرنے میں معاون محسوس ہوتا تھا۔

اس بے نظیر نظارے نے ہمارے داخلی موسم میں تغیر و تبدل کے ہزار ہا طوفان بیدار کر دیے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم ایک ڈیڑھ صدی پہلے کے کسی لکھنوی بالا خانے میں پہنچ گئے ہوں۔ قریب تھا کہ ہمارے پہلو میں کوئی منی بائی یا حجاب بائی غزل سرا بھی ہو جاتی کہ ان کی نوکیلی اور تیز آواز نے فضا میں تیرتا ہوا سارا طلسم چھلنی کر کے رکھ دیا۔

''یہ کیا بیہودگی ہے؟'' حضرت کے اشارے پر ہم نے ٹیبل کی جانب دیکھا' وہ کتاب ٹائپ کی چیز جو انہوں نے پھینکی تھی وہ اسی ماہ کا میگزین تھا۔ جس میں ہمارا الدھڑ نامہ شائع ہوا تھا۔ ہم نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک شعر ان کے منہ پر دے مارا۔

سادگی' بانکپن' اغماض' شرارت' شوخی
تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

''اس بکواس کا کیا مطلب ہوا؟'' وہ بزرگ دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکا کر نتھنے پھیلاتے ہوئے بولے۔

''اس بے حجابانہ آمد اور بے باکانہ حرکت کے بعد بھی آپ ہم سے مطلب طلب فرما رہے ہیں' کیا آپ کو تمیز و تہذیب سے اتنی بھی آشنائی نہیں کہ کسی کے دولت خانے پر کس طرح حاضر ہوا کرتے ہیں؟''

''اچھا تو اب ہمیں تمیز و تہذیب کا درس بھی تم..... یعنی تم دو گے؟''

''اگر آپ کی عمر اور صحت کا خیال نہیں ہوتا تو اب تک دو چار درس تو ہم آپ کی گدی شریف پر نقش کر چکے ہوتے۔''

''حصار ادب میں رہو نابنجار' تم جانتے نہیں ہم کون ہیں؟''

''بانکے میاں! حلیے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آثار قدیمہ والوں نے آپ کو ڈیڑھ صدی قبل کے کسی لکھنوی بالا خانے کے کھنڈرات سے دریافت کیا ہے۔ اب یہ آپ بتا دیں کہ آپ اس بالا خانے کی کسی بائی کے عاشق صادق ہیں یا بزنس ایجنٹ؟'' ہماری قیاس آرائی پر بانکے میاں کے وجود برائے نام میں دوڑتا چلو بھر لہو ان کے

چہرے میں سمٹ آیا اور وہ ایک قدم کمرے کے اندر آ کر حلق کے بل چیخ اٹھے۔

"اپنی زبان نامناسب کو لگام دو برخوردار! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا پاپوش تمہارے سر ناپاک کی زینت ہو جائے۔"

بے اختیار ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے کیونکہ محسوس یہی ہوا تھا کہ سماعت کے پردوں میں سوراخ ہو جائیں گے، کمرے میں چھت کے قریب چاروں دیواروں پر بے شیڈز پر جو گلاس، پلیٹیں، قطار در قطار سجائی گئی تھیں ایک دفعہ تو وہ بھی کپکپا اٹھی تھیں۔ اس چنگھاڑ کی بازگشت نے دم توڑا تو بالکل بلا ارادہ ہی زبان سے ایک شعر پھسل پڑا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

"بند کرو یہ ژاژ خائی۔" گلاس پھر تھرا اٹھے۔

"بانکے میاں! آہستہ۔" ہم نے کانوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ذرا آہستہ، کیوں ہمارے کانوں میں سوراخ کرنے پر تلے ہوئے ہیں آپ۔"

"ہمارا نام بانکے میاں نہیں ہے۔"

"تو کلن میاں ہوگا۔"

"دریدہ دہن تم۔" بزرگ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔

"ٹھیک ہے پھر بنے میاں ہوگا؟"

بزرگ تلملا اٹھے، انہوں نے اضطراری انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور دروازے کے ساتھ پڑی اینٹ اٹھائی اور ہم بوکھلا کر چپل سمیت مسہری پر سوار ہو گئے۔

اس ناگہانی صورت حال میں اور تو کچھ سوجھا نہیں ہم نے تکیہ اٹھا کر ڈھال کی صورت سامنے کر لیا۔

"ارے حضرت..... قبلہ دیکھیے ہم..... ہماری بات تو سنیے آپ..... اب ہمیں کیا خبر کہ آپ کا اسم مبارک کیا ہے۔" ہماری گھبراہٹ حقیقی تھی اور کیسے نہیں ہوتی وہ کارٹون ڈھائی کلو کی اینٹ اٹھائے کھڑا تھا۔ ڈھائی کلو جو آئن اسٹائن کی مساوات E-mc2 کے مطابق ستاون ہزار ملین کلوواٹ کی طاقت تھی اب اگر وہ ہماری کھوپڑی کی مزاج پرسی کر جاتی تو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا کیا حال، بلکہ حالت ہوتی۔

"اب اپنے ذہن سے کوئی رقیق جملہ آزاد کر دو۔"

"قبلہ..... آپ تو جذباتی ہی ہو گئے میں تو یونہی ذرا حسن ظرافت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔" اس کارٹون کے تاثرات نرم پڑتے دیکھ کر ہماری جان میں کچھ جان آئی۔

"حضرت! آپ کھڑے کیوں ہیں، ادھر..... ادھر آ کر بیٹھیے نا۔" ہم نے ٹیبل کے اس طرف دیوار کے ساتھ بچھی دوسری مسہری کی طرف اشارہ کیا۔

"ہوں، اب تمہارے مزاج شریف مقام درست پر تشریف فرما ہوئے ہیں۔" وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا اور آگے بڑھ کر دوسری مسہری پر بیٹھ گیا۔ خبیث نے اینٹ بھی اپنے ساتھ ہی مسہری پر "بٹھا" لی تھی۔

"میاں! اب ہمارے گوش گزار دو کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔" اس نے ٹیبل پر پڑے میگزین کی طرف اشارہ کیا۔

"حضرت اسے میگزین کہتے ہیں۔" ہم نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہم بھی جانتے ہیں۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس کے اندر کیا لکھا ہے؟"

"بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔"

"جاہل! کوڑھ مغز انسان، تم نے کیا لکھا ہے۔"

"لدھڑ نامہ....." اس کارٹون کی آنکھوں میں لاوا ابلتا دیکھ کر ہم نے فوراً وضاحت کی۔

"مم..... میرا مطلب ہے کہانی لکھی ہے۔"

"کیوں لکھی ہے؟"

"کمال ہے بھئی میری مرضی کا معاملہ ہے یہ، میں کچھ بھی کروں، کچھ بھی لکھوں آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے یوں بازپرس کرنے والے۔"

"یہ صرف تمہاری مرضی کا معاملہ نہیں۔" وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "دوسروں کی عزت و وقار کا معاملہ بھی ہے یہ۔ کسی معصوم کے کنول رنگ نوخیز جذبوں کا جنازہ ہو کر رہ جائے، گل احساس پورے بانکپن تک کھلنے سے پہلے ہی

مرجھا جائے تو معاملہ فقط تمہاری ذات شریف تک نہیں رہ جاتا اس میں کچھ مزید زندگیوں اور مرضیوں کا سوال بھی آ جاتا ہے' سمجھے تم۔"

"قبلہ! میں واقعی نہیں سمجھ سکا' بھلا میرے افسانہ یا کہانی تحریر کرنے سے کسی کی فصل کیوں مرجھانے لگی اور کیوں اس کا جنازہ ہونے لگا؟"

"کوئی ایک نہیں' ہماری جذباتی دنیا میں آج ایک ساتھ کئی جنازے اٹھے ہیں۔ تمہاری وجہ سے آج ہماری عزت کی درگت ہو گئی' ہمارے وقار کا اقبال تہہ خاک ہو کر رہ گیا۔ تمہاری اور تمہاری ان خرافات کی وجہ سے جنہیں تم کہانیاں سمجھ کر تحریر کرتے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ حضور کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یقیناً آپ کے ساتھ یہ سب آپ کی اپنی ہی کسی حرکت کے سبب پیش آیا ہوگا۔"

"ہماری حرکت......" وہ جیسے پھٹ پڑا۔ "یہ بے ہودہ کہانیاں کیا ہماری حرکت ہیں۔ جنات پر یہ گھٹیا قسم کی بہتان طرازیاں کیا ہم فرما رہے ہیں اور یہ تمہاری تازہ ترین کمینگی۔" اس نے ہمارے سامنے ٹیبل پر پڑے میگزین کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا یہ بھی ہماری حرکت ہے۔"

"تازہ ترین کمینگی۔" والی بات پر ہم بس تلملا کر رہ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے یہ میری حرکت ہے' آپ کو اس سے کیا' آپ کیوں خوامخواہ میں انگارے چباتے پھر رہے ہیں۔" ہم نے اپنے لہجے کی تلخی کو دبانے کی ناکام سعی کرتے ہوئے کہا۔

"انتہائی ڈھیٹ اور واہیات قسم کے انسان ہو تم۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے انہیں بدنام کرنے پر ایک ذرا بھی احساس ندامت نہیں تمہیں۔"

"کمال ہے! میں نے آپ کی شان میں ایسی کیا گستاخی کر دی جو آپ اس قدر تکلیف میں مبتلا ہیں کہ کچھ بھی کہے جا رہے ہیں۔"

"لدھڑ نامے کے نام سے پورا گستاخیانہ لکھنے کے بعد بھی تم یہ پوچھ رہے ہو کہ تم نے کیا گستاخی کی ہے' یعنی...... یعنی کہ تمہاری اس معصومیت پر آفرین ہے۔" اس نے دانت کچکچائے۔

ہمارے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ عزت کی درگت' بے ہودہ کہانیاں' جنات پر بہتان' لدھڑ نامہ' گستاخیانہ ہر کہانی پر ملنے والا دھمکی آمیز خط اور...... اور اب اس عجیب وغریب چیز کی یوں آمد' اس نے کس طرح آتے ہی ہمارے لدھڑ نامے والے میگزین کی کاپی پھینک کر ماری تھی؟ تو...... تو گویا وہ' ایک انکشاف انگیز خیال جیسے ہمیں ساری حقیقت حال سے آگاہ کر گیا۔

"آپ نے ابھی تک اپنے تعارف سے نہیں نوازا۔ کم از کم اپنے اسم مبارک سے تو آگاہ فرما دیجیے۔" گویا ہم نے اس سے اپنے اندازے کی تصدیق چاہی تھی۔

"ہمارا نام تعارف تو تمہیں پہلے سے حاصل ہے' جبھی تو اتنی تفصیل اور یقین سے ہمارے متعلق تم نے قلمی موشگافیاں فرمائی ہیں؟"

"یعنی...... یعنی آپ ہی......"

"ہاں! ہم ہی ہیں تمہارے ابا حضور فیاض لدھڑ" اس نے زیر خند سے کہا تو ہمارے دماغ میں ایک ساتھ کئی قمقمے جگمگا اٹھے' فیاض لدھڑ کے تمام خطوط ہماری نگاہوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ تمام الفاظ اور تمام بے ہودہ القابات جن سے ہمیں نوازا گیا تھا اچانک ہی نغمہ سرا ہو گئے۔ یکایک ہمارے وجود میں دوڑتے ہوئے خون میں جیسے سونامی کے آثار بیدار ہونے لگے تھے۔ ہم نے ازسرنو اس کارٹون کا بغور جائزہ لیا۔ یہ یقین تو ہمیں پہلے ہی سے تھا کہ اس واہیات مذاق کے پیچھے ضرور کوئی گھٹیا قسم کا انسان چھپا ہوا ہے' اب اس نمونے کو بغور دیکھتے ہوئے ہمیں یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ یہ شخص گھٹیا مزاج کے ساتھ ساتھ دماغ بھی مجنونانہ رکھتا ہے۔

ہمارے دل ودماغ میں شدت سے اس کی مزاج پرسی کی خواہش ابھری۔ نزدیک تھا کہ ہم جھپٹ کر اس کی مہین سی گردن دبوچ ہی لیتے کہ یکبارگی ہماری نظر اس کے

دائیں طرف مسہری پر تشریف فرما اس اینٹ پر جا ٹھہری جس پر کہ وہ کمینہ ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔

"محترم! چند لمحات کے ادھار پر آپ یہ مقدس اینٹ مجھے مرحمت فرمائیں گے۔" ہم نے اپنے خون میں اٹھتے ابال پر قابو پاتے ہوئے لجاجت سے کام لیا۔

"کس لیے؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ آپ کے مبارک ہاتھوں کے لمس سے فیض یاب ہوئی ہے' میں اس مقدس اینٹ کو بوسہ دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"بکومت' ہمیں تمہاری غلیظ کھوپڑی میں رقص فرما شیطانی خیالات کی بخوبی خبر ہے۔ تمہارے تخریب کارانہ عزائم کو ہم خوب سمجھ رہے ہیں۔"

"لیکن حضور! میرے دل میں اچانک ہی یہ آرزو شدت سے مچل اٹھی ہے کہ میں آپ کے ذخیرہ سمجھ دانی میں کچھ مزید اضافے کی کوشش کروں۔ آپ کے خطوط نے کب سے میرے اندر آپ سے ملاقات کی آتش شوق کو بھڑکا رکھا ہے' میں آپ کی زیارت کے لیے کس شدت سے بے قرار رہا ہوں آپ اس کا تصور بھی نہیں فرما سکتے اور نہ ہی ایسے پر تکلف ماحول میں بیٹھ کر محض زبان سے ان تمام بے قراریوں کا کامل اور موزوں اظہار کر پانا میں اپنے لیے ممکن سمجھتا ہوں۔"

"شکر کرو کہ تم یہ سب محسوس کرنے کے لیے ابھی تک زندہ سلامت ہو' ہمارا بس چلتا تو اب تک تمہیں جہنم واصل کر چکے ہوتے۔ بار بار خط کے ذریعے تمہیں سمجھایا' تنبیہ کی مجال ہے جو رتی برابر بھی حیا آئی ہو تمہیں' بھئی حد ہوتی ہے ڈھٹائی اور جہالت کی بھی' آخر کیا سوچ کر تم یہ سب بکواس سپرد قرطاس کرتے آرہے ہو' اور تو اور سیدھا ہمی کو نشانہ بنالیا' ہماری کردار کشی کے شوق میں لدھڑ نامہ لکھ ڈالا۔ تم ہمارے یا ہمارے ہم جنسوں کے متعلق جانتے ہی کیا ہو جو یوں ہم لوگوں کو ذلیل و رسوا کرنے پر کمر بستہ ہوئے کھڑے ہو۔"

یقیناً وہ جو کہ ہمیں اپنے متعلق خاندان جنات میں سے ہونے کا یقین دلانے کی احمقانہ کوشش کررہا تھا اور ہم اینٹ شریف جی کی وجہ سے اپنی جگہ تشریف جمائے اسے اور اس کی بکواس کو برداشت کرتے رہنے پر مجبور ہوئے بیٹھے تھے۔

"آپ کی باتوں سے تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ خاصے خوددار اور غیور قسم کے جن زاد ہیں لیکن آپ کے عمل سے اس بات کی نفی ظاہر ہوتی ہے آپ جن ہو کر ایک معمولی انسان سے خوفزدہ ہیں اور اس کے مقابل اپنے تحفظ کی غرض سے ایک اینٹ پر بھروسہ فرما رہے ہیں۔ اس طرح آپ از خود اپنی برادری کے جاہ و حشم اور ان کے قوت و اختیار کی توہین فرما رہے ہیں۔ درحقیقت آپ جیسے کمزور' کم ہمت اور بزدل جن ہی قوم جنات کی ذلالت و رسوائی کے ذمہ دار ہیں۔"

"اپنی زبان ملعون کو لگام میں رکھو' ہمیں انسانوں کے درمیان آتے ہوئے یہ حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ ہم اپنی جناتی طاقت سے کسی انسان کو جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے' وگرنہ تو اب تک ہم تمہاری گردن مروڑ چکے ہوتے۔ ہماری اس قسم کو ہماری مجبوری خیال مت کرو۔" ہم فوراً تن کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"یعنی آپ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" ہمارا ارادہ اس پر جھپٹنے کا تھا لیکن اس کمینے نے شاید ہماری نیت بھانپ لی۔ جو فوراً اینٹ ہاتھ میں اٹھالی تھی۔

"صرف اپنی جناتی طاقت سے نہیں البتہ اس اینٹ سے ہم ضرور تمہاری مزاج پرسی کرسکتے ہیں مردود۔"

ہمارے اعصاب فوراً ہی ڈھیلے پڑگئے۔ اس کی آنکھوں میں رقصاں مجنونانہ چمک اس بات کی غماز تھی کہ وہ اپنے کہے پر عمل بھی کرسکتا ہے۔

"دیکھیے' آپ مسلسل نامناسب الفاظ کے استعمال سے میری عزت نفس مجروح فرما رہے ہیں۔ جو کسی طور بھی ایک شریف جن زاد کو قطعی زیب نہیں دیتا۔"

"اپنی عزت نفس کا تو بہت پاس ہے تمہیں' اور دوسروں کی جیسے کوئی عزت ہی نہیں۔ وہ تو پیدا ہی بے عزت ہوتے ہیں' ہے نا۔"

''میں نے ایسا کب عرض کیا؟''

''گزشتہ اتنے ماہ سے اور کیا کررہے ہو تم' قوم جنات کی مٹی پلید کر کے رکھ چھوڑی ہے تم نے' کبھی ان کو غلام مزدور بنا دیتے ہو' کبھی قبضہ گروپ کا اعزاز بخش کر خود ہی انہیں کسی عمارت میں ٹھونس دیتے ہو۔ کبھی کسی جن کی یادداشت گم ہو جاتی ہے اور وہ انسانی معاشرے میں انتہائی فضول اور لچر قسم کی حرکتیں کرنے میں مگن ہو جاتا ہے' کبھی قاتل تو کبھی عاشق' چلو اگر عاشق ہو تو برداشت ہو بھی جائے' تم نے تو عاشق کے نام پر ایک جاہل گنوار اور بے حیا قسم کا غنڈہ بنا کر پیش کیا ہے فیاض لدھڑ کو۔'' اس کی سیاہ آنکھیں یکا یک ہی ایک تپش سی دینے لگی تھیں۔ تمہاری اس واہیات تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عشق و عاشقی کی ذرہ بھی تمیز نہیں ہے تمہیں اور تم ہو کہ داستانیں لکھنے لگے؟ اور یہ بھلا کوئی بات ہوئی کہ جن جب اور جس کے وجود میں چاہے حلول فرما جاتا ہے' کوئی وبائی مرض سمجھ کر رکھا ہے یا جراثیم' بھئی حد ہوتی ہے بہتان اٹھانے کی بھی' تم نے تو لگتا ہے جنات کو ایک بالکل ہی جاہل' بے کار اور فارغ قسم کی مخلوق تصور کر رکھا ہے۔ جسے انسانوں سے پنگے بازی کے سوا اور کوئی کام کاج ہی نہیں ہے۔ تمہاری کہانیوں میں جنات' جنات کم اور بندر زیادہ معلوم ہوتے ہیں یا...... یا پھر تہذیب و تمدن سے قطعی ناآشنا وحشی قبائل سے تعلق رکھنے والے انسان۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ تم انسانوں جیسے نہیں ہیں۔ اور ہم نے اگر بذریعہ خط سمجھانے کی کوشش کی تو تم نے ہم پر قلمی حملہ کر دیا۔ ذرا بھی شرم دامن گیر نہیں ہوئی وہ سب لکھتے ہوئے۔ اپنے اندر کی ساری کمینگی اور گھٹیا پن لدھڑ نامے میں تم نے ہم سے منسوب کر ڈالا۔ کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں کہ تمہاری اس بے ہودہ حرکت کی وجہ سے ہمارے کندھوں پر غم و اندوہ کا کیسا کوہ گراں آن پڑا ہے؟''

''چلیں اگر سوئے اتفاق کچھ آن بھی پڑا ہے تو سنبھال رکھیے' نہیں سنبھالنا چاہتے تو اپنے ناتواں کندھوں سے اتار پھینکیے۔ اتنا سیخ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' ہماری شان بے نیازی لدھڑ کو متاثر نہ کر سکی۔

''تم ایسا بک سکتے ہو' تم پر تو نہیں گزر رہی نا' ہم سے پوچھو' دنیا تو ہماری اجڑی ہے۔ جذبے تو ہمارے شہید ہوئے ہیں اور...... اور ہم یہ فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ اس کا ازالہ بھی اب تمہی کرو گے۔ تمہاری وجہ سے ہمارا سارا معاملہ بگڑا ہے سو اب تم ہی اس بگاڑ کو سدھارو گے۔''

''کیا مطلب' کیسا بگاڑ؟''

''تمہارے لدھڑ نامے کی وجہ سے ہماری زندگی' ہماری منگیتر سلیم ہم سے خفا ہو گئی ہے' تم نے اس کی نظروں میں ہمارا کردار مشکوک بنایا ہے' اس لیے اب تم ہی اس کی غلط فہمی دور کرو گے۔''

''محترم! یہ سلیم صنف کرخت میں سے ہے یا صنف نازک میں سے۔''

''کمینے شخص ہم نے فرمایا ہے کہ ہماری منگیتر ہے۔'' اس نے نتھنے پھیلاتے ہوئے اینٹ اٹھا کر اپنے دائیں گھٹنے پر بٹھالی۔ ''ہماری طرح اسے بھی مطالعے سے گہرا لگاؤ ہے۔ عموماً ہم کتب و رسائل کا آپس میں تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ اسے تمہارا انداز تحریر پسند آیا تو اس نے تمہاری تحریر کو خاصا سراہا۔ ہماری سیاہ بختی کہ ہم اس سے کہہ بیٹھے کہ تم ہمارے دوست ہو۔ اس پر وہ ایک خوش گوار حیرت کا شکار ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم تمہیں سمجھا دیں کہ جنات کے متعلق مت لکھو' کیونکہ تمہاری معلومات ناقص ہیں اور ہم نے تمہیں خط لکھ ڈالا مگر تم...... تم تو کوئی مہان خبیث انسان ثابت ہوئے۔'' اس نئے القاب پر ہمارے دماغ میں پھر سے مروڑ اٹھا تھا' لیکن ہم اینٹ کو دیکھتے ہوئے ضبط کر گئے۔ وہ بک رہا تھا۔

''تم نے لدھڑ نامے میں جس طرح ہماری شخصیت کو مسخ کر کے پیش کیا ہے' جس طرح ہماری کردار کشی کی ہے اس سے سلیم ہماری جانب سے بدظن ہو گئی ہے۔ اسے شبہ ہو گیا ہے کہ ہم ایک بدکردار جن ہیں' ہم قومی' نسلی اور اخلاقی اقدار سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ جبھی ہمارے دوست نے یہ سب لکھا ہے۔ اور جب ہم نے اسے اپنے نجیب

الطرفین اور صاحب کردار ہونے کا یقین دلانے کی کوشش کی تو اس نے ہمارے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا اور ہمیں سخت لہجے میں تنبیہہ کیا کہ اگر آئندہ ہم نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو وہ پوری جناتی جماعت اور امیر جماعت کو بتا دے گی کہ ہم نے ایک انسان پر اپنی جناتی حیثیت ظاہر فرما دی ہے جس کی ہم لوگوں کو سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ اس کی اس دھمکی سے ہم گھبرا گئے متوقع سزا کے خوف سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ ایسی صورت میں سلیم ہم سے ہمیشہ کے لیے چھن جاتی۔ ہمارے ہاں قومی اقدار اور قوانین کا بہت احترام فرمایا جاتا ہے۔ ہم سب کی نظروں میں ناقابل اعتبار اور غداری ہی حیثیت اختیار کر جاتے۔ یہ سب تو چلو پھر بھی گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن سلیم کی ناراضی اس کی جدائی ہم برداشت نہیں کر سکتے اس کے ہجراں میں تو ہم پاگل ہو جائیں گے مر جائیں گے ہم لدھڑ جیسے بول نہیں بلکہ کراہ رہا تھا اس کے چہرے پر غم و یاس کے گہرے سائے اتر آئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی پل وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے اس لیے اب تم ہی جا کر اس کی یہ غلط فہمی دور کرو گے تم ہی اسے یقین دلاؤ گے کہ ہمارے کردار میں کوئی کمزوری کوئی خرابی نہیں اور ہم صرف اسی کے خواب دیکھتے ہیں۔ ہماری دھڑکنیں اسی کے نام کی تسبیح کرتی ہیں اور وہی ہماری پہلی اور آخری محبت ہے۔"

لدھڑ کے لہجے میں گھلی بے قراریوں کو محسوس کرتے ہوئے ایک ذرا تو ہمارا دل بھی پسیجا تھا۔ مگر اس کی داخلی و خارجی حالت کی نسبت ہمیں اس کی بیان کردہ کہانی میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا کرب و اضطراب اپنی جگہ لیکن ایک مصنف ہونے کی حیثیت سے ہماری نظر میں لدھڑ کی پریشانی یا مسئلے کے حل کی بجائے اس کی یہ غم ناک داستان عشق زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔

ایک ذرا سی رنگ آمیزی سے اس کہانی کو مزید اثر انگیز بنایا جا سکتا تھا۔ ایک جناتی داستان عشق یہ اچھوتا آئیڈیا ہمارے قلمی سفر میں یقیناً ایک سنگ میل ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک شاہکار تخلیق کی بنیاد بن سکتا تھا۔

"سمجھ شریف میں کچھ آیا یا نہیں۔" لدھڑ کے مخاطب کرنے پر ہمارے خیالات کا تانا بانا بکھر گیا۔ وہ مغموم نظروں سے ہم ہی کو گھور رہا تھا۔

"جی..... بالکل میں صورت حال کی تمام نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو بخوبی سمجھ رہا ہوں اور یہ طمانچے والا سین تو بہت ہی دل دوز اور جذبات انگیز ثابت ہوگا۔"

"کیا..... ! تم..... تم پھر کسی شیطانی کا سوچ رہے ہو۔"

"نہیں حضور! شیطانی نہیں مہربانی کہیے۔ آپ نے مجھے ایک اور دلچسپ کہانی سے نوازنے کی مہربانی فرمائی ہے تو میں اس کہانی میں مزید اثر انگیزی پیدا کر کے آپ کی مہربانی کا جواب مہربانی ہی سے دوں گا۔"

"یعنی تم پھر سے کہانی لکھنے کا سوچ رہے ہو۔"

"ظاہر ہے آپ خود ہی تو فرما رہے ہیں کہ میں سلیم صاحب..... مم میرا مطلب ہے آپ کی منگیتر سلیم کی غلط فہمی دور کروں۔ اسے آپ کے خلوص و محبت اور آپ کے بلند کردار ہونے کا یقین دلاؤں تو اس کے لیے ایک نئی کہانی تو مجھے لکھنی ہی ہوگی۔"

"خبردار! جو اب تم نے ایسی کسی منحوس جسارت کا خیال بھی کیا تو پہلے ہی تمہاری خرافات کی بدولت ہماری دنیا اجڑ کر رہ گئی ہے اب مزید کیا گل کھلانا چاہتے ہو۔"

"آپ بالکل ہی بے فکر ہو جائیں جناب! اپنے اب تک کے تخلیقی تسلسل اور روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بار میں آپ کی داستان عشق میں جذبہ و احساس اور اخلاص و وفا کی رنگ آمیزی سے وہ سماں باندھوں گا کہ آپ کی سلیم بے خود ہو کر آپ تک کھنچی چلی آئے گی۔ کہانی نہیں یوں سمجھیں کہ تعویز محبت لکھوں گا اس بار۔ سبھی ازالے ایک ساتھ ہو جائیں گے۔ اور دیکھ لیجیے گا آپ دعائیں دیتے پھرو گے مجھے۔"

"بکومت!" لدھڑ مطمئن ہونے کی بجائے الٹا

بھڑک اٹھا۔ "داستان عشق لکھو گے تم۔ جانتے ہیں ہم تمہارے عشق اور تمہارے تعویز محبت کو بھی' اسی کے باعث تو آج یہ سب ہمیں برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ غنڈہ گردی کو تم عشق لکھتے ہو اور غنڈے بدمعاش کو عاشق' اب اگر تم نے ایسا کچھ رقم کرنے کی کوشش کی تو ہم تمہارے یہ نجس ہاتھ کچل ڈالیں گے۔" لدھڑ نے غصے سے دانت کچکچائے تو اس کی نوکیلی داڑھی جیسے خوفزدہ ہو کر لرزنے لگی۔

"میں آپ کے جذبوں کو تحریر کروں گا۔ حقیقت کو لکھوں گا تو سلیم صاحبہ اصل صورت حال جان پائیں گی نا' اگر میں لکھوں گا ہی نہیں تو ان کی غلط فہمی بھلا کیسے دور ہوگی۔ کیسے حقیقت جان پائیں گی وہ۔"

"اس کے لیے تم سلیم سے بالمشافہ ملاقات کرو گے۔ اس کے روبرو اپنی کمینگی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے اس حقیقت سے آگاہ کرو گے کہ تمہارے لدھڑ نامے والے فیاض لدھڑ سے ہمارا قطعاً کوئی تعلق نہیں اور یہ یقین دہانی بھی کہ ہم اس کے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتے' کسی اور ماہ جبیں کو سوچ بھی نہیں سکتے ہم۔"

"یہ کام تو کہانی کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے' بلکہ کہانی کے ذریعے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ پھر بھلا سلیم صاحبہ کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے۔" ہمارے تمام جواز صرف اپنی نئی کہانی کے حق میں تھے۔

"ہمیں تمہاری نثری وضاحت درکار نہیں ہے۔ تم خود چل کر سلیم کے پاس جاؤ گے۔"

"کیا مطلب...... کہاں؟"

"وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتی ہے۔ سو کالج آتے جاتے وقت تم اس سے مل کر اسے ساری حقیقت بتا سکتے ہو۔"

"واہ! یہ بھی خوب کہی آپ نے۔" ہمارا لہجہ آپ ہی آپ زہر خند ہو گیا۔ "اچھا حل سوچا ہے آپ نے۔ اپنا الو سیدھا کرنے کے چکر میں آپ میری عافیت کو داؤ پر لگانا چاہتے ہیں۔ مجھے بیچ رستے سینڈل کھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ سمجھے آپ۔"

"تو پھر کسی وقت اسے گھر جا کر مل لو۔ ہاؤسنگ کالونی والی جامع مسجد کی عقبی گلی میں تیسرا مکان ہے۔" اس نئے مشورے پر ہمارے کان ذرا تن کر کھڑے ہو گئے۔

ہم بتاتے چلیں کہ ہمارا دولت خانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ایک نواحی آبادی میں واقع تھا اور ہاؤسنگ کالونی کی جس گلی اور جس مکان کا لدھڑ ذکر کر رہا تھا' وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نامی گرامی قصاب فتح یار عرف پھمن پہلوان کا گھر تھا۔ یعنی عاقبت نااندیش لدھڑ پھمن پہلوان کی دختر کے عشق میں مبتلا تھا اور یقیناً اپنی زندگی محفوظ رکھنے کی غرض سے ہمیں قربانی کا بکرا بناتے ہوئے پھمن کے ہاتھوں ہماری گردن مڑوانے کا سازشی منصوبہ بنا کر آیا تھا۔

"کہیں آپ پھمن پہلوان کے گھر کا ذکر تو نہیں فرما رہے؟" ہم نے تصدیق چاہی۔

"ارے' تم جانتے ہو انہیں۔ وہی تو ہمارے متوقع خسر صاحب ہیں۔ سلیم انہی کی دختر نیک اختر ہے۔" لدھڑ کی باچھیں پھیل گئیں۔

"جی ہاں! تھوڑا بہت جانتا ہوں' آپ ہی کے ہم عمر ہوں گے۔" ہمارے طنز کی چبھن لدھڑ کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے وہ تو ہم بچپن ہی سے بیماریوں کے زیرِ سایہ رہے ہیں۔ نمونیا' ٹائیفائڈ' نزلہ وزکام اور دو چار بار ہیضہ بھی لاحق ہوا ہے۔ بس اسی لیے ذرا اپنی عمر سے زیادہ معتبر دکھائی پڑتے ہیں ورنہ تو سلیم سے بس دو چار برس ہی زیادہ بڑے ہوں گے۔ خیر چھوڑو یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تم یہ بیان کرو کہ تم سلیم سے کالج کے راستے میں ملاقات کرو گے یا اس کے گھر جا کر ملنا چاہو گے؟"

"یہ بھی میرا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں خود ذبح ہونے پہلوان کے گھر جا پہنچوں۔ سکون آپ کی ہڈی کو نہیں ہے اور قیمہ میرا بنوانا چاہتے ہیں۔ مجھ سے بالکل بھی یہ توقع مت رکھیے گا کہ میں آپ کے مجنونانہ جذبات کی زکواۃ میں اپنی جان کا نذرانہ دوں گا۔" میرے دوٹوک انداز پر کچھ دیر کے لیے تو لدھڑ

کو بالکل ہی چپ لگ گئی پھر وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔
"اپنے فیصلے پر اچھی طرح نظر ثانی کر لو۔"
"اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"
"مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"
"کیا میں اسے دھمکی سمجھوں؟"
"دھمکیاں تو بزدل دیا کرتے ہیں۔ ہم تو تمہیں حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں۔"

"بہتر ہوگا کہ آپ اپنی بہادری کا مظاہرہ اپنے خسر صاحب کے حضور جا کر کریں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ سلیم کی نظروں میں بھی آپ کی کچھ عزت بحال ہو جائے۔ ویسے بھی آپ کے خسر آپ پر تو چھرا بگدا اٹھائیں گے نہیں کیونکہ آپ کے وجود سے انہیں پھیپھڑا جات کے علاوہ کوئی بوٹی شوٹی تو ملنے کی نہیں۔"

"خبیث انسان!" لدھڑ کو شائد زیادہ ہی بے عزتی محسوس ہوئی تھی کہ وہ اینٹ سنبھالتا ہوا دھاڑا تو ہم بری طرح بوکھلا گئے۔ ہمارا گھٹنا ٹیبل سے ٹکرایا تو وہ ایک طرف الٹ گئی۔ لدھڑ اینٹ ہاتھ میں تولتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ ہماری تین پائے کی ٹیبل الٹی تو چوتھی ٹانگ کی جگہ رکھی اینٹیں ہمارے سامنے ظاہر ہوئیں۔ اضطراری انداز میں ہم نے جھپٹ کر ایک اینٹ اٹھائی اور اچھل کر مسہری پر کھڑے ہو گئے۔ صورت حال یکا یک ہی خاصی سنگین نوعیت اختیار کر گئی تھی۔ ہمارے ہاتھ میں اینٹ آتے ہی لدھڑ بھی جیسے قدرے محتاط ہو گیا ورنہ تو شاید وہ ہمیں نشانہ بھی بنا چکا ہوتا۔

"ہم تمہارا غلیظ بھیجا نکال دیں گے۔" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے اپنے اینٹ والے ہاتھ کو حرکت دی تو ہمارا اینٹ والا ہاتھ از خود سر سے بھی بلند ہو گیا۔

"مار دو میں بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ یہ اینٹ سیدھی سر میں آئے گی۔" وہ اپنی جگہ اینٹ اٹھائے کھڑا تھا اور ہم مسہری پر چوکس کھڑے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر تھے اور درمیان میں صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ لہٰذا کسی کا نشانہ خطا ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔

ہم پوری طرح چوکنے تھے کہ وہ پہل کرے تو ہم بھی اس کا کھوپڑا کھول دیں۔ اسے بھی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ اگر اس نے پہل کی تو خود بھی محفوظ نہیں رہے گا۔

"بہت پچھتاؤ گے تم جانتے نہیں ہو ہمیں۔" وہ قہر بار نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے خونخوار لہجے میں بولا۔

"بہت اچھی طرح جان چکا ہوں۔ اتنا بھی گھامڑ نہیں ہوں میں۔ ایک تو تمہارا عشق ہی انتہائی نامناسب ہے اوپر سے احمقانہ ڈرامہ رچانے چلے آئے۔ تم نے کیا سوچا تھا کہ میں تمہارے اس جناتی ڈرامے پر یقین کرتے ہوئے تمہیں جن تسلیم کر لوں گا۔ تم سے خوفزدہ ہو کر تمہارے اوٹ پٹانگ مشوروں پر عمل کرتا چلا جاؤں گا اور سلیم سے تمہاری لائن سیٹ کروا دوں گا۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ میں تمہاری عمر کا لحاظ کرتے ہوئے تمہاری عزت کرتا آ رہا ہوں اور تم پتا نہیں کیا سمجھ رہے ہو۔" دراصل اینٹ ہاتھ میں آتے ہی ہمارے حوصلوں کا وقار بیدار ہو آیا تھا۔

"لائن....." لدھڑ نے بدمزگی سے دہرایا۔ "یہ نامناسب اصطلاح تم جیسا پست ذہن مصنف ہی استعمال کر سکتا ہے۔"

"بس، بس رہنے دو بڑے میاں! اپنا مناسبیات کا فلسفہ اپنے پاس ہی رکھو اور اپنی اس کہانی میں پھانسنے کے لیے کسی اور احمق کو تلاش کرو جا کر۔"

"بڑے میاں کسے کہہ رہے ہو؟" لدھڑ نے آنکھیں نکالیں۔

"تم کو کہہ رہا ہوں اور کون ہے یہاں۔"

"دریدہ دہن تم....." لدھڑ تلملا کر رہ گیا۔ یقیناً ہمارے ہاتھ میں دبی اینٹ اس کی لگام بن گئی تھی۔

"بس اب مزید توہین برداشت نہیں کروں گا میں، بہت سن چکا اور بہت عزت کر چکا تمہاری اللہ توبہ کرنے کی عمر ہے تمہاری اور تم ہو کہ ایک لڑکی کے عشق کی آبیاری فرماتے پھر رہے ہو اور لڑکی بھی ایسی جو تمہاری بیٹی کی عمر کی ہو گی۔ افسوس اور شرم کا مقام ہے۔"

ہمارے لہجے کا دکھ اور تاسف حقیقی تھا۔ اس کا مسئلہ اور

مقصد چونکہ اب پوری طرح ہم جان چکے تھے اس لیے اس کی عمر اور صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سمجھ لینا بھی کوئی مشکل امر نہیں تھا کہ اس نے ہمیں اپنے متعلق ایک جن ہونے کا یقین دلانے کی کوششیں کیوں کی ہوں گی۔ یقیناً وہ سلیم سے اظہار عشق کی صورت میں سلیم کے متوقع شدید ردعمل سے خائف تھا اور ایسا کچھ بھی کرنے سے پہلے ہمیں اپنے نمائندے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے سلیم کا عندیہ جان لینا چاہتا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ سنگینی کو جانچ لینا چاہتا تھا۔ وہ تو جاننا اور جانچنا چاہتا تھا' ہم تو پہلے سے جانتے تھے۔ خوشی کمہار والا واقعہ تو ہماری آنکھوں دیکھی بات تھی' گوشت اور ہڈی کے تناسب پر خوشی کمہار نے بحث وتکرار کرنے کی جسارت کی تھی۔ پھمن پہلوان نے گائے کا پایہ اٹھا کر خوشی کے سر پر دے مارا اور خوشی صاحب دانت نکالتے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گئے تھے پھر ہاسپٹل پہنچ کر ہی ہوش آیا تھا جناب کو۔ ایسے میں بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم لدھڑ سے کوئی ہمدردی پالتے۔

وہ بداندیش اپنی جگہ کھڑا قہر بار نگاہوں سے ہمیں گھور رہا تھا' یوں جیسے ہمیں کچا ہی چبا جائے گا' ہم بھی پوری طرح مستعد تھے کہ اگر وہ کوئی سنگین حرکت کرنے کی کوشش کرے تو موقع پر ہی اسے ڈھیر کر سکیں مگر وہ کچھ دیر تک ہمیں گھورتے رہنے کے بعد اچانک حرکت میں آیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہمارے رویے سے یقیناً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا حربہ کامیاب نہیں ہو سکا اور ہمارے تیور دیکھتے ہوئے اس نے یہ اندازہ بھی بخوبی لگا لیا ہوگا کہ اس کی مزید کوئی بے وقوفی اس کے اپنے ہی حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے سو اس نے خاموشی سے رفو چکر ہونا ہی بہتر خیال کیا ہوگا۔

ہم نے اطمینان کی سانس لی اور اینٹ پھینک دی۔ ابھی ہم بیٹھ نہیں پائے تھے کہ یکا یک ہمیں ایک شدید گڑبڑ کا احساس ہوا' اور ہم چونک پڑے' اچانک دروازے پر لدھڑ کی منحوس صورت نمودار ہوئی' پھر اس سے پہلے کہ ہم سنبھلتے یا اپنے دفاع میں کچھ کرتے' اس ذلیل نے ہاتھ میں پکڑی اینٹ ہم پر کھینچ ماری۔ ہم نے برق رفتاری سے اچھل کر بچنے کی کوشش کی لیکن اس کمینے کا نشانہ بڑا غضب کا تھا۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے' پہلا دھماکا ہمارے بائیں گھٹنے اور اینٹ کے باہمی وصال کا تھا اور دوسرا مسہری کی کمر ٹوٹنے کا۔ ہماری درد بھری کراہ ان دھماکوں سے الجھ کر رہ گئی۔ ڈگمگا کر جو گرے تو اپنی ہی پھینکی اینٹ پر' ایک لمحے کو تو یوں محسوس ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کا نچلا مہرہ اپنی جگہ سے اچھل کر حلق میں آ پھنسا ہے۔ سائیں سائیں کے شور میں ہم نے لدھڑ کے بیرونی جانب دوڑتے قدموں کی آواز سنی تو بے ساختہ ایک انتہائی موٹی اور برہنہ گالی کو فوراً اس کتے کے تعاقب میں روانہ کیا' کیونکہ وجودی طور پر ہم خود ایسا کرنے سے قاصر تھے۔

ہمارا گھٹنا ٹیاؤں ٹیاؤں اور ریڑھ کی ہڈی کا نچلا مہرہ چیاؤں چیاؤں کر رہا تھا۔ اس ٹیاؤں' چیاؤں کو ضبط کرنے میں ہماری کتنی ہی دفعہ ہائے ہائے ہوئی۔ آخر کار ہم نے خود کو سنبھال لیا' وہ ہمیں چوٹ دے کر فرار ہو چکا تھا اور چوٹ کے ساتھ ساتھ مسہری کا نقصان بھی کروا گیا تھا۔

ہم اندر ہی اندر اس کی مکاری پر کھولتے رہے اور دل ہی دل میں اسے گالیاں بکتے رہے۔ ان لمحات میں ہم نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ بہت جلد سود سمیت حساب برابر کریں گے۔ اس جہنمی کی دونوں ٹانگیں توڑ کر اسے ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دیں گے' تاکہ اس کے خاندان میں سے دوبارہ کوئی اور لدھڑ جن بننے کی خواہش تک نہ کر سکے۔ یہ فیصلہ کر لینے کے بعد ہمیں خاصی تقویت کا احساس ہوا۔ درد میں بھی کافی حد تک کمی واقع ہوئی' پھر بھی وقفے وقفے سے بلند ہونے والی ٹیاؤں چیاؤں کی لہریں ہمارے دماغ میں ٹیسیں جگاتی رہیں۔ رات تک ہمارا گھٹنا حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھول چکا تھا اور کمر گویا پتھر کی بن کر رہ گئی تھی۔ سونے سے پہلے ہم نے ہلدی اور روئی گرما کر متاثرہ مقامات پر باندھ لی تھی۔ ساری رات ہم درد وکرب سے کراہتے رہے اور لدھڑ سمیت اس کے پورے خاندان کی نجی زندگی کے متعلق ناقابل اشاعت قیاس آرائیاں فرماتے رہے۔

ان پر بڑھتے تک بستر میں لیٹے رہنا دیتے تو ہمارا معمول تھا لیکن اس روز بستر پر لیٹے رہنے میں بڑا عمل دخل ہماری تکلیفوں کا بھی تھا لیکن کب تک زندگی کی ضرورتیں اور جسمانی حاجتیں تو جوں کی توں برقرار تھیں۔ سو بادل نخواستہ ہم اپنی مضمحل جسمانی قوت مجتمع کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جیسے تیسے صبح کی ابتدائی اور ناگزیر ضرورتوں سے فارغ ہو کر ہم نے دڑبوں کے دروازے کھولے تو ہمیں ایک غیر معمولی پن کا شدت سے احساس ہوا۔ خلاف معمول تمام نفوس کی موجودگی کے باوجود آج صحن کی فضا میں ایک کثیف سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ چھنو دھنو اور رجو اپنی اپنی جگہ گم سم کھڑی تھیں۔ بطخوں کے نغمے جیسے ان کے گلوں میں منجمد تھے اور ہماری پیاری مرغیاں بھی اپنی قوت گویائی سے گویا محروم ہو چکی تھیں۔

ہمارے دروازہ کھولتے ہی وہ ایک قطار میں باہر نکلیں اور صحن کے وسط میں کھڑی ہو کر گردنیں اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ ان کے منہ سے عجیب سہمی سہمی سی ککڑ کک کی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف سے بطخوں کا گروپ بھی باہر نکل آیا لیکن ان کا رویہ بھی ہمیں مشکوک ہی دکھائی دے رہا تھا۔

مرغیوں' بطخوں کا مشاہدہ فرماتے فرماتے ہم چونک پڑے' بطخیں تو دس کی دس ہمارے روبرو تھیں البتہ بارہ مرغیوں میں سے دو اس وقت کم تھیں' بے اختیار ہم نے جالی میں سے دڑبے کے اندر جھانکا تو دل پر جیسے گھونسہ سا پڑا۔ مرغیاں تو دڑبے میں نہیں تھیں البتہ مرغیوں کی باقیات وہاں ضرور موجود تھیں۔ بکھرے ہوئے پر اور کچھ خون آلود ہڈیاں گواہی دے رہی تھیں کہ رات ان پر کوئی قیامت گزر گئی ہے۔ یقیناً موت کے منہ میں جانے سے پیشتر وہ بہت تڑپی اور پھڑپھڑائی ہوں گی رہ رہ کر انہوں نے ہمیں مدد کے لیے پکارا بھی ہوگا لیکن افسوس کہ ہم ان کی صدائیں نہ سن سکے' گو کہ رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے تھے مگر شاید جسمانی تکلیفوں نے حواس کو اس حد تک نڈھال کر رکھا تھا کہ ہمیں ٹھیک سے اپنے گردوپیش کی کچھ خبر ہی نہ رہی تھی۔ ان کی اس بے کسی کی موت پر ہماری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کچھ دیر تک ہم ان کے احترام میں مغموم خاموشی اختیار کیے کھڑے رہے۔ پھر بغور دڑبے کا جائزہ لینے لگے کہ موت نے کدھر سے نقب لگائی ہوگی۔ دڑبے کے بائیں طرف کونے میں ہمیں وہ سوراخ بھی نظر آ گیا جہاں سے اچھا خاصا سانپ یا نیولہ وغیرہ باآسانی دڑبے میں داخل ہو سکتا تھا۔ ہم نے گھٹنے اور کمر سے اٹھتی ٹیسوں کے ساتھ بدقت تمام اس سوراخ میں مٹی بھر کر اسے اچھی طرح کوٹ کوٹ کر بند کر دیا۔ ذہنی دانست میں تو ہم باقی مرغیوں کو آئندہ کے لیے خطرے سے محفوظ کر چکے تھے مگر یہ ہماری خام خیالی ثابت ہوئی۔

یہ دو مرغیاں تو گویا تباہی کے ایک تسلسل کا آغاز تھیں' ان دو مرغیوں کی موت کے ساتھ ہی جیسے ہمارے ماہ و انجم گردش میں آ گئے اور ہماری بدقسمتی کا ستارہ پوری تابنا کیوں کے ساتھ جگمگا اٹھا۔

وہ دن اور رات تو آرام سے گزر گئی' کمر کا درد بہت حد تک کم ہو گیا تھا البتہ گھٹنا شاید براہ راست نشانہ بننے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی برہم تھا۔ صبح ہوئی تو جو سوراخ ہم کل اچھی طرح بند کر چکے تھے اسے پھر سے کھلا ہوا پایا اور دڑبے میں ایک مرغی کی باقیات کو گزر چکنے والے حادثے پر نوحہ کناں' بطخوں والے حصے کا دروازہ کھولا تو باہر آتے ہی خدا جانے کیوں ایک کمبخت بطخ نے ہماری پنڈلی پر کاٹ لیا۔ اسے دھمکانے کے لیے جو ٹانگ جھٹکی تو گھٹنا ٹیاؤں ٹیاؤں پکار اٹھا۔ یہ تھا اس روز ہماری صبح کا آغاز ناشتے کی غرض سے دودھ دوہنے' چھنو کے پاس گئے تو اس حرافہ نے بالکل اچانک ہی ہماری پسلیوں میں اپنے سینگ گھسیڑ ڈالے۔ ضرب ایسی شدید تھی کہ کچھ پل کے لیے تو ہماری سانس ہی رک گئی۔ ابھی یہ مقام شکر تھا کہ ہم بروقت مخالف سمت کو لڑھک کر اس سے دور ہو گئے' ورنہ اس کے سینگوں نے ہماری پسلیوں میں شگاف نہیں بنا ڈالے' ورنہ اس بے دید نے تو اپنی طرف سے ہمیں قتل کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی تھی۔ یہ دیکھ کر ہمیں مزید حیرانی ہوئی کہ چھنو اور دھنو

دونوں ہی کی آنکھوں میں ہمارے لیے نفرت ہی نفرت تھی اور تو اور رجو کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی آگ دہک رہی تھی۔ ہمارا چوبیس گھنٹوں کا ساتھ تھا۔ ہم ایک ساتھ ایک کنبے کی طرح جیتے آئے تھے وہ ہماری دوست، ہماری سہیلیاں تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے موڈ مزاج سے بخوبی آشنائی رکھتے تھے سو ان تینوں کے جارحانہ تیور ہمارے لیے کسی اچنبھے سے کم نہیں تھے۔

وہ تینوں وحشت ناک انداز میں ہمیں گھورتی رہیں اور ہم حیران و پریشان ان کی صورتیں تکتے رہے۔ مگر یہ نہیں سمجھ پائے کہ ان کے مزاجوں کی اس عجیب و غریب تبدیلی کی اصل وجہ کیا ہے۔

ناشتے کے لیے انڈہ بناتے ہوئے ہاتھ جلا تو دوپہر میں اکلوتا سیلنگ فین دھواں دے گیا۔ سلامت حالت کی اکلوتی مسہری پر قیلولہ فرما رہے تھے کہ اچانک اس کے ایک طرف کے دونوں پائے یکبارگی مفارقت دے گئے اور ہم لڑھک کر فرش پر آ رہے، ہمارا مجروح سراپا جگہ جگہ سے بلبلا ہی تو اٹھا تھا۔ دونوں پایوں کی جگہ اینٹیں ترتیب دے کر ہم دوبارہ مسہری پر لیٹ کر کراہتے رہے اور موجودہ صورت حال پر جھنجلاتے کڑھتے رہے۔

دوسرے روز پھر دو مرغیاں اپنے دردناک انجام کو پہنچ گئیں۔ سوراخ پھر کھلا ہوا تھا۔ حالانکہ کل ہم نے اس جگہ پتھر کوٹے تھے۔ چھنو، دھنو اور رجو بدستور بدمزاجی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ہم نے ان کو بہتیرہ سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کی خفگی اور رنجش کے اسباب جاننے کی کوشش کی، لحاظ مروت کی اہمیت پر نور افشانی بھی فرمائی لیکن وہ اپنی موجودہ روش ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔

آئندہ روز مرغیوں کی تعداد میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہوئی البتہ تین بطخیں ڈربے کے اندر پراسرار طور پر مردہ حالت میں پائی گئیں اور پھر چند ہی روز میں صورت حال یہ ہوگئی کہ آٹھ بطخیں اور گیارہ مرغیاں یکے بعد دیگرے اس جہان فانی سے کوچ فرما گئیں اور ہم بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ انیس نفوس کی یوں موت ویرانی آنگن کے ساتھ ساتھ ہماری معیشت کے لیے بھی کسی کمر توڑ جھٹکے سے کم نہیں تھی۔ ایک اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ دم توڑ چکا تھا اور اسی تسلسل کے مدنظر ہمیں لاشعوری طور پر یہ یقین بھی ہو چکا تھا کہ بچ رہنے والی ایک مرغی اور دو بطخیں بھی بس اب مہمان ہی ہیں۔ ان کے بعد بھی اگر موت کی یہ مستقل مزاجی برقرار رہتی تو چھنو، دھنو اور رجو کے بعد یقینی طور پر ہماری ہی باری آتی۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی ہمارا روڈ پر آ جانا تو یقینی تھا۔ روزگار ملنا تو تقریباً ناممکن ہی تھا سو ضروریات زندگی کی خاطر یا تو ہمیں بھکاری بننا تھا یا پھر چور ہم اپنے بھیانک مستقبل کے اس تصور ہی سے جھرجھری لے کر رہ گئے۔

پورے شباب پر آئی ہوئی صبح کا وقت تھا۔ ہم کمرے میں اکلوتی مسہری پر لیٹے میگزین کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ پسلیوں اور گھٹنے کے درد میں بہت حد تک افاقہ ہو چکا تھا اور ہمارا ارادہ تھا کہ کوئی نئی کہانی شروع کی جائے۔ ویسے بھی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ ختم ہو جانے کے بعد ہمیں شدت سے احساس ہوا تھا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ لکھنا چاہیے تاکہ مرغیوں اور بطخوں والے نقصان کا ازالہ اس ذریعے سے ہوتا رہے۔

دروازے میں سے اچھل کر کمرے کے اندر آ جانے والی چیز نے ہمیں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا آئندہ پل ہم اس چیز کو ذلیل لدھڑ کے طور پر شناخت کر چکے تھے۔

وہی مخصوص حلیہ مغل شاہی کھسہ، سفید سلک کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ، دائیں ہاتھ میں اینٹ، سفید ٹوپی اور اس دفعہ اس کے ہونٹوں پر سرخی کے ساتھ ساتھ منہ میں پان بھی تھا۔ یک بہ یک ہمارے تن بدن میں نفرت اور غصے کی آگ دہک اٹھی۔ ہم نے تیزی سے اٹھنا چاہا تو لدھڑ کی مکروہ آواز نے ہمیں ٹھٹکا دیا۔

"خبردار! اگر اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش کی تو آج اینٹ سیدھے سر کا پتہ پوچھے گی۔"

ہم نے شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔ وہ اینٹ والا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے چوکنے انداز میں کھڑا ہمیں تک

رہا تھا۔ ہماری تین پسلیوں اور ایک گھٹنے میں ابھی تک تکلیف باقی تھی لیکن وہ ایسی نہ تھی کہ لدھڑ کی درگت بنانے میں ہمارے لیے پریشانی کا باعث بنتی۔ پریشانی کا باعث تو وہ اینٹ بن گئی تھی جو لدھڑ نے ہاتھ میں اٹھا رکھی تھی۔ ہمارا درمیانی فاصلہ اور ہماری نشست بھی لدھڑ کے لیے فائدہ مند تھی۔ جتنی دیر میں ہم مسہری سے اٹھتے وہ کمینہ اتنی دیر میں ہمیں اینٹ سے نشانہ بنا سکتا تھا اور اس خبیث کی نشانہ بازی صلاحیت سے تو ہم واقف ہی تھے۔ ہم آب نیم کا گھونٹ بھر کر اپنی جگہ تشریف فرما رہ گئے۔

"کہو میاں! کیسے مزاج ہیں؟" اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ تبسم تھا' ہمارا خون کھول کر رہ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ خاصے خفا ہو ہم سے غالباً اس روز ضرب کچھ زیادہ ہی شدید رہی ہے نا۔"

"کیوں آئے ہو؟" ہمارے حلق سے جیسے غراہٹ خارج ہوئی تھی۔

"تمہاری خبر گیری اور تمہاری مرغیوں' بطخوں کی تعزیت فرمانے۔ مجموعی طور پر انیس عالم عدم کو روانہ ہو چکی ہیں نا۔"

اس کی بات سن کر ہم قدرے چونک پڑے۔ اسے تو باقاعدہ تعداد بھی معلوم تھی۔ مگر کیسے؟

"سیدھی طرح بکو کیوں آئے ہو؟"

شاید اسے ہمارا انداز تخاطب ناگوار گزرا تھا۔ چند لمحے تو وہ گہری نظروں سے ہمیں گھورتا رہا پھر سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

"بلند بخت! تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ تم قصوروار ہو۔ پہلے ہماری معصوم محبت' تمہاری قلمی نحوست کا شکار ہوئی۔ تمہاری نثر نگاری ہمارے جذبوں کی شہادت کا باعث بنی۔ پھر اس روز ہم نے پوری دیانت داری سے تمام حقیقت تمہارے گوش گزار کی تو ہماری جذباتی صداقتوں کا احترام فرمانے کے بجائے تم نے الٹا ہماری اور ہماری محبت کی تذلیل شروع کر دی۔ ایسے میں پھر ہمارا غصہ تو حق بجانب ٹھہرتا ہے نا' گھٹنے اور پسلیوں کی تکلیف' ہاتھ کا جلنا' دودھ سے محرومی' مسہری' پنکھا' گیارہ مرغیاں اور آٹھ بطخیں اگر تم نے ہماری بات مان لی ہوتی تو تمہیں یہ تکلیفیں اور نقصان تو نہ اٹھانا پڑتا۔"

ہم بس چپ چاپ اسے گھورے گئے۔ ہمارے لیے یہ بات خاصی حیران کن تھی کہ اسے یہ سب کس طرح معلوم ہوا؟

"اب بھی وقت ہے۔" لدھڑ بک رہا تھا۔ "ہماری بات مان لو اور جا کر سلیم کو حقیقت حال بتاؤ' اسے ہماری محبت کے تقدس اور ہمارے جذبوں کی صداقت کا یقین دلاؤ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تم مزید نقصانات سے محفوظ رہو گے۔"

"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہمارا اب تک جو بھی نقصان ہوا ہے وہ تمہارا کیا دھرا ہے۔"

بس تم علاج ہے

ایک صاحب کا بچہ اول درجے کا جھوٹا تھا۔ صاحب یہ بات جانتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اس سے کہا۔ "دیکھو بیٹا! تم اگر تم ایک لمحہ بھی سوچے بغیر کوئی جھوٹ بولو تو میں تمہیں پچاس روپے دوں گا۔"

لڑکے نے فوراً کہا۔ "صبح تو آپ نے سو روپے دینے کا کہا تھا۔"

☆☆☆

گاہک (دکان دار سے) "مجھے ایک خالی بوتل کی ضرورت ہے۔"

دکان دار "خالی بوتل دو روپے کی ہے لیکن اگر اس میں کچھ ڈلوا لو تو بوتل کی قیمت نہیں لی جائے گی۔"

گاہک: "اچھا تو اس میں پانی ڈال دیں۔"

☆☆☆

بیوی: "کیوں جی منا کیوں رو رہا ہے؟"

شوہر: "کیا کروں ہوتا ہی نہیں ہے۔"

بیوی: "لوری گا کر سلا دو۔"

شوہر: "میں نے لوری بھی گائی تھی لیکن پڑوسیوں نے کہا کہ اس سے اچھا تو بچے کا رونا ہی ہے۔"

مظہر عرف مجو..... گورنگی کراچی

"تو اس سب کی کوئی اور عقلی توجیہ ہے تمہارے پاس؟" وہ بھونڈے انداز میں ہنسا۔ اگر مزید بربادی سے بچنا چاہتے ہو تو ہماری بات مان لو بلند بخت!"

"اور اگر میں نہ مانوں تو۔" ہم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کل صبح تمہاری دونوں بطخیں اور بچ رہنے والی مرغی بھی ختم' پھر چھنو اور دھنو اور اس کے بعد رجو بھی تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے گی۔ کیا تم ایسا پسند کرو گے؟"

"ہاں! تمہارے کسی مذموم مقصد میں استعمال ہونے کی بجائے میں یہی پسند کروں گا کہ ان بے زبانوں کے بعد تم میری بھی جان لے لو۔"

"اچھی طرح سوچ لو ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"لکھ کر دوں کیا۔" ہمارا لہجہ زہر خند تھا۔

"ٹھیک ہے' ہم جانتے ہیں کتے کی دم اتنی جلدی سیدھی نہیں ہوا کرتی۔" اس ذلیل نے تبصرہ فرمایا اور جس طرح اچھل کر کمرے کے اندر آیا تھا اسی طرح کمرے سے نکلا' اور پھر اس کے بیرونی دروازے کی طرف دوڑتے قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ ہم غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ دیر تک اسے گالیاں بکتے رہے اور آپ ہی آپ جھنجلاتے رہے۔ کھولتے رہے پھر بھی ہم پوری طرح کتے کی دم ہضم نہیں کر پائے تھے۔ ہاں البتہ ہمارا غصہ ضرور کم پڑ گیا تھا۔ دماغی حالت معمول پر آتے ہی ایک ساتھ کئی سوال دماغ میں آ موجود ہوئے۔ گزشتہ چند دنوں میں ہمیں جو کچھ بھی پیش آیا تھا اس کی خبر لدھڑ کو کیسے ہو گئی؟ ان دنوں تو گھر میں کوئی آیا بھی نہیں تھا' جو کچھ بھی ہوتا رہا تھا وہ سب دیکھنے بھوگنے والی ایک صرف ہماری ذات تھی' پھر وہ سب بالکل ٹھیک ٹھیک لدھڑ کمینہ کیسے جانتا تھا؟ اور وہ خطوط' ہر دفعہ پراسرار طور پر نیا خط کیسے ہمارے تکیے پر آ موجود ہوتا تھا؟ بذات خود لدھڑ کی آمد بھی تو ایک اسرار ہی تھا آخر اسے ہمارا اتا پتا کیسے اور کہاں سے مل گیا تھا؟

ہم سوچتے گئے اور الجھتے گئے مگر ہمارا ذہن ان سوالوں کے جواب تلاشنے یا جواز تراشنے میں ناکام رہا۔ شاید اسی وجہ سے ہمارا چھٹا الارم واویلا مچانے لگا تھا کہ ہو نہ ہو کچھ نہ کچھ گڑبڑ تو ہے۔ ہماری سوچوں کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب صحن میں ہماری بقید حیات جوان مرغی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ کامرانی کے نشے میں سرشار ان نعروں سے ہم بخوبی واقف تھے۔ ایسے نعرے سن کر اکثر ہم خلوص دل سے مرغیوں کی عظمت کا اعتراف کیا کرتے تھے کہ وہ انڈہ دینے جیسی غیر معمولی اور حیران کن صلاحیت کی حامل ہوتی ہیں۔

ہم اٹھ کر صحن میں چلے آئے۔ وہ تنہا مرغی صحن کے وسط میں کھڑی گردن گھما گھما کر دڑبے کی طرف دیکھتی اور یوں پکارنے لگتی گویا انڈے میں چھپے اپنے لخت جگر' نور نظر کو آوازیں دے کر اپنے پاس چلے آنے کا کہہ رہی ہو۔ چند دن پہلے تک صحن میں مرغیوں کی کیسی ہلچل' کیسی رونق تھی' پورے صحن میں ادھر سے ادھر چہل قدمی فرماتی رہتی تھیں اور دن میں کئی کئی بار کمرے میں آ کر ہماری مزاج پرسی بھی کیا کرتی تھیں مگر اب...... اب صرف ایک مرغی تھی' دونوں بطخیں ایک طرف کونے میں اداس دلول سی کھڑی تھیں۔ چھنو' دھنو اور رجو کے تیور بدستور جارحانہ تھے۔ تینوں کی آنکھوں میں ہمیں نفرت اور دہشت ہلکورے لیتی محسوس ہوئی۔ معلوم نہیں یہ لدھڑ کی تازہ ترین بکواسیات کا اثر تھا یا کیا کہ آج پہلی بار ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے چھنو' دھنو اور رجو' تینوں آسیب زدہ ہوں۔ ان کے مزاجوں کی غیر معمولی تبدیلی اور تیور گویا اس بات کے غماز تھے کہ وہ واقعی کسی ماورائی طاقت کے زیر اثر ہیں۔

اس خیال کے ساتھ ہی ہماری ریڑھ کی ہڈی میں جیسے برف کا کیچوا رینگ گیا۔ ہم نے بے اختیار ایک جھرجھری لی اور سر جھٹکتے ہوئے دڑبے کی طرف بڑھ گئے۔ دڑبے میں جھانکنے کے بعد ہم نے ہاتھ لمبا کر کے دڑبے میں سے انڈہ اٹھانا چاہا تو یکبارگی جیسے ہمارے طبق روشن ہو گئے' ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم نے انڈہ نہیں بلکہ کوئی سلگتا' دہکتا انگارہ ہاتھ میں اٹھا لیا ہو۔ اس کی حدت اتنی

زیادہ تھی کہ بے اختیار ہمارے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ انڈہ خود بخود ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ہم نے تڑپ کر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ پہلے تو ہم نے پریشانی سے اپنے ہاتھ کا جائزہ لیا۔ بچت ہوگئی تھی۔ پھر بے یقینی سے انڈے کو دیکھا اور اس کے بعد حیرت سے صحن کے وسط میں کھڑی مرغی کی طرف دیکھا جو تفاخرانہ انداز میں گردن اکڑائے قہقہے لگا رہی تھی۔

ہم اس بے حیا کے حوصلوں پر دنگ ہی تو رہ گئے تھے۔ چند لمحوں کی حیرت و بے یقینی کے بعد ہم نے ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے محتاط سے انداز میں انڈے کو چھوا تو چونک پڑے۔ وہ تو بالکل عام سی حالت میں تھا' ہم نے جلدی سے اسے اٹھا کر دیکھا' کچھ بھی خاص نہیں تھا۔ نہ کوئی تپش نہ حرارت تو...... تو پھر چند لمحے پہلے کیا ہوا تھا؟

یا حیرت! یہ سب کیا ہے' کیا ہمارا دماغی توازن گڑبڑاتا جارہا ہے' یا یہ لدھڑ سے تازہ ترین ملاقات کے اثرات ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم لاشعوری طور پر اسے واقعی میں ایک جن تسلیم کرنے لگے ہیں؟

باوجود کوشش کے ہم اپنے اس سوال کا کوئی بھی مناسب اور واضح جواب کھوجنے میں ناکام رہے۔ باقی کا دن معمول کے مطابق گزرا البتہ اس روز آنے والی رات کو ہم صبح تک دڑبے کے پہرے دار بنے رہے۔ وہ جہنمی لدھڑ ہمیں صاف الفاظ میں بطخوں اور مرغی کے قتل کی دھمکی دے کر گیا تھا سو ہم بھی پوری تیاری کے ساتھ منتظر رہے کہ اگر وہ بھولے سے آ بھی جائے تو اگلا پچھلا تمام حساب سود سمیت بے باک کردیا جائے مگر ہم منتظر ہی رہے۔ وہ خبیث نہیں آیا۔ ساری رات سکون سے گزری' کہیں کوئی آہٹ' کوئی سرسراہٹ تک نہیں ہوئی اور صبح صادق کی سفیدی نمودار ہونے لگی۔ ہم خاصے مطمئن اور خوش تھے لیکن پھر جس وقت ہم دڑبے کے دروازے کھول رہے تھے اس وقت ہم پر یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ ہماری شب بیداری اکارت گئی ہے۔ ہماری ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ مرغی اور دونوں بطخیں رات کسی لمحے اس خاموشی سے دم توڑ گئی تھیں کہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوسکی کہ وہ کب اور کیسے زندگی کی قید سے آزاد ہوئیں۔

یکا یک ہی ہماری طبیعت کچھ مضمحل سی ہوگئی' دل و دماغ پر حزن و ملال کی سی کیفیت اتر آئی۔ ساری رات ہم پوری طرح چوکس اور ہوشیار رہے تھے۔ ایک ذرا بھی غفلت کو ہم نے اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ اس کے باوجود گویا موت ان کے اپنے ہی جسموں میں چھپی بیٹھی تھی۔

ہم نے بوجھل دل کے ساتھ ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا اور اپنے کمرے میں آگئے۔ ناشتے کے طور پر ہم نے رات کے بچے ہوئے کھانے سے چند لقمے زہر مار کیے اور مسہری پر دراز ہوگئے۔ رہ رہ کر ہمارے خیالات کا رخ لدھڑ کی طرف چلا جاتا اور ہم کسمسا کر رہ جاتے۔ ہم اس کے متعلق کوئی بھی فیصلہ کرنے کے معاملے میں خود کو شدید مشکل کا شکار پا رہے تھے۔ بار بار ہماری آنکھوں کے سامنے بھائیں بھائیں کرتے ویران دڑبے کا منظر ابھر آتا۔ کبھی چھنو دھنو کی اکڑی ہوئی لاشیں دکھائی دیتیں تو کبھی زمین پر تڑپتی پھڑکتی رجو ہمارے دل کو دہلانے لگتی۔ ایسے ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں کب ہماری آنکھوں میں نیند اتر آئی کچھ پتا ہی نہیں چلا اور ہم نیند کی غفلت انگیز کیفیت میں کھو گئے۔

دوبارہ ہماری آنکھ کسی کے بار بار پکارنے پر کھلی تھی اور جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے لدھڑ کو دروازے کے قریب کھڑے دیکھا۔

"ارے بس میاں! اب اٹھ بھی جاؤ۔" وہ ہاتھ میں پکڑی اینٹ کو جھلا رہا تھا۔ ہماری بچی کھچی نیند اور سستی فوراً اڑنچھو ہوگئی۔

"تم......!"

"ہم! اب اٹھ بیٹھو تاکہ چار باتیں ہوسکیں۔"

"اب کس لیے آئے ہو؟"

"وہی' تمہاری خبر گیری اور آخری بطخوں اور مرغی کی تعزیت فرمانے۔" اس کا جگالی کرتا منہ دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ وہ پان سے شغل فرما رہا ہے۔

ہمارا ذہن بیدار ہوتے ہی جمناسٹک میں مصروف ہو چکا تھا۔ ہم نے بغور ایک نئے انداز میں لدھڑ کا سرتاپا جائزہ لیا اور پھر سے شدید تذبذب کا شکار ہو گئے۔ اس کی شخصیت کسی طرف سے بھی ایک جن کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اسے ایک جن تسلیم کرنا ہمیں خاصا مضحکہ خیز خیال محسوس ہو رہا تھا۔ دوسری طرف چند ہی دن میں یکے بعد دیگرے بارہ مرغیوں اور دس بطخوں کی پراسرار موت کے ساتھ ساتھ چند دیگر خیالات بھی ہمیں کچوکے دیئے جا رہے تھے۔

"خاصے رنجیدہ خاطر دکھائی دے رہے ہو۔ ہم تمہارا دکھ سمجھ سکتے ہیں لیکن کیا کیا جا سکتا ہے' یہ سب تو ہونا تھا' ہم نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔" لدھڑ ہم سے مخاطب تھا۔

"تم انتہائی جھوٹے اور مکار شخص ہو۔" ہماری بات سن کر لدھڑ کے تاثرات بدل گئے۔

"بھلا اس کا کیا مطلب ہوا۔"

"مطلب یہ کہ کیا تمہارے پاس اپنی شناخت' اپنی پہچان کروانے والی کوئی چیز ہے یا نہیں۔"

"ہمارا شناختی کارڈ بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اگر تم کہو تو ہم وزٹنگ کارڈ بھی بنوائے لیتے ہیں۔"

"میرا اشارہ تمہاری جناتی حیثیت کی طرف ہے۔ تم مسلسل ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے آ رہے ہو کہ تم کوئی انسان نہیں بلکہ ایک جن ہو۔ اب بھی یہ رعب جمانے کی کوشش کر رہے ہو کہ پہلے والی مرغیوں اور بطخوں کی موت کے بعد رات بھی تمہی نے دونوں بطخوں اور مرغی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ جب کہ یہ جھوٹ ہے' میں خود ساری رات وڑبے کے قریب ہی موجود رہا ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان تینوں کے تحفظ کی فکر سے زیادہ میں تمہاری آمد کا منتظر تھا۔ اور اگر تم رات آ گئے ہوتے تو میں تمہاری طبیعت صاف کر دیتا۔ مگر تم......" میں نے اس کے ہاتھ میں دبی اینٹ کو گھورا۔ "تم تو ہو ہی بزدل۔"

"تم ساری رات وڑبے کے قریب دبکے رہے نہ کوئی آیا نہ گیا' نہ کوئی شور نہ آہٹ۔ اس کے باوجود دونوں بطخیں اور مرغی اس جہان فانی سے کوچ فرما گئیں پھر بھی تم ہماری حیثیت اور صلاحیتوں کے متعلق شبہات کا شکار ہو۔ چلو تم یہ یقین کر لو کہ ہم تمہاری ہی طرح کے ایک انسان ہیں تو؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے' مسئلہ تو پھر بھی وہی ہے' ہماری محبت ہماری زندگی سلیم ہم سے خفا ہے اور اس کی غلط فہمی تمہی کو دور کرنی ہے۔"

"کیوں' میں کیوں ایسا کروں' مجھے کیا مصیبت پڑی ہے' میرا تم سے' تمہاری سلیم سے یا تم دونوں کی محبت سے کیا لینا دینا۔ میرا کیا تعلق واسطہ۔"

"گھامڑ انسان! تمہارا کیا تعلق واسطہ ہے' یہ سمجھنے پانے پر تم آمادہ ہی کب ہوا اور تمہیں اس سب سے اپنا کوئی تعلق واسطہ محسوس ہوتا ہے یا نہیں' ہمیں اس سے بالکل بھی سروکار نہیں۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ تمہیں سلیم سے مل کر اپنی لدھڑ نامے والی کمینگی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے اس بات کا یقین دلانا ہے کہ ہمارا تمہارے والے فیاض لدھڑ کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں اور ہم صرف اور صرف اس سے محبت فرماتے ہیں۔"

"اور اگر میں اب بھی نہ مانوں تو؟" اس نے صحن کی طرف پیک کی پچکاری چھوڑی۔

"تو پھر اپنی چھنو' دھنو اور رجو کو بس آج کا مہمان سمجھو' ان کے بعد تم بھی جلد ہی سڑک پر آ جاؤ گے۔ لیکن ہم تب بھی تمہاری زیارت کا شرف حاصل کرتے رہیں گے۔" لدھڑ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور ہم اس کے پریقین انداز پر پھر سے الجھن کا شکار ہو گئے۔

تمہاری یہ ہٹ دھرمی تمہیں لے ڈوبے گی۔ کہیں کے نہیں رہو گے تم' بہتر ہے کہ ہماری بات مان لو۔"

ہمیں خاموش اور الجھن زدہ دیکھ کر وہ تیز لہجے میں مزید بولا۔

"دیکھو بلند بخت! تمہیں نقصان پہنچا کر ہمیں بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی لیکن کیا کریں ہم بھی اس دل نامراد کی شوریدہ سری کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ شاید تمہیں آج تک

کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی جو تم ہماری اذیتوں کو سمجھ ہی نہیں پا رہے۔ ہماری جذباتی بربادی کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا۔ تم کسی بھی طرح ایک بار سلیم کو ہماری محبت کی صداقت کا یقین دلا دو ہم زندگی بھر تمہارے ممنون واحسان مند رہیں گے۔ ہم تمہارے سارے نقصان کی تلافی فرما دیں گے۔ ہم تمہارے سارے دلدر دور فرما دیں گے۔ بس ایک بار تم سلیم کی غلط فہمی دور فرما دو۔"

لدھڑ کی بے قراریاں ہمیں چونکا گئیں۔

"کیا مطلب؟ میرے نقصان کی تلافی کس طرح کرو گے؟"

"تمہاری چند مرغیوں اور بطخوں کا نقصان ہوا ہے، ہم تمہیں پورا پولٹری فارم کھلوا دیں گے۔ پنکھے کے بدلے اے سی لگوا دیں گے، ان بوسیدہ مسہریوں کی جگہ وکٹورین بیڈ آ جائیں گے، اس گھر کی جگہ ایک عالی شان بنگلہ بنوا دیں گے اور یہ جو تم لکھنے لکھانے کا شوق رکھتے ہو اس حوالے سے ہم تمہیں تمہارا ذاتی پریس لگوا دیں گے تم خود اپنے ڈائجسٹ اور میگزین چھاپنا۔"

لدھڑ نے چند ہی جملوں میں ہماری زندگی کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ کھلی آنکھوں میں ہمارے سامنے ایک حسین خواب آ ٹھہرا تھا۔

"بولو کیا کہتے ہو؟" وہ پر امید نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں ان سبز باغات کو حقیقت کیسے مان لوں؟" اس کی ان باتوں پر یقین کر لینے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں تھی سو ہم نے فوراً اظہار بھی کر دیا۔

"ہم سمجھ گئے۔" اس نے تیز لہجے میں کہا اور دائیں ہاتھ میں موجود چار انگوٹھیوں میں سے ایک انگوٹھی اتار کر ہماری طرف اچھال دی۔

"لاہوتی الماس ہے۔ یہ باقی تین بھی ہم تمہیں نذر کر دیں گے اور ان کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً تمہارے کام آتے رہیں گے۔" ہم نے بغور چاندی کی اس انگوٹھی کا معائنہ کیا جس میں جڑا نگینہ اپنے ہیرا ہونے کا احساس دلا رہا تھا لیکن ہمیں کچھ خاص پہچان نہ تھی اور اس کارٹون کے پاس ایسی چار چار انگوٹھیوں کا ہونا ہمیں اس ہیرے کی اصلیت کے متعلق شکوک وشبہات کا شکار کر رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ہمارے متعلق کچھ زیادہ ہی بدگمانیاں پال رکھی ہیں۔" اس نے جیسے ہمارے خیالات پڑھ لیے تھے۔ "تم چاہو تو کسی جوہری کو دکھا کر اپنی تسلی کر سکتے ہو۔"

"ہاں وہ تو کرنی پڑے گی۔"

"اور اگر اس الماس کے اصلی ہونے کی تصدیق ہو گئی تو؟"

"تو......" ہم نے پرسوچ نظروں سے لدھڑ کو دیکھا۔ یہ "تو" واقعی بڑا اہم سوال تھی۔

"تو پھر تم سلیم کی غلط فہمی دور فرماؤ گے۔ بدلے میں ہم یہ تینوں الماس بھی تمہیں تحفے کے طور پر دے دیں گے۔ ان میں سے مزید ایک تو ہم تمہیں اسی وقت نذر کر دیں گے جب تم سلیم سے ملنے کی غرض سے رخصت ہونے لگو گے۔ باقی دو تمہاری کامیابی کے موقع پر۔" وہ گویا ہم سے معاہدہ باندھ رہا تھا۔

"کیا سلیم صاحبہ مجھے اتنا موقع دیں گی کہ میں انہیں پوری بات بتا سکوں!" ہم نے ہچکچاتے ہوئے متوقع مہم کے سب سے نازک مرحلے کی سنگینی کا اندازہ لگانے کے لیے پوچھ لیا۔ لدھڑ تو جیسے ہمیں رستے پر آتا دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"ہاں بالکل! ہم تمہارے ساتھ چلیں گے لیکن ایک بار تمہارے ہمراہ اسے اپنی صورت دکھانے کے بعد ہم واپس چلے آئیں گے پھر جب تم اس کے قریب جاؤ گے تو ہماری نسبت کی وجہ سے وہ تم سے گھبرائے گی نہیں اور تمہیں بھی اپنی بات سنا دینے کی سہولت مل جائے گی کہو کیا کہتے ہو؟"

"کہنا کیا ہے فی الحال تو میں اس ہیرے کی اصلیت معلوم کروں گا۔ اس کے بعد پھر کچھ سوچوں گا۔"

"بالکل سوچو! اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ دشمنی اور نفرت سے سوائے تباہی و بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا...

ہمارے بیچ تو یوں بھی ایسا کوئی معاملہ نہیں جس کی بنا پر ہم ایک دوسرے سے دشمنی نبھاتے پھریں۔ وہ تو بس ایک اتفاقیہ معاملے کی وجہ سے صورت حال ذرا کشیدگی اختیار فرما گئی۔ اب یقینی طور پر ہمیں ایک دوسرے کی دوستی قبول کر لینی چاہیے۔ تم چھنو دھنو اور رجو کی ہمراہی میں خوشی خوشی گزارہ فرماؤ' علاوہ ازیں تم ہمارے کام آؤ' ہم تمہارے کام آتے ہیں اور یقین مانو کہ ہم دونوں ہی کی بہتری اسی میں ہے۔ تم بھی شاد' ہم بھی شاد۔"

لدھڑ نے ایک بار پھر صحن کی طرف پچکاری پھینکی اور بائیں ہاتھ سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے پھر میں سوچوں گا۔" ہم نے شان بے نیازی کا مظاہرہ کیا' دراصل ہم مزید کسی بدمزگی کے بغیر فی الوقت لدھڑ سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ گزشتہ دنوں کے تمام واقعات اور لدھڑ کی پھر سے موجودگی سے ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کارٹون اتنی آسانی سے ٹلنے والی چیز نہیں اور پھر اس کی موجودہ پیشکش بھی کچھ کم کشش انگیز نہیں تھی۔ چار چار ہیروں کی انگوٹھیاں چونکہ اس کی باتیں اور شخصیت ہمارے لیے بدستور الجھن کا باعث تھی۔ اس لیے فی الحال ہم ہیرے کی اصلیت معلوم کر لینے سے پہلے کوئی بھی سخت یا انتہائی فیصلہ لینے سے گریز کرنا چاہتے تھے' شاید لدھڑ نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ فی الوقت ہمیں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ کل آنے کا کہہ کر روانہ ہوا تو اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم بھی نکل کھڑے ہوئے' ہیرے کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے' ہم بری طرح بے چین ہو رہے تھے۔ اندازہ تو یہی تھا کہ سچا ہیرا ہے' مگر لدھڑ کی وجہ سے دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

مغرب میں ابھی خاصا وقت باقی تھا۔ ہم نے شہر پہنچ کر چند ایک سناروں اور جوہریوں سے رابطہ کیا تو ہیرے کے سچا ہونے کی تصدیق ہوگئی۔ تین مختلف جگہوں سے ہم نے اس کی قیمت لگوائی' جب تینوں جگہوں سے ہمیں سوا تین لاکھ کے قریب قریب ریٹ ملا تو ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہمارا سارے کا سارا مقدر جی جان سے دھڑک اٹھا ہو۔ کم از کم ہماری نظر میں سوا تین لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی اور وہ بھی ایک ہیرے کی' لدھڑ کے پاس ایسی ہی تین انگوٹھیاں مزید تھیں جو وہ ایک واہیات سے کام کے بدلے ہمیں دینے کو تیار تھا۔ یعنی مجموعی طور پر تیرہ لاکھ روپے کی خطیر رقم ہماری ہو سکتی تھی۔ تیرہ لاکھ' پہلی بار ہمیں لگا کہ لدھڑ واقعی میں جن ہو بھی سکتا ہے' وگرنہ اس جیسی شخصیت کے پاس ہیرے کی چار انگوٹھیوں کی بھلا گیا تک؟ اچانک ہی ہمارے پھیپھڑے گھبراہٹ کا شکار ہونے لگے اور دھڑکنیں بھی بدتمیزی پر اتر آئیں۔

مغرب کے قریب ہم دھڑکتے دل اور پھولی سانسوں کے ساتھ گھر واپس پہنچے۔

لکھ پتی ہونے کا تصور ہمیں ورغلا چکا تھا اور ہم جلد از جلد باقی انگوٹھیاں بھی حاصل کر لینا چاہتے تھے تاکہ ان کو بیچ کر ایک بہتر معیار زندگی ترتیب دیا جا سکے' ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ ہم لدھڑ کی خواہش پوری کرتے ہوئے سلیم سے ضرور ملاقات کریں گے گو کہ کام کچھ بے ہودہ اور کچھ تھوڑا سا سنگین بھی تھا لیکن تیرہ لاکھ کے فائدے کے لیے تو یہ کام انتہائی معمولی نوعیت کا تھا۔ ایک دن تھوڑے سے وقت کے لیے معمولی سی سردردی اور تیرہ لاکھ کا فائدہ......!

ہم اپنے اس فیصلے پر پوری طرح مطمئن تھے' یہ فیصلہ کرتے وقت ہم نے اب تک ہو چکنے والی اور آئندہ متوقع اموات کے متعلق بھی سوچا تھا۔ چھنو دھنو اور رجو کی زندگیاں ہمیں بہت عزیز تھیں۔ ویسے بھی یقین و بے یقینی کی تصدیق کے چکر میں نقصانات کے تجربات سمیٹتے رہنا ہمیں کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اور پھر ہمیں یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ لدھڑ کی دشمنی ہمارے لیے نقصان دہ ہو یا نہ ہو اس کی دوستی ہمارے لیے یقیناً فائدہ مند رہے گی۔

دوسرے دن لدھڑ صبح ہی صبح آن ٹپکا' لیکن اس بار اس کے آنے کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ بیرونی دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز سن کر جب ہم نے جا کر باہر جھانکا تو گلی میں چند قدم کے فاصلے پر اسے نہایت شریفانہ

انداز میں کھڑے پایا۔

"کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟" وہ ہم پر نظر پڑتے ہی بولا تھا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس رات ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم ہمارے کام آؤ یا نہیں، ہم اب تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ کیا اب تم ہمیں اندر آنے کی اجازت مرحمت فرماؤ گے؟"

"ہاں آؤ! مجھے تمہارا انتظار تھا آج۔" ہم نے کہا تو وہ محتاط سے انداز میں آگے بڑھ آیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ہم اس کی مہین سی گردن نہ دبوچ لیں۔ ہم دونوں صحن سے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک رجو (بھینس) کی مانوس آواز ہمارے کانوں میں شہد سا گھول گئی۔ چھنو دھنو کو اگر ہم اپنی چھوٹی بہنوں کا درجہ دیتے تھے تو رجو کو اپنی بڑی بہن تصور کرتے تھے۔ وہ ہمیں پیار سے بختے کہہ کر پکارا کرتی تھی اور آج کئی روز بعد اس نے ہمیں آواز دی تھی۔ ہم نے چونک کر ٹھٹکتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔ وہ اپنی کٹوراسی آنکھوں میں ممتا کے جذبات سمیٹے ہمیں تک رہی تھی اور تو اور چھنو اور دھنو کے چہروں کی پتھریلی سنجیدگی کی جگہ بھی جیسے ان کی حقیقی معصومیت لوٹ آئی تھی اور وہ دونوں بھی آنکھوں میں انسیت سمیٹے ہم ہی کو دیکھ رہی تھیں۔

ہم نے ایک نظر لدھڑ کی طرف دیکھا۔ وہ ہونقوں کی طرح کھڑا آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔ چھنو دھنو اور رجو کا اپنے حواسوں میں لوٹ آنا ہمارے لیے ایک خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ ہم بے اختیار ہو کر ان کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ باری باری ہم چاروں آپس میں ہم آغوش ہوئے۔ معذرت کے ساتھ، چاروں نہیں تینوں، رجو سے بس گلے گیر ہو کر رہ گئے تھے۔

اس جذباتیت میں کچھ دیر کے لیے تو ہم لدھڑ کو بھی بھول گئے تھے۔ پھر جب ذرا ہمارے جذبوں کی طغیانی تھمی تو ہم نے ان کو چارہ وغیرہ ڈالا اور لدھڑ کو لے کر کمرے میں چلے آئے۔ ہوسکتا ہے الماسی انگوٹھیوں کا کمال ہو یا یہ محض اس کے رویے کی تبدیلی کا اثر رہا ہو۔ بہر حال آج وہ ایک خاصا معزز و معقول شخص دکھائی دے رہا تھا۔

"لگتا ہے رات بھر تمہیں نیند نہیں آئی۔" ہم نے اس کے صبح ہی صبح ٹپک پڑنے کے حوالے سے قیاس آرائی فرمائی۔

"بس اب کیا بتائیں، نیند کے ساتھ تو ہماری کتنے دن سے چپقلش چل رہی ہے۔ اب اس کے مہرباں ہونے کے کچھ امکان روشن ہوتے محسوس ہوئے ہیں تو ضبط کرنا دشوار ہو کر رہ گیا ہے۔ تم نے بھی تو اب تک ہیرے کی اصلیت کے متعلق اپنی تسلی فرمالی ہوگی؟"

"ہاں، وہ تو میں کر چکا۔" آج پہلی دفعہ ہم ایک ساتھ، ایک ہی مسہری پر بیٹھے تھے۔ "اب تم بھی ہماری تسلی کراؤ۔"

"جو بھی کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو کیسی تسلی چاہتے ہو؟"

"یہی کہ ہمارے ساتھ کوئی دغا نہیں ہوگا۔ مطلب پورا ہوجانے کے بعد تم اپنے وعدے اور زبان سے پھر وگے نہیں۔ یہ باقی کی تین انگوٹھیاں بھی ہمارے حوالے کردوگے۔"

"لاحول ولاقوۃ، کیا تم ہمیں دھوکے باز خیال کرتے ہو۔ ہمیں جھوٹا اور فریبی تصور کیے بیٹھے ہو۔ بھئی حد ہوتی ہے تم تو انتہائی بدگمان انسان واقع ہوئے ہو۔" ہماری بات سے شاید لدھڑ کی غیرت مضروب ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہاتھ سے تینوں انگوٹھیاں اتار کر ہماری گود میں ڈال دیں۔

"یہ لو یہ سب ابھی سے تمہارے حوالے اور بتاؤ اور کیا چاہتے ہو؟"

ہم نے انگوٹھیاں ہاتھ میں لیتے ہوئے حیران نظروں سے لدھڑ کی طرف دیکھا۔

"کمال ہے! ابھی میں نے تمہارا کام کرنے کی حامی تو نہیں بھری۔"

"کوئی بات نہیں، ہمارا اندازہ ہے کہ تم ہمارے کام آؤ گے۔"

"اور اگر میں انکار کردوں تو؟"

"پھر یقیناً تم یہ انگوٹھیاں بھی اپنے پاس رکھنا گوارا نہیں

کرو گے۔"

"یک بہ یک اتنا اعتماد فرض کرو کہ میں یہ انگوٹھیاں اب تمہیں واپس نہیں کرتا اور تمہارے کام آنے سے بھی انکاری ہو جاتا ہوں تو تم کیا کر لو گے میرا!؟"

"کیا کریں گے ہم۔"

"ہاں۔"

لدھڑ کی آنکھوں میں فوراً معنی خیزی کی چمک اور ہونٹوں پر ایک شریری مسکراہٹ ابھر آئی۔ پھر وہ ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہنسنے لگا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہمارا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"دانت تو ایسے نکال رہے ہو جیسے میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا ہے۔" ہم نے فوراً اپنی ناگواری کا اظہار بھی کر دیا۔

"اور نہیں تو کیا۔ تم نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے تو یعنی تمہیں ابھی تک یہ اندازہ ہی نہیں ہو پایا کہ ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں؟" اس کے اس انداز پر ہمیں مزید سبکی کا احساس ہوا۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہنسی ہنسی میں اپنے حلق سے بطخوں اور مرغیوں کی آوازیں نکال رہا ہے۔

"دیکھو! میں صرف انگوٹھیوں کی وجہ سے تمہارے کام آنے کے لیے تیار ہوا ہوں لہٰذا کسی اور خوش فہمی میں مت رہنا تم۔"

"ہمیں معلوم ہے جانتے ہیں ہم۔"

"تو پھر اپنے ان گندے دانتوں کی نمائش بند کرو۔ ایسے میرا جی الٹ رہا ہے۔" یقیناً یہ ہمارے لفظوں اور لہجے کی اثر انگیزی تھی کہ لدھڑ کی ہنسی کو یک بہ یک بریک لگ گئے اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کھنڈ گئی۔

ہم نے تینوں انگوٹھیاں اپنی انگلیوں میں پھنسائیں اور لدھڑ کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب پتھریلے انداز میں یک ٹک سامنے والی دیوار کو تک رہا تھا۔ ایک نظر میں تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی روح اس کے نازوک وجود کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔

چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد ہم نے خود ہی اسے مخاطب کیا۔

"کیا تم دونوں کا کوئی راز دار بھی ہے؟"

"راز دار......!" لدھڑ بڑبڑایا۔

"ہاں جو تمہارے اور سلیم کے تعلق کے بارے میں جانتا ہو۔"

"ہم نے کتنی دفعہ تمہارے گوش گزار کی ہے کہ وہ ہماری منگیتر ہے۔" لدھڑ نے گلہ کرتی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ "اور ایسا ہمارے بزرگوں کی مرضی سے ہوا ہے۔ ہم دونوں کے خاندان اور برادری کے بہت سے لوگ یہ بات جانتے ہیں۔"

"کیا تم لوگوں کا آپس میں کوئی اور رشتہ بھی بنتا ہے۔"

"ہاں سلیم ہماری سگی عم زاد ہے۔"

"پھر تو وہ بھی جن زادی ہوئی۔" ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا تو لدھڑ نے انتہائی غلط نظروں سے ہماری طرف دیکھا لیکن کوئی غلط بات کہنے سے گریز کرتے ہوئے بولا۔

"آج سے کئی برس قبل ابا اور چچا حضور نے ایک ساتھ انسانی آبادیوں کی طرف آنے کا قصد فرمایا تھا۔ ہم اس وقت بہت چھوٹے تھے پھر بھی ہمیں اپنے آبائی دیار کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ وہاں دور دور تک جنات کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انسان وہاں نہیں پائے جاتے تھے۔"

"یہ آپ کس خطہ سرزمین کا ذکر فرما رہے ہیں؟" ہم نے چبھتے ہوئے لہجے میں ٹوکا۔

"کیا تم نے اپنی دادی یا نانی جان سے کبھی کوہ قاف کی کوئی کہانی نہیں سماعت فرمائی۔" لدھڑ نے حیرت و بے یقینی سے ہماری طرف دیکھا۔

"یعنی آپ کوہ قاف کے ایک جناتی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔" ہمارے لہجے کے شدید طنز کا بھی لدھڑ پر ایک ذرا اثر نہیں ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک الوہی سی مسرت اور چمک پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے اپنے دیس اپنی مٹی کا ذکر اور تصور اس کے لیے نہایت سکون و اطمینان کا باعث ہو۔ وہ یوں خلا میں تک رہا تھا جیسے کوہ قاف تک دیکھ رہا ہو۔

ہم متذبذب سے ہوکر بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگے۔ وہ بول رہا تھا۔

کوہ قاف کی صورت میں پھیلے ہوئے اس پہاڑی سلسلے کے دامن میں گھنے جنگلات کی بہتات ہے۔ ہماری قوم آغاز دنیا کے وقت سے ان جنگلات کے دشوار گزار خطوں میں آباد ہے قدرتی حسن وخوبصورتی اور رنگ ونور کے روح پرور مناظر کے بیچوں بیچ' فطرت کے انتہائی قریب' وہاں انسانوں کی مداخلت نہیں۔ جنات کے اپنے رسم ورواج اور اخلاق واقدار کے اپنے ضابطے ہیں۔ شاذ ہی وہاں کبھی کسی انسان کو پایا گیا۔ وہ بھی بس کچھ وقت کے لیے کیونکہ وہاں زندگی خوبصورت سہی' لیکن انتہائی دشوار ہے۔ ابا حضور بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ زمانوں پہلے جب انسان پہلی دفعہ ان خطوں میں پہنچا تو اسے دیکھ کر اس وقت کے تمام جنات دنگ رہ گئے تھے۔ تب پہلی دفعہ جنات کو معلوم ہوا کہ ہماری اس دنیا کے علاوہ' یہاں سے بہت دور کہیں ایک اور دنیا بھی ہے' جس میں انسان نامی ایک ایسی مخلوق رہتی ہے جس کا رہن سہن خاصا عجیب وغریب ہے۔ پھر گزرتے زمانوں کے ساتھ یہ واقفیت بڑھتی چلی گئی۔ مختلف قبیلوں کے مہم جویانہ طبیعت رکھنے والے چند جوانوں نے انسان کی اس دنیا اور اس دنیا تک جانے والے راستوں کو دریافت کرنے کا منصوبہ سوچا اور یوں پہلی دفعہ سات سردار قبیلوں کے سات جوان' وادی کے دشوار گزار خطوں کو عبور کرتے ہوئے نامعلوم سمتوں کی طرف ایک عہد انگیز سفر پر روانہ ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب وکامران لوٹے تو اپنے ساتھ انسانوں کے استعمال اور ضرورت کی بہت سی حیرت انگیز اور عجیب وغریب اشیاء بھی لے کر آئے۔ انسانی آبادیوں میں جنات کی آمد ورفت کا آغاز ہوا تو جلد ہی قوم جنات کو اندازہ ہوگیا کہ انسان نامی یہ مخلوق نہایت فتنہ انگیز ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کی مالک ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ خطرناک ہے توقع کی جارہی تھی کہ مستقبل میں کبھی نہ کبھی یہ مخلوق وجود جنات کے لیے بھی خطرے کا باعث بن جائے گی۔ اس خطرے کا سدباب انتہائی ضروری تھا۔ اس طرح ہمارے جناتی سماج کے سرداروں اور مذہبی اسیروں نے ایک طویل غوروفکر اور مشاورت کے بعد بہت سے نوجوانوں کو چند مخصوص قواعد وضوابط کا پابند ٹھہرا کر انسانوں سے علوم فنون سیکھنے کی غرض سے انسانی آبادیوں میں بھیج دیا۔ ان میں سے کچھ تو انسانوں کی جادوگری میں ہی مست ہورہے اور جو واپس لوٹے ان کی طرز زندگی میں بھی ایک واضح اور بہتر بدلاؤ دیکھنے میں آیا۔ بس پھر یہ آنا جانا بڑھتا ہی چلا گیا۔ ضروریات میں سہولتوں کے خواہاں جنات کے بہت سے خاندان وادی قاف کے جنگلوں سے نکل نکل کر مختلف انسانی بستیوں میں آباد ہوتے چلے گئے۔ ضروریات زندگی کے حصول کی خاطر انہوں نے مختلف مزدوریاں' ملازمتیں اور کاروبار بنالیے۔ جنات انسانی آبادیوں کی طرف ایسے ہی کشش محسوس کرتے تھے جیسے تم لوگ یورپ اور امریکہ کے لیے محسوس کرتے ہو۔ وادی قاف بحیرہ کیسپین اور بحراسود کے درمیان واقع ہے۔ دیگر ہم نسلوں کی طرح ابا اور چچا حضور بھی کئی سال پہلے وادی سے ہجرت فرما کر پہلے کابل اور کابل سے پھر یہاں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آبسے تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم ہم نے کابل کے مولوی ثناء اللہ خان یوسف زئی سے حاصل کی اور اردو ادب میں ماسٹرز یہاں آکر مکمل کیا۔ یہیں ہمارے ایک اور بھائی کی پیدائش ہوئی۔ سلیم کے مزید دو بڑے بھائی اور خود سلیم بھی یہیں پیدا ہوئی۔ ہمارے والدین نے بچپن ہی میں ہماری منگنی کردی تھی اور ہوش سنبھالتے ہی ہم ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوگئے۔ سلیم نے ہماری خاطر ہی اردو ادب میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ ہم اسے منشی پریم چند' سجاد حیدر' اور غلام عباس کے افسانے اور آغا حشر کے ڈرامے تحفوں میں دیا کرتے تھے۔ آج وہ اردو ادب کے آخری سال میں ہے۔ طے یہ پایا تھا کہ سلیم کا ماسٹرز مکمل ہوتے ہی ہمارا نکاح پڑھوادیا جائے گا اور ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوجائیں گے۔ کتنے منصوبے تھے ہمارے

کتنے خواب سجا رکھے تھے ہم نے مگر اب تمہارے لدھڑ نامے نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہماری تو گویا دنیا ہی اجڑ کر رہ گئی ہے۔ زندگی ہمارے لیے ایک کرب مسلسل' ایک مستقل عذاب بن گئی ہے۔"

یک بہ یک ہی لدھڑ انتہائی شکستہ اور آزردہ خاطر نظر آنے لگا۔ ہم بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے' گہری توجہ سے اس کا یہ افسانوی بیان سن رہے تھے۔ اس کے لب و لہجے اور چہرے کے تاثرات میں ضرور کچھ ایسا تھا' جس نے ہمیں کسی بھی قسم کے تبصرے اور طنز سے باز رکھا۔ ہم بس پرخیال سنجیدگی سے اسے تکے گئے۔ وہ چند لمحے سر جھکائے اداس و ملول بیٹھا رہا' پھر ہماری طرف دیکھتے ہوئے لجاجت سے بولا۔

"بلند بخت! بس اب تم ہی ہماری بگڑی بنا سکتے ہو۔ صرف تم ہی سلیم کی بدگمانی دور کر سکتے ہو۔"

"کیا سلیم میری بات پر یقین کرے گی؟"

"تم لدھڑ نامہ کے مصنف ہو۔ سلیم صرف ایک تمہاری ہی بات پر تو یقین کر سکتی ہے۔"

"مگر مجھے یہ سب انتہائی عجیب اور نامناسب لگتا ہے۔ لدھڑ نامہ' فیاض لدھڑ جن وہ سب اور وہ تمام واقعات تو قطعی فرضی تھے۔ پھر اب تم سچ مچ کے فیاض لدھڑ' ایک جن' اب اگر میں کسی کو جا کر یہ یقین دلانے کی کوشش کروں کہ میری کہانی والا فیاض لدھڑ جن' ایک فرضی کردار تھا جب کہ حقیقی فیاض لدھڑ جن' تم ہو اور میرے والے لدھڑ کی نسبت تم ایک شریف' مہذب اور باکردار جن ہو۔ تو کیا تمہیں نہیں لگتا کہ یہ خاصا مضحکہ خیز ہوگا؟

"نہیں' ہمیں ایسا نہیں لگتا۔ بے شک وہ سب فرضی تھا لیکن اتفاق سے ہمارے لیے وہ طوق گلو ثابت ہوا۔ تمہیں یہ سب اس لیے عجیب اور نامناسب محسوس ہو رہا ہے کہ جنات کے متعلق تمہارے خیالات ماورائی نوعیت کے ہیں۔ تمہاری معلومات ایسے تصورات پر بنیاد کرتی ہیں جنہوں نے مفروضوں سے جنم لیا۔ دراصل آج سے بہت پہلے ہی ناکافی معلومات کی بنا پر انسان نے قوم جنات کے متعلق نہایت عجیب و غریب حیران کن اور اثر انگیز مفروضے اور تصورات گھڑ لیے تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور پھیلتے گئے۔ جنات کا ہوا میں اڑنا' اچانک ظاہر اور غائب ہو جانا۔ کسی بھی انسان کے بدن میں حلول کر جانا' اور جس روپ یا شکل میں مرضی ہو' ظاہر ہو جانا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب قصے' کہانیوں کی حد تک تو ٹھیک ہے حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں۔"

"کمال بات کر رہے ہو تم' ایسے تو بے شمار واقعات ملتے ہیں۔"

"ہاں بازار میں کتابوں کی صورت بکتے ہیں۔ یا پھر ایک مخصوص طرح کی نفسیات رکھنے والے لوگ ایسے واقعات کو اپنے تجربے یا مشاہدے کا حصہ قرار دے کر اپنے غیر معمولی اور برتر ہونے کی فطری خواہش کو تسکین پہنچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

"لیکن ان حقائق کے متعلق تو بے شمار مستند حوالے موجود ہیں۔"

"چند ضعیف حوالوں کے علاوہ کہیں کوئی مستند حوالہ موجود نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہر کسی کے نزدیک حقیقت پڑھی' سنی یا سوچی ہوئی نہیں بلکہ دیکھی اور محسوس کی ہوئی ہونی چاہیے۔ کیا تمہارا کبھی کسی جن سے واسطہ پڑا ہے۔ خود تم نے کبھی کہیں کوئی جن دیکھا ہے؟"

بات کرتے کرتے لدھڑ نے اچانک ہم سے براہ راست پوچھ لیا۔

"میرا...... جن......" میرے مزید کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر لدھڑ بول پڑا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تم ہنوز ہمارے متعلق شکوک و شبہات کا شکار ہو۔ کوئی بات نہیں۔ تمہاری طرح اور بھی بے شمار لوگ ہیں جن کا اپنی روزمرہ کی زندگی میں جنات سے واسطہ پڑتا ہے' جنات کے ساتھ لین دین بھی ہوتا ہے' لیکن چونکہ ان کے حواس اور اذہان مفروضاتی تصورات کی دھند میں ملفوف ہوتے ہیں سو وہ جان ہی نہیں پاتے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ یہ شخص جو بھی گیا ہے' یہ جن

بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہ خیال ہی سب کو انتہائی مضحکہ خیز اور احمقانہ لگتا ہے کہ جن سبزی کی دکان سے آلو خریدتا ہے۔ دن بھر رکشہ چلاتا ہے راج مستری کے ساتھ مزدوری کرتا ہے کسی بینک میں منیجر کی پوسٹ پر کام کرتا ہے کہیں گوشت یا ٹینٹ سروس کی دکان کھولے بیٹھا ہے یہ سب مضحکہ خیز ہی تو ہے لیکن حقیقت میں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آخر جنات کو بھی تو زندگی کرنی ہے نا۔"

"زندگی کرنے کے لیے انہیں یہ سب کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے انہیں کیا کمی وہ تو اپنی جناتی طاقت سے کچھ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔"

"جناتی طاقت......!" لدھڑ گویا خود پر ہنسا تھا۔ "اپنی محنت سے کما کھا کر دنیا میں عزت سے جیتے رہنے کے لیے ساری جناتی طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بھی آس پڑوس کے گھروں سے چیزیں چھپر کر لینا اب کوئی آسان یا معمولی کام تو رہا نہیں۔ تمہارے محکمہ پولیس کی تحمل مزاجی کے باعث جنات جاتی تو کب کی ایسی حرکتوں سے توبہ تائب ہو چکی ہے۔"

گو کہ ہمیں لدھڑ سے شدید اختلاف محسوس ہو رہا تھا لیکن ہم کوئی اختلاف یا اعتراض اٹھا کر ایک لایعنی بحث کو طول نہیں دینا چاہتے تھے۔ ویسے بھی ہمیں اس بات سے کوئی خاص غرض نہیں تھی کہ جنات کیسے ہوتے ہیں اور کیسے نہیں نہ ہی ہمارے نزدیک یہ سب جاننا سمجھنا کوئی اتنا ضروری تھا۔ ہماری دلچسپی تو محض ان چار انگوٹھیوں کی حد تک بھی جو اس وقت ہماری انگلیوں میں تھیں۔

"کیا مجھے یہ ساری تفصیل سلیم کو بتانا ہوگی۔"

"ارے نہیں بالکل نہیں۔ یہ سب تو ہم نے صرف تمہیں جنات کے متعلق ایک درست اور حقیقت کے مطابق تصور دینے کے خیال سے کہہ سنایا ہے۔ سلیم کو تم نے کیا بتانا اور سمجھانا ہے اس بارے میں تو ہم پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ اب سوال صرف یہ باقی ہے کہ "کب؟" اور اس کا جواب تو ہم بھی جاننا چاہتے ہیں۔"

"سلیم کے معمولات کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے کالج کے علاوہ کہیں آنا جانا؟" ہمیں اب گھات کا موقع تلاشنا تھا۔

"بالکل نہیں وہ ایک مکمل مشرقی جن زادی ہے۔"

"کالج اکیلی جاتی ہے یا ساتھ کوئی ہوتا ہے۔"

"بڑا بھائی موٹر سائیکل پر چھوڑنے جاتا ہے۔ البتہ واپسی پر بھائی ساتھ نہیں ہوتا۔"

"زبردست یعنی کالج سے واپسی گھر تک اکیلی جاتی ہے۔ تو راستے میں مناسب موقع دیکھ کر چلتے چلتے ہی ساری بات بتائی جا سکتی ہے۔"

"مناسب موقع تو دیکھا جا سکتا ہے مگر اسے اکیلا دیکھنا تھوڑا مشکل ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"بھئی کالج سے صرف ایک اسے ہی تو چھٹی نہیں ہوتی نا! علاقے کی اور بھی بہت سی دوشیزائیں ہوتی ہیں۔ آگے پیچھے چار چھ کی کئی ٹولیاں ہوتی ہیں۔"

"پھر تو رستے میں کچھ کہنے کا سوچنا ہی فضول ہے۔ میں ایسے مواقعوں پر گلے پڑ جانے والی رنگین و سنگین عزت افزائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تم کسی اور موقع کی نشاندہی کرو۔" ہم نے پہلو بدلتے ہوئے لدھڑ کو مخاطب کیا۔

"پھر تم کالج کے اندر جا کر رابطے کی کوشش کر سکتے ہو۔"

ہم نے گھور کر دیکھا لدھڑ پوری طرح سنجیدہ تھا۔

"نہیں تم اس کی کسی ایسی سہیلی یا رشتے دار کا بتاؤ جس کے گھر اس کا آنا جانا ہو۔"

"کالج کے علاوہ تو وہ کہیں بھی نہیں آتی جاتی۔"

"شہر محلے یا آس پڑوس میں کہیں کوئی ایک گھر تو ایسا ہوگا۔"

"نہیں ہے۔" لدھڑ نے قطعیت سے جواب دیا تو ہم فکر مندی سے اپنا نچلا ہونٹ چبا کر رہ گئے۔ یہ صورت حال تو خاصی الجھن اور پریشانی والی تھی۔ باہر کہیں سلیم سے مذاکرات کے قطعی کوئی امکانات نہیں تھے اور گھر کے

دروازے تک جانا اپنے جسم و جان کو گوشت کے بھاؤ بانٹ دینے کے مترادف تھا۔

اگر ہمیں ایک طرف جان کا نقصان دکھائی دیتا تھا تو دوسری طرف تیرہ لاکھ کا خسارہ بھی نظر آتا تھا۔ اور ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ ان دونوں خساروں سے بچاؤ کا صرف ایک ہی حل تھا اور وہ تھا کسی معقول و مناسب صورت حال میں سلیم تک رسائی اور استغاثے کی کارروائی......!

ہمارے اور لدھڑ کے درمیان دیر تک تبادلہ خیال جاری رہا۔ مختلف منصوبے اور معاملے کے مختلف پہلو زیر بحث آتے رہے آخرکار ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ بیچ رستے کی ذلالت کے خطرے سے محفوظ رہنا ہے تو پھر ہمیں یا تو کالج کے اندر جانا ہوگا یا پھر سلیم کے گھر میں گھسنا پڑے گا' گھر؟ جہاں پھمن پہلوان روز بھینس اور بکرے ذبح کرتا تھا اور کالج؟ کالج کی چند لڑکیوں کی موجودگی میں سلیم سے بات کر لینے کی ہمت تو ہم میں تھی نہیں' جہاں سے کسی بھی طرف فرار ہو جانا بھی آسان ہوتا ہے۔ پھر کالج کے اندر جانا تو ایسے ہی تھا جیسے بندہ خود بھڑوں کے چھتے میں سر گھسیڑ دے کہ "لوڈ تنک مار ڈس لو مجھے۔" اور اس طرح کی حرکت پر بات بگڑنے کی صورت میں کالج انتظامیہ ہمیں حوالہ پولیس کرنے کا حق بھی استعمال کر سکتی تھی۔

گھوم گھما کر بات پھر تیرہ لاکھ کے خسارے پر آ رکی تو ہم جھنجلا اٹھے آخر ایک طویل بحث و تکرار کے بعد ہم ایک منصوبے کے تحت چوری چھپے سلیم کے گھر میں داخل ہونے کے سنگین فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ہمارے اس فیصلے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم غیر شعوری طور پر پھمن اور لدھڑ کو چچا بھتیجا تصور کرنے لگے تھے۔

منصوبے کے مطابق ہم دونوں کو نصف شب کے بعد سلیم کے دو منزلہ مکان میں داخل ہونا تھا۔ سلیم کے بھائی نیچے والے کمروں میں سوتے تھے اور پہلوان جی اپنی اہلیہ کے ہمراہ اوپری منزل کے ایک کمرے میں۔ ان کے اور سلیم کے کمرے کے درمیان والا کمرہ اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا' جس کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں' ہم دونوں سیڑھیاں چڑھتے ہی سیدھا سلیم کے کمرے میں جاتے۔ ہماری ایسی آمد یقیناً اس کے لیے حیرت اور ناگواری کا باعث تو بنتی لیکن لدھڑ کی وجہ سے یقیناً وہ حواس باختہ ہو کر واویلا مچانے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ سلیم کو اپنا چہرہ دکھا کر لدھڑ کمرے سے نکل کر اسٹور روم والے کمرے کے دروازے کے قریب ہمارا انتظار کرتا۔ ہم اپنا تعارف پیش کرنے کے بعد ساری رام کہانی سلیم کے گوش گزار کرتے۔ اسے بتاتے کہ لدھڑ ہمیں کب' کیسے اور کیوں ملا اور یہ کہ لدھڑ صاحب واقعی آپ سے سچی اور خالص روحانی محبت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں اپنی اور لدھڑ کی طرف سے سلیم کے حضور معافی کی درخواست پیش کرتے ہوئے رخصت لینا تھی۔ پھر جس خاموشی سے ہم مکان میں داخل ہوتے اسی خاموشی سے واپس ہو لیتے اور چاروں انگوٹھیاں ہماری ہو جاتیں۔ یعنی اتنے سے کام کے بدلے ہم تیرہ لاکھ کما لیتے اور بالفرض محال اگر سلیم کا رویہ ہماری توقع کے خلاف ہوتا' یا ہم گھر کے کسی اور فرد کی نظروں میں آ جاتے' بات بگڑ جاتی تو بھی لدھڑ کی وجہ سے کوئی زیادہ سنگین نوبت نہ آتی اور گھر کی بات کو گھر کے اندر ہی رفع دفع کر دینے کی کوشش کی جاتی۔ اس صورت میں بھی ہم چاروں انگوٹھیوں کے حق دار ٹھہرتے۔

مزید کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد ہم نے آج رات ہی اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کی ٹھان لی۔ اس کے بعد لدھڑ رات کا وعدہ کر کے روانہ ہو گیا اور ہم رنگ برنگی سوچیں سوچنے لگے۔ شکوک و شبہات اور اندیشوں واہموں کی دھند میں سے جھانکتا ہوا تابناک مستقبل ہمیں للچاتا رہا' ہماری ہمت بندھاتا رہا اور ہم جلد از جلد دھند کی اس چادر کے پار نکل جانے کے اضطراب میں گھرے رہے۔

رات قریباً ایک بجے جب بیرونی دروازے پر مدھم سی دستک ہوئی' اس وقت ہم چولہے پر چائے کی دیگچی چڑھائے بیٹھے تھے' توقع کے عین مطابق آنے والا لدھڑ ہی تھا۔ وہ اپنے مخصوص حلیے میں ایک کھٹارا سی سائیکل

سنبھالے کھڑا معمول سے کچھ زیادہ ہی مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا مگر ہم نے کوئی تبصرہ کیے بغیر خاموشی سے اسے اندر بلا لیا۔ چائے تقریباً تیار ہی تھی ہم نے دو کپوں میں انڈیلی اور ایک کپ لدھڑ کو تھما دیا۔

"یہ سائیکل کس لیے پہلوان کا گھر زیادہ فاصلے پر تو نہیں۔"

"یہ وہاں تک جانے کی بجائے گڑبڑ کی صورت میں فوراً نکل بھاگنے کے لیے زیادہ ضروری تھی۔ ایسے مواقعوں پر اپنی سواری نہایت کارآمد ثابت ہوا کرتی ہے۔" لدھڑ نے تدبر کا اظہار کیا۔

"یہ چلتی بھی ہے۔" سائیکل کی حالت ہمارے لیے تشویش کا باعث تھی۔

"دو چلتی...... ارے بھاگتی ہے میاں! بلکہ یوں کہو کہ اڑتی ہے ہوا سے ہمکلام ہوتی ہے ایک بار جب آگے بڑھا دی جائے تو پھر جلدی سے رکنے کا نام بھی نہیں لیتی اور غلطی سے کہیں رک نہ جائے اس احتیاط کے پیش نظر ہم پہلے ہی اس کے دونوں بریک نکال کر پھینک چکے ہیں۔"

"یعنی اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی لولا لنگڑا بنانے کا بندوبست کر کے آئے ہو۔"

"ایک تو تم ہمیشہ منفی پہلو پر پہلے سوچتے ہو۔ بھئی بریک نہیں تو کیا ہوا ہینڈل تو ہے نا اور ماشاء اللہ دونوں آنکھیں بھی سلامت وصحت مند ہیں تمہاری پھر گھبراتے کیوں ہو۔"

"میری آنکھیں۔" "یعنی تمہارا مطلب ہے کہ سائیکل مجھے چلانا ہوگی۔"

"چلانے کو تو ہم بھی چلا لیں گے لیکن ہماری ڈرائیو پہ شاید تمہیں اطمینان نہ ہو اس لیے......؟"

"میرے خیال میں تو اسے یہیں کھڑا رہنے دیں تو بہتر ہوگا۔" ہم نے اپنا خیال ظاہر کیا مگر وہ بھی لدھڑ تھا۔ اس نے سائیکل کے فوائد پر مدلل قسم کی تقریر شروع کر دی اور ہم بس خاموشی سے سنتے گئے۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر صورت سائیکل ساتھ ہی لے کر چلے گا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کے۔ اس کے بعد ہم لوگ خدا کا نام لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ رات کے دو بجے کا عمل تھا ہم نے پچھلے دروازے پر تالا ڈالا اور سائیکل اٹھانے کی ذمہ داری لدھڑ کے سر ڈال کر خود اس کے پیچھے سائیکل پر تشریف فرما ہو گئے تاکہ اگر کہیں کسی قسم کے تصادم کی صورت حال بنے بھی تو بروقت اچھل کر اتر سکیں اپنا آپ بچا سکیں۔

گلی سے نکلتے ہی لدھڑ نے سائیکل کا رخ اسٹیشن کی طرف جانے والے راستے پر موڑا تو ہم بے اختیار بول پڑے۔

"ہمیں تو باؤ سنگھ کالونی جانا تھا۔"

"جانا تھا نہیں جانا ہے۔"

"تو پھر ادھر کدھر! بس اسٹینڈ کی طرف سے چلو نا۔ جلدی پہنچ جائیں گے۔"

"ادھر سے گئے تو ہمیں شبستان ہوٹل کے سامنے سے گزرنا ہوگا جو مناسب نہیں سو ہم اوپر سے ہو کر کالونی پہنچیں گے۔"

"مناسب کیوں نہیں تم نے کیا ان کا قرض دینا ہے۔"

"شب کے اس پہر اگر ہوٹل کے کسی فرد کی نظر ہم پر پڑ گئی تو قبلہ والد بزرگوار کے ہاتھوں ہماری شامت آ جائے گی۔"

"یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"دراصل وہ ہوٹل ہمارا ہی ہے لہٰذا اگر کسی ملازم نے بھی ہمیں دیکھ لیا تو خبر والد محترم تک پہنچ جائے گی کہ آپ کے برخوردار رات آخر پہر گشت فرماتے دیکھے گئے ہیں۔ اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمارے والد گرامی کس مزاج کے جن واقع ہوئے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہماری

سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا انسیشن کی طرف سے ہی کالونی میں داخل ہونا مناسب رہے گا۔ تم بے فکر ہو کر بیٹھو اور خود کو کالونی پہنچا سمجھو۔"

لدھڑ وضاحت پیش کرتے ہوئے کسی پروفیشنل سائیکلسٹ کی طرح سامنے کی سمت جھکتا چلا گیا اور سائیکل جیسے لحہ بہ لحہ سڑک سے بلند ہوتی ہوئی ہوا سے کلام کرنے لگی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم۔" ہمیں اپنی آواز میں خفیف سی لرزش محسوس ہوئی تھی۔

"سائیکل چلا رہے ہیں۔"

"آہستہ.... آہستہ رفتار کم کرو۔" ہم نے ایک ہاتھ سے گدی اور دوسرے سے لدھڑ کی سلکی شیروانی پکڑلی۔

"میں کہہ رہا ہوں رفتار کم کرو اس کے تو بریک بھی نہیں ہیں۔ کیوں اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی اپاہج کر دینے پر تلے ہو۔"

"بے فکر ہو کر ہماری ڈرائیونگ کا لطف اٹھاؤ۔" لدھڑ کے لہجے میں بے پروائی تھی اور ہمارا حلق تھا کہ خشک ہوا جا رہا تھا۔ گو کہ رستہ صاف تھا۔ سڑک خالی تھی اکا دکا اسٹریٹ لائٹس اور چاند کی روشنی میں دور تک واضح دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی رکاوٹ کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ پھر بھی بن بریک سائیکل کی ایسی جمبو جیٹ رفتار کسی طور بھی مناسب نہ تھی۔ لدھڑ کی ایک ذرا غلطی ہمیں کسی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر سکتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اپاہج پن کا باعث بن سکتی تھی۔

"پاگل مت بنو۔ رفتار کم کر دو پھر مجھے اتار دو۔" ہم نے اپنی لرزیدہ آواز میں کہا لیکن اس کم بخت نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"دیکھو میں چھلانگ لگا دوں گا۔" ہم نے گویا دھمکی دی تو اس کے حلق سے اچھلنے والا بھیانک قہقہہ ہمارے کانوں سے رگڑ کھاتا ہوا گزر گیا اتنی تیز رفتاری سے دوڑتی سائیکل سے چھلانگ لگانے کی دھمکی پر اسے قہقہہ لگانا بھی چاہیے تھا۔ ایک بار تو ہمارے جی میں آئی کہ اس کمینے کی کمر پر دو ہنٹر رسید کریں اور دو چار گھونسے پسلیوں میں ٹھونک دیں۔ مگر ہماری ایسی کوئی حرکت یقینی طور پر ہم دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہوتی سو ہم بس دانت کچکچا کر رہ گئے۔

سائیکل تھی کہ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھتی گئی۔ ایک کے بعد ایک موڑ سڑک سے گلی گلی سے سڑک آخرکار ہاؤسنگ کالونی کی جامع مسجد والی مرکزی سڑک پر پہنچتے ہی لدھڑ سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے پیڈلنگ بھی روک دی۔ سائیکل اب خودکار انداز میں آگے کی طرف دوڑتی جا رہی تھی۔ ہمارے کشیدہ اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔ اور سانس میں بھی قدرے سہولت در آئی۔

سائیکل اپنے ہی زور میں آگے بڑھتی گئی۔ اندازہ تھا کہ وہ رکتے رکتے بھی مسجد سے کافی آگے جا نکلے گی مگر لدھڑ نے مسجد کے قریب پہنچتے ہی دونوں پاؤں نیچے سڑک پر جما دیے۔ سڑک پر اس کے جوتوں کے گھسنے کی آواز نے رات کے سکوت کو کچھ دیر کے لیے زخمی تو کیا لیکن سائیکل بالکل مسجد کے قریب جا رکی۔ پھمن پہلوان والی گلی یہاں سے محض چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ ہماری دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی تھی بس کہیں کہیں روشنی کے آثار تھے اور ہمیں اس وقت چوروں کی طرح پھمن پہلوان کے گھر گھسنا تھا گو کہ ایسا کرتے ہوئے ہمارے دیکھے جانے کے امکان بالکل بھی نہیں تھے پھر بھی ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں ضرور کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے ہم دیکھ لیے جائیں گے۔

"اب اترو بھی۔" لدھڑ کی آواز نے ہمیں چونکایا تو ہم سائیکل سے اتر کھڑے ہوئے۔

"آؤ" لدھڑ نے مختصراً کہا اور آہستہ سے گلی کی جانب بڑھ گیا۔

"کیا وہ سب سو رہے ہوں گے؟"

"نہیں ہمارے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے خدا کے بندے ظاہر ہے رات کے اس پہر ہر کوئی خواب خرگوش میں مدہوش ہوتا ہے۔ انہوں نے تو صبح

جلدی اٹھنا ہوتا ہے سو وہ رات کو بھی جلدی جاتے ہیں۔"

لدھڑ کی وضاحت پر ہم ہونٹ بھینچ کر رہ گئے لیکن تشفی نہیں ہوئی۔ گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ فضا پر ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ یوں جیسے ان گھروں میں کوئی ذی روح باقی نہ رہا ہو۔ سب مر چکے ہوں۔ جیسے جیسے ہم پہلوان کے گھر کے قریب ہوتے جا رہے تھے ہماری گھبراہٹ میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔

"لدھڑ بھائی! کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔" ہماری آواز میں لرزش تھی۔

"ارے میاں! گھبراتے کیوں ہو ہم ہیں ناں تمہارے ساتھ۔ مسئلے کو ہم دیکھ لیں گے تم بس سلیم کا سوچو باقی ساری ذمہ داری ہماری ہے۔"

"میں نے پہلے کبھی کسی کی دیوار نہیں پھاندی اس لیے تھوڑی سی گھبراہٹ تو ہوگی ہی۔"

"یعنی دوسرے لفظوں میں تم ہمیں عادی دیوار پھاندو کہہ رہے ہو۔" لدھڑ نے بدمزگی سے سرگوشی کی۔

"تمہارا تو گھر والا معاملہ ہی ہوا ناں اور پھر تم تو عاشق صادق بھی ہو مگر میں اس معاملے میں اناڑی ہوں، مجھے عشق و عاشقی کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"یہی مکان ہے۔" لدھڑ پھمن پہلوان کے مکان کے دروازے پر رکتے ہوئے بولا۔

"لدھڑ بھائی! ایک بار پھر سوچ لو۔"

"کتنا سوچو گے میاں! اب تو منزل پر پہنچ چکے۔" لدھڑ نے سائیکل آہستہ سے دیوار کے بالکل ساتھ کھڑی کر دی۔

"تمہاری شادمانی اور تمہاری خوش زمانی دیوار کے اس طرف ہے بلند بخت! خدا کا نام لے کر چڑھ جاؤ۔ ایک بار سلیم کو حقیقت حال سے آگاہ کر دو اس کے بعد خوشحالی کی زندگی گزارو۔"

ہم نے لاشعوری طور پر ادھر ادھر دیکھا۔ خاموشی، سناٹا اور کہیں کچھ نہ تھا۔

"ٹھیک ہے تم بھی ساتھ ہو نا؟"

"ارے ہاں بھئی! تم چڑھو دیوار پر ہم بھی ساتھ ہی ہیں۔"

ہم نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا اپنی نیت اور مقصد کی سچائی و صفائی کا اظہار فرمایا اور لدھڑ کی مدد سے سائیکل پر پاؤں دھرتے ہوئے دیوار کے اوپر جا پہنچے یہ آٹھ دس مرلے کا ایک صاف ستھرا مکان تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک کم پاور کا بلب روشن تھا جس کی مدھم روشنی میں صحن دھندلا ہی سہی مگر دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے ہی چار پانچ کمرے ایک قطار میں بنے دکھائی دے رہے تھے اور تین کمرے اوپر تھے۔ دائیں طرف کونے میں ایک گائے بندھی ہوئی تھی جس کی یقیناً صبح شامت آنے والی تھی۔ بیرونی دروازے کے ساتھ دکھائی دینے والا کمرہ یقیناً بیٹھک رہی ہوگی۔ اور دروازے کے اس طرف دیوار کے ساتھ ساتھ ایک کیاری میں مختلف پودے دکھائی دے رہے تھے جو دیوار کے آخری کونے تک ایک قطار کی صورت موجود تھے۔ ہم دیوار پر اکڑوں بیٹھے تھے ایک نظر اندر کا جائزہ لینے کے بعد ہم لدھڑ کی طرف متوجہ ہوئے وہ سائیکل پر چڑھ آیا تھا ہم نے اسے دیوار پر چڑھنے میں ہاتھ کا سہارا دیا دل کو قدرے ڈھارس ہوئی کہ وہ اپنے کہے کے مطابق ہمارے ساتھ ہی ہے۔

"وہ برآمدے کے ساتھ سے سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں اور یہ ادھر بائیں طرف والا کمرہ سلیم کا ہے۔" لدھڑ نے سرگوشی کرتے ہوئے ہمیں اشارے سے سیڑھیاں اور سلیم کا کمرہ دکھایا جس کی کھڑکی میں سے ہلکی نیلی روشنی جھلک رہی تھی جو یقیناً زیرو پاور کے بلب کی تھی۔

"ٹھیک ہے اترا جائے پھر.....'"

"ہاں احتیاط سے۔" لدھڑ نے آہستہ سے ہمارا کندھا تھپتھپایا اور ہم دیوار سے اندرونی جانب لٹک گئے۔ ہمارے دونوں ہاتھ دیوار کے کنارے پر تھے اور خود ہم نیچے لٹکے ہوئے تھے اس کے باوجود ہمارے پاؤں زمین نہیں چھو رہے تھے۔ ہم نے ایک نظر لدھڑ پر ڈالی اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ نیچے کیاری تھی کوئی آواز تو نہیں ابھری البتہ کل شام

شاید پودوں کو پانی دیا گیا تھا جس کی وجہ سے ہمارے پاؤں ٹخنوں تک کیاری کی کیچڑ نما مٹی میں دھنس گئے۔ کچھ کیچڑ بوٹوں کے اندر بھی گھس گیا' جی میں تو آئی کہ بوٹ اتار کر لدھڑ کے منہ پر کھینچ ماریں مگر صورت حال کی سنگینی کے پیش نظر ہم وہیں دبک کر بیٹھ رہے۔

آئندہ لمحے ہماری پیروی کرتے ہوئے لدھڑ بھی ہمارے پہلو میں آ بیٹھا۔

''لعنت ہو۔''

''کس پر'' لدھڑ کی بڑبڑاہٹ پر ہم تنفر ہوئے۔

''جس کسی نے بھی پودوں کو غسل دیا ہے۔'' اس نے مینڈک کی طرح منہ پھلایا۔

''ہوسکتا ہے' سلیم صاحب نے دیا ہو۔'' یقیناً ہماری قیاس آرائی اسے انتہائی ناگوار گزری تھی۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں بس ہمیں گھور کر رہ گیا۔

کچھ دیر تو ہم دونوں وہیں دبکے رہے پھر اٹھ کر دبے قدموں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ پورے گھر پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہم ابھی صحن کے وسط میں پہنچے تھے کہ ایک طرف بندھی گائے اپنی بھیانک آواز میں یوں ڈکرائی کہ ہمارا تو کلیجہ ہی کانپ اٹھا' قریب تھا کہ ہم پلٹ کر بھاگ کھڑے ہوتے' لدھڑ نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تیز سرگوشی میں بولا۔

''آگے بڑھو۔'' ہمارے قدم خود کار سے انداز میں آگے کی سمت اٹھ گئے۔ ابھی ہم مزید چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک کسی کتے کی بھیانک آواز ہمیں دہلا گئی۔ ابھی ہم ٹھیک سے سمت کا تعین بھی نہیں کر پائے تھے کہ کتے کی پہلے سے بھی زیادہ بھیانک اور دلدوز آواز ہمیں لرزا گئی۔ بس پھر جو ہوا آناً فاناً ہو گزرا۔

اچانک کسی طرف سے ایک ساتھ دو کتے نمودار ہوئے تھے۔ یعنی یک نہ شد دو شد' کتوں کی جسامت اور جبڑے دیکھتے ہی ہماری تو روح فنا ہوگئی۔ کتے کیا تھے بچھڑے تھے۔ یعنی اچھے خاصے جسیم و جیم اور خوفناک تھے' ہم نے بوکھلاہٹ میں لدھڑ کی طرف دیکھا لیکن وہ تو اپنی جگہ سے یوں غائب تھا جیسے کبھی رہا ہی نہ ہو۔

کتے ہولناک انداز میں غراتے بھونکتے ہماری طرف لپکے تو ہمارے حواس بالکل ہی مختل ہوگئے۔ اندازہ ہے کہ ہم بیرونی دروازے کی سمت ہی دوڑے تھے اور اسی دوران ہمیں ایک طرف بندھی گائے کی پیٹھ پر سے دیوار پر چڑھتے ہوئے ذلیل لدھڑ کی ایک جھلک بھی دکھائی پڑی تھی' غالباً اس نے چیختے ہوئے کچھ کہا بھی تھا لیکن ہماری سماعت میں صرف کتوں کی گرج دار آوازیں دندنا رہی تھیں' یا پھر اپنی ہی دہشت زدہ بے معنی چیخ و پکار۔

شاید کتے تھوڑی سی ڈھیل دیتے تو ہم نکل بھاگنے میں کامیاب ہو ہی جاتے مگر وہ تو کتے تھے۔ ہم دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دونوں نے ایک ساتھ ہمیں آلیا۔ ایک نے ہماری دائیں پنڈلی کو احترام بخشا تو دوسرا چھلانگ مار کر سیدھا ہمارے کندھوں پر آ سوار ہوا۔ پنڈلی کی اذیت ناک گرفت اور اس دھچکے سے لڑکھڑا کر ہم منہ کے بل گرے اور ہمارے کندھوں پر سواری کا شوقین ایک دھماکے کی آواز سے بیرونی دروازے سے جا ٹکرایا۔ کتوں کی بھاؤں بھاؤں اور ہماری بھاں بھاں سے پورا ماحول لرز اٹھا تھا۔ دونوں کتے عفریتوں کی طرح ہم پر چھا گئے تھے اور ہم جی جان سے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے زمین پر تڑپ رہے تھے' ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔ ادھر سے ادھر پلٹنیاں کھا رہے تھے۔ ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ ہمارا آخری وقت آ چکا ہے' اور آئندہ کچھ ہی دیر میں ہم پھمن پہلوان کے ان گوشت خور پہلوان کتوں کے معدوں میں پہنچ چکے ہوں گے۔ شاید ہمارا یہ اندیشہ درست ثابت ہو ہی جاتا کہ اچانک پھمن کے پانچوں پہلوان سپوت' کتوں کو آوازیں دیتے' جھڑکتے موقع پر پہنچ آئے۔

انہوں نے جیسے تیسے کتوں کو قابو کر کے ایک طرف باندھا اور پھر ہماری طرف متوجہ ہوگئے' ہمیں اٹھا کر برآمدے میں لے جایا گیا' پانی پیش کیا گیا۔ اتنے میں پھمن جی بھی نیچے پہنچ آئے تھے۔

گو کہ ہمارا وجود جگہ جگہ سے ادھڑ چکا تھا لیکن مقام شکر

تھا کہ بروقت وہ پانچ فرشتے پہنچ آئے تھے اور ہماری جان بچ گئی تھی۔ وجود کے تمام اعضا بھی ثابت سلامت تھے۔

پانی پینے کے بعد ہمارے حواس مزید کچھ ٹھکانے پر آئے تو ہمارا انٹرویو شروع ہو گیا۔

کون ہو کہاں سے آئے ہو کیسے آئے اور کیوں آئے؟

ان سب کے مہربان اور ہمدردانہ رویے سے ہماری آنکھیں بھر آئیں اور ہم نے بھرائی ہوئی آواز میں تمام حقیقت حال پوری دیانت داری اور حرف بہ حرف سچائی کے ساتھ ان کے گوش گزار کر دی، اب خدا معلوم کہ انہیں اس داستان کا کونسا حصہ ناگوار گزرا کہ وہ ایک ساتھ پھر کر ہم پر ٹوٹ پڑے، گھونسے، ٹھڈے، تھپڑ، کمینوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ کونسا حصہ پہلے سے زخمی ہے، کس مقام کو نشانہ بنانا چاہیے اور کس کو نہیں، ہم چیختے رہے، چلاتے رہے لیکن وہ تو جیسے بہرے ہو چکے تھے، کتوں والی تمام دہشت ناکی جیسے ان میں اتر آئی تھی۔ ہمارا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا تو ہمیں پھر سے پانی پیش کیا گیا، کچھ پانی ہمارے سر پر انڈیلا گیا، حواس قدرے بہتر ہوئے تو پھر سے انٹرویو......

"ہاں بھئی جن کے رشتے دار! کون ہو، کہاں سے اور کیوں آئے ہو؟ سب کچھ سچ سچ بتادو۔"

ہمیں خیال گزرا کہ شاید ذہنی وجسمانی ابتری کے باعث ہم کچھ غلط بیان دے چکے ہیں سو اس بار ہم نے اچھی طرح لدھڑ کی آمد اور اب تک کے تمام واقعات کو یاد کرتے ہوئے پھر سے تمام حقیقت پوری ایمانداری سے بیان کرنا شروع کر دی مگر ان کم بختوں نے اس بار ہماری پوری کہانی سنی بھی نہیں اور پھر سے شروع ہو گئے۔

اس روز ہمیں لفظ قصائی کی حقیقی معرفت سے آگاہی ہوئی۔ اور ہم لفظوں کے معنوی اثرات کے بھی خلوص دل سے قائل ہو گئے۔

دن چڑھے تک انٹرویو کا یہ ستم انگیز سلسلہ جاری رہا ہم پر بار بار غشی کے دورے پڑتے رہے، ہر بار ہمیں کچھ پانی پلا دیا جاتا، کچھ ہمارے سر پر انڈیلا جاتا اور پھر سے وہی سوالات دہرائے جاتے اور جواب مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ کمینے پھر سے ہم پر ٹوٹ پڑتے۔

خدا معلوم پھر کس مہربان نے تھانے اطلاع دی، پولیس والے کس طرح وہاں پہنچے بہرحال پولیس کے آنے پر ہی ہماری جان بخشی ہوئی تھی وگرنہ تو وہ قصائی خاندان ہمارے قیمے سے روزی کمانے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔

ہمیں اپنی اس وقت کی شکستہ حالت کا کچھ ٹھیک سے اندازہ نہیں، شاید پولیس والوں کے خیال میں ہم کوئی تسلی بخش حال میں نہیں تھے جو وہ ہمیں تھانے لے جانے سے پہلے ہسپتال لے گئے تھے۔ تین چار گھنٹے ہسپتال میں رکھنے کے بعد انہوں نے ہمیں لے جا کر حوالات میں ڈال دیا۔

ویسے تو پولیس تھانے کے نام سے ہماری ہمیشہ ہی سے جان جاتی تھی لیکن اس وقت ہم نے حوالات میں خود کو خاصا مطمئن اور محفوظ جانا، کم از کم یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب ہماری زندگی محفوظ ہے۔ کیونکہ یہاں قصائی خاندان بشمول کتوں کے ہم پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔

قلب وذہن اور جسم وجاں کی زبوں حالی کا جو عالم تھا اسے مناسب الفاظ میں بیان کرنا تو ممکن ہی نہیں۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں ہم پر جو قیامت گزری تھی اس کے گزر چکنے کے باوجود ہمارے اندر کہیں بے یقینی کا احساس ہمک رہا تھا۔ شاید ہم اس سب کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ آخر کو ہماری آنکھ لگ گئی۔ خدا معلوم نیند ہی تھی یا کہ نقاہت کے باعث بے ہوشی، بہرحال ہم ایک سکون بخش غفلت میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

ہمارے آئندہ تین چار روز نہایت پرسکون انداز میں گزرے کھانا پانی، وقت پر ملتا رہا۔ دوبار ہمیں ہسپتال لیجا کر تازہ مرہم پٹی بھی کرائی گئی، کچھ ادویات ہمیں حوالات ہی میں مہیا کر دی گئی تھیں، اس خصوصی دیکھ بھال کے طفیل تین چار روز میں ہی ہماری توانائیاں بحال ہو گئیں پولیس والوں کے اس مہربان رویے نے ہماری ہن کے

متعلق رائے ہی بدل ڈالی تھی۔ ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ہمارے ملک کے عوام بے جا طور پر پولیس کو برا گردانتے ہیں ناپسند کرتے ہیں حالانکہ پولیس والے خاصے معقول انسان ہوتے ہیں۔

صبح ہم نے یہ اندازہ قائم کیا تھا اور شام کو ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہوگیا۔ اس روز دن میں پھمن پہلوان اپنے پانچوں بلڈاگ سپوتوں کے ہمراہ تھانے آیا تھا۔ گھنٹہ بھر ایس ایچ او کے دفتر میں وہ لوگ نجانے کیا کھچڑی پکا کر رخصت ہوگئے اور شام کے وقت ہمیں تھانے کے صحن میں نکال لیا گیا۔ سامنے ہی ایس ایچ او صاحب بذات خود کرسی بچھا کر بیٹھ گئے اور پانچ چھ جوان ہمارے اردگرد کھڑے ہوگئے۔

صورت حال کی غیر معمولی نوعیت کا اندازہ تو ہمیں فوراً ہی ہوگیا تھا مگر نوعیت کی شدت ہم پر کچھ دیر بعد آشکار ہوئی۔ ہم سے جتنے سوال کیے گئے ہم نے ان کے بالکل سچ اور ٹھیک ٹھیک جوابات دیئے اور اس سچ کے انعام میں ہمیں وہیں ننگے فرش پر لٹا لیا گیا۔ اس کے بعد الحفیظ الا مان ہم نے بہت واویلا کیا بہت واسطے دیئے کہ آپ لوگ جو سننا پسند کریں ہم وہی عرض کیے دیتے ہیں لیکن انہوں نے ہماری ایک نہ سنی گویا وہ صرف ہمیں اپنی حد درجہ نامعقولیت کا یقین دلانے پر آمادہ تھے سو ہمارے لاکھ شور وغل کے باوجود کم بختوں نے ہماری اچھی خاصی تشریف شریف کی ڈبل روٹی بنا کر رکھ دی اور ہم آئندہ تین روز اٹھتے بیٹھتے اپنے منہ سے خارج ہونے والی ہائے ہائے کی آوازوں سے محظوظ ہوتے رہے۔

اسی دوران ہم پر یہ بھی آشکار ہوا کہ ہماری ہیرے کی چاروں انگوٹھیاں بھی غائب ہیں دل ڈوب سا ہی تو گیا تھا۔ اب تک جو بھی گزری تھی اس میں یہ چار انگوٹھیاں ہی تو تھیں جو کسی قدر حوصلے اور اطمینان کا باعث تھیں کہ چلو جو عذاب گزرا سو گزرا حوصلے اور ازالے کے طور پر لاکھوں مالیت کی یہ چار انگوٹھیاں تو ہمارے پاس ہیں نا مگر اب وہ بھی نہیں رہی تھیں۔ گزشتہ دنوں ہماری حالت بھی ایسی دگرگوں رہی تھی کہ ہمیں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ انگوٹھیاں کب کہاں اور کس نے ہماری انگلیوں سے اتاریں۔ نجانے یہ اوچھی اور کمینی حرکت پہلوان کے سپوتوں نے سرانجام دی تھی یا ہمیں وہاں سے لے کر آنے والے نامعقول پولیس ملازمین نے۔ ہم نے جاننے کی کوشش کی تو ایک پولیس ملازم سے استفسار کے جواب میں ہمارے دائیں کان کے اندر کہیں گھنٹہ بھر سیٹیاں سی بجتی رہی تھیں۔

لدھڑ کا خیال آیا تو ہمارے تن بدن میں آگ کے بھانبھڑ جل اٹھے۔ اس سارے معاملے کا اصل ذمہ دار تو وہی کمینہ تھا نا ساری ذمہ داری اپنے سر لینے کا دعوے دار مسئلے کی صورت میں سارا معاملہ سنبھالنے اور بگاڑ کو اپنے سر اٹھانے کا وعدہ کر کے مشکل وقت میں ہمیں مصیبت میں اکیلا چھوڑ کر خود کیسے فرار ہوگیا تھا دھوکے باز جھوٹا مکار اور ذلیل لدھڑ! پہلے ہمیں کتوں نے بھنبھوڑا پھر پھمن اور اس کے پہلوان مسٹنڈوں نے اب یہاں پولیس والوں نے ہماری ایسی تیسی کر کے رکھ چھوڑی تھی اور اس خبیث کو اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ ہماری خبر گیری کو آ جاتا چلو خود نہ سہی کسی اور ہی کو بھیج دیتا۔ مگر نہیں اس ذلیل نے تو پلٹ کر دیکھا تک نہیں تھا اور یہاں کوئی ہماری سننے ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ہم نے قسمیں اٹھا اٹھا کر قصائیوں اور پولیس والوں کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اصل مجرم وہ جہنمی لدھڑ ہے مگر کسی کو ہماری بات پر یقین ہی نہیں تھا۔ کوئی سننے ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

ہم حوالات کے ایک کونے میں بیٹھے اپنی بدبختیوں پر کڑھنے کے ساتھ ساتھ لدھڑ اور اس کے خاندان کو کوس رہے تھے کہ حوالات کے دروازے پر نجیب احمد نجمی کی صورت دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت سے اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

”نجمی تم یہاں کیسے؟ تمہیں کس نے بتایا؟“ ہمیں واقعی اس کی اچانک آمد پر حیرت بھی تھی اور حیرت سے زیادہ خوشی بھی آخر وہ ہمارا پرانا اور خیر خواہ دوست تھا۔

”گھر گیا تھا تمہارے پڑوسی چاچا نذیر نے بتایا کہ پولیس تمہارے گھر کی تلاشی لینے آئی تھی اور پولیس والوں

ہی سے انہیں معلوم ہوا کہ تم تھانے میں ہو۔ یہاں آ کر مجھے تفصیل معلوم ہوئی ہے' کیوں کیا تم نے ایسا' اگر کوئی ضرورت تھی تو مجھ سے کہتے۔ چوری کرنے کا تم نے سوچا بھی کیسے؟'' نجمی انتہائی متاسفانہ دکھائی دے رہا تھا۔

''چوری.....؟''

''اور نہیں تو کیا۔ فتح یار عرف پھمن پہلوان نے تمہارے خلاف چوری کی ایف آئی آر درج کروائی ہے' اور ایس ایچ او صاحب نے بتایا ہے کہ تمہیں پہلوان کے گھر ہی سے گرفتار کیا گیا ہے۔ تم چوری کی نیت سے ان کے گھر میں گھسے تھے مگر موقع پر ہی پکڑے گئے۔''

''یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔''

''یعنی تم رات کے آخر پہر پہلوان کے گھر میں نہیں گھسے؟''

''گیا تھا' مگر چوری کی نیت سے نہیں' بلکہ پہلوان کی بیٹی سلیم کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے کہ میں نے اپنی کہانی ''لدھڑ نامہ'' میں جس فیاض لدھڑ کا ذکر کیا ہے وہ ایک فرضی کردار ہے' محض میرے ذہن کی اختراع اور میری کہانی والے فیاض لدھڑ کا اس کے والے فیاض لدھڑ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور نہ ہی لدھڑ نامہ لکھنے سے پہلے تک میں حقیقی فیاض لدھڑ سے واقف تھا۔''

''فیاض لدھڑ.....'' نجمی نے یوں کہا جیسے لدھڑ اس کے حلق میں پھنستا پھنستا رہ گیا ہو۔ ''یہ موصوف کون ہیں؟''

''سلیم کا منگیتر ہے۔ وہی کم ذات تو مجھے پہلوان کے گھر لے کر گیا تھا۔ پھر جب کتے سامنے آئے تو پہلوان کے گھر میں بندھی گائے پر چڑھ کر دیوار پھلانگ کر فرار ہو گیا۔''

''گائے پر چڑھ کر دیوار پھلانگ گیا کا کیا مطلب ہوا؟''

''میرا مطلب ہے! دیوار اونچی تھی لہٰذا وہ پہلے گائے پر سوار ہوا پھر دیوار پر اور یوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مجھے کتوں نے دبوچ لیا' اسی شور شرابے میں پہلوان اور اس کے بیٹے جاگ گئے اور میں ان کے ہتھے چڑھ گیا۔''

''تو تم نے اس کا بتایا نہیں۔''

''کس کا؟''

''وہی لدھڑ کا' لدھڑ کے متعلق نہیں بتایا ان لوگوں کو۔''

''بتایا تھا' ان کو بھی اور یہاں پولیس والوں کو بھی مگر کوئی سنتا مانتا ہی نہیں۔''

''تمہیں کس نے بتایا تھا کہ وہ سلیم کا منگیتر ہے؟'' نجمی نے پرسوچ سے انداز میں پوچھا۔

''خود لدھڑ نے۔''

''اور اس طرح پہلوان کے گھر میں گھسنے کا مشورہ بھی اسی کا ہو گا؟''

''یہ فیصلہ ہم نے باہمی مشاورت کے بعد کیا تھا۔''

''کمال ہے یار! مجھے تم سے ایسی بے وقوفی کی توقع تو ہرگز نہیں تھی۔ ایک شخص تم سے آ کر کہتا ہے کہ میں فلاں لڑکی کا منگیتر ہوں اور تم رات کے آخر پہر اس لڑکی کے گھر میں گھس کر اسے یہ بتاؤ کہ تمہاری کہانی میں وہ کیا تھا۔''

''میری کہانی والا فیاض لدھڑ ایک فرضی کردار تھا اور لدھڑ نامہ میں اس کردار کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا وہ محض میری ذہنی پیداوار تھی حقیقی فیاض لدھڑ کا کردار اس سب سے مستثنیٰ ہے بلکہ اس سے پہلے تک تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ حقیقت میں بھی کوئی فیاض لدھڑ ہے۔ بس اتفاقیہ طور پر یہ مطابقت ہو گئی ہے۔ میں سلیم کو یہی بتانے پہلوان کے گھر گیا تھا۔''

''اگر ایسی کسی مطابقت کا اتفاق ہو بھی گیا تھا تو وہ دونوں منگیتر آپس میں خود ہی کلیئر کر لیتے' تمہیں درمیان میں سر پھنسانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی یوں ایسے احمقانہ طریقے سے۔''

''لدھڑ نے کلیئر کرنے کی کوشش کی تھی مگر سلیم اس کی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ دراصل اسے یہ معلوم تھا کہ میں اور لدھڑ آپس میں دوست ہیں اس لیے میں نے لدھڑ کے جس واہیات سے کردار کی عکاسی کی ہے وہی سچ ہے اور لدھڑ حقیقتاً اسی کردار اور اسی پروانہ صفت مزاج کا مالک ہے۔ لہٰذا وہ لدھڑ سے بری طرح بدظن ہو گئی تھی اور اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی لہٰذا چار و ناچار لدھڑ

نہایت دل گرفتگی کے عالم میں میرے پاس چلا آیا۔"

"اگر تم لدھڑ کو پہلے سے جانتے ہی نہیں تھے تو سلیم تم دونوں کو دوست کیوں سمجھنے لگی تھی؟" نجمی نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر ٹکاتے ہوئے ہمیں گھورا۔

"اصل میں یہ جھوٹ اس سے لدھڑ ہی نے بول رکھا تھا۔"

"اور یقیناً یہ سب کچھ تم سے لدھڑ ہی نے کہا ہوگا؟"

"ہاں بالکل۔"

"اور تم خدائی فوجدار بن کر بغیر سوچے سمجھے فوراً اس کے ہمراہ چل پڑے۔"

"نہیں فوراً تو نہیں، کئی دن بعد میں نے یہ قدم اٹھایا تھا، اور کافی زیادہ سوچ بچار بھی کی تھی۔ سلیم کو اتنی سی معلومات پہنچانے کے بدلے تیرہ لاکھ کے لگ بھگ فائدہ ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد میں نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"تیرہ لاکھ!" نجمی واضح طور پر چونک پڑا تھا۔ "وہ کس طرح۔"

"لدھڑ نے ہیرے کی چار انگوٹھیاں دی تھیں جن میں سے صرف ایک کی قیمت کم و بیش سوا تین لاکھ کے قریب قریب تھی۔ میں نے باقاعدہ مارکیٹ سے ریٹ لگوایا تھا مگر افسوس کہ وہ چاروں میرے پاس نہیں رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پولیس والوں نے ہی میری انگلیوں سے اتار کر غائب کر لی ہیں۔"

نجمی کچھ دیر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"کون! لدھڑ؟"

"ہاں وہی۔"

"مجھے کیا معلوم۔"

"اس نے یہاں تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟"

"نہیں۔"

"اس نے تمہیں پہلوان کے گھر میں گھسنے کے معاوضے کے طور پر ہیرے کی چار انگوٹھیاں دی تھیں؟"

نجمی نے گویا تصدیق چاہی تھی۔

"گھر میں گھسنے کے عوض نہیں، سلیم تک وضاحت پہنچانے کی خدمات کے بدلے میں انعام یا معاوضے کے طور پر کہہ لو۔"

"کیا وہ پاگل تھا۔"

"ہاں شاید سلیم کی محبت میں کچھ کچھ پاگل تو لگتا تھا وہ۔"

"اس سے بڑے پاگل اور احمق تم ہو جو اس کی اس کہانی میں آ کر پہلوان کے گھر جا گھسے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس سارے ڈرامے کے پس پردہ اس کا کوئی اور مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ شکر کرو کہ تم کسی بڑی مصیبت میں نہیں پھنس گئے اور آج یہاں زندہ سلامت بھی کھڑے ہو۔"

نجمی کی جھنجلاہٹ اور برہمی دیکھتے ہوئے ہم ہونقوں کی طرح بس آنکھیں پٹپٹا کر رہ گئے۔ ہمیں کسی حد تک اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس معاملے کو کچھ زیادہ ہی پیچیدہ اور سنگین رنگ میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور لدھڑ کو بھی ضرورت سے زیادہ ہی توپ چیز تصور کر رہا ہے۔

کچھ دیر تک وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"بہرحال تم اب فکر نہ کرو۔ پہلے میں تمہاری گلو خلاصی کے لیے کچھ کرتا ہوں، اس کے بعد پھر لدھڑ صاحب کو بھی دیکھ لیں گے۔"

نجمی نے حوصلے تسلی کے چند جملے مزید کہے اور روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے سے پہلے ہم نے انگوٹھیوں کی بابت بھی اسے یاددہانی کرا دی تھی کہ کسی نہ کسی طرح چاروں انگوٹھیاں بھی برآمد کروائے۔

نجمی سے ملاقات اور حال احوال کے بعد ہم خاصا اطمینان محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ تو اندازہ نہیں کہ تھانے سے رخصت ہونے کے بعد اس نے ہمارے سلسلے میں کیا کیا اور کیا نہیں، بہرحال ہمیں دوسرے روز ہی تھانے سے جیل منتقل کر دیا گیا۔ جہاں ہم نے پندرہ روز لدھڑ کو بددعائیں دیتے ہوئے گزارنے اور سولہویں روز ہماری

آزادی کا پروانہ آ گیا۔

جیل سے باہر نکلے تو توقع کے عین مطابق نجمی کو ہم نے اپنا منتظر پایا۔ اسی کی مہربانی سے ہماری ضمانت ہوگئی تھی وگرنہ تو ہمارے پیچھے آنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ہماری ضمانت تو اس نے دے دی تھی مگر باوجود کوشش کے وہ انگوٹھیوں کے سلسلے میں کچھ نہیں کر پایا تھا۔ اس کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق ہم یہ تک ثابت نہیں کر سکتے تھے کہ ہمارے پاس کوئی ایک بھی انگوٹھی موجود رہی تھی، ہم بس دل تھام کر رہ گئے تھے کہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

نجمی ہمیں وہاں سے اٹھا کر گلستان ہوٹل لے آیا۔ کڑاہی گوشت کا آرڈر دے کر ہم لوگ دوسری منزل پر ایک پرائیویٹ کیبن میں آ بیٹھے۔

''اب بتاؤ کہ تمہارے لدھڑ صاحب سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''اپنے ماں باپ کا ہوگا وہ نامعقول، میرا کیوں؟'' نجمی کا جملہ ہمیں واقعی ناگوار گزرا تھا۔

''چلو یونہی سہی، ملے گا کہاں وہ؟''

''اس کے ماں باپ ہی کو پتا ہوگا۔''

''اور ان سے کہاں ملا جا سکتا ہے؟''

''یہ ان کے اس نالائق برخوردار کو پتا ہوگا؟''

''تمہیں بھی کچھ پتا ہے یا نہیں۔'' نجمی جھنجلا سا گیا۔

''ان میں سے کون کہاں پایا جا سکتا ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں۔''

''یعنی لدھڑ کے حوالے سے تمہارے پاس کوئی اتا پتا نہیں۔''

''بالکل، میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔''

''کھامڑ انسان! تمہاری ابھی صرف ضمانت ہوئی ہے۔ مکمل گلوخلاصی کے امکان تبھی ممکن ہو سکتے ہیں جب ہمیں اس سارے مسئلے کے اصل کردار کا کوئی اتا پتا، کوئی سراغ مل جائے گا۔ اور اس سارے ڈرامے کے پیچھے اس کا اصل مقصد کیا تھا یہ بھی تبھی معلوم ہو سکے گا۔''

''مقصد تو وہی تھا جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ واقعی سلیم کی محبت میں پاگل ہے۔ رہی بات اتے پتے اور سراغ کی تو وہ ہمیں پھمن پہلوان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔''

''کیوں؟ اس کی کیا رشتے داری ہے اس سے؟''

''بتایا تو تھا کہ وہ سلیم کا منگیتر ہے۔ پہلوان کا ہونے والا داماد اور میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ وہ پہلوان کا بھتیجا بھی ہے اس کے سگے بھائی کا بیٹا ہے وہ۔ لہٰذا پہلوان سے زیادہ بہتر اس کے متعلق اور کون جانتا ہوگا۔''

نجمی کو خشمگیں نظروں سے اپنی جانب گھورتا دیکھ کر ہم نے پوچھ لیا۔

''ایسے کیا گھور رہے ہو؟ کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اٹھ کر کسی دیوار میں سر دے ماروں۔''

''تو دل کی مان لو جبر کوئی اچھی چیز تو نہیں۔''

''ساتھ میں تمہارا سر بھی توڑنا چاہتا ہوں۔''

''دوسروں پر جبر کرنا تو اور بھی کمینے پن کی بات ہوئی۔''

''یار! بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ تم جھوٹے نہیں ہو مگر وہ لدھڑ تو جھوٹا ہو سکتا ہے نا اگر وہ سچ میں سلیم کا منگیتر یا پہلوان کا بھتیجا ہوتا تو نوبت یہاں تک آتی ہی نہیں۔ تم نے جب سچ سچ سب کچھ ان لوگوں کو بتا دیا تھا تو پھر ان لوگوں نے تمہاری باتوں پر یقین کیوں نہیں کیا؟ اگر لدھڑ سچ میں ان کا کوئی رشتہ دار ہوتا تو وہ اس سارے معاملے کو اس طرح اچھالنے کے بجائے کسی اور طرح حل کرتے، خود سوچو ذرا، تھوڑا غور کرو کہ اگر لدھڑ پہلوان کا بھتیجا ہے اس کا ہونے والا داماد ہے، تو پھر بھلا وہ سرے سے ہی انجان کیوں بن گئے؟''

''ہاں میں اتنے دن یہی سب سوچتا رہا ہوں، لدھڑ سے کافی دن تک میری چپقلش جاری رہی تھی۔ میں نے اسے بہت قریب اور توجہ سے دیکھا سنا ہے اس لیے یہ بات تو میں پورے یقین اور ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جھوٹا نہیں تھا اور اگر اس نے مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا اس کی ہر بات سچ تھی تو پھر یقینی طور پر قصائی خاندان

کالدھڑ کے وجود سے یوں انجان بن جانا محض ایک ڈھکوسلے کے سوا اور کچھ نہیں ہے' اور ایسا انہوں نے اس لیے کیا ہوگا کہ لدھڑ سے ان کا شناسائی ظاہر کرنا لدھڑ کے حرف بہ حرف سچے ہونے کی گواہی بن جاتا اور ایسی صورت میں اس خاندان کی حقیقی اصلیت کا راز فاش ہوکررہ جاتا جو کہ انہیں قطعی گوارا نہیں ہوگا۔" ہم نے پوری سنجیدگی سے اپنا تجزیہ نجمی کے گوش گزار کردیا۔

"کیسی اصلیت؟ اور کیسا راز؟"

اسی وقت ویٹر آ پہنچا سو ہم نے کچھ کہنے سے گریز برتا' ویٹر آرڈر سرو کر کے لوٹ گیا تو ہم کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"تم کسی راز کی بات کررہے تھے؟" نجمی پھر مستفسر ہوا۔

"ہاں' لدھڑ خاندان اور قصائی خاندان کی اصلیت ہمارے معاشرے میں ایک راز ہے جو فی الوقت صرف مجھ پر آشکار ہوا ہے اور وہ بھی لدھڑ کی وجہ سے۔"

"صاف صاف کہو۔"

"دراصل یہ لوگ ہم میں سے نہیں ہیں۔ یہ دونوں بھائی' یعنی لدھڑ کا باپ اور پھمن پہلوان' یہاں آباد ہونے سے پہلے کابل میں رہائش پذیر تھے۔" ہمارے لہجے کا تذبذب محسوس کرتے ہوئے نجمی نے بغور ہمیں دیکھا۔

"کیا یہی وہ راز ہے؟"

"یہ لوگ کابلی بھی نہیں ہیں۔ اصل میں کابل یہ بس کچھ عرصہ ہی رہے ہیں' اس سے پہلے یہ وادی کوہ قاف کے پہاڑی جنگلات میں رہتے تھے۔"

"تو......!" نجمی نے لقمہ چباتے چباتے بھنویں اچکا کر تیکھی نظروں سے ہمیں گھورا۔

"تو یہی کہ یہ ہم انسانوں میں سے نہیں ہیں۔"

"ہم انسانوں میں سے نہیں ہیں یا سرے سے انسان ہی نہیں ہیں؟" نجمی کے چبھتے ہوئے لہجے پر کسمسا کر رہ گئے۔

"یقین کرنا تھوڑا مشکل ہے مگر ہمارا خیال تو یہی ہے کہ یہ لوگ واقعی انسانی برادری سے تعلق نہیں رکھتے۔"

چند لمحے کی خاموشی اور ٹھہراؤ کے بعد نجمی دوبارہ کھانے کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"میں نے تمہاری کسی نئی کہانی کے متعلق نہیں بلکہ لدھڑ کے متعلق پوچھا تھا۔" اس کا لہجہ گہری سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

"میں بھی تمہیں کوئی کہانی نہیں بلکہ لدھڑ اور اس کے خاندان کی اصلیت کے متعلق بتارہا ہوں۔"

"یعنی تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ لدھڑ اور پھمن پہلوان کوہ قاف کے جنات میں سے ہیں۔"

"میں یہی کہہ رہا ہوں۔"

نجمی نوالہ لیتے لیتے رک گیا۔ اس کی بے یقین نظریں یقیناً ہمارے چہرے پر یہ ٹٹولنے کی کوشش کررہی تھیں کہ کہیں ہم سنجیدگی سے اسے بے وقوف تو نہیں بنارہے۔ کوئی مذاق تو نہیں کررہے۔ ہم سمجھ رہے تھے' اس کی ذہنی حالت کا ہمیں اندازہ تھا' جو ہم نے کہا تھا اسے کوئی بھی آسانی سے ہضم نہیں کرسکتا تھا۔ خود ہم ابھی تک رہ رہ کر الجھن اور بے یقینی کا شکار ہوجاتے تھے' لیکن پھر گزشتہ دنوں کی بہت سی ایسی باتیں' چھوٹے چھوٹے ایسے واقعات ہمیں یاد آجاتے جن کی کوئی بھی عقلی توجیہہ کرنے سے ہمارا ذہن قاصر رہتا تو ہم یہ مان لینے پر ہی اطمینان محسوس کرتے کہ ہو نہ ہو لدھڑ کچھ نہ کچھ جناتی تو تھا۔

"کھانا کھالو پھر ڈاکٹر داور کی طرف چلتے ہیں۔" کافی دیر کی خاموشی کے بعد نجمی نے گھمبیر لہجے میں کہا تھا۔

"کیوں؟"

"تمہارے مینٹلی چیک اپ کے لیے۔ یقینی طور پر تمہارا دماغی توازن کچھ متاثر ہے۔"

"میرا دماغی توازن بالکل درست ہے اور مجھے اس کا پورا ادراک ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں' کسی کی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے' اتنی عجیب لگے کہ تمہیں اس پر یقین نہ آسکے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس پر فوراً جہالت یا پاگل پن کا فتویٰ لگادیا جائے۔ تم نے آج

تک جنات کے متعلق صرف پڑھایا سنا ہوگا مگر میں مشاہدہ اور تجربہ رکھتا ہوں اور اسی بنا پر میں پورے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے لوگوں کی طرح تمہاری معلومات بھی ناقص ہیں۔ جنات کے متعلق تمہارے جو خیالات اور تصورات ہیں انہوں نے ایسے مفروضات سے جنم لیا ہے جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں' اسی لیے تمہیں لگتا ہے کہ میرا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔'' ہمیں لدھڑ کے دلائل یاد آ گئے تھے۔

''یعنی تمہارے تجربے اور مشاہدے کی رو سے انسان اور جنات میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ دونوں ایک سے ہیں۔''

''ہاں' تقریباً خصوصاً جب یہ لوگ انسانی معاشرے میں رہ رہے ہوں تب انہیں انسانوں سے علیحدہ شناخت کرنا صرف صاحب نظر ہستیوں ہی کا کمال ہوسکتا ہے۔ ہم جیسے کور چشم انسانوں کا نہیں۔ کیونکہ ہمارے درمیان رہتے ہوئے انہیں اپنی جناتی طاقتوں کو استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی انسان پر اپنی اصلیت ظاہر کرنے کی۔ خلاف ورزی کرنے والے کو غدار اور باغی تصور کرتے ہوئے ہمیشہ کے لیے عالمی جن برادری سے علیحدہ کردینا سب سے معمولی سزا کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے بعد بھی اس پر نظر رکھی جاتی ہے کہ کہیں وہ برادری کے مفادات کے لیے نقصان اور بدنامی کا باعث نہ بنے۔ ایسی صورت میں مجرم کو موت یا تازندگی کے لیے زنداں کی سزا دے دی جاتی ہے۔''

شاید ہم نجمی کو قائل کرنا چاہتے تھے اور وہ تھا کہ ہمیں عجیب متفکر اور الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کھانا ہم کھا چکے تھے اسی دوران ویٹر آ کر برتن سمیٹ کر لے گیا تھا اور نجمی نے اسے چائے کا بھی کہہ دیا تھا۔

''لدھڑ کے ساتھ تمہارا کتنے دن واسطہ رہا ہے؟''

''کافی دن' وہ آتا جاتا رہا۔ ہمارے درمیان بحث مباحثہ بھی ہوا اور خاصی تلخی بھی۔ پہلے پہل تو ہمیں بھی وہ ایک جن کے طور پر ہضم نہیں ہوسکا تھا' پھر آہستہ آہستہ ہمیں یقین کرنا پڑا کہ بظاہر ایک عام اور احمق سا انسان نظر آنے کے باوجود اس میں کچھ نہ کچھ غیر معمولی ضرور ہے۔''

''مثلاً کیا؟''

ہم نے نجمی کو پوری توجہ اور سنجیدگی سے اپنی طرف دیکھتے پایا تو شروع سے آخر تک تمام واقعات پوری تفصیل اور جزئیات سمیت اس کے گوش گزار کردیے۔ پہلے خط سے لدھڑ کی آمد تک اختلاف' تلخی' مرغیوں' بطخوں کی پراسرار موت' اپنے نقصانات اور لدھڑ کا پل پل کے متعلق باخبر ہونا۔ چھنو' دھنو اور رجو کے پراسرار تیور' لدھڑ کی انگوٹھیوں والی پیشکش' ہمارا باہمی اتفاق اور پھر پہلوان کے گھر میں داخلے تک کی تمام تفصیل۔

اس دوران ویٹر چائے سرو کرگیا تھا اور نجمی چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے مکمل توجہ اور سنجیدگی سے ہماری یہ داستان سن رہا تھا۔

تمام واقعات سننے کے بعد بھی اس پر وہی سنجیدگی طاری رہی۔ اس نے کوئی اختلاف کیا نہ اتفاق' بس سرسری سے انداز میں صرف اتنا کہا کہ ''ٹھیک ہے' دیکھتے ہیں' تمہیں لدھڑ کے متعلق کوئی جانکاری ملے تو فوراً مجھے اطلاع کرنا۔'' اس کے بعد اس نے بل ادا کیا اور ہمیں بائیک پر بٹھا کر ہمارے دولت خانے والی گلی کے سامنے لا اتارا۔ جانے سے پہلے اس نے جیب سے چابیاں نکال کر ہمیں تھمادیں۔

''دونوں کمروں کو میں نے تالا لگادیا تھا۔ بیرونی دروازے کی چابی چاچا نذیر کے پاس ہے۔ جانوروں کے چارے وغیرہ کی ذمہ داری انہوں نے قبول کرلی تھی اس لیے میں کسی وقت چکر لگاؤں گا۔''

اس کے بعد وہ روانہ ہوگیا اور ہم اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ بیرونی دروازہ ہمیں کھلا ملا اور چاچا نذیر کو ہم نے رجو کا دودھ دوہنے میں مصروف پایا۔ ہمارے صحن میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے رجو کی نظر ہم پر پڑی اور وہ فرط مسرت سے چہک اٹھی۔

''بختے! میرے بچے۔'' مارے خوشی کے جو اس نے اپنی دم گھمائی تو چاچا نذیر اپنی کنپٹی پر ہاتھ رکھتا ہوا ایک طرف

ہٹ گیا۔ چھنو اور دھنو بھی بے قرار ہوا تھی تھیں۔ اپنی تینوں سہیلیوں کی دیکھ ریکھ کے سلسلے میں ہم نے چاچا کا شکریہ ادا کیا تو وہ پہلوان کیس کے متعلق ہمیں ٹٹولنے کی کوشش میں لگ گیا مگر ہم نے سیدھا موڈ نہیں دیا اور دودھ والا برتن تھما کر اسے کر چلتا کر دیا۔ بیرونی دروازے کی زنجیر چڑھانے کے بعد ہم اپنی سہیلیوں کی طرف لوٹ آئے۔ دیر تک ہم چاروں آپس میں حال احوال کرتے رہے۔ گپیں ہانکتیں رہے، ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کئی سال بعد اپنے گھر اپنے غمخواروں کے درمیان لوٹ کر آئے ہوں۔

کمروں کے تالے کھولنے کے بعد ہم نے جھاڑ پونچھ کی، اپنی رائٹنگ ٹیبل سجائی اور رات دیر تک مسہری پر لیٹے مختلف النوع سوچوں اور خیالوں سے الجھتے رہے، پھر نجانے رات کے کس پہر ہمیں نیند نے آلیا۔

دوسرے روز سہ پہر کے وقت نجمی آ کر ہمیں اپنے ساتھ ایک تصویری نمائش میں لے گیا۔ پہلے تو ہم نے یہی خیال کیا تھا کہ ایسا اس نے صرف تفریح کی غرض سے کیا ہے لیکن جب وہاں اتفاقیہ طور پر ڈاکٹر داور سے ملاقات ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے بھی دیرینہ دوستوں کے سے انداز میں ہمارے ساتھ گپ شپ شروع کی تو تب ہمیں نجمی کی کمینگی کا اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ہمارے ماضی اور حال کے متعلق دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری مصروفیات اور ہمارے خیالات کے متعلق سوالات کرتے رہے۔ ہماری پسند ناپسند، گزشتہ زندگی کے تجربات اور آئندہ کے پروگرام ہم بھی مجبوراً خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ البتہ واپسی پر نجمی کو ہم نے خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ہم کتنے خوش اخلاق واقع ہوئے ہیں۔

اس روز ہم نے غصے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ نجمی کی شکل تک نہیں دیکھیں گے اور نجمی سے بھی ہم نے کہہ دیا تھا کہ وہ ہم پر مزید کوئی احسان کرنے کی کوشش نہیں کرے لیکن اسی رات ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ دوسرے روز ہم ازخود نجمی کے پاس اس کے آفس جا پہنچے۔ ہوا یوں کہ نمائش سے واپس گھر ہم مغرب سے کچھ پہلے ہی پہنچے تھے۔ نجمی ہمیں گلی کے سامنے اتارتے ہی روانہ ہو گیا تھا ہم نے گھر آ کر چائے بنائی اور کپ اٹھا کر باہر صحن میں اپنی سہیلیوں کے پاس آ کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اپنے عقب میں کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے جب ہم نے پلٹ کر دیکھا تو چونک پڑے۔ ایک ہی لمحے میں ہماری گزشتہ دنوں کی تمام اذیتیں یکبارگی جیسے تازہ ہو گئیں۔

''تم......!'' بے اختیار ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ لدھڑ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی شیروانی آج سلوٹوں سے پر تھی۔ سر سے ٹوپی غائب تھی، بال بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی دن سے اس نے منہ بھی نہ دھویا ہو۔

''اب کس لیے آئے ہو؟'' ہم نے اپنے لہجے کے غصیلے تاثر پر قابو پانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''ہم تم سے نہایت شرمندہ ہیں بلند بخت۔'' اس نے گویا ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ تکلیفوں کے ساتھ ساتھ جیسے ہمارے اندر گزرے دنوں کی ساری ذلت کا احساس بھی ایک دم جاگ اٹھا۔

''کوئی ضرورت نہیں شرمندہ ہونے کی۔ شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے جو میں تمہاری باتوں میں آ کر پہلوان کے گھر میں جا گھسا، جھوٹے، مکار۔''

''نہیں بلند بخت! ایسا مت کہو ہم جھوٹے نہیں ہیں۔ ہم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تم سے۔''

اس کے جواب پر ہمارا پارہ اور چڑھ گیا اور ہم نے چائے کا کپ زمین پر دے مارا۔

''تم نے جھوٹ نہیں بولا۔ گڑبڑ کی صورت میں ساری ذمہ داری کس نے قبول کی تھی۔ ہمارے سر تو صرف سلیم تک وضاحت پہنچانا تھا، بگاڑ تو تم نے سنبھالنا تھا، تمہارے چچا کا گھر تھا، مسئلے کی صورت میں گھر کا معاملہ گھر میں ہی حل ہونا تھا اور مصیبت کے وقت ہمیں موت کے منہ میں اکیلا چھوڑ کر خود کتنی آسانی سے فرار ہو گئے تم۔ پلٹ کر دیکھا تک نہیں، تمہارے چچیروں نے کتے سے

بدتر حالت بنادی تھی ہماری۔ ہم نے قسمیں اٹھا اٹھا کرانہیں بتایا کہ تمہارا چچازاد تایازاد لے کرآیا ہے ہمیں' مگر کون تایا اور کہاں کا تایا زاد' اور تم کہتے ہو کہ تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھانے کی مہمان نوازی اور چھتروں کے بعد پندرہ دن ہم جیل میں بھی گزار آئے ہیں یہ سب تمہارے سچ ہی کی بدولت تو ہوا ہے' کمینے کہیں کے۔"

"تمہاری خفگی اور آزردگی حق بجانب ہے' مگر بخدا! ہمیں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ چچا حضور نے گھر میں کتے بھی رکھ لیے ہیں وگرنہ ہم قطعی تمہیں لے کر یوں گھر میں داخل نہ ہوئے ہوتے۔ کیونکہ کتوں سے ہمیں بے انتہا خوف آتا ہے۔ یہ کم بخت جب کسی کو کاٹنے کا ارادہ کرتے ہیں تو کچھ بھی سنتے مانتے ن ہیں اور اکثر اوقات تو یہ بھی دیکھنے سننے میں آیا ہے کہ کتے کا شکار بننے والا خود بھی تھوڑا کتا کتا سا ہو جاتا ہے' بس اسی باعث ہم نے اس وقت فرار ہونے میں ہی عافیت جانی تھی۔"

"بند کرو اپنی یہ بکواس اور سچ بتاؤ کہ تمہاری اصلیت کیا ہے؟ تمہارا اصل مقصد کیا تھا؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟"

"ہماری اصلیت اور مقصد تم جانتے ہو وہی سچ ہے جو ہم نے پہلے تمہیں بتایا تھا۔ سلیم اور بس سلیم! ہماری محبت' ہماری زندگی' ہمارا سکھ' سکون اور ہماری ہر خوشی' ہماری چاہت' اطاعت وہ راحت جاں' وہ دل ربا' وہ زہرہ جمال' پری پیکر' غنچہ دہن' شیریں سخن۔"

لدھڑ کی آنکھیں خوابناک ہوتی چلی گئیں۔ چہرہ جیسے جگمگا اٹھا' لہجے میں شیرینی سی گھل آئی۔ نجانے اس کی یہ بکواس کتنی طوالت اختیار کرتی کہ ہم نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اسے جھڑک دیا۔

"چپ..... چپ کرو بے شرم بے حیا' کسی کی بہن بیٹی کا یوں تذکرہ کرتے ہوئے تمہیں غیرت نہیں آتی۔"

"وہ ہماری محبت بھی ہے۔"

"تو پھر اپنی محبت اور محبت کے باپ بھائیوں کے سامنے جاکر یہ قصیدے پڑھو۔ میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو؟"

"یہ اب ممکن نہیں رہا' سب کچھ ختم ہو چکا' بلند بخت! سب کچھ۔" لدھڑ نے درد و غم سے چور لہجے میں کہا۔

"گزشتہ بیس بائیس دن تم نے بہت عذاب ناک حالت میں گزارے ہوں گے' لیکن تم اندازہ بھی نہیں کرسکتے کہ یہ روز و شب خود ہمارے لیے کتنے تباہ کن رہے ہیں۔ کرب واذیت کے کتنے طوفان ہمارا پوچھ گزرے ہیں۔"

اس رات اگر ہم خاموشی اور رازداری سے سلیم تک رسائی حاصل کر لیتے تو آج صورت حال مختلف ہوتی۔ خدا ان کتوں کو غارت کرے جنہوں نے سارا معاملہ ہی بگاڑ کر رکھ ڈالا۔ بات قبلہ والد بزرگوار کے ساتھ ساتھ برادری کے اور بھی بہت سے افراد کے علم میں آ گئی تھی۔ جرگے اور پنچایتیں بیٹھ گئیں۔ چچا حضور نے رشتہ توڑ دیا اور ہمیں جناتی قانون کے مطابق غدار قرار دے کر عالمی جناتی برادری سے علیحدہ کردیا گیا۔ ہمارے پاس اب سر چھپانے کا ٹھکانہ تک نہیں ہے لیکن اس سے بھی بڑی اذیت کی بات یہ ہے کہ کل سلیم کا نکاح ہے اور نکاح سے بھی بڑھ کر کرب ودکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے متعلق سلیم کی بدگمانی اب بھی جوں کی توں برقرار ہے۔ وہ اب بھی ہمیں فریبی اور بدکردار تصور کرتی ہے۔"

لدھڑ کے تازہ حالات وواقعات سے آگاہی پاتے ہی ہم نے ایک گونا گوں قلبی تسکین محسوس کی کہ چلو اگر ہم رسوا ہوئے ہیں تو کچھ ذلالت اس کا بھی مقدر ہوئی۔

"قسمت بانصیب! تمہارے مقدر میں یہی لکھا ہوگا۔ صبر کرو' صبر۔"

"نہیں بلند بخت! ہمارے مقدر کو دوش نہ دو' مقدر کو کوشش سے سنوارا جاسکتا ہے' سلیم اگر ہماری زندگی کا حصہ نہیں بھی بن سکتی تو کم از کم کوشش کر کے اس کی غلط فہمی تو دور کی جاسکتی ہے نا' اس کا دل تو صاف کیا جاسکتا ہے نا۔"

"تمہارا جو دل کرتا ہے کرتے پھرو۔ میری جان چھوڑو۔" ہم نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بے زاری سے کہا اور پلٹ کر کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

"بلند بخت! ہم بہت امید لے کر تمہارے پاس آئے ہیں۔"

ہماری کمر پر جیسے اس نے کوڑا رسید کر دیا تھا۔ ہم نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا..... کیا بکا ہے تم نے؟"

"دیکھو بلند بخت! ہمیں اندازہ ہے کہ تم نے پہلے ہی بڑی مصیبت کاٹی ہے۔ لیکن تم یہ بھی تو دیکھو کہ خود ہم کس حال کو پہنچ آئے ہیں۔ ہم تو بالکل ہی تباہ برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارا تو کچھ بھی نہیں بچا' ہماری محبت' ہماری سلیم بھی ہماری نہیں رہی پھر بھی ہم کسی نہ کسی طرح جی لیں گے لیکن اگر وہ ہمارے خالص اور پاکیزہ جذبوں کو محض ایک فریب سمجھتی رہے' ہمیں دغاباز اور بدکردار سمجھ کر ہم سے نفرت کرتی رہے تو یہ ہم کیسے برداشت کر پائیں گے۔ ایسی صورت میں کیسے جی پائیں گے ہم' نہیں بلند بخت! نہیں' یہ ہم سے برداشت نہ ہوگا۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ سلیم کی یہ بدگمانی اور نفرت ہماری جان لے لے گی۔ ہم جی نہیں پائیں گے' بلند بخت! نہیں جی پائیں گے ہم۔"

لدھڑ کی آواز رندھ گئی تھی۔

"نہیں جی سکتے تو جا کر چلتن کے نیچے سر دے دو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تم بہت کچھ کر سکتے ہو بلکہ صرف ایک تم ہی تو کر سکتے ہو بلند بخت! ہماری آئندہ زندگی کی راہ کے خار تم ہی تو کم کر سکتے ہو' سلیم کی غلط فہمی بس تم۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ہمارا ضبط جواب دے گیا۔

"بند کرو اپنی یہ بکواس اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ بھاڑ میں گئے تم اور تمہاری سلیم۔ مجھے....." سلیم کے بھاڑ میں جانے سے شاید اس عاشق صادق کا ضبط پھٹ پڑا تھا۔

"بس۔" اس کی تیز اور نوکیلی چنگھاڑ سے ہمارا سماعت خانہ جھنجھنا اٹھا۔

"خبردار! اگر اب تم نے اپنی زبان ناپاک سے سلیم کی شان میں ایک لفظ کی بھی گستاخی کی تو ہم تمہاری زبان کو تمہارے حلق سے جڑ سمیت اکھاڑ لیں گے۔"

اس کے اس گستاخانہ طرز تخاطب پر ہماری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ اس بار ہم اسے اینٹ اٹھانے کی مہلت نہیں دینا چاہتے تھے لہٰذا فوراً لپک کر اس کے مقابل جا کھڑے ہوئے۔

"لو کاٹو میری زبان۔"

"تم ہمیں کچھ بھی کہہ لو ہم برداشت کریں گے مگر سلیم کے خلاف ایک لفظ نہیں سنیں گے۔" لدھڑ نے نتھنے پھلاتے ہوئے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"تم چلتے بنو یہاں سے۔ چلو نکلو۔" ہم نے اسے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ دو قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔

"بلند بخت' یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو نہ سہی' تم نکلو شاباش۔" ہم نے اسے دو قدم مزید لڑکھڑا دیا۔

"یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے۔"

"تم نکلو بھی' بڑے دیکھے ہیں تم جیسے نواب میں نے۔"

"پچھتاؤ گے۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم چلتے پھرتے نظر آؤ' ورنہ پچھتانے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔ چلو نکلو باہر۔" ہم نے اسے دھکے مار مار کر گھر سے باہر نکال دیا اور دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔

آج اس کمینے کو یوں نکال باہر کرنے پر ہمیں ایک کمال طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اندر کمرے میں جا کر ہم نے دو گلاس دودھ کے پیئے اور ذہن بٹانے کی غرض سے ایک پرانا میگزین اٹھا کر مسہری پر نیم دراز ہو گئے۔ ایک مکمل ناول پڑھ لینے کے بعد ذہن کی تخلیقی حسیات کافی حد تک بیدار ہو آئی تھیں۔ کچھ دیر کی سوچ و بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی اور لدھڑ کی اسی حقیقی داستان میں کچھ رنگ آمیزی کرتے ہوئے آئندہ ماہ کے میگزین کے لیے ایک کہانی لکھ مارتے ہیں۔

مزید کچھ دیر کے غور و خوض کے بعد ہم نے کاغذ قلم سنبھالا اور اپنی نئی تخلیق کے متعلق کچھ خاص خاص نکات

ترتیب دینے میں مصروف ہوگئے۔ پھر تقریباً ایک پون گھنٹے کی مغز ماری کے بعد ہم ایک زبردست شہکار قسم کی کہانی کا تانا بانا ترتیب دے چکے تھے۔ ہماری مصنفانہ حس ہمیں بتا رہی تھی کہ یہ کہانی ہماری بہترین تحریروں میں سے ایک ہوگی۔

ہم نے پروگرام بنایا کہ رشید خان کے ڈھابے سے کھانا پیک کروالاتے ہیں اور چائے کا تھرموس بھی بھرلیتے ہیں اس کے بعد صبح تک بیٹھ کر لکھتے رہیں گے۔ وقت دیکھا تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ڈھابہ زیادہ دور نہیں تھا اور عام طور پر رات بارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ ہم نے بیرونی دروازے والا تالا اٹھایا۔ صحن والا بلب پہلے ہی سے جل رہا تھا سو ہم پاؤں میں چپل پھنسا کر باہر نکل آئے۔

طائر تخیل کی پھڑپھڑاہٹوں نے ہمیں خاصا بے چین کردیا تھا۔ اس لیے ہم جلد از جلد شب بیداری کا انتظام کرلینے کے بعد کہانی کا آغاز کردینا چاہتے تھے۔

اچانک ہماری چھٹی حس نے ہمیں چونکا دیا۔ تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف اٹھتے ہمارے قدم ایک پریشان کن احساس کے تحت جیسے زمین سے چپک کر رہ گئے تھے۔

ہم نے تیزی سے پلٹ کر صحن کے دوسرے کونے کی طرف دیکھا تو ہمارا دماغ بھک سے رہ گیا۔ پورا صحن خالی اور ویران پڑا تھا۔ چھنو دھنو اور رجو اپنی اپنی جگہ سے یوں غائب تھیں جیسے کبھی رہی ہی نہ ہوں۔ ہم نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا تو اس کی بدستور زنجیر چڑھی ہوئی نظر آئی۔ ہم اپنی جگہ ناچ کر ہی تو رہ گئے تھے۔

صحن کی کچی زمین بالکل ہموار تھی۔ کھونٹے جوں کے توں موجود تھے مگر وہ تینوں اپنی زنجیروں سمیت غائب تھیں۔ ہم نے پریشانی کے عالم میں خالی الذہن کی سی کیفیت میں دوسرے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ صحن کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا مگر وہ تینوں وہ یوں غائب تھیں جیسے اپنی جگہ کھڑی کھڑی ہوا میں تحلیل ہوگئی ہوں۔ زمین میں جذب ہوگئی ہوں یا پھر آسمان کی طرف کہیں پرواز کرگئی ہوں۔

ہم ان کے کھونٹوں کے پاس ششدر سے کھڑے بے یقینی سے باری باری تینوں کھونٹوں کو بولائے ہوؤں کی طرح تک رہے تھے ہماری عقل دانی تھی کہ بس سن ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں لدھڑ کی منحوس آواز سن کر ہم محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً اچھل پڑے۔

''بھول جاؤ انہیں وہ نہیں ملنے کی اب۔''

کمرے کی پیشانی پر لگے بلب کی روشنی صحن کی بائیں دیوار کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے بہت مدھم پڑ جاتی تھی۔ اسی ملگجے اندھیرے میں ہم نے لدھڑ کو دیوار کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''ہم جانتے ہیں کہ نقصان اٹھائے بغیر کوئی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ لہٰذا اس دفعہ اپنی چھنو دھنو اور رجو جی کے اغوا کے نقصان سے سبق سیکھو۔'' لدھڑ صحن میں ٹانگیں لٹکائے دیوار پر بیٹھا کمال اطمینان سے ہمیں نصیحت کررہا تھا۔ ہمارا خون کھول اٹھا۔

''دیکھو لدھڑ! آج سے پہلے تک جو کچھ ہوا وہ ہوگزرا اب کوئی نیا تماشا نہیں چاہیے مجھے۔ چھنو دھنو اور رجو مجھے کس درجہ عزیز ہیں اس کا تمہیں اندازہ نہیں لہٰذا بہتر ہوگا کہ تم انہیں واپس کردو۔'' ہم بات کرتے کرتے اس کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

''تمہیں بھی اندازہ نہیں ہے کہ سلیم ہمیں کس درجہ عزیز ہے۔ سلیم کی رائے ہمارے نزدیک کیا اہمیت رکھتی ہے اس وقت ہمارے متعلق اس کی رائے ہے وہ انتہائی نامناسب اور تکلیف دہ ہے اور اس کی یہ رائے تب تک تبدیل نہیں ہوگی جب تک اس کی غلط فہمی دور نہیں ہوجاتی تم اس کی غلط فہمی دور کردو ہم چھنو دھنو اور رجو جی تمہیں واپس کردیں گے۔''

لدھڑ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''کہاں ہیں وہ تینوں؟'' ہم نے اس کی بکواس کو نظر انداز کردیا۔

''انہیں تو ہم وادی کوہ قاف کے سبزہ زاروں میں چھوڑ آئے ہیں۔ وہ جگہ تینوں ہی کو بہت پسند آئی ہے۔''

ہمیں اس خبیث کی ہٹ دھرمی کا بخوبی اندازہ تھا

سمجھ رہے تھے کہ فی الوقت وہ سلیم کے علاوہ اور کوئی سیدھی بات نہیں کرے گا۔ سیدھا جواب جاننے کے لیے پہلے اسے سیدھا کرنا ضروری تھا۔ ہم نے حساب لگایا کہ اگر ہم دو قدم مزید دیوار کے قریب ہو کر ہاتھ بڑھائیں تو اسے ٹخنوں سے پکڑ کر صحن میں گھسیٹ سکتے ہیں اور پھر ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم نے بھوکے چیتے کی طرح جھپٹ کر اس کے دونوں ٹخنے دبوچے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ایک جھٹکے سے نیچے کھینچ لیا۔ وہ "ارے......ارے" کہتا ہوا دھپ کی آواز سے ہمارے سامنے آ گرا۔ اس کی گھٹی گھٹی دردناک کراہ سے ہم نے اندازہ لگایا کہ جناب کو خاصی شدید چوٹ آئی ہے۔ مگر ہم نے پرواہ کیے بغیر اس کے دائیں کندھے پر پاؤں رکھ دیا۔

"لدھڑ! سچ سچ بتا دو کہ چھنو وغیرہ کہاں ہیں ورنہ آج تمہاری ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دوں گا میں۔"

"ارے تمہارا بیڑہ غرق ہو' پہلے دیکھ تو لو کہ ہماری کوئی ہڈی یا پسلی سلامت بچی بھی ہے کہ نہیں۔" لدھڑ نے اپنے درد بھرے لہجے میں ہمیں گویا ایک معقول مشورے سے نوازا تھا۔

"فضول بکواس نہیں! صرف سوال کا جواب دو کہاں ہیں وہ تینوں؟" ہم نے پاؤں کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔

"بتاتے ہیں' خدا قسم بتاتے ہیں۔ تم پاؤں ہٹاؤ۔ ہمیں ذرا سانس تو لینے دو۔ ہماری شاید کمر کی ہڈی دغا دے گئی ہے۔ اوئے میرے خدا!" ہم نے اس کے کندھے سے پاؤں ہٹایا اور اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر لیا۔

کھڑے ہوتے ہوئے وہ ایک ذرا ڈگمگایا پھر سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں اب بولو؟" ہم نے اسے جھنجوڑتے ہوئے غرا کر پوچھا۔ جواب دینے کی بجائے اس کمینے نے بالکل ہی غیر متوقع طور پر ہمارے منہ پر ٹکر ماری اور ہم لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئے۔ دماغ جھنجھنا کر رہ گیا تھا اور ہماری آنکھوں میں نیلی پیلی پھلجھڑیاں سی گھس آئی تھیں۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ہمارے سینے پر ایک زوردار ضرب پڑی شاید اس نے لات ماری تھی۔ ہمارے قدم اکھڑ گئے اور ہم کمر کے بل جا گرے۔ سانس جیسے اس ضرب سے پھیپھڑوں کے اندر ہی کہیں چپک کر رہ گئی تھی۔

"ہاں اب بولو! سلیم کے پاس چلتے ہو یا مزید تواضع پسند کرو گے؟"

لدھڑ اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکائے تفاخرانہ انداز میں ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ ہم اپنی چوٹوں کو فراموش کرتے ہوئے اٹھے اور وحشیانہ انداز میں لدھڑ پر جھپٹ پڑے۔ مگر وہ ہماری توقع سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ وہ برق رفتاری سے ایک طرف ہٹا' ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ سے ہماری کلائی تھامی اور دوسرا ہاتھ جو ہماری بغل میں گھسیڑ کر جھٹکا دیا تو ہم اچھل کر اس کے عقب میں جا گرے۔ ہمارے کندھے پر خاصی چوٹ آئی تھی مگر اس بار بھی ہم نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔

ہمیں اپنے منہ میں خون کا مخصوص نمکین سا ذائقہ محسوس ہوا جو اس ذلیل کی ٹکر کا نتیجہ تھا۔ ہم نے نفرت سے ایک طرف تھوکا اور آستین سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے دوبارہ اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے بچنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر ہم بھی اس بار پہلے سے زیادہ ہوشیار تھے سو ہم دونوں ایک ساتھ ہی گرے۔ اس کی گردن ہمارے بازو کے شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ لدھڑ نے اسی حالت میں پلٹا کھایا تو ہم بھی اس کے ساتھ ہی دوسری طرف الٹ گئے۔ پھر دائیں پھر بائیں' وہ ہماری گرفت سے نکلنے کے لیے ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہا تھا مگر ہم بھی کسی چیچڑی کی طرح اس سے چمٹ کر رہ گئے تھے۔

"نہیں لدھڑ خان! اب اس شکنجے سے تمہیں ملک الموت ہی آ کر رہائی د......د......" ہمارے جملے کا آخری حصہ بے ساختہ چیخ میں ڈھل گیا۔ اس کتے نے ہمارا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اپنے واہیات دانتوں میں دبا لیا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے کسی موذی نے ہمارے انگوٹھے کی کمر میں زہریلے نشتر اتار دیئے ہوں۔ ہماری کربناک چیخوں سے رات کا سناٹا لرز اٹھا تھا۔ ہماری گرفت از خود ڈھیلی پڑتی چلی گئی

اور وہ جہنمی ہماری گرفت سے نکل گیا۔ ہمارے بازو کے حلقے سے نکلتے ہی اس نے الٹا ہاتھ گھما کر ہماری دائیں کنپٹی پر رسید کیا تو ہم ایک درد بھری کراہ کے ساتھ بائیں طرف الٹ گئے۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہماری کنپٹی پر کسی لوہار نے ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔ ہم نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ پسلیوں میں پڑنے والی زوردار ٹھوکر نے ہمیں دوسری طرف لڑھکنے پر مجبور کر دیا۔

بس پھر اس کے بعد اس کمینے نے ہمیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ کسی فٹ بالر کی طرح پینترے بدل بدل کر اور اچھل اچھل کر ہمیں ٹھوکریں رسید کرتا رہا۔ کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے۔ کبھی دائیں سے کبھی بائیں' حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے حواس ہی مختل ہو کر رہ گئے تھے۔ ہم سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ وہ ہماری کس سمت موجود ہے۔ ہمیں تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ چھ چھ لدھڑ ہمارے وجود کو فٹبال سمجھ کر پریکٹس میں جت گئے ہوں۔ آئندہ کچھ ہی دیر بعد ہم کچے صحن میں ادھ مرے سے پڑے اپنی دردناک کراہوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے اور لدھڑ صاحب ہمارے سرہانے ملک الموت بنے کھڑے تھے۔

''مزاج شریف درست ہوئے یا مزید چھتروں کی گنجائش ہے ابھی؟'' لدھڑ کی زہریلی آواز ہماری سماعت میں زہر گھول گئی۔

''خدا تمہیں غارت کرے تم...... تمہاری...... ٹانگوں میں تمہاری...... پپ...... پیروں میں لمبے لمبے کیڑے پڑیں۔ کس جرم کا بب...... بدلہ لے رہے ہو مجھ سے۔'' ہم نے کراہوں کے ساتھ ساتھ بددعا دیتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''لعنت ہے تم پر۔ ہماری زندگی تہہ وتیغ کر دی تم نے۔ ہم نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ تم خود اس عبرت ناک حالت میں پڑے ہو اور ابھی تک تمہیں اپنے جرم ہی کا پتا نہیں چلا ہم نے منع کیا تھا تمہیں سرزنش کیا تھا تمہیں' اس کے باوجود تم کمینے پن اور اپنی ڈھٹائی سے باز نہیں آئے اور الٹا لدھڑ نامہ جیسی واہیات اور لچر قسم کی کہانی لکھ ڈالی' یہ جرم نہیں تو اور کیا ہے؟ بہرحال اب بھی وقت ہے' ہماری بات مان لو چل کر سلیم کو ساری تفصیل سے آگاہ کر دو۔ اس کی غلط فہمی دور کر دو اور باقی زندگی سکون سے گزارو۔''

لدھڑ بات کرتے کرتے ہمارے قریب ہی پنجوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ ایک بار تو ہمارے جی میں آئی کہ اس کے تھوبڑے پر گھونسہ رسید کر دیں لیکن پھر اپنی حالت زار کے پیش نظر ہم نے اپنے اس جذبے پر لعنت ڈال دی۔

''کیا میں تمہیں...... اس قابل نن...... آہ...... ہائے نظر آتا ہوں کہ چل کر کہیں جا سکوں......''

''تم صرف ہاں بھرو' ہم تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جائیں گے۔'' لدھڑ اٹھ کھڑا ہو گیا تھا' ہم کچھ زہر اگلنا چاہتے تھے کہ وہ پلٹ کر اندرونی جانب بڑھ گیا۔ ہم پیچ وتاب کھا کر رہ گئے اور دل ہی دل میں اسے ڈھیر ساری ناقابل اشاعت قسم کی گالیاں دے ڈالیں کہ یہی ہمارے بس میں تھا۔

وہ خبیث دیکھنے میں مریل اور مریض نظر آتا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ دو تھپڑ ماریں گے تو یہ عالم بالا کو روانہ ہو جائے گا مگر آج کا تجربہ ہماری ساری خوش فہمیوں کو مٹی چٹا گیا تھا۔

ہمارا پورا وجود اپنی زبوں حالی پر نوحہ کناں تھا۔ جگہ جگہ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دانتوں اور جبڑے میں بھی شدید تکلیف شروع ہو چکی تھی۔ ان لمحوں میں ہمیں تجمی کا خیال آیا تو اسے بھی ہم نے جی بھر کر گالیوں اور بددعاؤں سے نوازا دیا کہ اس نے ہمیں کہانیاں لکھنے پر اکسایا تھا۔ ایک طرح سے اس ساری خرابی کا انتظام کروانے والا وہی خنزیر تھا۔

ہم اسی جگہ پڑے کراہ وکڑھ رہے تھے کہ لدھڑ ایک گلاس اٹھائے ہمارے قریب آ بیٹھا۔

''یہ لو نیم گرم دودھ پیو' تمہاری حالت سنبھل جائے گی۔''

ہم نے نفرت انگیز نظروں سے اسے گھورا مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے نرم اور ناصحانہ انداز میں بولا۔

''ہلدی ڈال کر لائے ہیں' تمہارے لیے' بہت فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ پی لو۔''

اس نے ہمیں سہارا دیا اور ہم نے بہتر خیال کرتے ہوئے گھونٹ گھونٹ کر کے گلاس خالی کر دیا۔ حالانکہ ہمارا دل کچھ اور چاہ رہا تھا۔

دودھ کے بعد وہ خبیث ہمیں سہارا دے کر اندر لے گیا اور ہمیں مسہری پر لٹا کر گردن تک لحاف اوڑھانے کے بعد خود نہایت اطمینان سے ہماری پائنتی ہی بیٹھ گیا۔

''دیکھنا ابھی کچھ ہی دیر میں تمہارے درد میں افاقہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر ہم سلیم کی طرف چلیں گے۔''

اس کتے' کمینے اور ذلیل کو بدستور سلیم کی پڑی ہوئی تھی۔

''مجھ سے بالکل بھی ایسی ..... توقع مت رکھنا.....''

ہم نے زہر خند سے کہا۔

''کل سلیم کی شادی ہے' وہ رخصت ہوگئی تو پھر اس تک رسائی حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ یعنی ہمارے پاس صرف صبح تک کا وقت ہے' اس لیے آج رات تمہیں ہر صورت سلیم تک پہنچنا ہے۔ وہ تمام مصنف حضرات کی حد درجہ عزت کرتی ہے۔ انہیں آئیڈیالائز کرتی ہے لہٰذا وہ تمہاری بات توجہ سے سنے گی اور لازماً تمہارے کہے پر یقین بھی کرے گی اس کے بعد ہمیں.....''

لدھڑ اپنی ہانکے جا رہا تھا۔ ہم نے چڑھ کر اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''کیا تم پاگل ہو چکے ہو؟ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے ایسی کوئی توقع مت رکھنا۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گا چاہے تم مجھے جان سے مار ڈالو' مگر میں تمہاری یہ حسرت ہرگز پوری نہیں کروں گا۔ سمجھے تم۔''

لدھڑ چند لمحے سنجیدگی سے ہمیں دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی تو ہم تمہاری زندگی کو جہنم بنا دیں گے۔ تم زندگی کو بھی ترسو گے اور موت کو بھی' مرنا چاہو گے تو ہم تمہیں تمہاری موت سے پہلے مرنے بھی نہیں دیں گے۔ نہ جی سکو گے نہ مر سکو گے' آگے تمہاری اپنی مرضی۔''

''بہتر ہوگا کہ تم مجھے جان سے مار ڈالو ورنہ اگر میرا داؤ چل گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ہماری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ایسی صورت میں ہم پیشگی تمہیں اپنا خون معاف کرتے ہیں۔''

لدھڑ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور ہم دانت پیس کر رہ گئے۔ وقت گزرتا گیا اور لدھڑ کی وحشتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ کبھی اندر آتا' کبھی باہر نکل جاتا' بار بار ہمیں سلیم کی طرف جانے پر اکساتا' کبھی دھمکیاں دے کر اور کبھی نرمی سے لالچ دے دے کر۔ پھر کمرے میں ٹہلنے لگ جاتا۔ ہماری چوٹوں کے درد میں کچھ افاقہ ہوا تو دوبارہ ہمارے درمیان پھر سے ہاتھا پائی ہوئی اور ہمارے دردوں چوٹوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

لدھڑ جھنجلاتا رہا' اول فول بکتا رہا' اور ہمیں آئندہ کی اذیت ناک زندگی کے حوالے دے دے کر ہراساں کرنے کی سعی کرتا رہا۔ مگر ہم بھی اپنی ضد پر قائم رہے۔ ہمارے اختیار میں اس سے انتقام کا یہی ایک طریقہ تھا۔ رات کے آخری پہر اس کی وحشت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس کی بے چینی' اذیت' بے بسی اور حواس باختگی کو دیکھتے ہوئے خود ہمیں بھی ہول اٹھنے لگے تھے۔ ہمیں اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ یہ کم بخت کہیں اس حالت جنون میں ہمیں قتل ہی نہ کر ڈالے' ساتھ ہی اس کی ایسی قابل رحم حالت دیکھ کر ہم اپنے زخموں میں ٹھنڈک سی بھی اترتی محسوس کر رہے تھے۔

جس وقت محلے کی مسجد سے موذن کی آواز بلند ہوئی لدھڑ اس وقت انتہائی مضطربانہ انداز میں کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔ موذن کی آواز سنتے ہی وہ یک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔

چہرے کی رنگت بالکل سفید پڑ چکی تھی۔ یوں جیسے اس پر موت وارد ہوگئی ہو۔

ہم بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ یوں ساکت کھڑا تھا جیسے یکایک پتھر کا ہو کر رہ گیا ہو۔ اذان کے ساتھ ساتھ ہی اس کے تاثرات نرم پڑتے چلے گئے' اس کا اضطراب اور تناؤ کم ہوتا چلا گیا۔ اذان ختم ہوئی تو وہ دیوار کا سہارا لے کر کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے زمین ہی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت کسی ایسے جواری جیسی ہوگئی تھی جو اپنی کل متاع' تمام جمع پونجی کے ساتھ ساتھ اپنی سانسیں تک ہار گیا ہو اور اسے یقین ہو کہ بس اب ملک الموت پہنچا کہ پہنچا' اس نے دونوں ٹانگیں زمین پر پھیلا دی تھیں۔ کمر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور اس کا سر آہستہ آہستہ یوں جھک گیا تھا کہ اس کی تھوڑی اس کے سینے سے جا لگی تھی۔

باہر کا اندھیرا اجالے میں ڈھلتا چلا گیا۔ چڑیوں اور پرندوں کی چہکاریں سنائی دینے لگیں' وقفے وقفے سے گاڑیوں کے انجن اور ہارن بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ زندگی حرکت میں آ چکی تھی۔ ہم مسہری پر نیم دراز سی حالت میں پڑے لدھڑ کا جائزہ لے رہے تھے وہ جوں کا توں بیٹھا تھا' جیسے بیٹھے بیٹھے ہی اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی ہو اور اب اس کا بے جان وجود بس دیوار کے سہارے پڑا ہو۔

سورج طلوع ہوا' باہر اچھی خاصی دھوپ پھیل گئی تو ہمیں لدھڑ کی اس ساکن حالت سے اختلاج قلب محسوس ہونے لگا۔

"چلو بس کرو اب کب تک یونہی بیٹھے رہو گے؟" ہم نے اسے مخاطب کیا مگر اس نے تو جیسے سنا ہی نہیں۔ چند لمحے کے توقف کے بعد ہم نے دوبارہ کہا۔

"زندہ بھی ہو یا موت پڑ گئی ہے تمہیں؟" اس بار بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ہم نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔ "اچھا چلو اٹھو سلیم کی طرف چلتے ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

یہ الفاظ اس کے پتھرائے ہوئے وجود میں جیسے حرکت پھونک گئے۔ اس نے رعشہ کے مریض کی طرح لرزتے ہوئے سر کو اٹھا کر ہماری طرف دیکھا' اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور چہرے پر شدید کرب کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

"اچھا تو ابھی زندہ ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب تمہارے کفن دفن کا سیاپا بھی مجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔"

وہ جواب میں کچھ کہے بغیر چند لمحے یتیموں کی طرح ہماری صورت تکتا رہا پھر سر کو پیچھے دیوار کے ساتھ ٹکا کر چھت کو تکنے لگا۔

"رات گزر چکی دن نکل آیا ہے۔ تم بھی نکلو اور اپنے چچا حضور کے ہاں پہنچو شادی والا گھر ہے' سو کام ہوتے ہیں۔ ہاتھ بٹانا ان لوگوں کا۔" ہم آہستہ سے سیدھے ہو بیٹھے۔ لدھڑ خاموش رہا۔

"اب کس لیے یہاں دھرنا دیئے بیٹھے ہو۔ اٹھ کر جاتے کیوں نہیں؟"

"کہاں جائیں؟" لدھڑ کی مردہ سی آواز سنائی دی۔

"جہنم میں..... اپنے باپ کے پاس جاؤ یا اپنی سلیم کے پاس جاؤ' جہاں مرضی جاؤ لیکن یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"ان میں سے کسی کے پاس ہم کیسے جاسکتے ہیں۔ ہمیں تو بے دخل کیا جا چکا ہے۔ سب قطع تعلق کر چکے ہیں ہم سے۔"

"تو جدھر مرضی جاؤ یہاں سے بہر حال نکلو اب۔"

"ہمارے پاس رہنے کو سر چھپانے کو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"تو پھر.....؟"

"پھر یہی کہ اب ہم یہیں رہیں گے۔ تمہارے ساتھ..... ہمیشہ..... تا زندگی۔"

"کیا..... تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھنے لگا۔ میں تمہیں ایک منٹ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔"

"جب ہم رہنے کا فیصلہ کرچکے ہیں تو تمہارے رکھنے نہ رکھنے کا کیا سوال اور اب تو عمر بھر تمہیں بس برداشت ہی کرتے رہنا ہے اور بس۔"

لدھڑ نے گردن سیدھی کرتے ہوئے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھورا۔

"واہ یعنی زبردستی بدمعاشی ہے؟"

"جو مرضی سمجھو۔"

"میں کہتا ہوں کہ شرافت کے ساتھ دفعان ہو جاؤ ورنہ ......"

"بکواس بند کرو۔" لدھڑ نے تیز لہجے میں ہماری بات کاٹ دی۔ "ذرا تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کرو۔ سلیم کی وجہ سے ہم تمہاری بہت بکواس برداشت کرتے رہے ہیں مگر اب وہ مجبوری ختم ہوئی۔ اب اگر تم نے ایک لفظ کی بدتمیزی بھی کی تو ہم ابھی اٹھ کر تمہارے دونوں ہاتھ توڑ ڈالیں گے۔ کھانے سے بھی جاؤ گے اور دھونے سے بھی۔" لدھڑ نے خونخوار لہجے میں کہا تو ہم ہونٹ بھینچ کر رہ گئے۔ جسمانی طور پر ہم پہلے ہی کچھ اچھی حالت میں نہیں تھے اور لدھڑ کے تیور بتا رہے تھے کہ اس نے جو کہا ہے خلوص دل کے ساتھ کہا ہے۔

"تم کہیں اور جا کر بھی تو رہ سکتے ہو یہیں کیوں؟" ہم نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کسی اور کے اتنے احسانات نہیں ہیں ہم پر۔ عمر بھر تمہاری مہربانیوں کا بوجھ اٹھانا تو اب ہمارا مقدر ہو چکا ہے مسٹر آفاق بزمی۔"

لدھڑ نے طنز بھرے لہجے میں کہا اور اٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگا۔

"اب ذرا مسہری بھی خالی کردو۔ ہم کمر سیدھی کرنا چاہتے ہیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اس کے حکم پر عمل کرنا پڑا۔ ہمارے خیال میں عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ فی الوقت ضبط و تحمل سے کام لیا جائے۔ ہم اپنا شکستہ وجود اور جسمانی قوت مجتمع کرتے ہوئے اٹھے تو وہ ہماری مسہری کو اپنے باپ کی ملکیت سمجھتا ہوا اس پر پھیل گیا۔

"اب کھڑے ہماری صورت کیا تک رہے ہو؟ کوئی صفائی ستھرائی کرلو اور کچھ ناشتے پانی کا انتظام بھی کرلو۔ جاؤ شکل گم کرو۔"

اس نے دونوں ہاتھ اپنی گردن کے نیچے رکھتے ہوئے ہمیں یوں حکم دیا جیسے ہم اس کے زرخرید غلام ہوں ہم نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا تھا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ لہٰذا ہم خاموشی سے سر جھکا کر صحن میں نکل آئے۔ مگر صحن میں رکے نہیں بلکہ لنگڑاتے ہوئے دبے قدموں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ بے آواز انداز میں ہم نے دروازے کی زنجیر ہٹائی اور باہر نکل آئے۔ دن اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ نجمی سے ہم اس کے آفس میں ہی مل سکتے تھے سو ہم اس کے آفس کی طرف روانہ ہو لیے جب ہم اس کے سامنے پہنچے تو ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک پڑا۔

"ارے بلند بخت! یہ تمہاری حالت کیسی ہو رہی ہے کیا ہوا؟"

اس نے ہمیں جلدی سے بٹھایا پانی پلایا اور ہم نے کل شام سے لے کر اب تک کا سارا ماجرا کہہ سنایا اور ساتھ ہی اپنے آنے کا مقصد بھی بیان کردیا کہ ہم لدھڑ کے خلاف ڈکیتی اور ارادہ قتل کی ایف آئی آر درج کرانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

ہماری ساری بات پوری توجہ اور انہماک سے سننے کے بعد وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو تم؟" اس کا مراقبہ طویل ہوتا دیکھ کر ہم سے چپ نہیں رہا گیا۔

"تم نے بتایا ہے نا کہ لدھڑ تمہارے گھر ہی میں موجود ہے؟"

"ہاں! اس کا وہاں سے ٹلنے کا بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔"

"دیکھو بلند بخت! اگر ہم تھانے میں ایف آئی آر درج کروا کر پولیس کو ساتھ لے کر تمہارے گھر پہنچتے ہیں تو

پولیس والے اسے گاڑی میں ڈال کر لے جائیں گے پھر وہ جانیں اور لدھڑ جانے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے ایک دو دوست پولیس میں ہیں اگر ان میں سے کسی کو ہم ساتھ لے کر لدھڑ کے سر پر جا پہنچیں تو پہلے خود ذاتی طور پر تمہاری اس حالت کا حساب کتاب برابر کریں گے اور پھر اس پولیس ملازم دوست ہی کے ذریعے اسے تھانے پہنچادیں گے۔ وہاں پھر پولیس والے اس کی الگ سے سیوا کریں گے تو اس کا دماغ پوری طرح ٹھکانے آجائے گا۔ ساری زندگی یاد رکھے گا وہ۔"

نجمی کی بات سن کر ہمیں اپنی آپ بیتی یاد آ گئی کہ کس طرح پہلے قصائی خاندان نے ہماری درگت بنائی تھی اور اس کے بعد پولیس والوں نے کیسے اپنی مہربانیوں کی تلافی کی تھی۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ میں بھی کھل کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں گا پھر۔"

"ہاں بالکل! میں ابھی پتا کرتا ہوں دلاور خان کا۔" نجمی نے جلدی سے کہا اور پھر فون پر کسی سے رابطہ کرنے لگ گیا اور ہم چائے کی طرف متوجہ ہوگئے جو کچھ ہی دیر پہلے چپڑاسی رکھ کر گیا تھا۔

دوسری طرف رابطہ ہوجانے کے بعد نجمی نے مختصر الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا کہ ایک ڈکیت کا کیس ہے۔ مدعی میرا دوست ہے اور اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مجرم تنہا اور تنہا ہے اور ابھی موقع واردات پر موجود ہے فوری کارروائی چاہیے مگر فرینڈلی۔"

دوسری طرف سے کیا کہا گیا تھا یہ تو ہم نہیں سن سکے البتہ نجمی نے مطمئن سے انداز میں فون بند کیا تو ہمیں اندازہ ہوگیا کہ جواب مثبت ہے۔

"لو بھئی بات ہوگئی تم جلدی سے چائے ختم کرلو۔ دلاور خان بس ابھی پہنچ آئے گا۔"

اور پھر واقعی پانچ منٹ بعد دو جیم شحیم خوفناک سے پولیس ملازم پہنچ آئے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی نجمی انہیں جلدی سے ایک طرف لے گیا اور کچھ کھسر پھسر کرنے لگا' ہمیں اس کا یہ رویہ کچھ عجیب تو لگا تھا مگر ہمیں زیادہ غور و خوض کا وقت نہیں ملا کیوں کہ کچھ ہی دیر میں وہ تینوں ہمارے قریب چلے آئے تھے۔ ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے ان میں سے ایک پولیس والوں کے سے مخصوص انداز میں ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"سر جی! نجیب صاحب نے ہمیں معاملے کے متعلق سمجھادیا ہے۔ آپ اب بالکل بے فکر ہوجائیں۔ اب ہم جانیں اور وہ ڈاکو کا بچہ جانے۔ چلیں کدھر چلنا ہے۔" یقیناً وہی دلاور خان تھا۔ ہم نے رسمی انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر ہم چاروں آفس سے باہر نکل آئے۔ دلاور لوگوں کے پاس اپنی بائیک تھی۔ ہم نجمی کے ساتھ بیٹھ گئے اور دلاور لوگ اپنی بائیک پر ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگے۔

ہمیں پورا یقین تھا کہ ان لوگوں کے جتے دیکھتے ہی لدھڑ کی ہوا خشک ہوجائے گی اور وہ بھاگنے کا رستہ ڈھونڈھے گا مگر اس بار ہم بھی اگلے پچھلے سارے حساب بے باک کر کے ہی دم لیں گے۔

جس وقت ہم گلی میں داخل ہوئے اس وقت ہمارا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں وہ کمینہ ہمیں غائب پاکر متوقع صورت حال کے پیش نظر فرار ہی نہ ہوگیا ہو۔

بائیکس ہم لوگوں نے دروازے کے سامنے گلی میں ہی کھڑی کردیں اور خود اندر داخل ہوگئے۔ نجمی ہمارے برابر چل رہا تھا' جب کہ دلاور اور اس کا ساتھی ہم سے دو قدم پیچھے تھے۔ ہم دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ "یا اللہ لدھڑ اندر کمرے ہی میں موجود ہو۔ ہمارے گھر سے نکل آنے کے بعد وہ مسہری سے اٹھا ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھ لگ گئی ہو اور وہ ابھی تک پڑا سو رہا ہو۔" پھر جب ہم کمرے کے دروازے میں پہنچے تو ہمارا پورا وجود جیسے توانائیوں سے بھر گیا۔ ہماری چوٹوں کا درد جیسے اچانک کہیں غائب ہوگیا تھا۔

وہ بدبخت مسہری پر موجود تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گردن کے نیچے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ یوں اطمینان سے لیٹا ہوا تھا جیسے اپنے باپ کے گھر میں پڑا ہو۔ ہم لپک

کر مسہری کے قریب پہنچ گئے۔

"یہی ہے وہ کمینہ مردود! یہی ہے لدھڑ کا بچہ! وہ جہنمی جن کی اولاد۔"

ہمارے چلانے پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور ہمارے پیچھے کھڑے نجمی اور دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے دو پولیس والوں پر نظر پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"دیکھ لو نجمی! یہی ہے وہ ذلیل فیاض لدھڑ جس کے اکسانے پر میں پھمن پہلوان کے گھر میں داخل ہوا تھا اور رات بھر یہ پھر مجھے مجبور کرتا رہا ہے کہ میں پہلوان کی بیٹی کے سامنے جا کر اس خبیث کے کردار کی صفائی پیش کروں۔ میرے انکار پر اس نے چھنو وغیرہ کو بھی کہیں غائب کر دیا ہے اور مجھے بھی تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔"

ہم خاموش ہوئے تو ہمیں توقع تھی کہ اب نجمی یا دلاور وغیرہ میں سے کوئی اس خنزیر سے کچھ کہے گا مگر وہ تینوں چپ رہے تو ہم نے نجمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچنے لگے؟ یہ صرف دیکھنے میں مریل اور مریض لگتا ہے ہے پورا سور! رات وقفے وقفے سے تین چار بار پیٹا ہے اس نے مجھے۔"

نجمی نے ہمارے چہرے سے نظر ہٹا کر ایک سرسری سی نظر لدھڑ پر ڈالی پھر دلاور اور لوگوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بھی عجیب سوالیہ نظروں سے نجمی کی صورت تک رہے تھے۔ ان تینوں کی خاموشی اور چہروں کے تاثرات سے ہمیں فوراً کسی غیر معمولی گڑبڑ کا احساس ہوا تو ہم چونک پڑے۔

ہم نے لدھڑ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا' نجمی اور دلاور کی طرف دیکھا تو ان کی سنجیدہ نظروں کو اپنی ہی جانب متوجہ پایا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ تم لوگ کیوں بت بن کر کیوں کھڑے ہو؟"

ہمارے سوال کے جواب میں نجمی نے محبت بھرے انداز میں ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بلند بخت آؤ' چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"ڈاکٹر داور کے کلینک چلتے ہیں۔ تم بہت زیادہ اپ سیٹ ہو' کچھ دن وہیں......"

"کیا...... کیا' مطلب کیا ہے تمہارا؟" ہم نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے تیز لہجے میں کہا اور ساتھ ہی ایک نظر لدھڑ پر ڈالی جس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔ ایک وحشت انگیز خیال ہماری دھڑکنوں کو بے ترتیب کر گیا تھا۔

"مطلب تم سمجھ رہے ہو بلند بخت! تمہیں تھوڑے حوصلے اور تحمل سے کام لیتے ہوئے یہ سچائی تسلیم کرنا ہوگی کہ اس کمرے میں ہمارے علاوہ اگر کوئی اور فرد بھی تمہیں دکھائی دے رہا ہے تو وہ محض تمہارا الوژن ہے۔ حقیقت نہیں۔" نجمی کے کہے ہوئے الفاظ گویا الفاظ نہیں ایک ہولناک دھماکا تھا جو ہمارے اندر کہیں ہوا تھا؟ اور کچھ دیر کے لیے ہمارے ہوش وحواس کو مفلوج کر گیا تھا۔ ہم اپنی جگہ حیران وششدر کھڑے اس کی صورت تکتے رہ گئے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ شاید ہمیں وہم ہوا ہے' ہمارے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

ہم نے لدھڑ کی طرف دیکھا وہ اپنے غلیظ ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے دلچسپ نظروں سے ہم ہی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا طنز ہلکورے لے رہا تھا۔ ہم نے بار بار پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا تو اس نے شرارت سے ہمیں آنکھ ماردی۔ وہ موجود تھا' ہم سے محض چند قدم کے فاصلے پر' اپنے وجود کی اٹل اور ٹھوس حقیقت کے ساتھ...... ہمارے وجود کی چوٹیں' زخم اور ان سے اٹھتی ٹیسیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ وہ ایک خبیث حقیقت ہے نہ کہ کوئی الوژن۔

ہم نے لدھڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلاور کو مخاطب کیا۔

"کیا آپ کو بھی یہ ملعون دکھائی نہیں دے رہا؟"

دلاور متذبذب سے انداز میں کندھے اچکا کر نجمی کی طرف دیکھنے لگا تو اس کے اس انداز سے ہمارے ذہن

میں شک کا ایک انتہائی تکلیف دہ اور دلدوز خیال کسمسا اٹھا۔

''نجمی! کہیں یہ سب تمہارا کوئی پلان تو نہیں؟ تم میرے ساتھ کوئی سنگین قسم کا کھیل تو نہیں کھیل رہے؟''

''فار گاڈ سیک یار! تم اپنی ذہنی کیفیت کو نہیں سمجھ پا رہے۔ میری مانو اور چلو میرے ساتھ، تمہیں ڈاکٹر داور کی ہیلپ کی ضرورت ہے آؤ۔''

نجمی نے ہمارا بازو تھامنا چاہا تو ہم فوراً تڑپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

''مجھے کسی کی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہارا پاگل پن ہے جو تم مجھے میرے ہی پاگل ہونے کا یقین دلانے کی احمقانہ کوشش کر رہے ہو۔'' ہم نے لدھڑ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم اس کتے کو میرا الوژن قرار دے رہے ہو اور اس الوژن نے رات میری ہڈی پسلی ایک کر چھوڑی تھی۔ یہ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا تو کیا یہ چوٹیں بھی تمہیں نظر نہیں آ رہیں؟ کیا یہ بھی میرا الوژن ہیں؟'' ہم نے اپنے نیلے پڑے گال اور سوجھے ہوئے ہونٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''ہاں! یہ چوٹیں تو ہیں مگر میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ......''

''تم کسی کے متعلق کچھ مت کہو۔'' ہم نے تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں تمہارے اس کھیل کو سمجھ چکا ہوں۔ اب تم مجھے مزید بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ سمجھے تم۔''

''کیسا کھیل! کیا سمجھ چکے ہو تم؟''

''مجھے فکشن اسٹوری رائٹنگ پر آمادہ کرنا۔'' ہم نے لدھڑ کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر اس جن کے بچے کا وارد ہونا' مجھے پہلوان کے گھر اور تھانے میں پھنسا کر قصائی خاندان اور تھانے میں موجود ملازمین کی نظروں میں ایک نفسیاتی مریض کی شناخت دلوانا' پھر ڈاکٹر داور جیسی معتبر ہستی کو گواہ بنانا اور اب مجھے اس کے کلینک میں داخل کروا کر باقاعدہ میرے پاگل پن کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہتے ہو تم' اس سارے کھیل کے پیچھے تمہارا ہی شاطر دماغ ہے نا؟'' آپ ہی آپ ہمارا لہجہ زہریلا ہوتا چلا گیا تھا۔

''مجھے بھلا اس سب سے کیا حاصل ہوگا؟''

چھنو' ڈھنو اور رجو تو مجھ سے ہتھیا چکے تم لوگ اور اصل چیز تو ابھی باقی ہے' میرا یہ مکان۔ یہ لاکھوں کی جائیداد تمہیں معلوم ہے نا کہ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں' اب اگر میں بھی کسی پاگل خانے پہنچ جاؤں تو تم جو مرضی ہیرا پھیری کر لو کون پوچھنے والا ہوگا۔ تمہیں لاکھوں روپے نظر آ رہے ہیں۔ اس لیے یہ خنزیر تمہیں نظر نہیں آئے گا؟''

ہم نے نفرت انگیز نظروں سے لدھڑ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ہمارے ذہن میں اس کے علاوہ تو اور کوئی وجہ تھی ہی نہیں جس کے باعث نجمی لدھڑ کے بیٹھے ہونے کے باوجود بھی اس کی موجودگی سے انجان بنتے ہوئے اسے محض ہماری نظر کا دھوکہ اور فریب قرار دیتا رہتا۔

''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ میرے ساتھ یہاں اور بھی دو افراد موجود ہیں مگر لدھڑ صرف ایک تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔ تو اس کا سیدھا سا مطلب یہی ہوا نا کہ مسئلہ صرف تمہارے ساتھ ہے۔''

''یہ دونوں بھی تو تمہارے ہی دوست ہیں۔ یہ سب تم لوگوں کی آپس کی ملی بھگت ہے۔ تم سب ملے ہوئے ہو۔''

ہمارے تبصرے پر دونوں پولیس ملازموں کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات کھنڈ گئے مگر وہ نجمی کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش ہی رہے۔

''چلو اب بکواس بند کرو اور چلو ہمارے ساتھ۔'' نجمی ہماری طرف بڑھا۔ تو ہمارا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔

''میں کہتا ہوں یہ ڈرامہ بازی بند کرو اور اپنے اس جن کے بچے کو یہاں سے لے کر دفعہ ہو جاؤ۔''

''چلو ایک دفعہ ڈاکٹر داور سے مل لو اس کے بعد جو مرضی کرتے پھرنا۔'' نجمی نے قریب آ کر ہمارا بازو تھاما تو ہم نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا کر اسے دھکا دیا۔

''دور ہٹو ورنہ تمہارا منہ توڑ دوں گا میں۔''

نجمی ایک ذرا لڑکھڑایا اور ناگوار لہجے میں بولا۔

''اگر تم سیدھی طرح نہیں مانتے تو مجھے زبردستی

کرنا پڑے گی۔"

اور میں اپنے جیتے جی تمہیں تمہارے اس گھٹیا مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ یہ مکان میرے والد صاحب نے بڑی مشکل اور محبت سے بنایا تھا۔" ہم نے قطعیت سے جواب دیا مگر نجمی بھی جیسے کوئی پختہ ارادہ باندھ چکا تھا۔ وہ دوبارہ ہماری طرف بڑھا تو اس کے نزدیک آتے ہی ہم نے اسے گردن سے دبوچ کر زمین پر پٹخ دیا۔ اور خود اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر دلاور اور اس کا ساتھی دونوں ایک ساتھ ہم پر جھپٹ پڑے ۔ ہمارے درمیان کھینچا تانی تو ہوئی مگر کچھ ہی دیر میں ان قوی ہیکل پولیس والوں نے ہمیں بے بس کر دیا۔ دلاور کے ساتھی نے دیوار پر کیل کے سہارے لٹکی ہوئی ہماری شلوار میں سے ازار بند نکالا اور ہمارے دونوں ہاتھ ہماری پشت پر کس کر باندھ دیئے۔ لدھڑ اب باقاعدہ ہنس رہا تھا مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ صرف ہم نے دو چار موٹی موٹی گالیوں سے نوازا تھا اسے۔ "نجیب صاحب! آپ نے تو کہا تھا کہ تھوڑی سی گڑبڑ ہے مگر یہ بندہ تو مکمل طور پر پاگل ہے۔ بلکہ خطرناک پاگل ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ رات اس نے ایسے ہی دورے کی حالت میں کہیں ٹکریں شکریں مار کر اپنا تھوبڑا بھی خود ہی سجایا ہے۔" دلاور اپنی پیٹی درست کرتے ہوئے نجمی سے مخاطب ہوا۔

"مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنی سنگین حد تک پہنچ چکا ہے۔"

"بہر حال اسے یوں آزاد چھوڑنا دوسروں کے ساتھ ساتھ خود اس کے اپنے حق میں بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا میں اسے تھانے لے جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر داور کے پاس بھی میں اسے خود ہی لے جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے مگر خیال کیجیے گا' کوئی سختی مت کیجیے گا۔ آپ خود بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس کی ذہنی حالت کیا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں نجیب صاحب! ہماری طرف سے جوان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

نجمی نے ممنونیت سے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ دونوں بھوت ہمیں اپنے ساتھ تھانے لے گئے۔ دوسرے روز ہمیں ڈاکٹر داور کے کلینک لے جایا گیا اور اس ڈنگر ڈاکٹر نے پوری ذمہ داری سے ہمارے متعلق شیزوفرینیا کی کریٹیکل اسٹیج کی رپورٹ بنا کر دلاور خان کے حوالے کر دی اور ساتھ ہی تحریری طور پر یہ رائے یا مشورہ بھی دے دیا کہ ہمیں مینٹل ہاسپٹل لاہور ریفر کر دیا جائے اور پھر دو دن بعد ہی ہمیں پولیس کسٹڈی میں بذریعہ ٹرین لاہور پاگل خانے پہنچا دیا گیا۔

اسی سفر کے دوران ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ لدھڑ کو ہمارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا اظہار لدھڑ نے خود بھی کیا تھا کہ وہ ہمارے علاوہ کسی دوسرے پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرے گا اور دوران سفر ہمیں اس بات کا مشاہدہ اور تجربہ بھی ہو گیا۔ راستے بھر وہ جہنمی ہمیں ذلیل کرتا رہا' واہیات بکواس میں مصروف رہا مگر ہمارے اردگرد کے مسافر اور ہمارے نگران پولیس ملازمین اس کے وجود سے بالکل بے خبر رہے۔ تب ہمیں یقین ہوا کہ نجمی اپنی جگہ حق بجانب تھا۔ یقیناً اسے اور دلاور لوگوں کو بھی وہ ذلیل دکھائی نہیں دیا ہو گا۔

شاید ہم نجمی کے کہے کے مطابق یہ بھی یقین کر لیتے کہ وہ محض ہمارا ایک الوژن ہے کوئی حقیقت نہیں لیکن ایک معاملہ ہمیشہ اس بات کی نفی کرتا رہا۔

آئے دن ہمارے جسم پر لگنے والی چوٹیں' چہرے کے نیل' زخم اور ان سے اٹھنے والی ٹیسیں! گزشتہ تین سال سے ہم لاہور کے پاگل خانے میں بیٹھے نجمی اور لدھڑ کو بددعائیں دینے کے ساتھ ساتھ خود کو یہ باور کراتے رہتے ہیں کہ یہ چوٹیں' زخم اور ان سے اٹھنے والی ٹیسیں محض ایک الوژن کی کرامات نہیں ہو سکتیں۔



یادگار

ابوضیاء اقبال

وقت کے ساتھ ساتھ جہاں بہت کچھ بدلا ہے وہیں انسان میں بھی شعور و آگہی کا اضافہ بھی ہوا ہے' ورنہ پرانے وقتوں میں لوگ بڑے نازک طبع و حساس ہوتے تھے' اب بھی ہوتے ہیں مگر اتنے نہیں۔
ایک سفیر کو پیش آنے والے حالات جو امن کے لیے مذاکرات کرنے گیا تھا۔

مغرب سے درآمد اس کہانی کا دلچسپ پیرایۂ اظہار ہی اس کا حسن ہے

پرنس بسمارک پیٹرسبرگ پہنچا تو رات ہوچکی تھی۔ وہ زار روس کے نام قیصر جرمنی کی جانب سے امن و آشتی کا پیغام لایا تھا۔ دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات پہلے ہی تھے اور قیصر دوستی کے اس بندھن کو مضبوط کرنا چاہتا تھا وہ لب گور تھا اور لوگ بڑھاپے میں کچھ زیادہ ہی امن پسند ہوجاتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہوکر بسمارک محل کے ایک مرصع کمرے میں خوب میٹھی نیند سویا۔ وہ علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا چنانچہ اٹھ کر کپڑے پہنے اور پائیں باغ میں چہل قدمی کو چلا گیا۔ اس کی سحر خیزی سے پہلے شاہی پہرے دار جاگ چکے تھے اور محل کے ہر کونے میں ہر راہداری کے سرے پر ہر ستون کے پاس ایک محافظ کھڑا تھا جو اسے دیکھ کر فوجی قواعد کے تحت رائفل اٹھاتا اور سیلوٹ کرتا اس سے بسمارک جزبز ہورہا تھا کیونکہ باغ کے کنجوں میں پرندے تکریم خداوندی میں چہچہا رہے تھے۔ گھاس، پتوں اور پھولوں پر شبنم کے موتی دمک رہے تھے اور ابھرتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنیں ایک نئے دن کی نوید دے رہی تھیں۔ وہ کسی کی موجودگی کے بغیر زندگی کی ان نعمتوں سے لطف اٹھانا چاہتا تھا اس کے علاوہ تنہائی میں اپنے خیالات یکسوئی سے یکجا کرنا چاہتا تھا اسے ناشتے کے فوراً بعد زار سے ملنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بات چیت کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار رکھے۔

"یہ محافظ تو میرے اعصاب پر سوار ہورہے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

"اور ان کی وردی تو آنکھوں میں بری طرح چبھ رہی ہے اس ملک میں ذوق پر دولت کر پلا بھاری ہے۔"

وہ روش روش، قطعہ قطعہ چلتا ہوا اناس کے اس درختوں کے پاس پہنچا تو اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ یہاں کوئی پہرے دار نہیں تھا اور سامنے آنکھوں کے ذریعے دل میں اتر جانے والا ایک سمن زار تھا۔ وہ قدرت اور انسان کی صناعی پر دیر تک مبہوت کھڑا رہا۔ پھر اس کے قدم آہستہ آہستہ اس جنت نگاہ قطعے کی طرف بڑھنے لگے۔

معاً وہ ٹھٹکا سبزہ زار کے عین وسط میں ایک پہرے دار کھڑا تھا جو درختوں کے جھنڈ میں پہلے اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے پہرے دار کے قریب گیا۔

"تم یہاں کھڑے کس چیز پر پہرا دے رہے ہو؟" اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے پہرے دار سے کہا۔

"میں کیا بتاؤں۔" پہرے دار نے سادگی سے کہا جو ابھی نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور آداب محل سے نابلد تھا۔

"بڑی عجیب بات ہے۔" بسمارک نے کہا "تم کسی راستے پر پہرہ دیتے تو بات بھی تھی لیکن تم تو اس سبزہ زار کے بیچوں بیچ کھڑے ہو میری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آئی۔"

"میں اس جگہ کھڑا ہوں جہاں مجھے کھڑا ہونے کا حکم ملا ہے۔" پہریدار نے تنک کر جواب دیا اسے ایک اجنبی کی دخل اندازی پر غصہ آنے لگا تھا۔

"اور یہ حکم تمہیں دیا کس نے؟" بسمارک نے پوچھا۔

''سارجنٹ نے اور کس نے۔'' پہرے دار نے جھنجلا کر جواب دیا۔ بسمارک خاموشی سے بڑھ گیا۔ واپسی پر اس نے دیکھا کہ پہرے دار اسی طرح ساکت کھڑا نہ جانے کس چیز کا تحفظ کر رہا تھا۔

ناشتے کے بعد زار نے اسے بلا بھیجا اور بات چیت شروع ہوئی۔ بسمارک کا سارا دھیان باغ کے حسن کی غارت گری کی طرف تھا اور زار اس کی غیر حاضر دماغی پر حیران تھا کہ ایسے بونگے شخص کو عالمی شہرت کس بنا پر ملی ہے۔

''میں شاید اپنی بات کی وضاحت نہیں کر سکا ہوں۔ اگر سوال پیدا ہو کہ پولینڈ میں اپنے سپاہیوں کو کہاں متعین کروں۔'' زار نے کہا۔

''سبزہ زاروں کے وسط میں۔'' بسمارک بول پڑا۔

زار اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''م...... م...... معاف کیجیے یور میجسٹی۔'' بسمارک نے جلدی سے کہا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میں نے آج ایک عجیب بات دیکھی جس نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا اس سے میرے ذہن پر بڑا بوجھ پڑا ہے۔''

''واقعی۔'' زار نے اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو کر کہا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں وہ کیا بات تھی؟ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ہم یہاں اپنے معزز مہمان کے آرام کا ہر طرح خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔''

بسمارک نے اسے بتایا تو اس کے چوڑے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ اس نے کہا۔

''آپ نے اناس کے درختوں کے پاس بتایا کہ وہ پہرے دار کھڑا ہے وہ یقیناً پرانا باغ ہوگا ہاں...... ہاں وہی ہے مجھے یاد آیا وہاں ایک پہرے دار ہے میں نے اسے سیکڑوں بار دیکھا ہوگا لیکن مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ وہاں کیوں کھڑا ہے آیئے چل کر پوچھتے ہیں۔'' زار کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اس نے بڑے طمطراق سے کہا۔

''امن کی باتیں ملتوی کی جاسکتی ہیں۔''

دونوں اس جگہ پہنچے تو پہرے دار بدل چکا تھا۔ اس نے فوراً بادشاہ سلامت اور اس کے مہمان کو فوجی انداز میں سیلیوٹ مارا۔

''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟'' زار نے پوچھا۔

پہرے دار کانپنے لگا اس نے اعتراف کیا کہ اسے اس کی وجہ معلوم نہیں ہے۔ اس پر سارجنٹ کو بلوایا گیا اور اس نے بھی پہرے دار کی طرح لرزتے ہوئے اپنی ناواقفیت کا اقرار دیا۔ اسے بھیجا گیا کہ کیپٹن کو بلا لائے کیپٹن نے بتایا کہ ہر پہرے دار کو کرنل کے احکامات کے تحت تعینات کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ کرنل سے جواب طلبی کی جاتی سو اس نے عرض کی کہ پہرے داروں کی تعیناتی اس کے مرحوم پیش رو کے مرتب کردہ منصوبے کے تحت کی جاتی ہے اور اس منصوبے کی توثیق وزارت داخلہ سے مشورے کے بعد وزارت جنگ نے کی تھی۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان تمام برسوں میں تم نے یہاں سے پہرا کبھی نہیں ہٹایا؟'' زار نے ترش روئی سے پوچھا۔

''میں نے اپنے زمانے میں ایک بار بھی نہیں ہٹایا۔ یور میجسٹی'' کرنل نے فخر سے سینہ پھلا کر کہا۔ پھر اس نے اپنی شاندار خدمات کی مکمل تفصیل سنائی کیونکہ اس کی ترقی کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا جس کا اس کے دل میں گہرا گھاؤ تھا۔

''میں یہاں چوبیس گھنٹے پہرے دار رکھتا ہوں جو اپنی مقررہ جگہ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوتا۔''

''اچھا، ہم اس بارے میں لنچ کے بعد بات کریں گے۔'' زار نے بسمارک سے کہا وہ اس پر اپنی فوج کی نا اہلی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں اس نے وزیر جنگ کی طلبی کا پروانہ جاری کیا جس میں کہا کہ وہ اس سبزہ زار پر پہرے کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔

زار کے حکم نامے سے وزارت جنگ میں کھلبلی مچ گئی۔ وزیر جنگ نے ان تمام سابق فیلڈ مارشلوں کی ایک

فوری میٹنگ بلوائی جو خدا کو پیارے نہیں ہوئے تھے ان کے علاوہ سارے سابق و موجودہ کلرک اور سیکرٹری بھی طلب کیے گئے۔ کانفرنس روم میں گرد آلود فائلوں، دستاویزات، رپورٹوں اور ردی کی ٹوکریوں کا انبار لگ گیا گرد و غبار سے سب لوگوں کو چھینکوں پر چھینکیں آنے لگیں حکومت کا معمر ترین سابق فیلڈ مارشل صاحب فراش تھا لہٰذا وزیر جنگ کو بذات خود گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر جانا پڑا۔ اس فیلڈ مارشل کی بینائی کمزور ہو گئی تھی اور وہ اونچا بھی سنتا تھا وزیر جنگ کو چیخ چیخ کر بولنا پڑا۔

"اچھا اچھا زار یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میں نے پچپن سال پہلے ترکوں کو شکست فاش کیسے دی تھی؟" فیلڈ مارشل نے نقاہت کے باوجود حتی الامکان اکڑ کر کہا۔

"یہ بڑی اطمینان بخش بات ہے کیونکہ تاریخ میں اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ ترکوں نے اس کے چھکے چھڑا دیے تھے لیکن وہ اپنی شجاعت اور کامیابی کی دھاک بٹھانے پر مصر تھا وہ پوری تفصیل سے میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے لگا۔

"لیکن زار ترکوں کے بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتا ہے۔" وزیر جنگ جز بز ہو کر اس کے کان میں چیخا۔

"وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ پرانے باغ میں جنوب مغرب کی سمت پینتیس قدم کے فاصلے پر پہرے دار کیوں کھڑا کیا گیا تھا؟ کرنل نے پرانے کرم خوردہ ریکارڈ سے باغ کا جو نقشہ ڈھونڈ نکالا ہے اس میں کسی منصوبے کا ذکر ہے وہ منصوبہ کیا تھا؟"

یہ سن کر فیلڈ مارشل پر اوس پڑ گئی اور اس کا فروزاں چہرہ بجھ گیا۔

"اب میرا حافظہ وہ پہلا سا نہیں رہا ہے البتہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی پہرے دار کو بطور سزا وہاں کھڑا کیا گیا تھا۔"

"تو کیا یہ سزا برسوں جاری رہی اور ایک دوسرے کو منتقل ہوتی رہی؟" وزیر جنگ نے چڑ کر کہا۔

"یقیناً یہی ہوا ہوگا۔" فیلڈ مارشل نے اعتماد سے کہا۔

"میرے زمانے میں ڈسپلن بہرحال ڈسپلن تھا۔"

"اور کیا یہ بھی درست ہے کہ ہر پہرے دار چار گھنٹے کے بعد بدلا جاتا تھا؟" وزیر جنگ نے پوچھا۔

"سال کے تین سو پینسٹھ دن پورے کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔" فیلڈ مارشل نے جواب دیا۔

وزیر جنگ بھنا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوپہر کو وہ شاہی محل میں پیش ہوا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اعتراف کیا کہ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو گیا ہے۔ ساری فوج میں کوئی نہیں بتاتا اور نہ کوئی ریکارڈ موجود ہے کہ باغ میں پہرے دار کیوں کھڑا کیا گیا ہے۔ اس دوران میں انجینئروں کی ایک فوج نے باغ کا گوشہ گوشہ چھان مارا کہ کوئی ایسا سراغ ملے جس سے پہرے کا جواز ثابت ہو لیکن ان کی مراد پوری نہ ہو سکی۔

زار اس راز پر سے پردہ ہٹانے کے لیے اتنا مضطرب تھا کہ اس نے امن کی بات چیت کو پس پشت ڈال دیا اور یہی حال بسمارک کا تھا سارے محل میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ایک ایک آدمی سے پوچھ گچھ کی جا چکی تھی ہر خدمت گار دوسرے سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ پرانے باغ میں پہرے دار کیوں کھڑا کیا گیا تھا؟ زار نے تنگ آ کر شہر میں منادی کرا دی کہ جو فرد بھی اس گتھی کو سلجھائے گا اسے ایک ہزار روبل سکہ رائج الوقت بطور انعام دیا جائے گا۔

اڑتے اڑتے یہ خبر محل کی سب سے معمر خادمہ تک پہنچی جو ایک گوشہ عزلت میں اپنے دن گن گن کر کاٹ رہی تھی۔ اس بے چاری کو سوائے ایک نوجوان خادمہ کے سب فراموش کر چکے تھے۔ وہی نیک دل لڑکی اس کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھتی تھی بڑھیا عہد شباب میں اپنے دور کی زارینہ کی مقرب خاص اور منظور نظر رہ چکی تھی جو موجودہ زار کی دادی تھی۔

"بیٹی، یہ آج نقاروں پر چوب کیوں پڑ رہی ہے۔ ڈھول تاشے کیوں پیٹے جا رہے ہیں کیا کسی ملک کے ساتھ جنگ چھڑ گئی ہے؟" اس نے پوپلے منہ سے اپنی محسنہ سے پوچھا۔

''نہیں بڑی اماں ایک پہرے دار کے بارے میں اعلان کیا جارہا ہے۔'' نوعمر خادمہ نے بتایا۔
''کیسا پہرے دار بیٹی؟'' بڑھیا نے پوچھا۔
''جو سبزہ زار پر کھڑا ہے؟''
''کون سا سبزہ زار؟''
''وہی جہاں کسی زمانے میں تیر و کمان سے بیگمات نشانہ بازی کی مشق کرتی تھیں اس کے عین درمیان میں ایک پہرے دار کھڑا ہے اور کوئی نہیں بتاتا ہے وہاں کیوں کھڑا ہے؟''
''اس کی وجہ تو ہر ایک کو معلوم ہونا چاہیے؟'' بڑھیا نے اپنی بے نور آنکھوں سے حیرت جھلکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''خدا ہم پر رحم کرے آج کل لوگ کیسے کوڑھ مغز ہوگئے ہیں۔''
''لیکن وجہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔'' لڑکی چلا کر بولی۔
''اور زار نے وجہ بتانے کو ایک ہزار روبل انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔''
''میری بچی!'' بڑھیا مسکراہٹ سے بولی۔ ''تمہیں دھوم دھام سے بیاہ رچانے کا موقع مل رہا ہے تم نے میری بڑی خدمت کی ہے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بادشاہ کے سامنے لے چلو۔''
لڑکی کی سمجھ میں نہ آیا کہ پہرے دار کا اس کے بیاہ سے کیا تعلق ہے بہرحال اس نے شرما کر بڑھیا کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لے کر چلی گئی۔
''یور میجسٹی میں آپ کو بتاتی ہوں کہ گھاس کے اس قطرے پر پہرے دار کیوں ہے؟'' بڑھیا نے زار کے سامنے پیش ہو کر کہا۔ ''برسہا برس گزرے خدا بخشے آپ کی دادی نے باغ میں بیگمات کی نشانہ بازی کا ایک مقابلہ کرایا تھا۔ کیا ماہر نشانے باز تھیں آپ کی دادی بھی اور ان کی خوب صورت بانہوں اور کلائیوں کے تو کیا کہنے ان کی نمائش کے لیے نشانہ بازی سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔ ہاں تو بہار کی ایک خوشگوار دوپہر کو بیگمات باغ میں جمع تھیں انہوں نے کمان کھینچی اور تیر چلائے پھر اپنا نشانہ دیکھنے کے لیے دوڑیں اچانک زارنیہ نے آواز دے کر انہیں روک دیا اور گھٹنے کے بل جھک گئیں۔ بیگمات ان کے گرد جمع ہوگئیں۔ زارینہ موسم کا پہلا بنفشے کا پھول دیکھ رہی تھیں۔ مبارک سلامت کی نقرئی آوازوں سے فضا میں جلترنگ سے بجنے لگے۔ یہ مبارک شگون تھا کیونکہ خیر سے زارینہ کا پاؤں بھاری تھا۔ زار یعنی کہ آپ کے دادا کو خبر ہوئی تو وہ دوڑے دوڑے آئے وہ اپنی ملکہ پر جان چھڑکتے تھے چنانچہ انہوں نے وہاں فوراً ایک پہرے دار کھڑا کرنے کا حکم صادر کیا کہ کوئی پھول کو پیر تلے روند نہ دے۔ زارینہ کی گود ہری ہوئی اور آپ کے والد دنیا میں تشریف لائے لیکن چونکہ پہرے کا حکم واپس نہیں لیا گیا اس لیے یہاں پہرے دار بدستور رہا اور شاید اب تک ہے۔''
''اور اس پھول کا کیا بنا؟'' زار نے پوچھا۔
''اس کا نام و نشان بھی نہ رہا۔'' بڑھیا نے شان بے نیازی سے کہا۔
زار سوچ میں پڑ گیا کہ اپنے اسلاف کی روایت کو کیسے توڑے جرمنی سے امن و آشتی کی بات چیت کھٹائی میں پڑ گئی اور بسمارک کو بے نیل و مرام وطن لوٹنا پڑا۔



چشم براہ

اسرار احمد

ذہن انسان کو قدرت نے بڑی صلاحتیں عطا کی ہیں لیکن لالچ ایک ایسی بلا ہے جو انسان سے اس کا سب کچھ چھین لیتی ہے اور پھر اس کے ہاتھ صرف مایوسی رہ جاتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کا بہت کم حصہ انسان استعمال کر پاتا ہے۔ جدید سائنس ان ہی صلاحیتوں کی کھوج میں ہے۔

ایک ایسے ہی لالچی شخص کا احوال جو دوسروں کی دولت بٹورنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے ڈیسک کے قریب رکھی ہوئی کمزور سی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نو وارد سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

زرد اور وغلی نسلی کا یہ شخص بیک نگاہ مجھے متاثر کرنے میں ناکام رہا تھا لیکن پھر بھی ایک بات ضرور تھی جس نے میرے دل کو بے چین کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ اس کی سیاہ اور چمک دار آنکھوں میں کچھ نہایت ہی عجیب سا تاثر تھا کوئی ایسا جادو کہ ایک لمحے کے لیے میری تھرتھری چھوٹ گئی۔

''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں مسٹر......!''

میں نے اپنے سر کو نہایت ہی تفاخر اور افسرانہ شان کے ساتھ حرکت دی۔ ظاہر ہے کہ میں ایک وسیع کاروباری کمپنی کا منیجر تھا۔ جس کی شاخیں دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیلی ہوئی تھیں۔

''اسٹیمپ...... میرا نام ہیری اسٹیمپ ہے کیا تم کسی کی شکل صورت دیکھ کر اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکتے ہو؟''

''میں اس کرسی پر بیٹھا ہی اس لیے ہوں کہ کار آمد ہیروں کو پرکھ کر انہیں ان کی قابلیت کے مطابق فائدہ پہنچا سکوں، کیا سمجھے مسٹر اسٹیمپ۔'' میں نے اپنی آواز میں ذرا درشتی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ تم میں کیا صلاحیت ہے؟''

یکا یک اس کے چہرے پر سنجیدگی نظر آنے لگی۔

''میں جانوروں کو بھی ہپناٹائز کرنے کی قدرت رکھتا ہوں۔'' وہ بولا۔

میں نے اس کی بات سن کر زور سے قہقہہ لگایا۔ بھلا ایسی مضحکہ خیز بات پر کس طرح یقین کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ بات بالکل ہی ناممکن نظر آتی تھی لیکن ہماری کمپنی کے اصول کے مطابق کسی ناقابل یقین بات کو یوں چٹکیوں میں اڑا دینا اور دعویٰ کرنے والوں کو صاف جواب دے کر دل توڑ دینا کاروباری اصول کے سراسر منافی تھا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بظاہر ناقابل عمل نظر آنے والی کوئی بات اپنے اندر ایک حقیقت پوشیدہ رکھتی ہے اور ہم صرف اس لیے دھوکا کھاتے ہیں کہ ہمارا دل اور دماغ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ ہم اس لیے نہایت سختی کے ساتھ اس اصول پر کاربند ہیں کہ کسی شخص کے دعوے کو بھی بغیر آزمائے اور اپنی تسلی کیے بغیر ہرگز ہرگز رد نہ کریں۔

ادھر تو میں اپنی سوچ میں غرق تھا لیکن دوسری طرف اس کا چہرہ بالکل ہی سپاٹ تھا نجانے کیوں

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پراسرار آنکھوں میں میرے لیے ایک حقارت آمیز تاثر موجود ہے۔ مجھے مزید غصہ آ گیا میں نے چلا کر کہا۔ ''تم میرے سامنے ابھی فوراً اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرو۔''

میری بات کے جواب میں اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سفید رنگ کے چھوٹے سے چوہے کو نکال کر میرے سامنے ڈیسک پر رکھ دیا اور پھر میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھا گویا اب صرف میرے حکم کا منتظر ہے۔

''اب تم اس چوہے کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

جواب میں اس نے اپنی آنکھیں چوہے کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اس کی چمکدار آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ یوں دکھائی دینے لگا جیسے بہت زیادہ پی گیا ہو۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے میں نے دیکھا کہ وہ حقیر سا جانور اچانک اپنی تمام تیزی و طراری بھول گیا اور ایک دم ساکت ہو گیا۔ اس زرد رو نے ایک فاتحانہ نعرہ لگایا اور کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''واقعی کمال ہے۔'' میں نے ستائش کے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''تم ذرا دیر یہیں ٹھہرو، میں اپنی تسلی کے لیے ایک اور تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر آ گیا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یقیناً اس نے اس معمولی سے چوہے پر کافی محنت کی ہو گی جب میں واپس آیا تو میرے ہاتھوں میں میرا پالتو بلا جنجر دبا ہوا تھا اور میں یہ سوچ کر بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اب وہ یقیناً کافی پریشان ہو گا بلکہ عین ممکن ہے کہ اس مرتبہ ناکام ہی ہو جائے۔

میں نے بلے کو لے جا کر اس کے سامنے ڈیسک پر رکھ دیا اور منتظر رہا کہ اب پردہ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ روشن آنکھیں حسب معمول اپنے کام میں منہمک ہو گئیں مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جنجر بھی رفتہ رفتہ مدہوش ہوتا جا رہا تھا اور پھر وہ بالکل بے دم ہو گیا۔ جنجر اب مردہ نظر آ رہا تھا شکار اور شکاری بیک وقت میرے سامنے ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، تم نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔''

میں نے فراخدلی سے اعتراف کیا۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں فوراً ہی ایک عجیب و غریب منصوبے نے جنم لیا تھا۔ مجھے وہ منصوبہ بالکل ہی بے داغ نظر آتا تھا۔

''کیا یہ عمل گھوڑوں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور بار بار اس کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔

''میں تمہیں گھڑ دوڑ کے شعبے کا منیجر مقرر کرتا ہوں۔'' میں نے پیش کش کی۔

''کیا تم قمار بازی سے متعلق کچھ معلومات رکھتے ہو؟'' ابھی کنٹریکٹ کے کاغذ پر اس کے دستخط بھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ میں نے پوچھ ڈالا۔ اس نے بڑے ہی وقار کے ساتھ اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ایک ایسا انداز جو یقیناً ایک منیجر کے شایان شان تھا۔

''ٹھیک ہے، ویسے کچھ زیادہ فکر و تردد کی بات نہیں ہے۔ میں تفصیل بتاتا ہوں۔'' میں نے نرم لب و لہجے میں اپنا منصوبہ سمجھانا شروع کیا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ ہم غیر معروف اور چھوٹے قصوبوں میں ایسے گھڑ دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لیں جہاں زیادہ سے زیادہ چھ گھوڑے مقابلے میں حصہ لے رہے ہوں پہلے ہم اس بات کی چھان بین کریں گے کہ ایسا کون سا گھوڑا ہے جو مقامی لوگوں میں زیادہ معروف ہے اور جس کے جیتنے کے زیادہ امکانات ہیں پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ دوسرا مقبول ترین گھوڑا کون سا ہے ہماری رقم اسی گھوڑے پر لگی ہوگی جس کے دوسرے نمبر آنے کے امکانات زیادہ ہوں گے اور پہلے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو تم ہپناٹائز کرو گے ہوسکتا ہے کہ اس طرح ہمیں چند بار نقصان بھی اٹھانا پڑے وہ یوں کہ جس گھوڑے کے بارے میں ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ دوسرے نمبر پر آئے گا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آجائے لیکن مجموعی طور پر ہم یقیناً فائدے میں رہیں گے۔ ہاں، ایک خاص بات اور نوٹ کرلو تمہیں ایسا عمل کرنا ہے کہ وہ گھوڑا بالکل ہی ناکارہ ہو کر نہ رہ جائے ورنہ عین ممکن ہے کہ مقابلہ ملتوی ہوجائے۔ تمہیں صرف کوئی ایسی ترکیب کرنا ہے کہ آگے دوڑنے والا گھوڑا ذرا سست پڑ جائے اور دوسرے نمبر کے گھوڑے کو آگے جانے کا موقع مل جائے کیا ایسا ممکن ہے؟“

میری اتنی طویل تقریر سنتے سنتے اس کے چہرے پر بیزاری سی چھا گئی تھی لیکن میری بات کے جواب میں اس نے زبردستی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں بس مجھے ذرا ہلکا ٹرانس دینا پڑے گا میں یہ کام باآسانی کرلوں گا۔“

میں نے اپنی خطرناک مہم کے آغاز کی خاطر عنقریب ہونے والی ریس کا انتخاب کیا وہ جگہ جہاں یہاں سے پانچ فرلانگ دور تھی۔ ریس آج ہی ساڑھے تین بجے شروع ہونے والی تھی اور اس مقابلے میں دو سال سے کم عمر کے گھوڑے حصہ لے رہے تھے۔

ہم منزل مقصود پر وقت سے بہت پہلے پہنچ گئے مقابلے میں حصہ لینے والے تمام گھوڑے دلکی چال چلتے ہوئے اسٹارٹنگ پوائنٹ پر آ کھڑے ہوئے ریس شروع ہوتے ہی ہیری نے مقبول ترین گھوڑے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ گھوڑے نے ایک جھٹکا کھایا لیکن خدا کا شکر ہے کہ جاکی کو کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوا وہ گھوڑا جس کے بارے میں سب کو یقین تھا کہ جیت جائے گا ہمارے پسندیدہ گھوڑے سے بیس قدم پیچھے رہ گیا اور اس طرح ہماری لگائی ہوئی رقم بڑھ کر چار گنا ہوگئی۔

اس طرح ہماری پارٹنر شپ نہایت ہی خوشگوار انداز میں ترقی کے مراحل طے کرتی چلی گئی۔ اب ہر مقابلے میں یہی ہو رہا تھا کہ وہ گھوڑے جو مقبول و مشہور ہوتے چند قدم کے فاصلے سے شکست کھا جاتے بعض جگہ ہمارا نشانہ خطا بھی ہوگیا اور ہم سو فیصد یقین کے باوجود ہار گئے لیکن اس کے باوجود بھی دو مہینے کے اندر اندر میں بیس ہزار پاؤنڈ خالص منافع کا مالک بن چکا تھا۔

ہمارے کاروبار کی راہ میں بس ایک مصیبت بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی ہمیں ملک میں ہونے والی گھوڑ دوڑ کے مقابلوں کی تازہ ترین اور مفصل معلومات حاصل کرنا پڑتی تھیں جن کا حصول روز بروز مشکل تر ہوتا جا رہا تھا اس کے علاوہ ہر ریس میں حصہ لینے کے جنون میں ہمیں ہر دم سفر میں رہنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے ہماری ذہنی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی آخر کار سخت غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب کسی بڑے مقابلے میں قسمت آزمائی کروں اس کام کے لیے میں نے

سینٹ لیگر میں ہونے والی ریس کا انتخاب کیا جو ایک ماہ بعد منعقد ہونے والی تھی اس مقابلے میں صرف پانچ گھوڑے حصہ لے رہے تھے ریس کے ماہرین پر اعتماد تھے کہ فیورٹ گھوڑا ہر حال میں کامیاب ہوگا اور واقعی اس قابل رشک صحت کے حامل گھوڑے کو دیکھ کر اس بات پر رشک کرنا بھی گناہ تھا سیکنڈ فیورٹ گھوڑا ''سنی بے'' تھا۔ ہمارے نظریے کے مطابق سنی بے کے جیت جانے کے امکانات سو فیصد تھے بشرطیکہ ہماری ترکیب کارگر رہے۔

میں نے اپنی کل رقم بیس ہزار پاؤنڈ، ریس شروع ہونے سے تین ہفتے قبل سنی بے پر لگا دی میرا دل مارے خوشی کے بے قابو ہوا جا رہا تھا کیونکہ بہت جلد میں ساٹھ ہزار پاؤنڈ کا مالک بننے والا تھا۔

اس مرتبہ چونکہ ہم بالکل فرصت میں تھے لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ روزانہ میدان کا چکر لگائیں گے اور اگر ہو سکا تو فیورٹ گھوڑے پر اپنا عمل آزما کر دیکھیں کہ اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ میں نے ہیری کو یہ مشورہ بھی دیا اس کی بجائے کہ ہم آخری موقع پر اپنا داؤ آزمائیں۔ کیوں نہ ابھی سے آہستہ آہستہ اسے سست اور کمزور بناتے چلے جائیں اس گھوڑے کی شاندار صحت کے پیش نظر اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں ہم عین وقت پر اسے مسحور کرنے میں ناکام نہ ہو جائیں۔ ہیری نے اس مشورے پر صاد کیا اور ہم اس گھوڑے سے ملاقات کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ ہم نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ ہم اس گھوڑے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن ہر مرتبہ ناکام رہے بدقسمتی ہمیں گھیر چکی تھی اور ہمارے تمام منصوبے ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھی ہم تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ ہمارے بیشتر کامیاب حملوں نے ریسنگ کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا اور شاید اسی لیے حفظ ماتقدم کے طور پر حصہ لینے والے تمام گھوڑوں کی نہایت سختی سے حفاظت کی جا رہی تھی۔

مجبوراً ہمیں صبر کر کے بیٹھ جانا پڑا۔

آخرکار وہ دن آ ہی گیا جس کا ہمیں بے چینی سے انتظار تھا ہم بھی میدان کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں گھوڑے دوڑ شروع ہونے سے پہلے جمع ہوتے ہیں۔ ہم منتظر تھے کہ گھوڑے کب باہر آتے ہیں میرا پارٹنر ہیری بھی سخت بے چین تھا اور فیورٹ گھوڑے کو ہپناٹائز کرنے کے لیے سخت مضطرب نظر آتا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے گھوڑے اپنے اصطبل سے نمودار ہوئے محافظوں کا ایک جھرمٹ ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں مسلسل اسی جانب تھیں۔ اپنے ساتھی کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں میں اپنی حالت سے ضرور آپ کو مطلع کروں گا میری حالت تو یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں میرا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ میں تیورا کر ایک طرف گرا اور بے ہوش ہو گیا تمام گھوڑوں کی آنکھوں پر سیاہ چمڑا منڈھا ہوا تھا۔

میری بیس ہزار پاؤنڈ کی رقم ڈوب گئی تھی اور آج میں اس گھڑی کو کوستا ہوں جب میں نے یہ احمقانہ فیصلہ کیا تھا۔



پناہ گزین

زرین قمر

آغوشِ مادر کو سونا کر جانے والی ایک نوخیز کلی جب اسرائیلی جارحیت کا نشانہ بنی تو کتنے ہی دل کانپ اٹھے۔ انصاف طلب کرتے نہتے فلسطینیوں پر ایسی قیامت گزری جو تاقیامت ایک ماں کے لیے دردناک حقیقت بن گئی۔

رات بہت اندھیری اور ویران تھی اور رات کی اس تاریکی میں غزہ کی چھوٹی سی بستی ''جبالیہ'' کے علاقے میں واقع ایک اسکول سے بچوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ اسکول آبادی سے کچھ دور واقع تھا اور یونائٹڈ نیشن کی ملکیت تھا اس کو جبالیہ ایلیمنٹری ابوحلابیہ اسکول کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہ ایک گرلز اسکول تھا یہاں اس علاقے کے لوگوں نے پناہ لی ہوئی تھی اور اسکول کو یو این شیلڈ کی حیثیت دے دی گئی تھی ایسا ابوحلابی کے کہنے پر کیا گیا تھا جو اس علاقے میں یو این کے تمام اسکولوں کا انچارج تھا۔ فضا میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں جن میں ایک بہت چھوٹے بچے کی آواز بھی شامل تھی۔

''چپ ہوجا میرے لال!'' آمنہ زینت نے پیار سے اپنے آٹھ ماہ کے بچے کو تھپتھپایا وہ بہت دیر سے اسے سلانے کی کوشش کررہی تھی لیکن بچہ کسی صورت سونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے شدید بھوک لگی تھی اور آمنہ زینت کے پاس بہت تھوڑا سا دودھ بچا ہوا تھا جو اس نے احتیاطاً صبح کے لیے بچا کر رکھا ہوا تھا کہ جب بچہ صبح سوکر اٹھے گا تب وہ اسے دے گی اگر وہ دودھ اسے ابھی دے دیتی تو صبح کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ بچہ ایک بار پھر بھوک سے بلبلایا اور آمنہ زینت نے اسے سینے سے لگالیا اور اٹھ کر ٹہلنا شروع کردیا کہ شاید اس طرح بچہ خاموش ہوجائے لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

قریب ہی زمین پر لیٹے ہوئے اس کے دو بچے بھی بار بار کروٹیں لے رہے تھے جن کی عمریں دس اور بارہ سال تھیں۔ وہ بھی بھوکے تھے اور اس کیمپ میں موجود اور لوگوں کی طرح انہیں بھی دو وقت سے کھانے کے لیے کچھ نہیں ملا تھا' آٹھ ماہ کے بچے کو سینے سے لگائے ٹہلتے ہوئے آمنہ زینت نے اطراف کا جائزہ لیا ابوحلابیہ اسکول کے اس بڑے سے ہال میں ہر طرف لوگ بکھرے پڑے تھے' کچھ جاگ رہے تھے اور کچھ سونے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔ سب کا حال ایک جیسا ہی تھا انہیں اسرائیلی فوج کی وارننگ پر جبالیہ میں اپنے گھروں کو خالی کرنا پڑا تھا کیونکہ اسرائیلی فوج کے کہنے کے مطابق انہیں وہاں خطرہ تھا اور ان کی سیکورٹی کی کوئی بھی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔

غزہ کی پٹی پر واقع جبالیہ کی بستی کے یہ باشندے بہت ہی مختصر سے سازوسامان کے ساتھ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اس اسکول میں آگئے تھے جو یو این کی ملکیت تھا اور ان کے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ سمجھا گیا تھا ان کے ساتھ کچھ کمبل' کچھ ٹوکریاں جن میں تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان تھا۔ پانی کی چند بوتلیں اور بچوں کے چند کھلونے جو انہیں بہت عزیز تھے اور وہ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

آمنہ زینت کی گود میں اس کا آٹھ ماہ کا بچہ پھر مچلا اس بار اس کے رونے میں زیادہ شدت آگئی تھی۔

''ہاں میرے بچے......میرے لال! سوجاؤ۔'' اس نے ایک بار پھر اسے سلانے کی کوشش کی لیکن بچہ مچلتا ہی رہا۔

''اچھا اچھا بیٹا......اللہ مالک ہے' میں تمہیں دودھ دے دیتی ہوں۔ صبح جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس نے

ناامیدی سے کہا اور دوبارہ اس کمبل پر بیٹھ گئی جہاں کچھ دیر پہلے بیٹھی تھی اور جس پر ایک جانب اس کے دو بچے بھی لیٹے ہوئے تھے اس نے ایک کونے پر چھوٹے بچے کو بھی لٹا دیا اور پاس رکھی ہوئی ٹوکری سے دودھ کی بوتل نکالی جس میں آدھی بوتل دودھ تھا لیکن اس میں موجودہ پانی کی مقدار اتنی تھی کہ وہ دودھ بہت نیلا ہوگیا تھا اس نے جان بوجھ کر دودھ میں زیادہ پانی ملا دیا تھا تاکہ وہ کچھ زیادہ دیر چل سکے اس نے وہ بوتل بچے کے منہ سے لگادی اور خود بھی اس کے برابر میں لیٹ گئی۔ وہ کافی تھک گئی تھی ان لوگوں نے اپنے گھروں سے اپنے سامان کے ساتھ یہاں تک کا سفر پیدل ہی طے کیا تھا۔

آمنہ زینت کا شوہر پہلے ہی اسرائیلی حملے میں مارا جاچکا تھا وہ اپنے تین بچوں کے ساتھ تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ دن نکلتا تھا تو اسے یوں لگتا تھا کہ شام نہیں ہوگی اور شام ہوتی تھی تو اس کا کٹنا محال نظر آتا تھا۔ اسرائیلی حملوں میں شدت آگئی تھی ساری بستی ان حملوں سے پریشان تھی بہت کثرت سے اموات ہورہی تھیں اور بہت سے لوگ زخمی ہوکر معذور ہوچکے تھے۔

کچھ دیر دودھ پینے کے بعد بچہ سوگیا تھا اور آمنہ زینت نے چپکے سے اس کے منہ سے دودھ کی بوتل نکال کر ایک طرف رکھ دی تھی بوتل تقریباً خالی ہوچکی تھی پھر اس نے بھی کروٹ لے لی تھی اس کی آنکھوں میں نیند آگئی تھی۔ رات بھر اس کے بچے اور اس کمرے میں موجود لوگ بے چینی سے کروٹیں لیتے رہے صبح ہوتے ہی ان کی آنکھ لگ گئی تھی پھر اذانوں کے وقت جب قریبی مسجد سے اذان کی آواز آئی تو ہال میں موجود کئی لوگوں نے کروٹ بدلی تھی وہ نماز کے لیے اٹھنے کی تیاری کررہے تھے کہ اچانک جبالیہ کی ساری فضا فضائی حملوں سے گونج اٹھی تھی یکے بعد دیگرے کئی راکٹ فائر کیے گئے تھے جس ہال میں لوگ سو رہے تھے اس پر بھی راکٹ لگا تھا اور ہال کا ایک حصہ بالکل تباہ ہوگیا تھا کمرے میں راکٹ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور ایک شور برپا ہوگیا تھا۔

"ہائے امی...... میں مرگیا۔" آمنہ زینت کا ایک بچہ تکلیف سے چیخ رہا تھا۔

"اُف خدایا...... یہ کیا ہوگیا......" قریب ہی کسی کی آواز سنائی دی تھی۔

"مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ......" یہ کسی بچی کی آواز تھی جو ملبے کے ڈھیر سے آرہی تھی شاید کچھ لوگ اس ملبے میں دب گئے تھے۔

"تم کہاں ہو ایمن...... تم کہاں ہو ایمن......" قریب ہی کسی بچی کی ماں اسے آوازیں دے رہی تھی اور بہت سے بچے بچیوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہی آوازوں کے درمیان راکٹ فائر ہونے کے بھی کئی دھماکے سنائی دیتے تھے اسکول کی عمارت بار بار لرز رہی تھی صاف ظاہر تھا کہ صبح کے اس پہر اسکول کی اس عمارت کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا تھا۔

فلسطینی اسکاؤٹس کے چند لڑکے ادھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے انہوں نے اپنے اسکاؤٹ کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں اس وقت ان کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں اور اپنے کام کا کہاں سے آغاز کریں۔ اس حادثے کی اطلاق کیسے ذمہ دار لوگوں تک پہنچائیں اور اپنے زخمیوں اور مرنے والوں کو کیسے اسپتالوں تک پہنچائیں۔

کچھ ہی دیر میں اسپتالوں کی کچھ ایمبولینسز سائرن بجاتی وہاں پہنچ گئی تھیں اور ان اسکولوں کا انچارج ابوجلابیہ حسین بھی موقع پر پہنچ گیا تھا جسے یو این نے اس علاقے میں اپنے اسکولوں کی چین کا انچارج بنایا تھا۔

شاید راکٹوں کے دھماکوں نے انہیں اطلاع دے دی تھی کہ حملہ کہاں ہوا ہے اور کتنا شدید ہوا ہے جب ابو جلابیہ الحسین وہاں پہنچا تھا تو اسکول کے داخلی دروازے پر دو بوائے اسکاؤٹس اپنی وردیوں میں ملبوس ہاتھوں میں پلاسٹک کے شاپرز اٹھائے ملبے کے ڈھیر سے انسانی جسموں کے بکھرے اعضا تلاش کررہے تھے اور ان شاپروں میں ڈالتے جارہے تھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس

حادثے میں کتنے لوگ مارے جاچکے ہیں۔

اسپتالوں کی ایمبولینسز کے ساتھ ساتھ مختلف ٹی وی چینلز اور پرنٹ میڈیا کی ٹیمیں بھی جائے حادثہ پر پہنچ گئی تھیں اور انہوں نے اپنے طور پر اس واقعے کی کوریج شروع کردی تھی ایک ٹی وی چینل کی ٹیم نے ابو حلابیہ الحسین کو گھیر لیا تھا۔

''یاسیدی! آپ بتائیں جب آپ یہاں پہنچے تو آپ نے کیا دیکھا؟'' ایک رپورٹر نے اس سے پوچھا اس کے چہرے پر غیر اطمینان کے آثار تھے۔

''میں یہ سب کچھ دیکھ کر کانپ گیا ہوں۔....'' ابو حلابیہ نے بتایا۔ ''اندر ہال میں بھی گیا تھا وہاں عورتیں اور بچے تھے وہاں بہت تباہی ہوئی ہے۔'' اس نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

''جناب ہماری اطلاع کے مطابق یہاں بے سرو سامان اور نہتے عورتیں اور بچے پناہ گزین تھے پھر ان پر بمباری کیوں کی گئی' کیا اسرائیلی فوجیوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں صرف عورتیں اور بچے ہیں جن کے پاس ضروریات زندگی کا سامان بھی پورا نہیں۔'' ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

''ہاں یہ بہت افسوس کی بات ہے ہم نے اسرائیلی فوجیوں کو بار بار انتباہ کیا تھا کہ یہ پناہ گزینوں کا کیمپ ہے اور یہاں لوگوں نے اسرائیلی فوجیوں ہی کے کہنے پر پناہ لی تھی۔'' ابو حلابی نے بتایا۔

''اب آپ اس سلسلے میں کیا کریں گے؟ کیا اس مسئلے کا آپ کی نظر میں کوئی حل ہے؟'' حلابی سے پوچھا گیا۔

''ہم نے بہت کوشش کی ہے کہ امن ہوجائے اور اسرائیل اس جنگ کو بند کردے لیکن یہ اس کی ہی طرف سے مسلط کی گئی ہے اور وہ اسے بند کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں اور بار بار جنگ بندی کی خلاف ورزی کررہا ہے۔'' ابو حلابی کے انداز سے بے چارگی عیاں تھی ٹی وی چینلز کے لیے ابو حلابی سے سوالات کرنے کے بعد اسکول کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے تھے جہاں

اسرائیل کے راکٹوں سے ہونے والی تباہی یہاں موجود پناہ گزینوں کی درد بھری داستان سنا رہی تھی' کیمرے اس ہال میں ہونے والی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھ میں محفوظ کرنے لگے اور رپورٹرز ہال میں موجود لوگوں کی طرف بڑھے جن کو امدادی ٹیمیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کررہی تھیں۔

ہال میں جگہ جگہ وہ سامان بکھرا پڑا تھا جو پناہ گزین بچے اور عورتیں اپنے ساتھ لائے تھے ان میں بچوں کے کھیلنے کی پلاسٹک کی گیندیں' گڑیائیں' دودھ کی بوتلیں' پانی کی بوتلیں' ٹوکریاں جن میں کچھ دیر پہلے کچھ کھانے پینے کی اشیاء پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ ہال کی چھت کا ایک حصہ جو ٹوٹ کر نیچے گر گیا تھا اس کے علاوہ ہال کے ملبے کے ساتھ ساتھ راکٹوں کے پھٹنے سے پھیلنے والا بارود اور ٹکڑے پڑے تھے جن کے درمیان مرنے والوں کی لاشیں اور زخمی موجود تھے جنہیں نکالنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

سورج آہستہ آہستہ رات کی اوٹ سے اپنا چہرہ نکال رہا تھا' فضا میں ایک اداس سا اجالا پھیلا ہوا تھا اور ہال میں موجود منظر کو اب صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ اچانک ہی ایک رپورٹر کی نظر آمنہ زینت پر پڑی اور وہ اس کی طرف بڑھا' آمنہ نے اپنے تینوں بچوں کو سمیٹ کر ایک جگہ بٹھایا ہوا تھا' دو بچے اس سے چمٹے ہوئے تھے اور تیسرا آٹھ ماہ کا بچہ اس کی بانہوں میں دبکا ہوا تھا وہ ایک قدرے تاریک گوشے میں چھپی ہوئی تھی اس کا چہرہ اور بال دھول اور گرد سے اٹے ہوئے تھے اس کے اور بچوں کے جسموں پر زخم تھے جن سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا آٹھ ماہ کا بچہ جو اس کی بانہوں میں دبکا ہوا تھا بے جان تھا۔ آمنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے آنے والوں کو گھور رہی تھی' بچے کو اس نے خود سے یوں چمٹایا ہوا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے چھین کر بھاگ جائے گا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے رپورٹرز نے اس سے سوال کرکے مائیک اس کی طرف بڑھایا تاکہ وہ جواب دے سکے۔

''تم کون ہو.....؟ تمہارا نام کیا ہے؟'' اس سوال پر آمنہ زینت گھبرا کر اور کونے میں دبک گئی تھی اس نے اپنے بچوں کو اور قریب کرلیا تھا۔

''ڈرو نہیں' ہمیں بتاؤ تم کون ہو؟'' رپورٹر نے پھر سوال کیا۔

''اس نے کچھ نہیں کیا' یہ صرف دودھ مانگ رہا تھا۔ میں نے اسے شور بھی نہیں کرنے دیا تھا' سلادیا تھا اس نے کچھ نہیں کیا..... اس نے کچھ نہیں کیا.....'' وہ دیوانوں کی طرح بولے جارہی تھی۔

''سنو..... میری بات سنو..... ہمیں بتاؤ تم کون ہو؟ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے' ہم تمہاری مدد کریں گے۔'' اسے خوفزدہ دیکھ کر ایک خاتون رپورٹر اس کے قریب آگئی اور ہمدردانہ لہجے میں اس سے پوچھا اس کے اس انداز پر آمنہ رونے لگی۔

''وہ میرے بچوں کو ماردیں گے؟'' وہ بے تحاشہ رو رہی تھی۔ ''وہ بھوکے ہیں' انہوں نے کھانا نہیں کھایا' میں نے سب کو بھوکا ہی سلادیا تھا۔'' اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''تم یہاں کب سے تھیں؟'' خاتون رپورٹر نے پوچھا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی گود میں جو بچہ تھا وہ بے حس و حرکت تھا' شاید وہ مرچکا تھا اس نے سوال پوچھنے کے ساتھ ساتھ بچے کو بھی اس سے لینے کی کوشش کی۔

''نہیں..... یہ سو رہا ہے' اسے سونے دو اگر یہ اٹھ گیا تو پھر رونے لگے گا۔ یہ بھوکا ہے.....'' آمنہ زینت نے کہا۔

''اچھا میں اسے نہیں لیتی تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کب سے ہو؟'' خاتون رپورٹر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''ہم یہاں چار دن سے ہیں' ہمیں اسرائیلی فوجیوں نے کہا تھا کہ اپنے گھر خالی کردو یہاں خطرہ ہے ہم نے گھر خالی کردیئے اور یہاں آگئے۔'' آمنہ زینت نے بتایا۔

''لیکن یہ جگہ تو محفوظ ثابت نہیں ہوئی۔'' خاتون رپورٹر نے کہا۔

''لیکن سارے غزہ کا یہی حال ہے' ہر جگہ ایک سی ہی ہے۔ کہیں بھی چلے جاؤ پھر ہم اپنے گھر ہی کیوں نہ چلے

جائیں؟" آمنہ زینت نے پوچھا جس کا خاتون رپورٹر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ کیمرے کی طرف مڑ گئی تھی اور اپنے تاثرات ریکارڈ کروانے لگی تھی۔

اس حادثے میں زخمی ہونے والی خواتین اور مردوں نے اسکول کے باہر کے احاطے میں اس علاقے کے یو این اسکولوں کے انچارج ابوحلابی الحسین کو گھیر لیا تھا وہ سب ہی بہت غصے میں تھے۔

"ہم یہاں بھی محفوظ نہیں ہیں' ہمارا قصور کیا ہے۔ تم ہماری مدد نہیں کررہے ہو..... تم بھی ان کے ساتھی ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے' مجھ سے جو کچھ ہورہا ہے میں کررہا ہوں۔" حلابی نے جواب دیا۔

"اس حملے میں پندرہ لوگ مارے گئے ہیں اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے ہیں آخر یہ سب کب تک ہوگا۔" ایک اور شخص غصے میں چیخا۔

"آپ لوگ اندازہ نہیں لگا سکتے میرے لیے یہ سب بہت مشکل ہے کہ میں یہاں مرنے والوں اور زخمیوں کا پڑا ہوا خون دیکھوں اور ان کی دل ہلا دینے والی چیخیں سنوں' جو بے قصور ہیں' عام شہری ہیں..... میں سب کی لیے غمزدہ ہوں میں نے تو آپ کو محفوظ کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔"

"آپ نے اس سلسلے میں اور کیا کیا؟" ایک اور شخص نے پوچھا۔

"ہم نے بین الاقوامی امن کمیٹی سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ اسرائیل کو پابند کرے لیکن اسرائیل بین الاقوامی وایوئیشین قانون کی خلاف ورزی کررہا ہے۔" ابو حلابی نے تاسف سے کہا اس کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے۔

"اسرائیلیوں نے رات کے اندھیرے میں سوتے ہوئے نہتے لوگوں پر بمباری کی ہے' انہوں نے تقریباً پانچ راکٹ اس اسکول پر مارے ہیں۔" ابوحلابی کے لہجے میں بھی غصے کی جھلک نمایاں تھی۔

کچھ ہی دیر میں مختلف اسپتالوں سے آنے والی ایمبولینسز زخمیوں اور مرنے والوں کو لے کر روانہ ہوگئی تھیں اور ٹی وی کوریج کرنے والی ٹیمیں بھی اپنا کام مکمل کرنے میں مصروف تھیں' آمنہ زینت کو بھی ایک ایمبولینس میں اس کے بچوں کے ساتھ زبردستی بٹھایا گیا تھا وہ کسی صورت بھی بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس نے اپنی بانہوں میں پکڑے ہوئے مردہ بچے کو بھی کسی کے حوالے کرنے سے انکار کردیا تھا اسے اس کے بچوں کے ساتھ علاقے کے ایک اسپتال میں منتقل کردیا گیا تھا جہاں ان کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ وہ کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی اسپتال میں خود کو اور بچوں کو طبی امداد ملنے کے بعد اسے کچھ سکون ملا تھا تو وہ سوگئی تھی اس وقت اسپتال کی انتظامیہ نے اس کے مردہ بچے کو لے کر سرد خانے میں پہنچادیا تھا۔

آمنہ زینت کی آنکھ کئی گھنٹوں بعد کھلی تھی اس کے بچے دوسرے وارڈ میں تھے اس نے آنکھ کھلتے ہی انہیں دیکھنے کی ضد کی تھی تو ایک سسٹر اسے بچوں کے وارڈ میں لے گئی تھی جنہیں صحیح سلامت دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا لیکن پھر اسے اپنی گود کے آٹھ ماہ کے بچے کا خیال آگیا تھا۔

"وہ..... میرا چھوٹا بیٹا..... میرا بچہ کہاں ہے؟" وہ سسٹر کی طرف دیکھ کر چیخی۔

"وہ..... وہ....." جو سسٹر اسے اپنے ساتھ لائی تھی اسے بتاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"وہ..... وہ کیا..... وہ کہاں ہے؟" آمنہ زینت نے پوچھا۔

"وہ..... سرد خانے میں ہے....." سسٹر نے کہا تو آمنہ غصے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا کہا..... سرد خانے میں..... کیوں؟" آمنہ نے پوچھا۔

"وہ مرچکا تھا۔" سسٹر نے کہا۔

"نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا..... وہ ٹھیک تھا میں نے خود اسے دودھ پلایا تھا..... میں نے خود اسے سلایا تھا۔" آمنہ نے غصے اور بے چارگی کے ملے جلے انداز میں کہا۔

''صبر کرو بہن! اللہ کی مرضی یہی ہے۔'' سسٹر نے اسے دلاسہ دیا۔

''اس کا قصور کیا تھا؟'' آمنہ چیخی۔

''کچھ نہیں' تمہارا قصور کیا تھا...... تمہارے شوہر کا قصور کیا تھا' تمہارے ان دونوں بچوں کا قصور کیا تھا...... کچھ نہیں؟'' سسٹر نے بے چارگی سے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو' کچھ نہیں...... یہی ہمارا قصور ہے' ہم نے اپنی حفاظت نہیں کی۔ یہی ہمارا قصور ہے ہم نے اس وقت کے لیے کوئی تیاری نہیں کی' یہی ہمارا قصور ہے جبکہ اسرائیل کی تیاریاں...... جب سے وہ بنا' وہ وجود میں آیا 1948ء میں بلکہ اس سے بھی پہلے سے اس کی تیاریاں جاری ہیں اور ہم...... ہم سوتے رہے' خواب خرگوش میں۔ بے خبر رہے' آنے والے خطروں سے' ہم نے کچھ نہیں کیا' یہی ہمارا قصور ہے۔'' آمنہ بولے جارہی تھی اور سسکیاں لے رہی تھی۔

''آج شام کو آپ کی اور آپ کے بچوں کی اسپتال سے چھٹی ہوجائے گی۔'' سسٹر نے بتایا۔

''ہم کہاں جائیں گے؟'' آمنہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''ہم آپ کو زیادہ عرصے یہاں نہیں رکھ سکتے' آپ کے اور آپ کے بچوں کے زخم گہرے نہیں تھے ان کو کیور کرویا گیا ہے اسپتال میں اب بھی شدید زخمی آرہے ہیں جن کے لیے یہاں بیڈ نا کافی ہیں اس لیے جنہیں علاج دے دیا گیا ہے انہیں فارغ کیا جارہا ہے۔'' سسٹر نے تفصیل سے بتایا۔

''لیکن ابھی ہم ٹھیک نہیں۔'' آمنہ نے کہا۔

''ٹھیک ہوجاؤ گے' ابھی آپ سے زیادہ شدید زخمیوں کو دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔''

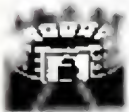
''ہم کہاں جائیں گے؟'' آمنہ نے پوچھا لیکن اس کی اس بات کا سسٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں اپنے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ جبالیہ کے اس اسکول میں جسے یو این نے ہمارے لیے پناہ گاہ بنایا تھا یا اپنے گھر جو اب ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے یا غزہ کی سڑکوں پر......'' آمنہ زینت نے پوچھا لیکن اس کے سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اسی شام آمنہ زینت کو اور اس کے بچوں کو اسپتال سے فارغ کردیا گیا تھا اور اس کے آٹھ ماہ کے بچے کی لاش بھی اس کے حوالے کردی گئی تھی وہ سوالیہ نظروں سے اسپتال کے عملے کو دیکھتی ہوئی اپنے بچوں کے ساتھ باہر سڑک پر آگئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اس چھوٹے سے قبرستان میں کھڑی تھی جہاں جبالیہ کے علاقے کے لوگوں نے اپنے طور پر اپنے مرنے والوں کو دفن کردیا تھا وہیں اس نے بھی اپنے بچے کو ایک چھوٹی سی قبر کھود کر دفن کردیا تھا اور اپنے دو بچوں کے ساتھ بہت دیر تک وہاں بیٹھی روتی رہی تھی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کبھی اپنے بچے کو یوں بے سرو سامانی میں دفن کرنا پڑے گا جب اس کا ساتھ دینے والا کوئی بھی اس کا اپنا اس کے ساتھ نہیں تھا اطراف میں کئی لوگ اپنے اپنے مرنے والوں کی قبروں کی مٹی درست کرنے میں مصروف تھے اور کچھ فاتحہ خوانی بھی کررہے تھے۔

کافی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد آمنہ زینت اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لیے قبرستان سے باہر آگئی تھی جہاں نہ اس کا شوہر اس کا منتظر تھا نہ ابوحلابی جس نے اس کو اسکول میں پناہ فراہم کی تھی وہ اپنے بچوں کے ساتھ تنہا وہاں سے روانہ ہوگئی تھی نامعلوم منزل کی طرف...... اس نے کچھ نہیں کہا تھا' یہی شاید اس کا قصور تھا اور اس قصور کی پاداش میں وہ انجانی منزلوں کی طرف رواں تھی...... شاید ایک نئے پناہ گزینوں کے کیمپ کی طرف؟



آخری حصہ

مستقبل ساز

خورشید پیرزادہ

انسان کو رب تعالیٰ نے اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر دنیا میں اتارا اسے عقل و شعور کے ہتھیار سے لیس کیا۔ پھر جس نے بھی ودیعت کردہ اس صلاحیت کو استعمال کیا اس نے کائنات کے سربستہ رازوں تک رسائی حاصل کرلی۔

وہ بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا لیکن کوئی اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔

کمپیوٹر کی دنیا کے ماہر سائنس دان کا احوال، اس نے مستقبل کو اپنے تابع کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔

نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص ایک خوب صورت ناول جس کی ہر سطر آپ کو چونکا دے گی۔

"اور تم نے اپنا کام نہایت خوبی سے کر دکھایا۔ میری نظروں میں میری وفادار بن کر مجھے وہاں سے نکال لائیں۔ اب یاد آرہا ہے مجھے اب یاد آرہا ہے مجھے کہ واپس لوٹ جانے کے لیے اور اپنے شوہر سے وفا کرنے کے لیے میں نے تمہیں کتنا کہا تھا مگر تم نہیں مانی تھیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس لمحے بھی تم اپنے شوہر سے ہی وفا کر رہی تھیں۔ اپنے بچپن کے دوست کو بے وقوف بنا رہی تھیں۔"

"مگر یہ تو سوچو کاشی کہ یہ سب میں نے' بلکہ ہم نے کیوں کیا؟" انیتا نے بھی بلند آواز میں چیختے ہوئے کہا۔

"ہم نے یہ سب تمہارے بھلے کے لیے کیا تھا۔ تمہاری حفاظت کو دھیان میں رکھتے ہوئے کیا تھا۔ ذرا سوچو کہ امیر جان سے بدلہ لینے کے لیے تم نے اس کی طرف بڑھنا تو تھا ہی اکیلے بڑھتے تو تم کسی بھی لمحے اس کے چنگل میں پھنس سکتے تھے اور ان حالات میں پوری سی آئی اے کی طاقت تمہارے پیچھے تھی۔"

"عمران نے تم کو یہ پٹی پڑھائی اور تم نے آنکھیں بند کر کے پڑھ لی۔"

"تو اس میں غلط بھی کیا ہے؟"

"غلط یہ تھا میری بچپن کی دوست کہ سی آئی اے مجھے اپنا مہرہ بنائے ہوئے تھی۔ مجھے آگے رکھ کر داؤ کھیل رہی تھی اور اس کے لیے انہوں نے تمہیں پٹی پڑھا کر استعمال کیا۔ وہ پٹی جسے تم ابھی بھی گائے جا رہی ہو۔"

جواب میں انیتا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کمرے کے باہر کوریڈور میں بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ابھی کاشف ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر زور سے دھکا مارا اور کسی نے تیز آواز میں اسے للکارا۔

"دروازہ کھول دو۔ ورنہ توڑ دیا جائے گا۔"

کاشف نے پہچان لیا کہ آواز عمران کی تھی۔

"وہ لوگ پہنچ گئے صاحب۔" خدا جانے کہا۔

"مگر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان حالات سے نمٹنے کا آپ کے پاس خاص انتظام ہے۔ کوئی آپ کا بال بھی بانکا نہیں کر پائے گا۔"

"کیا مطلب۔" بھناتے ہوئے کاشف نے کہا۔

"آپ کے پارسل میں ایک چشمہ ہوگا۔ اسے پہن لیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"مجھے نہیں پتہ صاحب کہ کیا ہوگا۔ لیکن اب تک ہر قدم پر وہی ہوا ہے جو سرتاج نے کہا تھا تو یقیناً آگے بھی

وہی ہوگا۔" خدا جانے نے کہا۔

"آپ چشمہ پہن لیجئے۔"

باہر سے دروازے کو توڑنے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔ اور قریب تھا کہ دروازہ کسی بھی وقت ٹوٹ کر گر پڑے۔

"چشمہ پہن لیجئے صاحب۔ میں اپنا کام شروع کرنے والا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے خدا جانے نے اپنی پینٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا دستی بم نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

"یہ کیا ہے۔" بم دیکھتے ہی کاشف کی چیخ نکل گئی۔

"تماشہ دیکھتے رہیں صاحب۔ بس چشمہ پہن لیں۔"

کاشف نے پارسل کھول کر اس میں چشمہ نکالا تو انیتا چیخ پڑی۔

"کاشی اس کی بات مت مانو۔ بے وقوفی مت کرو۔ خود کو سی آئی اے کے حوالے کر دو ورنہ تم مصیبت میں۔"

"اس کی نہیں تو کیا تمہاری بات مانوں۔ تم جو مجھے ہر قدم پر الو بناتی چلی آئی ہو۔" کاشف نے اپنی آنکھوں پر چشمہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

"کاشی! سمجھنے کی کوشش کرو' تم پھنس جاؤ گے' یہ تمہیں ہماری حفاظت سے نکالنے کی کوئی سازش ہے۔" انیتا اب بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ کاشف اس کے جواب میں کچھ کہتا' دو کام ایک ساتھ ہو گئے۔

پہلا تو یہ کہ کمرے کا دروازہ دھڑام کی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر کمرے کے فرش پر بکھر گیا۔

دوسرا یہ کہ ٹھیک اسی وقت خدا جانے نے دستی بم جیسا وہ آلہ دروازے کی طرف اچھال دیا۔ دھماکہ تو کوئی نہیں ہوا لیکن فرش سے ٹکراتے ہی وہ بم پھٹ گیا۔

ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ کمرے کے اندر بھی اور باہر بھی۔ سفید رنگ کے دھوئیں کی دبیز چادر نے ہر چیز کو جیسے ڈھک سا لیا تھا اور کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

یہ بات کاشف نے تب محسوس کی جب اس نے عمران اور اس کے ساتھیوں کو کمرے کے بیچ اندھوں کی طرح بھٹکتے دیکھا۔ وہ کئی بار ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

مگر کاشف کو حیرت اس بات پر تھی کہ اسے سب کچھ صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ دھواں بھی اور اس میں ہاتھ پاؤں مارتے عمران اور اس کے ماتحت بھی۔ وہ عمران سمیت تین افراد تھے اور تینوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ مگر وہ نشانہ کسے بناتے۔ کوئی نظر آتا تب نا۔

کاشف نے چشمہ اتار لیا۔ اب اسے بھی دوسروں کی طرح کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چشمہ پہنے ہوئے جو دھواں اسے سفید نظر آیا تھا وہ اب سیاہ رنگت لیے نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سیاہ دھوئیں کی ایک دیوار سی کھڑی کر دی گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی آنکھوں میں تیز جلن بھی ہونے لگی۔ اس نے فوراً چشمہ پہن لیا اور دھوئیں کا رنگ پھر سفید ہو گیا۔

اب وہ دوبارہ عمران اور اس کے ماتحتوں کو دیکھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی خدا جانے کو بھی۔

خدا جانے ہاتھ میں اسی بم جیسی ایک اور ڈیوائس ہاتھ میں لیے اندھوں کی طرح یوں دروازے کی طرف کھسک رہا تھا جیسے کوئی اندھیرے کمرے سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

کاشف نے آرام سے آگے بڑھ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ خدا جانے نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ ہی ہیں نا صاحب؟"

"ہاں۔" کاشف نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا۔

"ایک بار پھر وہی ہوا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ مجھے یہاں سے نکال کر لے جائیں گے۔"

"اس نے کہا تھا" کہنے پر کاشف ایک بار تو بری طرح سے جھنجھلا گیا۔ چاہا کہ اسے یہیں چھوڑ کر نکل

جائے مگر فوراً دماغ میں خیال آیا۔

"یہی تو ہے وہ کڑی جو بتائے گی کہ اس کے ملنے سے اب تک جو ہوا اس کا راز کیا ہے۔"

اس لیے وہ اسے یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا' وہ اس کا ہاتھ پکڑے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ریوالور ہاتھ میں لیے اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا عمران چلا کر بولا۔

"کاشف! اگر تم نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"گدھا کہیں کا۔" خدا جانے کی بڑبڑاہٹ صرف کاشف کے کانوں تک ہی پہنچ سکتی تھی۔

"نظر تو کچھ آ نہیں رہا اور گولی مار دے گا۔"

کاشف اسے لیے ہوئے دھوئیں کی دیوار کو پار کرتا چلا گیا۔

"جگی۔ افضل۔ دروازے کے آس پاس رہو۔" عمران ایک بار پھر چلایا۔

"وہ باہر نکلنے کی کوشش کرے گا۔"

"اندازہ نہیں ہو رہا ہے سر کہ دروازہ کس سمت میں ہے۔" خود کو گرنے سے بچانے کے انداز میں لڑکھڑاتے جگی نے کہا۔

"پتہ نہیں سالے نے کس قسم کا دھواں پھیلایا ہے۔ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔"

"آنکھوں میں جلن بھی ہو رہی ہے۔" افضل کی آواز آئی۔

جس وقت وہ یہ سب کہہ رہا تھا عین اسی وقت خدا جانے کا ہاتھ پکڑے کاشف اس کے برابر سے نکل کر کوریڈور میں پہنچا تھا۔ وہاں دھوئیں کی تہہ کچھ کم تھی۔ عمران دروازے کے قریب ہی ادھر ادھر ہاتھ مار رہا تھا۔ کاشف کو جانے کیا شرارت سوجھی کہ اس کے ہاتھ میں دبے ریوالور کی پروا کیے بغیر ایک زوردار تمانچہ اس کے گال پر جڑ دیا۔ تمانچہ اتنی زور کا تھا کہ وہ چیخ کر پیچھے کی طرف جا گرا۔ اس کی انگلی حرکت میں آ گئی اور فضا میں گولیوں کی آواز گونج اٹھی۔ اندھا دھند چلائی گئی گولیاں اس دھند نما دھوئیں کو چیرتی چلی گئیں۔

"مجھے کچھ نظر آنے لگا ہے صاحب۔ اس لیے۔"

دھیمی آواز میں بڑبڑانے کے ساتھ خدا جانے نے دوسرا بم بھی فرش پر پٹخ دیا اور اس وقت تو خود کاشف کے حلق سے بھی چیخ نکل گئی جب ایک کراہ کے ساتھ اس نے خدا جانے کو زمین پر گرتے دیکھا۔

اس کا ہاتھ چونکہ کاشف کے ہاتھ میں تھا اس لیے کاشف نے اسے گرنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن خدا جانے کا جسم کٹے درخت کی طرح زمین پر گرتا گیا۔ اس کا جسم کچھ اس طرح بے جان ہو کر گرا کہ اگر کاشف اس کا ہاتھ چھوڑ نہ دیتا تو خود بھی اس کے ساتھ گر جاتا۔

اس نے زمین پر ڈھیر خدا جانے کا جائزہ لیا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ سچ ہے۔ خدا جانے کی کھوپڑی تربوز کی طرح کھلی ہوئی تھی اور چاروں طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔

اور یہ کمال تھا عمران کے ریوالور سے نکل کر بھٹکتی ہوئی گولی کا۔ وہ خود کو یقین ہی نہیں دلا پا رہا تھا کہ وہ خدا جانے جس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

ادھر دھوئیں کے اندھیرے میں بھٹکتا عمران ریوالور خالی ہونے کے بعد بھی پاگلوں کی طرح ٹرائیگر دبائے چلا جا رہا تھا۔

ادھر کاشف کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی کہ جس سرتاج نے خدا جانے کو اتنا سب کچھ بتایا تھا۔ کیا اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا انجام اس طرح سے ہوگا؟



"ہاں صدیقی۔ کچھ ہوا؟" لیبارٹری میں داخل ہوتے ہوئے امیر جان نے جب یہ سوال کیا تو اس کا

لہجہ کافی تلخ ہو رہا تھا اور یہ تلخی کاشف کی بنائی ہوئی مشین کے سرکٹ کو سمجھنے میں لگے سرتاج کو چونکا گئی۔ وہ چونک کر امیر جان کی طرف گھوما اور گھومتے ہی اسے مزید چونکنا پڑا کیونکہ امیر جان کا چہرہ سرخ آگ کا گولہ بنا ہوا نظر آرہا تھا۔ سرتاج نے اسے آج سے پہلے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ دشمن کو شوٹ کرتے وقت بھی نہیں۔

''کیا بات ہے سر؟'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں کیا لگتی ہے؟'' امیر جان نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

''میں نے آپ کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا۔''

''تم نے ابھی ہمارا غصہ دیکھا ہی کہاں ہے صدیقی۔'' امیر جان نے قدرے بلند لہجے میں کہا۔

''غصہ تو تب دیکھو گے جب تم ہم سے جھوٹ بولنے کی کوشش کرو گے۔''

''جی میں سمجھا نہیں۔'' صدیقی تین سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔

''بھلا میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔''

''ہاں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے۔ بھلا تم ہم سے جھوٹ کیوں بولنے لگے ہمارے وفادار جو ٹھہرے۔'' یہ کہتے ہوئے امیر جان نے جیسے اپنے لہجے پر قابو پالیا تھا۔ اس نے جیب سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔ اور کش لگاتا ہوا میز کے ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دوسری پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آؤ بیٹھو۔ ہمیں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

چہرے پر تجسس کے تاثرات لیے صدیقی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے امیر جان کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

''ہمت خان کی رپورٹ کے مطابق' کے سمانا ہوٹل میں کاشف کسی خدا جانے نامی آدمی سے ملا تھا۔'' امیر جان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس نے کاشف سے کہا کہ انیس اگست کو اسے ایک آدمی ملا تھا جس نے اسے اسی دن بتا دیا تھا کہ آج یعنی چھبیس اگست کو اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا اور مزے کی بات یہ ہے کہ کاشف کے ساتھ وہی سب ہوا بھی۔''

''کک..... کیا بات کر رہے ہیں سر آپ؟'' صدیقی بھی دوسروں کی طرح حیران نظر آرہا تھا۔

''بھلا ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟''

امیر جان نے صدیقی کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''پھر اس نے کاشف کو اس آدمی کا نام بھی بتایا۔''

''نن..... نام بتایا۔'' سرتاج صدیقی دنگ رہ گیا۔

''یہ پوچھو کہ اس نے کس کا نام بتایا؟''

''کک..... کس کا نام بتایا؟''

''تمہارا۔'' امیر جان نے ایک جھٹکے سے صدیقی کے سر پر بم پھوڑتے ہوئے کہا۔

''مم..... میرا.....'' صدیقی اس طرح اچھلا جیسے اچانک ہی اس کی کرسی چولہے پر رکھے گرم توے میں تبدیل ہوگئی ہو۔

''پھڑ کو مت۔'' امیر جان نے کہا۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

''لل..... لیکن سر۔ میرا نام کیسے لیا اس نے؟'' سرتاج صدیقی کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔

''اس نے صرف نام ہی نہیں بتایا۔'' امیر جان نے ایک اور کش لیتے ہوئے کہا۔

''اس نے تمہارے نام سے لکھا ہوا ایک لیٹر بھی کاشف کو دیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ انیتا اپنے شوہر سے بغاوت کرکے اس کے پاس نہیں آئی بلکہ شوہر کے لیے ہی کام کر رہی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ بات بھی سچ نکلی۔''

''مم..... میری سمجھ سے تو یہ تمام باتیں اوپر ہیں سر۔'' سرتاج کو کاٹو خون نہیں۔

''اور کہیں آپ ان سب باتوں کو سچ تو نہیں مان رہے ہیں۔''

''نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔''

''مطلب؟''

''ہم اس کی کہی ہوئی باتوں اور اس لیٹر کو جھوٹ کیوں مانیں؟''

''بب...... بھلا میں ایسا کیوں کروں گا۔''

''یہی' بالکل یہی جاننا چاہتے ہیں ہم۔'' امیر جان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ کیا برا کیا تھا ہم نے تمہارے ساتھ؟''

''میں نے ایسا نہیں کیا سر۔''

''تو اس نے تمہارا نام کیوں لیا۔'' یوں لگ رہا تھا جیسے امیر جان اس کے چہرے پر ابھرنے والے ایک ایک تاثر کو پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

''اور لیا تو تمہارا ہی نام کیوں لیا۔ اسے کیا دشمنی تھی تم سے' اس کے پاس ایسا لیٹر کہاں سے آ گیا جس پر نیچے تمہارا نام لکھا تھا۔''

''اس بارے میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن۔''

صدیقی کو اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑنا پڑا اور وجہ تھی امیر جان کا اس کی طرف دیکھنے کا انداز۔ جو صاف صاف کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی بات سن ضرور رہا ہے لیکن یقین ذرا بھی نہیں کررہا۔

''رک کیوں گئے؟ بات پوری کرو۔'' امیر جان نے اسے ٹوکا۔

''تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''سوچنے کی بات یہ ہے سر کہ اگر اس سے ملنے والا آدمی میں ہی ہوتا تو میں اس سے اپنے نام کو چھپانے کے لیے کہتا یا بتانے کے لیے؟ اور اگر مجھے کوئی لیٹر دینا ہی ہوتا تو اپنے نام سے دینے کی بے وقوفی کیوں کرتا' کیا اسی لیے کہ وقت آنے پر آپ مجھ پر اسی طرح سے شک کریں؟''

''مطلب۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ حقیقت میں یہ کام کسی اور کا ہے۔ کسی ایسے شخص کا جو تمہیں ہمارے شک کے دائرے میں پھنسانے کی کوشش کررہا ہے۔''

''ظاہر ہے سر۔''

امیر جان پرسکون لہجے میں بولا۔

''مگر ہمارے خیال سے ایسا نہیں ہے۔''

''کک...... کیوں؟''

''اصلی وجہ بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تمہارے سوال کا جواب دیتے ہیں۔'' امیر جان نے کہا۔

''کاشف کے سامنے تم نے اپنا اصلی نام لینے کے لیے اس لیے کہا کہ یادداشت بھولے ہوئے کاشف کو تمہارے لیے یہ سمجھنا ضروری تھا کہ تم اس کے مددگار ہو۔ وہ لیٹر بھی اسی وجہ کا نتیجہ تھا۔ تم نے اتنی ہمت اس لیے کی کیونکہ' نمبر ایک۔ اس وقت تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خدا جانے اور کاشف کے مابین ہوئی باتیں ہم تک پہنچ بھی سکتی ہیں۔ نمبر دو۔ تم نے اس بات پر بھی غور کرلیا تھا کہ اگر پہنچ بھی جائیں تو تم نہیں پھنس سکو۔ اس لیے لیٹر کوڈ ورڈ میں لکھا۔ ایسے کوڈ ورڈ میں جسے صرف اور صرف کاشف ہی سمجھ سکے۔ اگر کوئی دوسرا اسے پڑھے بھی تو اس کے پلے کچھ نہ پڑ سکے۔ نمبر تین۔ یہ بات تم نے تب ہی سوچ لی تھی کہ ساری تدبیر کے بعد بھی اگر بات کھل گئی تو تم یہی کہو گے کہ اگر یہ سب میں نے کیا ہوتا تو خدا جانے سے اپنا اصلی نام لینے کے لیے کیوں کہتا۔ یا وہ لیٹر اپنے نام سے کیوں لکھتا؟''

''مم...... مطلب آپ میری کسی بھی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں۔'' سرتاج کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ''لگ تو یہ رہا ہے کہ آپ خدا جانے کی ساری باتوں کو سچ مان چکے ہیں۔''

''اس کی ایک نہیں۔ کئی ٹھوس وجوہات ہیں۔''

''وو...... وہ کیا؟''

''نمبر ایک۔ انیس تاریخ کو تم لاہور گئے تھے۔ اسی دن وہاں سے تم گوادر بھی گئے تھے اور پوسٹ آفس سے

کاشف کے بینک کو پارسل بھیجا گیا تھا۔''

''کک..... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ پارسل بھی میں نے ہی بھیجا تھا؟'' صدیقی متحیر لہجے میں بولا۔

''باوجود اس کے کہ یہ بات پہلے ہی واضح ہو چکی ہے کہ پارسل خود کاشف نے ہی بھیجا تھا۔ سی آئی اے والوں کے پاس اس کی رسید بھی ہے۔''

''اسی رسید کے ذریعے تو سب کو غلط ٹریک پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' امیر جان اس کی کسی دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''اس رسید کو کاشف نے صرف پُر کیا تھا۔ صرف سائن کیے تھے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ گوادر گیا تھا' ریکارڈ چیک کیا جا چکا ہے۔ انیس اگست کو کاشف یہیں تھا۔ امیر آباد میں۔ وہ باہر کہیں نہیں گیا تھا' اس کا مطلب یہ ہے کہ پارسل کے ساتھ رسید اس نے تمہارے حوالے کر دی تھی۔''

''ایسا نہیں ہے سر۔'' صدیقی گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

''میں بھلا ایسا کیوں کروں گا؟''

''تم پھر بھول گئے۔ ہم تم سے یہی بات تو جاننا چاہتے ہیں۔'' امیر جان نے اسے چبا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''آخر تم نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے سر۔'' صدیقی نے چیخ پڑنے کے انداز میں کہا۔

''میں نے ایسا نہیں کیا اور پھر انیس اگست کو میں تو اکیلا باہر نہیں گیا تھا۔ پوری بوٹ بھر کر گئی تھی۔ الوینہ اور بابر نعیم بھی گئے تھے۔''

''مگر ان میں سے کسی کے پاس وہ ذریعہ نہیں ہے جس کے بل بوتے پر وہ خدا جانے کو یہ بتا سکتے کہ چھبیس اگست کو کاشف کے ساتھ کیا ہوگا۔'' امیر جان نے کسی درندے کی طرح غراتے ہوئے کہا۔

سرتاج بالکل چپ رہا۔ اس کی سٹی گم تھی۔ چہرہ فق ہو رہا تھا۔

''جواب دو۔ کیا ان میں سے کسی کے پاس خدا جانے کو یہ بتانے کا کوئی ذریعہ تھا؟''

''نہیں۔'' سرتاج کو کہنا ہی پڑا۔

''بس' تم یہیں آ کر پھنس گئے اور ایسے پھنسے ہو کہ اپنے بچاؤ کے لیے تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور ہمارے پاس بھی اس بات کو سچ مان لینے کی یہی وجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ تم خدا جانے سے ملے تھے۔''

''مم..... مگر سر آپ سوچئے تو سہی۔ وہ سب مجھے بھی کیسے معلوم ہوگا' کاشف کے جانے سے پہلے۔''

امیر جان کا لہجہ خطرناک ہوتا چلا گیا۔

''اب تم نے یہ طے کرنا ہے کہ تم وہ سب یہاں ہمارے سامنے بیٹھ کر اتنے ہی سکون سے بتاؤ گے جتنے سکون سے ہم تم سے پوچھ رہے ہیں یا ٹارچر چیئر پر بیٹھ کر بتاؤ گے؟''

''آخر آپ میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہے ہیں؟'' سرتاج رونے جیسا ہو رہا تھا۔ اسے اپنا بھیانک انجام اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا تھا۔

''آ..... آ..... آپ مجھے ٹارچر چیئر پر بٹھائیں گے۔ آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں کہ میں ایسا کر۔''

امیر جان آگے کو جھکا اور اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا۔ ایک زور کا چانٹا سرتاج کے منہ پر پڑا جس کے زور سے وہ چیختا ہوا کرسی سمیت پیچھے کی جانب جا گرا۔

''حرامزادے۔ کتے۔ تم ہمارے خلاف سازشیں بن سکتے ہو اور ہم سے امید کرتے ہو کہ تمہارے بارے میں ایسا سوچیں بھی نہیں۔'' امیر جان کرسی سے اٹھ کر دھاڑتا ہوا بولا۔

''ہم نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ غصہ تو ہمارا تب دیکھو گے جب ہم سے جھوٹ بولو گے..... اب تم خود سمجھ چکے ہو کہ ہم بھی سمجھ چکے ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کسی اور کے پاس وہ ذریعہ ہی نہیں ہے جس کے بل

ہوتے پر یہ بتایا جا سکتا کہ کاشف کے ساتھ کب کیا ہوگا اور جھوٹ بول کر تم نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ تم باتوں کے نہیں۔ لاتوں کے بھوت ہو۔ اب تم جو بکو گے۔ ٹارچر چیئر پر ہی بکو گے۔"

سرتاج نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں سر۔"

"گارڈز۔" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے امیر جان چیخا۔

پلک جھپکتے ہی چار گارڈز لیبارٹری میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے کمانڈوز جیسی سیاہ وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے سرتاج صدیقی کو جکڑ لیا۔ سرتاج چیختے ہوئے ان کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ٹارچر روم میں لے چلو اسے۔" امیر جان نے غراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

فائرنگ کی آوازوں سے نچلی منزلوں کا تو پتہ نہیں لیکن ساتویں فلور پر افراتفری مچ گئی تھی۔ ایسی صورت میں کاشف نے فرار ہونے میں ہی بہتری سمجھی۔ کیونکہ اب ایک پل کی بھی تاخیر کا مطلب تھا خود کو پھنسوانا۔

وہ دوڑتا ہوا دھوئیں کی دیوار پار کر گیا۔ باقی کمروں میں رہنے والے اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے دھوئیں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کاشف کو دھوئیں سے نکلتا دیکھ کر کسی ایک نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

کچھ تو وہ ہڑبڑایا ہوا تھا ہی۔ کچھ گھبرانے کی ایکٹنگ کرتا ہوا وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"پتہ نہیں میرے برابر والے کمرے میں کچھ ہوا ہے مگر کیا ہوا ہے یہ میں نہیں جانتا۔"

وہ بھاگتا ہوا لفٹ ایریا کی طرف آیا' چار میں سے ایک لفٹ اتفاق سے اسی منزل پر رکی ہوئی تھی' کاشف اس میں سوار ہوا اور بیسمنٹ کا بٹن دبا دیا اور لفٹ تیز رفتاری سے نیچے کی طرف سفر کرنے لگی۔

کاشف کو ابھی بھی اپنا دل زوروں سے دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر خدا جانے کے مرنے کا منظر ابھر رہا تھا' اسے خدا جانے کی موت کا بہت افسوس ہو رہا تھا لیکن شاید اسے اب بھی یہ احساس نہیں ہو پایا تھا کہ ایک طرح سے خدا جانے کی موت کا ذمہ دار وہ خود ہے کیونکہ نہ وہ عمران کو تھپڑ مارتا اور نہ عمران بوکھلا کر فائرنگ شروع کرتا اور نہ خدا جانے اس کی بھٹکتی ہوئی گولی کا نشانہ بنتا۔

اس کے ذہن میں کئی سوال ایک ساتھ مچل رہے تھے وہ سوال جن کے جواب وہ خدا جانے سے جاننا چاہتا تھا' اس خدا جانے سے جواب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

لفٹ کے رکنے سے پہلے ہی کاشف فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی اندرونی حالت چاہے کیسی بھی ہو لیکن ظاہری طور پر اسے خود کو پرسکون ظاہر کرنا ہے تاکہ کوئی اس پر توجہ نہ دے سکے' لفٹ رکنے پر وہ باہر آیا' بیسمنٹ کے پارکنگ ایریا میں کئی نئی پرانی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

وہ گاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا بیرونی گیٹ کی طرف بڑھنے لگا' وہ جلد سے جلد ہوٹل کی عمارت سے باہر نکل جانا چاہتا تھا بغیر یہ جانے کہ اس کی اگلی منزل کون سی ہوگی۔

اچانک اس کے دماغ میں یہ خیال ابھرا کہ کاش میرے پاس گاڑی ہوتی تو' اور یہ خیال آتے ہی اسے ریموٹ والی رنگ کی یاد آئی جو اس کے پارسل میں موجود تھی۔

وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے دماغ میں کئی سوچیں ابھرنے لگیں۔

کیا اسے ریموٹ کا استعمال کرنا چاہئے؟

کیا یہاں کھڑی گاڑیوں میں سے ایک وہ گاڑی بھی

ہوسکتی ہے جس کا ریموٹ اس کے پاس ہے؟

وقت گنوائے بغیر اس نے پارسل کھول کر اس میں سے ریموٹ والی کی رنگ نکال لی اور پھر ہاتھ کو چاروں طرف گھماتے ہوئے دروازہ کھولنے والا بٹن دبانے لگا۔

اور اس وقت تو جیسے ایک پل کے لیے اس کے دل نے دھڑکنا ہی چھوڑ دیا جب ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ ایک گاڑی کی پارکنگ لائٹیں دو بار جلنے کے بعد بجھ گئیں۔

اس نے چور نظروں سے چاروں طرف دیکھا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ کوئی اس کی ذات میں دلچسپی تو نہیں لے رہا۔ وہ تیزی سے گاڑی کی طرف مڑا جو سرخ رنگ کی مرسڈیز تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور کی کار چرانے جا رہا ہو۔

قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر چابی سیلف میں لگا کر گھمائی اور دوسرے ہی پل کار کا انجن ایک غراہٹ کے ساتھ جاگ اٹھا۔

حالانکہ اس کا ذہن ابھی بھی الجھا ہوا تھا لیکن اس نے سر جھٹک کر کار کو باہر جانے والے راستے پر ڈال دیا۔ مگر باہر جانے والے راستے پر کاروں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی اور قطار لگنے کی وجہ سمجھ میں آتے ہی اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

گیٹ پر کھڑے دو اہلکار باہر نکلنے والی گاڑیوں سے پارکنگ سلپ لے رہے تھے۔ کاشف پریشان ہوگیا کہ پارکنگ سلپ کہاں سے لائے اور سلپ نہ ہونے کا مطلب یہ سمجھا جاتا کہ وہ کار چرا کر لے جا رہا ہے اور اس جرم میں اسے پکڑا بھی جا سکتا ہے۔ گاڑیاں رینگتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اب اس کی کار کے پیچھے بھی تین کاریں لگ چکی تھیں؛ جس کی وجہ سے اب وہ پیچھے بھی نہیں جا سکتا تھا اور گیٹ کی طرف بڑھتے رہنا اب اس کی مجبوری تھی۔

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے کاشف پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ گیٹ پر کھڑے باوردی گارڈ نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلایا اور وہ جانتا تھا کہ گارڈ اس سے کیا مانگ رہا ہے۔ کاشف نے کار روک کر اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ کبھی یہ جیب تو کبھی وہ جیب۔ جیسے وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے سلپ پتہ نہیں کہاں رکھ چھوڑی ہے۔

''پلیز سر' پیچھے لائن لگی ہوئی ہے۔'' گارڈ نے باادب لہجے میں کہا۔

کاشف کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل پا رہا تھا۔ جیبیں ٹٹولنے کے علاوہ وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ تبھی پیچھے والی گاڑی نے ہارن دیا۔

''یہ رہی سر۔'' گارڈ نے خود ہاتھ کار کے اندر ڈال کر اسپیڈومیٹر کے پاس رکھی چھوٹی سی سلپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

کاشف حیران پریشان کبھی گارڈ کو تو کبھی اس سلپ کو دیکھ رہا تھا۔ اور اسے کار آگے بڑھانے کا بھی ہوش نہ رہا دیر ہونے پر پچھلی کار والے نے جھنجھلا کر دوبارہ ہارن بجایا۔

سلپ دیکھ کر گارڈ نے بیریئر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جائیں سر۔''

اور کاشف نے ایک جھٹکے کے ساتھ کار آگے بڑھا دی۔

اسے ہوش اس وقت آیا جب وہ کار کو ہوٹل سے باہر سڑک پر لایا اور باہر کی ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی اور ہوا اس کے چہرے پر بہتے پسینے کو سکھانے لگی اور اس کے دل کی دھڑکنیں بھی معمول پر آنے لگیں۔

ٹریفک کے بہاؤ میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ اس کی نظر ڈیش بورڈ کی طرف گئی اور وہاں پر رکھے اپنے برانڈ کے سگریٹ پیکٹ کو دیکھ کر اس کے بدن میں سکون کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ اٹھایا تو اس کی نظر پیکٹ کے نیچے رکھے لفافے پر پڑی۔ پیکٹ اٹھاتے ہی لفافہ ہوا کے زور پر ڈیش بورڈ سے اڑ کر برابر کی سیٹ پر آ گرا۔

اس نے ایک ہاتھ سے لفافہ پکڑ لیا اور کار کے اندر کی لائٹ جلا کر لفافے کی طرف دیکھا۔ اس پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"FIHSAK"

جس کا سیدھا سادا مطلب تھا۔ "KASHIF"

یعنی یہ لفافہ اسی کے نام تھا۔ اس کے اندر لفافے کے اندر دیکھنے کی بے چینی ہو رہی تھی مگر ٹریفک کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے انڈیکیٹر دیا اور دھیرے دھیرے کار فٹ پاتھ کی طرف سرکانی شروع کی' اسے اتنی بے چینی ہونے لگی تھی کہ لفافے کے چکر میں اب وہ سگریٹ پینی بھی بھول گیا تھا۔

کنارے پر آ کر اس نے کار روک کر انجن بند کیا اور لفافے کو چاک کیا۔ اندر سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اس پر صرف ایک ہی لائن لکھی ہوئی تھی جو اسی کوڈ ورڈ میں تھی۔

"ANEEVLA - RAAB AK RAHOMLUG LETOH"

اس لائن کو پڑھتے ہی کاشف پر حیرت کا ایک اور دورہ پڑ گیا۔ وہ لائن کا پورا مطلب سمجھ چکا تھا اور اب دماغ میں یہ کشمکش چل رہی تھی کہ اسے اس پیغام پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں کہ اچانک کسی نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور ابھی کاشف کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ کاغذ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس نے جلدی سے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا تو ایک انسانی سایہ کار کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا چکا تھا اور اب وہ کاغذ چھیننے والا مخالف سمت میں دوڑتا چلا گیا۔

"چور...... چور...... چور...... پکڑو...... پکڑو...... پکڑو۔" کاشف چلاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا اور وہ آدمی موقع دیکھ کر سڑک پار کر گیا۔ کاشف نے سڑک پار کرنی چاہی مگر ٹریفک کی نئی لہر کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پایا۔

جب ٹریفک کی لہر کچھ تھمی تو وہ ہاتھ جھٹک کر رہ گیا۔ کیونکہ اب سڑک پار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کاغذ چھیننے والے کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔



کاشف کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے قدم جہاں تھے تہاں رک گئے اور اس کی آنکھیں اس دروازے پر جمی رہ گئیں جس پر ٹین کے بنے لال رنگ کے بورڈ پر سفید رنگ سے ایک کھوپڑی بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ 1100volt

وہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور ذہن میں کوندرہی تھی اس کے پارسل میں موجود وہ چابی جس کے ساتھ لگے فلیپ پر یہی سب لکھا تھا۔

"کیا وہ چابی اسی تالے کی ہے؟" اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔

"کیا چابی ٹرائی کرنی چاہئے؟

کیا اس دروازے سے اندر جانا چاہئے؟

جس کوریڈور میں وہ ٹھٹکا تھا وہاں کافی بھیڑ تھی لیکن یہ بھیڑ رکی ہوئی نہیں تھی لوگ آ جا رہے تھے اور وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کمرے کے اندر نہیں جا سکتا تھا پھر اس نے سوچا کہ بھیڑ ہے تو کیا ہوا ہر کوئی اپنے حال میں مست ہے اسے دیکھنے کی فکر کسے ہے' کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔

اسے تالا کھول کر اندر جاتے دیکھنے کی فرصت کسے ہے؟ وہ پارسل ہاتھ میں سنبھال کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک باوردی گارڈ نے اس کے نزدیک آتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے سر؟"

"بب...... بار میں۔" کاشف اس کے اس طرح اچانک پوچھنے سے ہکلا سا گیا۔

"وہ اس طرف ہے سر۔" گارڈ نے انگلی سے کوریڈور

کے اختتام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
بار کی لوکیشن بتانے کے بعد جب گارڈ نے واپس اس کی طرف دیکھا تو مجبوراً کاشف کو ادھر بڑھنا ہی پڑا۔ حالانکہ اس کی شدید خواہش ہو رہی تھی پارسل میں موجود چابی کو اس تالے میں ٹرائی کرنے کی اگر وہ چابی اسی کمرے کی تھی تو' کیا تھا اس کمرے میں اور اس کمرے کی چابی اس کے پاس کیوں ہے؟
مگر وہ اس گارڈ کے سامنے ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا وہ کم بخت اسی دروازے کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ کاشف کوریڈور میں بچھے سرخ قالین پر چلتا ہوا شیشے کے بنے اس بڑے سے گیٹ کے قریب پہنچا جس پر انگریزی کے بڑے بڑے حروف میں "BAAR" لکھا ہوا تھا گیٹ پر بھی ایک گارڈ کھڑا تھا جو آنے جانے والوں کے لیے گیٹ کھول بند کر رہا تھا لیکن بھیڑ اتنی تھی کہ ایک طرح سے گیٹ مسلسل کھلا ہوا ہی تھا۔
کاشف نے دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ پار کر کے بار کے اندر قدم رکھا۔ اگرچہ یہ بار کافی وسعت لیے ہوئے تھا لیکن اس میں موجود بھیڑ کو دیکھتے ہوئے کاشف نے سوچا کہ اگر یہاں اتنے ہی لوگ آتے ہیں تو اس کی وسعت دوگنی ہونی چاہیے تھی۔
ہال کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کے کندھے کئی خواتین اور مردوں سے ٹکرائے تھے' لیکن کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی وہ بھی سب سے انجان نگاہیں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے کسی کو تلاش کر رہا تھا اسے تلاش تھی الوینہ کی جو شاید ان تمام رازوں کی چابی تھی جنہوں نے اس کے دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔
اف یہ کتنی بھیڑ ہے یہاں الوینہ کو بلانے کے لیے یہی جگہ ملی تھی کیا۔
کہاں ڈھونڈوں اسے؟
ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا' اس نے پلٹ کر دیکھا الوینہ اس کے سامنے کھڑی تھی مجسم صورت میں اور اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ سجی ہوئی تھی لیکن کاشف اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دے سکا تھا۔
وہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا تھا کہ اسے مسکرانا چاہیے یا جھپٹ کر الوینہ کی گردن دبوچ لینی چاہیے۔
اس سے پوچھے کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ الوینہ نے اس کی کلائی تھامتے ہوئے کہا۔
"آؤ۔"
اور وہ بنا کچھ کہے اس کے ساتھ چل دیا۔ الوینہ کے جسم سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اسے مدہوش کیے دے رہی تھی وہ اسے لیے ایک میز کے قریب آئی اب ایک بار پھر کاشف کے لیے حیران ہونے کا لمحہ تھا میز پر ایک کارڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔
"Reserved For Kashif - Alveena"
اس میز کے گرد صرف دو ہی کرسیاں بچھی ہوئی تھی۔
"بیٹھو۔" الوینہ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
کاشف اپنے ذہن میں سوالات کا انبار لیے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا' سوالات اتنے زیادہ تھے کہ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ سب سے پہلے اسے کون سا سوال کرنا چاہیے۔؟
کس سوال کا جواب اسے پہلے چاہیے؟
زیادہ اہم کیا ہیں سوالوں کے جواب یا اس کی گردن دبوچنا؟
"کیا لوگے؟" الوینہ نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا۔
"تمہارے ساتھ تو امرت بھی نہیں لینا چاہوں گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔
"سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں اس کوڈ زبان کے بارے میں کیسے پتہ لگا؟"
"کون سی کوڈ زبان کے بارے میں؟" الوینہ نے حیرت سے پوچھا۔

''جس میں تم نے مجھے یہاں آنے کا پیغام لکھا تھا۔''
''اوہ...... وہ مجھے خود تمہی نے تو سکھائی تھی وہ زبان۔''
''میں نے؟'' کاشف بھنا گیا۔
''بھلا میں تمہیں کیوں سکھانے لگا وہ زبان؟''
''سوچو تم نے ایسا کیوں کیا ہوگا۔''
''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' کاشف نے تیز لہجے میں کہا۔
''میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔
الوینہ نے اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکائیں اور اس کی جانب جھکتی ہوئی بولی۔
''کیوں نہیں کر سکتے؟''
''کیونکہ اس زبان کے بارے میں میں صرف اسے بتا سکتا ہوں جسے اپنے بہت نزدیک سمجھتا ہوں۔ جیسے اغنیا تھی۔''
''میں وہی تو کہنا چاہتی ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔
''ہم اتنے ہی نزدیک آ گئے تھے۔ یا شاید نزدیکیوں سے بھی زیادہ نزدیک۔''
''شٹ اپ۔'' کاشف نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔
''تم کہنا کیا چاہتی ہو اگر تم نے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تو۔''
''پلیز کاشف۔'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی الوینہ بول پڑی۔
''تماشہ کھڑا مت کرو یہاں ہم اکیلے نہیں ہیں۔''
کاشف یوں چونکا جیسے اسے ہوش آ گیا ہو اس نے دیکھا کہ آس پاس کی میزوں کے گرد بیٹھے لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
اس نے سوچا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے میں خواہ مخواہ ہی جذباتی ہو رہا ہوں اور اب تو الوینہ اس کے ساتھ ہے ہی اسے وہ تب تک اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دے گا جب تک ذہن میں گھومتے ہر سوال کا جواب حاصل نہیں کر لیتا اب وہ چاہے کتنے بھی ہاتھ پاؤں مار لے لیکن اب وہ اسے نکلنے نہیں دے گا۔
مگر اس کے لیے اسے اپنے آپ پر قابو پانا ہوگا' خواہ مخواہ تماشہ کھڑا کرنا اس کے اپنے حق میں برا ثابت ہو سکتا ہے۔
دل میں ایسا فیصلہ کرتے ہی اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔
''کیا کہنا چاہتی ہو کتنا نزدیک آ گئے تھے ہم؟''
''تم کو اس وقت کے بارے میں ذرا سا بھی یاد نہیں ہے اس لیے میرے کچھ کہنے سے تمہیں یقین نہیں آئے گا۔'' وہ کاشف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔
''یہی سوچ کر اپنی اس ملاقات کا آغاز اس زبان کے کوڈ سے کیا جسے تم صرف اپنے نزدیکی لوگوں کو ہی سکھاتے ہو' تمہاری طرف سے کسی دوسرے کو تو وہ زبان سکھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر مجھے تمہاری ایجاد کردہ زبان آتی ہے تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہے کہ کبھی تم نے مجھ پر اعتماد کیا تھا؟''
''مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔'' کاشف نے اس بار بھی اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا' لیکن آواز دھیمی رکھی۔
''یہ زبان تو سرتاج کو بھی آتی ہے۔''
''اسے بھی میں نے ہی بتائی تھی۔''
''تت...... تم نے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے الوینہ کی آنکھوں میں جھانکا تب وہ پھر سے چونک کر رہ گیا اس کے سامنے بیٹھی الوینہ کی آنکھوں کا رنگ براؤن تھا جبکہ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ تھری اسٹار میں ملنے والی اور امیر جان سے ملوانے والی الوینہ کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔
کاشف کی آنکھوں کے آگے پارسل میں موجود الوینہ کی دو تصویریں گھومنے لگیں ایک کی آنکھیں سیاہ

تھیں اور دوسری کی براؤن۔
ان تصویروں کا مطلب کیا تھا؟
کیا یہ کہ اسے الوینہ ملیں گی؟
ایک براؤن آنکھوں والی اور دوسری سیاہ آنکھوں والی؟
یا یہ کہ نقلی الوینہ ملے گی جس سے اسے ہوشیار رہنا چاہیے؟
"میرے فیوریٹ کرکٹر کا نام بتاؤ۔" اس نے یکایک پوچھ لیا۔
"م...... مطلب؟" الوینہ بوکھلا گئی۔
اب کسی کی پرواہ کیے بغیر کاشف نے اونچی آواز میں غراتے ہوئے پوچھا۔
"تمہیں تو پتہ ہونا چاہیے کہ میرا فیوریٹ کرکٹر کون ہے اس کا نام بتاؤ؟"
یہی وہ لمحہ تھا جب الوینہ کے چہرے پر ایک زوردار گھونسہ پڑا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ کرسی سمیت پیچھے کی سمت الٹ گئی یہ دیکھ کر آس پاس موجود لوگ بھی چیخ پڑے تھے۔
کاشف اس وقت اور بری طرح بوکھلا گیا جب اسے ایک اور الوینہ نظر آئی اس نے کاشف کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔
"جاوید میانداد۔"
کاشف اس سیاہ آنکھوں والی الوینہ کو دیکھتا رہ گیا۔
وہ دوبارہ بولی۔
"کیونکہ اس نے اس وقت چھکا مارا تھا جب اس کی ٹیم کو اس کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی مرنے والے کو آکسیجن کی ہوتی ہے۔"
آس پاس موجود لوگ اپنے سامنے ایک ہی چہرے کی دو دو الوینہ کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔
خود کاشف کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔
"کاشف میرے ساتھ آؤ یہاں خطرہ ہے۔" سیاہ آنکھوں والی الوینہ اس کی کلائی پکڑ کر زبردستی کرسی سے اٹھاتی ہوئی بولی۔
ابھی الوینہ کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ ہال میں گولیوں کی دھائیں دھائیں گونجنے لگی چاروں طرف افراتفری مچ گئی لوگ چیخ و پکار کرتے ہوئے اپنے بچاؤ کے لیے گیٹ کی طرف بھاگنے لگے اور کاشف کا ہاتھ پکڑے الوینہ بھی اسی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔
کاشف حیران پریشان الوینہ کے ساتھ یوں چلا جا رہا تھا جیسے اس کی مرضی نہ ہو وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے الوینہ کے ساتھ جانا چاہیے یا اس سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے خود سے الجھتے ہوئے کاشف نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔
"ہمارے شکار صرف وہ دونوں ہیں۔" ہال میں ایک بلند آواز گونجی۔
"سب ان کے پاس سے ہٹ جائیں۔"
بھیڑ کے ساتھ دروازے کی طرف بھاگتے کاشف کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ الفاظ اس کے اور الوینہ کے لیے کہے گئے ہیں یہ بات سمجھتے ہی اس نے سرگوشی کرتے ہوئے الوینہ سے کہا۔
"خود کو بھیڑ سے الگ مت ہونے دینا جب تک ہم سب کے بیچ میں ہیں وہ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے۔"
چیختی چلاتی بھیڑ ایسے انداز سے دروازہ پار کر کے کوریڈور میں دوڑ رہی تھی جیسے بند ٹوٹ جانے پر پانی دوڑتا ہے۔ الوینہ اور کاشف بھی خود کو اسی ریلے کا حصہ بنائے ہوئے تھے۔
"مین گیٹ پر تعینات لوگوں کو الرٹ کر دو۔" بلند آواز ایک بار پھر گونجی۔
"وہ دونوں باہر نکل نہ پائیں۔"
دھائیں کی آواز کے ساتھ ایک بار پھر فائر ہوئے اور اس بار ایک چیخ گونجی شاید گولی نے کسی کو اپنا نشانہ چن لیا تھا۔ اس فائر اور چیخ نے لوگوں میں پھیلی دہشت میں اور اضافہ کر دیا تھا ایک دوسرے کی پرواہ کیے بغیر سب کو

بس اپنی جان کی فکر ہو رہی تھی۔ اس انسانی ریلے میں جو گرا وہ فٹ بال کی طرح ٹھوکروں کی نذر ہو گیا۔

بھاگتے ہوئے کاشف کی نظر اس دروازے پر پڑی جس پر خطرے کا نشان بنا ہوا تھا۔ ابھی اس کے دماغ میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ الوینہ اسے لیے اسی دروازے کی طرف لپکی اور کاشف سے کہا۔

"تمہارے پارسل میں اس تالے کی چابی ہوگی۔"

حیرت سے کاشف کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"تمہیں کیسے پتہ؟"

بھیڑ سیلاب کی طرح ان کے سامنے سے بہے چلی جا رہی تھی۔

"سوال بعد میں کرنا۔" الوینہ چیخی۔

"اسے کھولو۔ اگر ہم بھیڑ سے الگ ہو گئے تو ان کے لیے ہمیں نشانہ بنانا آسان ہو جائے گا۔"

کاشف نے دیر کیے بغیر پارسل سے چابی نکال کر تالے میں گھمائی چابی اسی تالے کی تھی کیونکہ ایک بار گھماتے ہی تالا کھل گیا تھا' دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور الوینہ نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا۔

یہ بارہ بائی بارہ کا کمرہ تھا اور کمرے کے بیچوں بیچ ایک ٹرانسفارمر رکھا تھا اور باقی کمرے میں اس سے منسلک تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا'

باہر سے ابھی بھی لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں مگر اس وقت ان دونوں میں سے کسی کی بھی توجہ اس طرف نہیں تھی' دونوں ہانپتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"اب کیا کرنا ہے؟" کاشف نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ۔" الوینہ بولی۔

"لیکن جب تمہیں یہ پتہ تھا کہ ہمیں اس کمرے میں پہنچنا ہے تو یہ کیوں نہیں پتہ کہ ہمیں یہاں کرنا کیا ہے؟"

"مجھے اتنا ہی پتہ ہے کاشف! جتنا تم نے مجھے بتایا تھا۔" الوینہ نے کاشف کی سمجھداری پر ایک اور حملہ کیا۔

"مم...... میں نے بتایا تھا' مطلب؟"

"پلیز کاشف۔" الوینہ بولی۔

"یہ باتوں کا وقت نہیں ہے جلدی کچھ کرو ورنہ ہم مارے جائیں گے۔"

یہ سنتے ہی کاشف کا دماغ تیزی سے حرکت میں آنے لگا اور حرکت میں آتے ہی دماغ نے اسے بتایا کہ یہاں کی چابی ربر کے دستانوں کے اندر تھی اور دستانوں کے اندر ہی Z کی شکل میں مڑا ہوا تار بھی تھا اور یہ سب اس کے پارسل میں ہی تو تھے۔

یاد آتے ہی اس نے جلدی سے پارسل میں سے دستانے اور تار نکالے دستانے پہنتے ہوئے جانے کہاں سے اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

اگلے ہی پل وہ ٹرانسفارمر کی طرف لپکا اور وہ کیبل تلاش کی جس کے ذریعے مین لائن سے بجلی ٹرانسفارمر میں آ رہی تھی۔ اس نے زیڈ کی شکل والے تار کو مین لائن کے تینوں تاروں سے جوڑ دیا۔

ٹرانسفارمر سے چنگاریوں کے ساتھ بھک کی زوردار آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی پورے ہوٹل کی ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کی بجلی غائب ہو گئی۔

"ویری گڈ...... ویری گڈ کاشف۔" اندھیرے میں الوینہ کی آواز سنائی دی۔ "اب ہم اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بڑے آرام سے اپنے کمرے تک پہنچ سکتے ہیں۔"



"میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" کمرے میں پہنچتے ہی کاشف نے جیب سے ریوالور نکال کر الوینہ پر تانتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو تمہیں گولی مارتے ہوئے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔"

الوینہ دروازہ بند کرنے کے بعد اس کی طرف گھومی' پورے ہوٹل کی طرح اس کمرے میں بھی اندھیرے کا راج تھا۔ کاشف اور اس کے ہاتھ میں دبے ریوالور کی

جھلک اسے صرف اس چاندنی کے بل پر نظر آ رہی تھی جو شیشے کی کھڑکی سے چھن کر کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ ریوالور دیکھ کر بھی الوینہ کے چہرے پر ذرا برابر گھبراہٹ یا ڈر نہیں تھا۔

''تم مجھے گولی نہیں مارو گے۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

کاشف نے اپنے لہجے میں درندگی سموتے ہوئے کہا۔

''اگر غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہو تو کمرے میں تمہاری لاش۔''

''نہیں کاشف! تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' الوینہ نے نہایت اعتماد کے ساتھ کہا۔

''اس کی دو وجوہات ہیں پہلی یہ کہ تمہیں میری جان نہیں اپنے سوالوں کے جواب چاہئیں' جو تم میری لاش سے نہیں لے سکتے۔ دوسری یہ کہ تم نے خود کہا تھا کہ تم یہاں۔ اس ہوٹل کے کمرے میں' تم مجھ پر ریوالور تان کر ایسا ضرور کہو گے مگر حقیقت میں گولی نہیں مارو گے اور یہی ہونے والا ہے' اس بات کا یقین مجھے اس لیے ہے کہ اب تک ہر قدم پر وہ اور صرف وہی ہوا ہے جو تم نے کہا تھا۔

''میں نے کہا تھا؟''

''ہاں۔ یہ بات تم نے خود کہی تھی۔''

کاشف کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تیرنے لگی۔

''اب تم مجھے کون سے نئے جال میں الجھانا چاہتی ہو؟''

''میں صرف وہ کہہ رہی ہوں جو تم نے مجھ سے کہا تھا۔''

''پھر وہی بات' میں نے کہا تھا' میں نے کہا تھا' میں نے بھلا تم سے کب' کیا اور کیوں کہا تھا۔'' کاشف ریوالور ہوا میں لہراتا ہوا بولا۔

''میں تمہارے اور امیر جان کے تعلقات سے اچھی طرح واقف ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم صرف اور صرف اسی کی وفادار ہو' تم صرف اسی کا کہا مانو گی اور اس کے سامنے میرا کہا تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

الوینہ کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ایک نظر ریوالور پر اور دوسری کاشف پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ معلوم بھی ہے اور تم نے کہہ بھی دیا تھا۔''

''کیا معلوم تھا؟''

''یہی کہ مجھے یہ سب جھیلنا پڑے گا یہ کہ تمہیں میرے اور امیر جان کے تعلقات کے بارے میں سب کچھ یاد ہوگا لیکن میرے اور اپنے تعلقات کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہوگا بھی کیسے وہ تعلق بنا ہی اس عرصے میں تھا' جس عرصے کے بارے میں ڈاکٹر بابر نعیم کے انجیکشن کی وجہ سے تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔''

کاشف اس کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ تو سوچو کہ اگر میں تمہارے ساتھ کچھ برا کرنا چاہتی تو تمہیں بچا کر یہاں نہ لاتی۔''

''میرے خیال سے تو تم نے مجھے بچانے کا ناٹک بھی امیر جان کے اشارے پر کیا ہے' بقول خدا جانے میرے ساتھ کب کیا ہونے والا ہے' اس بارے میں تم سے بہت زیادہ صدیقی کو پتہ تھا۔''

''اسے کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' کاشف نے حیرت سے پوچھا۔

الوینہ کے جواب دینے سے پہلے ہی پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ کمرہ ہی کیا پورا علاقہ دوبارہ روشن ہو چکا تھا۔ شاید بجلی کا فالٹ دور کر لیا تھا روشنی ہوتے ہی ایک لمحے کے لیے دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

''شاید وہ کنیکشن جوڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' کاشف اپنی آنکھیں ہاتھ سے مسلتا ہوا بولا۔

''میرے لیے ایک بار پھر یہ حیرت کی بات ہے کہ ہر واقعہ ٹھیک اسی وقت اور اسی طرح واقع ہو رہا ہے جیسے

کہ تم نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا۔'' وہ بولی۔

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ ایسا کیوں اور کیسے ہو رہا ہے۔''

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ کھیل وہی چل رہا ہے صرف کردار بدل گئے ہیں۔ سمانا ہوٹل میں خدا جانے بتا رہا تھا کہ میرے ساتھ کب کیا ہوگا وہی بات یہاں تم کہنا چاہتی ہو اس کا کہنا تھا۔ کہ وہ سب اسے صدیقی نے بتایا تھا تم میرا نام لے رہی ہو۔''

''یہ سارا معاملہ اس قدر الجھا ہوا ہے کاشف کہ جب تک میں تمہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ساری بات نہیں بتاؤں گی تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔''

''تو بتاؤ نا۔ وہی سب سننے کے لیے تو میں تمہارے ساتھ یہاں تک آیا ہوں۔''

''تم آئے نہیں ہو کاشف۔ میں تمہیں لائی ہوں۔'' الوینہ نے کہا۔

''یہ الگ بات ہے کہ ایسا کرنے کی ذمہ داری تم ہی نے مجھے سونپی تھی۔''

''مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ ذمہ داری تم کو کب سونپی تھی۔

''خیر' میرے خیال سے ہمارے بیچ اس ریوالور کی ضرورت نہیں ہے۔'' الوینہ بولی۔

''تم سب کچھ سننے کے خواہشمند ہو اور میں سنانے کی تو کیوں نہ آرام سے بیٹھ کر میری بات سن لو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔''

کاشف الجھ کر رہ گیا۔ اپنی دو زندگیوں کے بیچ کی بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑنے کے لیے اسے جس الوینہ کی تلاش تھی' جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا اس کے سامنے آنے پر مزید الجھ کر رہ گیا تھا وہ اس سے اپنے سوالوں کے جواب بھی چاہتا تھا اور دل و دماغ اس پر بھروسہ کرنے کو بھی تیار نہیں تھا تو اس کی بات سنے بھی یا نہیں؟

''کاشف۔'' الوینہ کی آواز پر وہ سوچ کی دنیا سے باہر آیا۔

''میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ تمہیں کسی سازش میں پھنسا رہی ہوں یا مدد کر رہی ہوں۔ اس کا فیصلہ بعد میں کر لینا' وہ سب سننے کے بعد' جسے اس موقع پر تمہیں بتانے کے لیے تمہی نے مجھے ہدایت کی تھی یہ طے ہے کہ میری باتیں سننے کے بعد اگر تمہارے دماغ میں گھوم رہے سارے ہی سوالوں کے نہ سہی زیادہ تر سوالوں کے جواب تو ضرور مل ہی جائیں گے۔''

یہ محسوس کر کے ایک بار پھر کاشف کے بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی کہ الوینہ ٹھیک وہی کہہ رہی ہے جو اس لمحے اس کے دماغ میں چل رہی تھی' اس نے سوچا بات تو ٹھیک ہے سننا تو چاہیے کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے یہ فیصلہ بعد میں ہوتا رہے گا کہ اس کی کون سی بات کے پیچھے کیا مقصد ہے۔

''بتانا ہی چاہتی ہو تو سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ میں وہاں تجربہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا یا نہیں۔'' کاشف نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ تجربہ جس کے لیے امیر جان نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔''

''تم سو فیصد کامیاب ہو گئے تھے۔'' الوینہ بولی۔

''اتنے زیادہ کامیاب ہوئے تھے کہ مارے خوشی کے تم امیر جان سے اور امیر جان تم سے زیادہ جھوم رہا تھا اور اس خوشی میں امیر جان نے امیر آباد میں ایک بڑی زوردار پارٹی کا بھی اہتمام کیا تھا۔''

''وہ تجربہ کس صورت میں تھا؟''

''ایک مشین کی صورت میں جو آج بھی چھوٹی لیبارٹری میں رکھی ہے۔''

''اس مشین سے کیا کام لیا جاتا ہے؟''

''اس سوال کا جواب تو صرف امیر جان یا سرتاج صدیقی کے پاس ہے' تمہارے پاس بھی تھا' مگر تم آج اسے بھولے ہوئے ہو۔''

"کیا انہوں نے کسی اور کو اس کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"نہیں۔"

"پھر پارٹی کس بات کی دی تھی' لوگوں نے پوچھا تو ہوگا۔" کاشف کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔

"صرف اتنا کہا گیا تھا کہ تمہیں جس کام سے امیر آباد لایا گیا تھا' تم نے وہ پورا کر دیا ہے۔"

"نہیں میں اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ مشین کے بارے میں اس نے تمہیں تنہائی میں بھی کچھ نہ بتایا ہو۔" کاشف نے اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"بہر حال' بن بیاہی ہی سہی' ہو تو تم اس کی ہی بیوی ایسی بیوی جس پر وہ جان چھڑکتا ہے تو ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ۔"

"میں نے اس سے کئی بار پوچھا تھا تو اس نے ہر بار صرف اتنا ہی کہا کہ یوں نہیں وینا اس عظیم الشان شاہکار کے بارے میں ہم یوں ہی نہیں بتائیں گے اس کے لیے تو ایک ادر زبردست پارٹی رکھی جائے گی۔"

"یا تو اس نے تمہیں ٹال دیا تھا یا تم مجھے چکمہ دینے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"اسی نے مجھے ٹال دیا تھا۔" الوینہ نے کہا۔

"اور اسی نے کیوں' تم بھی تو مجھے ٹالتے رہے تھے۔ میں نے تم سے بھی سینکڑوں بار پوچھا تھا تم نے ہمیشہ یہی کہا تھا کہ امیر جان کی طرف سے مشین کے بارے میں کسی کو بتانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"میں کیوں بتاتا جب تمہارے نام نہاد شوہر نے ہی نہیں بتایا بھلا میری کیا لگتی تھیں تم؟"

اس بار الوینہ کچھ نہیں بولی اس کے ہونٹوں پر وہی پھیکی مسکراہٹ پھر ابھر آئی تھی۔

"او کے۔" کاشف بولا۔

"آگے کہو۔ تم نے کیا کہنا ہے؟"

"ایک سگریٹ دو گے مجھے؟" الوینہ نے اپنی پھیکی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہ جو پارسل سے نہ نکلی ہو۔"

کاشف خود بھی سگریٹ کی طلب محسوس کر رہا تھا اس نے جیب سے پیکٹ نکالا اور ایک خود لے کر پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ اس کار میں تھا' جس سے تمہارا پیغام ملا تھا۔"

"تب تو ٹھیک ہے کیونکہ وہاں اسے میں نے ہی رکھا تھا۔" الوینہ نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

کاشف نے بغیر کوئی جواب دیئے لائٹر نکال کر پہلے اپنی سگریٹ سلگائی پھر الوینہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

الوینہ نے اپنی سگریٹ سلگانے کے بعد ایک لمبا کش لیا اور ایسے انداز میں کہنا شروع کیا جیسے ماضی قریب کی یادوں کو کھنگال رہی ہو۔

"میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ تم مجھ سے پیار کرنے لگے تھے مگر یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میں تم سے پیار کرنے لگی تھی۔"

الوینہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ کاشف نے اسے ٹوک دیا۔

"مطلب۔ شروعات ہی ٹاپ کلاس گپ سے۔"

"ایک بار پھر کہوں گی کہ یہ فیصلہ بعد میں کرنا کہ کیا گپ ہے اور کیا سچ۔ پہلے میری بات غور سے سن لو۔"

"ایک ادھیڑ عمر کے ارب پتی کھرب پتی کی بیوی مجھ سے پیار کرنے لگی تھی اس سے بڑی گپ اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"تم نے اس وقت بھی یہی کہا تھا' جب میں نے پہلی بار تم پر اپنا دل کھولا تھا اور جواب میں' میں آج بھی وہی کہوں گی جو اس وقت کہا تھا کہ کسی کے ساتھ جسمانی تعلق رکھنا اور کسی سے پیار ہو جانا دو الگ الگ باتیں ہیں' یہ سچ ہے کہ میں امیر جان کی بن بیاہی بیوی ہوں بیوی کیا تم مجھے اس کی داشتہ کہہ سکتے ہو' کھیل کہہ سکتے ہو اور وہ اس لیے ہوں کہ ایک وقت

میری سمجھ کے مطابق پیسہ ہی سب سے بڑی چیز تھی اسی پیسے کو حاصل کرنے کے لیے میں نے خود کو اپنے سے دوگنی عمر کے آدمی کی بانہوں میں گرا دیا تھا اور آج میرے پاس وہ سب کچھ بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ کچھ ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی یا جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے خود کو امیر جان کے حوالے کیا تھا۔ میں یہ بات آج بھی نہیں کہوں گی اور نا ہی مانوں گی کہ میں نے کچھ غلط کیا مگر جو سچ ہے وہ ہے اور سچ یہ ہے کہ میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں وہ پیار جو میں امیر جان سے کبھی نہیں کر پائی اور جسمانی تعلق کو پیار کا نام تو شاید تم بھی نہیں دے سکتے۔"

"خیر۔" کاشف بولا۔

"آگے بڑھو۔"

"شروع میں تم نے میرے پیار اور میرے جذبات کا بہت مذاق اڑایا تھا مگر جب پیار ہو جائے تو جس سے ہو اس کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔ وہی حالت میری بھی تھی۔ تمہارے لاکھ مضحکہ اڑانے کے باوجود جو پیار تم سے ہوا تھا تو ہوا ہی تھا' بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ مزید بڑھتا ہی گیا' ہم ساتھ ساتھ رہتے تھے کیونکہ تمہیں میرے برابر میں ہی رہائش دی گئی تھی۔"

"برابر میں رہائش؟"

"امیر آباد میں رہنے کے لیے تمہیں جو بنگلہ دیا گیا تھا وہ ٹھیک میرے بنگلے کے بغل میں تھا امیر جان نے وہ بنگلہ تمہیں اس لیے دیا تھا کہ میں تم پر نظر رکھ سکوں اس نے مجھے تمہاری جاسوسی کا کام سونپا تھا اس لیے میری تمہاری ہونے والی کسی بھی ملاقات پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی قسم کا شک کرتا تھا وقت بے وقت ہونے والی وہ ملاقاتیں میرے دل میں تمہارے لیے جگہ بناتی چلی گئیں مجھے معلوم تھا کہ میں غلط کر رہی ہوں۔ امیر جان کو کسی بھی وقت شک ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔ دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ تم مجھے قبول نہیں کر رہے ہو۔ مگر میں اپنے دل پر اختیار کھو چکی تھی اس لیے میرا وہ یک طرفہ پیار میرے دل میں پنپتا رہا اور دھیرے دھیرے اس بات کا احساس تم کو بھی ہونے لگا کہ بھلے ہی تم مجھ سے پیار نہیں کرتے' لیکن میں تم سے سچی محبت کرنے لگی ہوں اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ تم نے مجھے وہ کام سونپے جو کسی اور کو نہیں سونپ سکتے تھے۔"

"اب اس پریم کہانی کا پیچھا چھوڑ کر یہ بتاؤ کہ میں نے تمہیں کیا کام سونپے تھے؟" کاشف کے کہنے کے انداز سے ہی واضح تھا کہ اس نے الوینہ کی باتوں پر یقین نہیں کیا ہے۔

"بات 17 اگست کی ہے۔" الوینہ نے گہری سانس لینے کے بعد ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔

"یعنی آج سے صرف نو دن پہلے کی تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟ اور میں نے کہا تھا کہ پیار کرنے والا کیا ثبوت دے سکتا ہے؟ تب تم نے کہا تھا کہ جو پیار کرتے ہیں وہ جس سے پیار کرتے ہیں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اپنی جان بھی اپنے پیار پر نچھاور کر دیتے ہیں میں نے کہا تھا کہ مانگ کر تو دیکھو کاشف میں تمہارے لیے جان بھی دے دوں گی تب تم نے میری آنکھوں میں جھانکا تھا جیسے جانچ رہے ہو کہ میں جو کہہ رہی ہوں اس میں کتنا دم ہے اور تمہیں لگا تھا کہ میں جو کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں تو تم نے مجھے ایک لفافہ دیا تھا وہی لفافہ جو اس وقت پارسل کے روپ میں تمہارے پاس موجود ہے اس میں سگریٹ کا پیکٹ' گھڑی' ہیرے کی انگوٹھی' لائٹر' موبائل فون' آتشی شیشہ' اے ٹی ایم جیسا کارڈ' ایک ایسا کاغذ جس پر آٹھ ہندسوں کا کوئی نمبر لکھا تھا' کالا چشمہ' ایک روپے کے سکے جیسا سکہ' پلاسٹک کا گول بلا جس پر بھاگتا ہوا گھوڑا اور گھوڑے پر سوار بھی تھا اور سوار کے ہاتھ میں ایک جھنڈا' ایک کاغذ پر "چڑیا کے نیچے" لکھا تھا۔ دوسرے پر "مظاہرہ" یہ لفظ تین رنگوں لال' پیلے اور سیاہ رنگ

کے پتوں سے لکھا گیا تھا۔ ایک ہی پوز میں میری دو تصویریں' ربر کے دستانے' ان کے اندر Z کی شکل میں مڑا تار اور ٹین کا وہ لال بلا جس پر سفید رنگ سے خطرے کا نشان بنا ہوا تھا اور نیچے لکھا تھا 1100 volt''

''بس۔'' کاشف نے پوچھا۔

''یہی سب تھا لفافے میں؟''

''اس وقت تک تو یہی سب تھا۔''

''اس وقت سے مراد؟''

''ان چیزوں کے ساتھ تم نے مجھے اپنے ہاتھ کی بھری ڈاک خانے کی ایک رسید دی تھی اور کہا تھا کہ جب میں گوادر جاؤں تو وہاں کے پوسٹ آفس سے اس رسید پر لکھے ایڈریس پر رجسٹری کر دوں تم نے مجھے یہ بھی بتایا دیا تھا کہ یہ ایڈریس تمہارے بینک کا ہے۔''

''اور تم نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا؟''

''لفافے میں موجود چیزوں کو دیکھ کر میں چکر میں پڑ گئی تھی۔ سوچنے لگی کہ یہ بیکار کا سامان تم اپنے بینک کو کیوں بھیج رہے ہو؟ یہی سوال جب تم سے کیا تو تم بڑے ہی پراسرار انداز میں مسکرا دیے تھے اور کہا تھا کہ اس چکر میں مت پڑو۔ بس یہ بتاؤ کہ میرا یہ کام اس شرط پر کرسکتی ہو یا نہیں کہ اس کے بارے میں امیر جان یا کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی' میں نے کہا تھا کہ تم تو جان مانگنے والے تھے یہ تو کوئی کام ہی نہیں ہے لیکن یہ تو میں اس وقت ہی کر پاؤں گی جب میں گوادر جاؤں گی میری بات سن کر تم نے ایک بار پھر پراسرار انداز سے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ تم انیس تاریخ کو گوادر جاؤ گی میں یہ بات سن کر چونک پڑی تھی میں نے تم سے پوچھا کہ تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟ جواب میں تم نے بس اتنا کہا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔''

''اس کے بعد؟''

''سترہ اگست کو بس اتنی بات ہوئی تھی۔ اٹھارہ اگست کو بھی حالانکہ ہم سارا دن ساتھ رہے مگر تم نے کچھ نہیں کہا رات کے وقت جب میں نے تمہیں حیرانی کے ساتھ بتایا کہ امیر جان نے کل مجھے سرتاج اور ڈاکٹر بابر نعیم کو کسی ضروری کام سے لاہور اور پھر گوادر جانے کو کہا ہے تو تمہارے ہونٹوں پر پھر وہی مسکراہٹ چھا گئی تھی' اس وقت تم نے کہا تھا کہ پارسل بند کر کے میں نے اس لیے نہیں دیا کہ تمہیں ابھی لاہور اور گوادر سے کچھ اور چیزیں لے کر اس میں ڈالنی ہیں تب میں نے پوچھا تھا وہ کیا؟ تو تم نے بتایا کہ رات کو ساڑھے نو بجے کراچی کے کینٹ اسٹیشن سے لاہور کے لیے ایک ٹرین چلتی ہے۔ تم اس میں میرے نام کا ٹکٹ ریزرو کروانا۔ ریزرویشن 25 اگست کی ہوگی اس ٹکٹ کو بھی پارسل میں رکھ دینا۔ اس کے علاوہ 26 اگست کو تمہیں سکھر سے لاہور کے دو ہوائی ٹکٹ ریزرو کروانے ہیں۔ ایک میرے نام سے اور دوسرا انیتا کے نام سے یہ ٹکٹ دوپہر ایک بجے کی فلائٹ کے ہونے چاہئیں انہیں بھی پارسل میں ڈال دینا۔ اتنا سننے کے بعد میں نے کہا میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟ تو تم بولے اس پھیر میں مت پڑو۔ اس کے علاوہ تم نے 26 اگست کے لیے لاہور کے سمانا ہوٹل میں میرے نام سے سوئیٹ بک کروانا ہے اور بکنگ سلپ بھی لفافے میں ڈال دینی ہے ان کے علاوہ ایک اور چیز بھی ڈالنی ہے۔ میں نے پوچھا تھا وہ کیا تو تم نے جواب دیا تھا کہ تم کوئی بھی ایک نئی کار خریدو گی' ایسی کار جس میں ریموٹ سسٹم والا لاک ہوگا اور کار کو سمانا ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی کر دو گی اور اس میں میرے برانڈ کا سگریٹ کا پیکٹ بھی رکھ دو گی اور پارکنگ سلپ بھی کار میں ہی چھوڑ دینی ہے اور اس میں ایک لفافہ الگ سے چھوڑ رکھنا ہے۔ میں نے پوچھا اس لفافے میں کیا ہوگا۔ جواب میں تم نے مجھے ایک بند لفافہ پکڑا دیا تھا جس پر ''FIHSAK'' لکھا ہوا تھا اور بولے کہ ریموٹ سمیت کار کی چابی بھی تمہیں رجسٹری والے لفافے میں ہی ڈال دینی ہے اور ہاں لاہور سے

ہی ایک لاٹری کا ٹکٹ بھی لینا ہے' اس ٹکٹ کا نمبر آٹھ ہندسوں والا وہی ہونا چاہیے جو میں نے کاغذ پر لکھ رکھا ہے یاد رہے کاغذ کو پارسل میں رکھنا ہے لیکن لاٹری کے ٹکٹ کو یہاں لا کر مجھے دینا ہے۔ وہاں سے تم ہوٹل گلمو ہر جاؤ گی وہاں بھی ایک کمرے کی بکنگ کروانی ہے اس کے علاوہ ہوٹل گلمو ہر کے کوریڈور میں ایک ایسا دروازہ ہے جو زیادہ تر بند رہتا ہے اس پر ٹین کی ایک پلیٹ لگی ہوگی لال رنگ کی پلیٹ پر سفید رنگ سے خطرے کا نشان بنا ہوگا اور اس کے نیچے لکھا ہوگا 1.100 volt تمہیں کسی بھی طرح اس کمرے کی چابی تیار کروا کر پارسل میں موجود ویسے ہی نشان والے کی رنگ میں ڈالنی ہے اس کے بعد لفافے کو سیل کر کے رجسٹری کر دو گی تمہاری اتنی باتیں سننے کے بعد میں نے کہا تھا کہ کرا دوں گی بابا۔ میں سب کچھ کرا دوں گی۔ مگر یہ سب تم کروا کیا رہے ہو؟ مجھے تو یہ سب پاگل پن سا لگ رہا ہے۔ تم بولے ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ مطلب؟ تم نے کہا پارسل رجسٹری کرنے کے علاوہ تمہیں موٹی رقم دے کر کرائے کا ایک ایسا آدمی خریدنا ہے جو 26 اگست کی تاریخ کی رات کو ٹھیک نو بجے مجھے سمانا ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں دیکھے گا۔ پہچان کے لیے اسے میرا بغیر داڑھی والا فوٹو دکھا دینا۔ اس وقت میں وہاں انیتا کے ساتھ ہوں گا مگر اسے اچھی طرح سمجھا دینا کہ اس کے سامنے مجھ سے کوئی بات نہ کرے۔ بات کرنے کے لیے واش روم میں میرے پیچھے پیچھے چلا آئے۔ مگر واش روم میں ہماری بات پوری نہیں ہو سکے گی۔ اس سے پہلے ہی وہاں لال شرٹ والا آ جائے گا۔ اس لیے سمانا ہوٹل ہی میں ایک اور کمرہ بک کروانا ہے۔ جس میں میری اور اس کی آگے کی باتیں ہوں گی۔ وہ کمرہ اسی کے نام سے بک کرانا ہے اور اسے بتا بھی دینا ہے۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ خدا جانے والا قصہ بھی تمہارا ہی بنایا ہوا تھا۔" اب کاشف کچھ حیران نظر آنے لگا تھا۔

"یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میرا نہیں تمہارا بنایا ہوا تھا۔" الوینہ بولی۔

"میں تو صرف تمہارا معمول بنی ہوئی تھی۔ سمانا ہوٹل میں کیا کیا ہوگا؟ وہاں میرے ذریعے لائے گئے آدمی سے تمہاری کب کیا باتیں ہوں گی' کب لال شرٹ والا واش روم کے دروازے پر دستک دے گا۔ یہ ساری باتیں تم نے مجھے اٹھارہ اگست کی رات کو ہی اس طرح بتا دی تھیں جیسے آنکھوں دیکھا حال سنا رہے ہو۔ تم نے اس وقت یہ تک بتا دیا تھا کہ میں جس آدمی کو کرائے پر حاصل کروں گی اس کا نام خدا جانے ہوگا۔ میں وہ باتیں سن کر بہت حیران تھی۔ شاید تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس وقت میری کیا حالت رہی ہوگی۔ تم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے خدا جانے سے یہ بھی کہنا ہے کہ وہ تمہارے سامنے یہ نہ کہے کہ یہ کام اسے کسی لڑکی نے سونپا ہے بلکہ یہ کہے کہ اسے یہ ہدایات دینے والے کا نام سرتاج صدیقی ہے۔ تم نے اپنی تخلیق کی ہوئی کوڈ زبان میں لکھا ہوا ایک لیٹر بھی مجھے دیا تھا اور کہا تھا کہ اسے خدا جانے کو دے دوں۔ وہ یہ لیٹر مجھے اس کمرے میں دے گا جسے اس رات کے لیے تم انیس کو ہی بک کروا کے آؤ گی' اس کے علاوہ تم نے مجھے دستی بم جیسے دو بم بھی دیے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں ڈر گئی تھی۔ تم ہنسنے لگے تھے اور بولے گھبراؤ مت۔ یہ بم کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تم انہیں خدا جانے کو دے دو گی اور اس سے کہو گی کہ جب وہ کمرے میں مجھ سے بات کر رہا ہوگا تب عمران اور اس کے ماتحت حملہ کریں گے۔ اس وقت اسے مجھ سے یہ کہنا ہے کہ میں اپنے پارسل سے چشمہ نکال کر پہن لوں اور اس کے بعد ایک ایک کر کے تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ بم فرش پر پٹخ کر پھوڑنے ہیں۔ ان بموں سے صرف دھواں ہی نکلے گا۔"

"تمہاری باتوں سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے اس وقت میرے پاس کوئی جادو کا پٹارہ تھا۔"

''میں نے بھی تم سے یہی کہا تھا۔'' الوینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''حیران پریشان جب میں نے پوچھا کہ تم کیا باتیں کر رہے ہو کاشف! کیا ضروری ہے کہ جسے میں کرائے پر حاصل کروں اس کا نام خدا جانے ہی ہو۔ تمہیں کیسے پتہ کہ تمہاری باتیں ابھی ادھوری ہی ہوں گی کہ کوئی واش روم کا دروازہ بجادے گا اور وہ لال شرٹ ہی پہنے ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''اور میں نے کیا کہا تھا؟''

''اس وقت میری سب باتوں کے جواب میں تم نے اسی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا کہ تمہارے پاس جادو کا پٹارہ ہے مگر میں اس پٹارے کے بارے میں جاننے کی کوشش نا کروں اگر تم سے سچی محبت کرتی ہوں تو صرف وہ کروں جو تم کہہ رہے ہو۔''

''اور تم نے وہی سب کیا؟''

''جو کیا۔ وہ سب ظاہر ہے۔'' الوینہ نے کہا۔

''جب میں نے کہا کہ اگر تم مجھے اپنے جادو کے پٹارے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتے ہو تو مت بتاؤ' لیکن یہ تو بتا سکتے ہو کہ یہ سب تم کس مقصد سے کر رہے ہو؟ میرے اس سوال کو بھی تم مسکرا کر ٹال گئے تھے۔''

''اس کے بعد؟''

''انیس اگست کو میں نے لاہور اور گوادر میں سارے کام انجام دے دیے تھے۔ رات کو جب لوٹ کر امیر آباد میں تم سے ملی اور لاٹری کا ٹکٹ دیا تو میں حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی کیونکہ جس آدمی کو میں نے کرائے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اس کا نام سچ مچ خدا جانے ہی تھا اور اس وقت تو حیرت کی انتہا ہوگئی جب تم نے ٹرین کا وہ ٹکٹ' برتھ نمبر' پلین کے وہ سیٹ نمبر' سمانا ہوٹل اور گلمو ہر ہوٹل کے اس کمرے سمیت سوئیٹ اور روم نمبر تک بتا دیا جنہیں میں بک کر کے آئی تھی۔ ایک بار پھر میں یہ سوچ کر حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے لگی کہ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوگیا؟ اور تمہارے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی پراسرار مسکراہٹ تیرنے لگی تھی۔''

''پھر؟''

''23 اگست کی صبح تم نے مجھ سے کہا کہ الوینہ! تم جانتی ہو کہ جب میں لیبارٹری میں کام کر رہا ہوتا ہوں تو امیر جان ایک ٹی وی کے ذریعے اپنے بیڈ روم سے مجھ پر نظر رکھتا ہے' میرے یہ کہنے پر کہ ہاں یہ بات تو میں جانتی ہوں' تم نے کہا آج دن میں تمہیں اس کے بیڈ روم میں جا کر اسے خود میں اتنا مصروف کرنا ہے کہ کم سے کم آدھے گھنٹے کے لیے اس کا دھیان ٹی وی سے ہٹ جائے۔ تمہاری یہ بات سن کر میں چونک پڑی تھی۔ پوچھا تھا کہ تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟ جواب میں ایک بار پھر تم نے یہی کہا کہ وجہ جاننے کی کوشش نہ کروں' تم مجھ سے پیار کرتی ہو تو وہی کرو جو کہہ رہا ہوں اور۔''

''تو تم نے وہ کیا؟''

''ہاں۔ تمہارے پیار میں' پیار کی دیوانگی میں' میں نے وہ بھی کیا اور اس ڈھنگ سے کیا کہ آدھے گھنٹے تو کیا ایک گھنٹے تک امیر جان کو ٹی وی کی طرف دیکھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔''

''مطلب تم نے اسے اپنے اس خوبصورت بدن میں الجھائے رکھا۔''

''ظاہر ہے۔''

''کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ اس بیچ میں نے کیا کیا؟''

''اس وقت نہیں جان سکتی تھی بعد میں تم نے بھی پوچھنے پر کچھ نہیں بتایا' لیکن آج جانتی ہوں۔''

''کیا جانتی ہو؟''

''اس دوران تم نے اس مشین میں کوئی ایرڈ ال دیا ہوگا۔'' الوینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''سرکٹ میں کوئی خرابی کردی ہوگی۔''

''یہ تم کیسے جانتی ہو؟''

''آج دن میں امیر جان نے مجھے اپنے بنگلے پر بلایا تھا۔ میں یہ سوچتی ہوئی وہاں گئی کہ آج اس کا دن میں ہی موڈ کیسے بن گیا' مگر وہاں پہنچی تو قصہ ہی دوسرا نکلا۔ وہ

بہت زیادہ ہیجان میں مبتلا تھا۔"
"کیوں؟"
"تمہاری وجہ سے۔"
"میری وجہ سے؟"
"اسی نے مجھے بتایا کہ امیر آباد سے جانے سے پہلے تم نے اپنی بنائی ہوئی مشین میں خرابی ڈال گئے تھے۔ لیبارٹری میں کام کرتے سرتاج کو بھی دکھایا اور بتایا کہ وہ تمہاری بنائی ہوئی مشین کے سرکٹ کو سمجھنے اور اس ایرر کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم پر بہت تپا ہوا تھا وہ۔ یہ سوال اس کے دماغ پر ہتھوڑا بن کر برس رہے تھے کہ تم نے، تم نے کیسے گوادر جا کر پارسل اپنے بینک کو بھیج دیا، مشین میں ایرر کب ڈالا اور تم نے یہ سب کیوں کیا؟"
"یہ سوال تو اس وقت میرے دماغ میں بھی ہلچل مچا رہا ہے۔" یہ کہہ کر کاشف چند لمحے رکا، پھر الوینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"ایک سیکنڈ کے لیے اگر یہ مان لیا جائے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ یہ سب میں نے ہی کیا ہے، تو کیا؟"
"سرتاج کا خیال ہے کہ یہ سب تم نے ثمن کے قتل پر مشتعل ہو کر کیا ہے۔" الوینہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ کاشف بول پڑا۔
"کیا کہہ رہی ہو تم؟ ثمن کا قتل، اسے کس نے مار ڈالا۔"
"امیر جان نے۔"
"کیوں؟" کاشف نے چونک کر پوچھا۔
"وہ تو اسے بہت عزیز تھی۔ پھر اس نے اسے کیوں مار ڈالا؟"
"وہ واقعہ چونکہ میرے سامنے کا نہیں ہے اس لیے پوری بات تو نہیں بتا سکتی، لیکن آج ہی امیر جان سے اس کے بیڈ روم میں میری جو باتیں ہوئیں ان کے مطابق اس نے خود قبول کیا کہ ثمن کو اسی نے شوٹ کیا تھا اور اس لیے شوٹ کیا تھا کہ وہ غدار تھی اور مستقبل میں وہ امیر جان کا قتل کرنے والی تھی۔"
"یہ بات امیر جان کو کیسے معلوم ہوئی؟"
"مجھے نہیں پتہ۔"
"مگر ثمن کے قتل سے میری ان کارروائیوں کا تعلق؟" کاشف کو یہ بات الجھا رہی تھی۔
"امیر جان کے سامنے پیش کیے گئے سرتاج صدیقی کے خیال کے مطابق تم نے اس کے قتل والے دن سے ہی بال اور داڑھی بڑھانی شروع کر دی تھی۔ وہ داڑھی، جس سے وہ کاغذ ملا ہے جس پر بنے چھ خانوں میں انگلش کے چھ حروف لکھے ہیں۔"
"امیر آباد میں یہ خبر بھی پہنچ چکی ہے؟"
"وہاں ہر خبر پہنچ رہی ہے جسے سن کر جہاں کئی لوگ حیرت کر رہے ہیں یہ سب کیسے ہو رہا ہے وہاں دل ہی دل میں، میں یہ سوچ کر ان سے دوگنی حیرت میں تھی کہ پارسل کی وہ چیزیں کیسے کیسے کرشمے دکھا رہی ہیں جنہیں میں فالتو کی چیزیں سمجھ رہی تھی۔"
"اور یہ خبریں امیر آباد میں کس ذریعے سے پہنچ رہی تھیں؟"
"سی آئی اے میں معراج علی نام کا کوئی اہلکار ہے جو امیر جان کا پالتو ہے، اس کے ذریعے سے۔"
"اوہ۔"
"سرتاج کا کہنا ہے کہ اس کاغذ کا تمہاری داڑھی سے نکلنا یہ ثابت کرتا ہے کہ ثمن کے قتل کے ساتھ ہی تم فیصلہ کر چکے تھے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور۔"
"اور؟"
"میں بھی اس کے خیال سے متفق ہوں اور یہ بات امیر جان سے بات چیت کے دوران میں نے کہہ بھی دی تھی۔" الوینہ نے بتایا۔
"جب امیر جان نے یہ سوال اٹھایا کہ میں نے گوادر جا کر کس طرح پارسل بھیج دیا تو تم نے کیا کہا؟"
"بیچارے کے دماغ کو تھوڑا سکون دے دیا تھا۔"
"وہ کیسے؟"
"میں نے اسے بتا دیا کہ پارسل بھیجنے کے لیے

تمہیں گو اور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام تم نے امیر آباد کے ہی کسی فرد کو اپنے اعتماد میں لے کر کروالیا ہوگا۔"
"ایسے کہہ دیا تم نے؟"
"یہ بتائے بغیر کہ وہ فرد میں ہوں۔" الوینہ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟"
"اس کی عقل پر اپنی عقل کا سکہ جمانے کے لیے۔"
"کیا مطلب؟"
"وہ ایسے ہی تمہاری الوینہ کے تلوے نہیں چاٹتا۔ وہ میرے جسم کے ساتھ ساتھ میرے دماغ کا بھی لوہا مانتا ہے اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وقت بوقت میں ایسے عقلی بٹیر چھوڑتی ہی رہتی ہوں۔ مجھے لگا کہ وہ سب کہہ دینے میں کوئی برائی نہیں ہے تو کہہ دیا۔ اس نے محسوس کرلیا کہ میں نے وہ بات کہی ہے جو کسی کے دماغ میں نہیں آسکتی تھی۔"
"لیکن اگر اسے شک ہو جاتا تو؟"
"تم الٹا سوچ رہے ہو۔" الوینہ نے کہا۔
"ایسے حالات میں آدمی شک بھی کرتا ہے تو اسے دماغ سے نکال کر کرتا ہے جس نے وہ پوائنٹ دماغ میں ڈالا ہو۔ یہی سوچے گا کہ اگر یہی ہوتا تو خود یہ پوائنٹ کیوں اٹھاتا۔ وہی ہوا۔ اسی وقت اس کا دماغ اس سوال میں الجھ کر رہ گیا کہ کون ہے وہ غدار کاشف کے لیے یہ کام کس نے کیا ہوگا۔ مگر اس سوال میں بھی اس کا دھیان زیادہ دیر نہیں الجھا رہا۔"
"کیوں؟"
"اس لیے کہ اس کا جواب فوراً ہی مل گیا تھا۔"
"کیا کہہ رہی ہو تم' کیسے؟" کاشف نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
"اسی وقت ہمت خان کا فون آ گیا تھا۔ اس نے تمہارے اور خدا جانے کے درمیان ہونے والی ساری باتیں بتا دیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ خدا جانے کو سرتاج صدیقی نے ہی متعین کیا تھا اور یہ بھی کہ خدا جانے نے تمہیں سرتاج کا ایک لیٹر بھی دیا تھا۔"
"اوہ! تب تو بیچارہ سرتاج صدیقی پھنس گیا ہوگا؟" کاشف نے پریشان ہو کر کہا۔
"اس وقت وہ امیر جان کے ٹارچر روم میں ہے۔ اس سے ایسے ایسے سوال پوچھے جا رہے ہیں جن کے جواب اس کے فرشتے بھی نہیں دے سکتے اور۔" الوینہ نے تھوڑا رک کر کہا۔
"اس واقعے کے بعد میں ایک اور اندازہ لگانے میں کامیاب ہوئی ہوں۔"
"وہ کیا؟"
"یہ بات شاید تم نے مجھ سے کہی اس لیے تھی کہ خدا جانے سے یہ کہوں کہ سمانا ہوٹل میں تمہارے سامنے سرتاج صدیقی کا نام لے۔ سرتاج کے ہی نام کا لیٹر اسے دے تا کہ امیر جان تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ غدار سرتاج صدیقی ہے۔"
"اس سے بھلا مجھے کیا ہوا ہوگا؟"
"ہوسکتا ہے تم یہ چاہتے ہو کہ سرتاج کو اتنا ٹائم ہی نہ ملے کہ وہ تمہاری نشین کا ایریز نکال سکے۔"
"لیکن بھلا مجھے کیا پتہ تھا کہ خدا جانے والا واقعہ لیک ہو کر امیر جان تک پہنچ جائے گا؟"
"جب باقی کی سب باتیں پتہ تھیں تو یہ پتہ کیوں نہیں ہوگا؟"
"یعنی کہ؟"
"جادو کے پٹارے کی بات کر رہی ہوں میں۔" الوینہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔
"جادو کے اس پٹارے کی جو چوبیس تاریخ کو تمہارے پاس تھا۔ تب ہی تو آگے تک کے واقعے بتا دیئے کرتے تھے۔ تم اس وقت جانتے تھے کہ خدا جانے کے واقعے کی رپورٹ امیر جان کو مل جائے گی۔ لیکن آگے کی نہیں ملے گی۔ تب ہی تو کار میں جو لفافہ رکھوایا اس پر سرتاج کا نہیں میرا نام تھا۔ تم جانتے ہو گے کہ اس کی رپورٹ امیر جان تک نہیں پہنچ پائے گی۔"

''لیکن وہ لفافہ بھی مجھ سے کوئی چھین کر لے گیا۔''

''میرے خیال سے وہ کام سی آئی اے والوں کا تھا۔'' الوینہ نے یقین سے کہا۔

''اسی لیے تو میرے میک اپ میں کوئی اور لڑکی بھیجی گئی۔ مگر تم بھی پکے تھے' بلکہ ایک بار پھر کہنا پڑے کہ تم جانتے تھے کہ کوئی اس لفافے کو تم سے چھین لے گا اور پھر اس کا فائدہ اٹھا کر وہی تمہیں نقلی الوینہ کے جال میں پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ اس بات کو بھی تم انجکشن کے اثر سے آزاد ہونے سے پہلے تک جانتے تھے۔ تب ہی تو پارسل میں ایک ہی پوز میں میرے فوٹو رکھوائے تھے۔ تاکہ وقت آنے پر نقلی الوینہ کو پہچان سکو۔''

کاشف کو لگا کہ واقعی وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ ٹھیک نہ بھی کہہ رہی تو اس کی بات میں وزن ضرور ہے۔

''لیکن تم وہاں کیسے پہنچ گئیں۔'' اس نے پوچھا۔

''تم ہی نے بلایا تھا۔''

''مم...... میں نے بلایا تھا؟''

''گلمو ہر ہوٹل کے بار کی جس نشست پر ہم ملے وہ بھی تم نے میرے ذریعے انیس اگست کو ہی بک کروادی تھی۔ میں نے اسی وقت پوچھا تھا کہ کاشف کیا ہم چھبیس اگست کو ملنے والے ہیں۔ اس وقت تم ایک بار پھر سے مسکرا کر ٹال گئے تھے۔ لیکن چوبیس اگست یعنی پرسوں تم نے کہہ دیا تھا کہ میں چھبیس اگست کو یعنی آج اتنے بجے گلمو ہر ہوٹل کے بار میں ریزرو کرائی گئی میز پر پہنچ جاؤں۔ تم مجھے وہیں ملو گے۔''

''تب تو یہ بھی بتادیا ہوگا کہ......''

''بتادیا تھا۔ تم نے سب بتادیا تھا کاشف۔ تب ہی تو بار بار یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ سارے واقعات ہوں گے۔ یہ بات تمہیں پہلے سے پتہ تھی۔ یہ بھی کہ تم اس وقت نقلی الوینہ کے ساتھ ہوگے۔ مجھے وہاں پہنچتے ہی تمہارے فیورٹ کرکٹر کا نام بتانا ہوگا۔ اسی وقت جملہ ہوگا اور میں تمہیں لے کر جنریٹر والے کمرے میں جاؤں گی۔ وہاں تم خود اپنا کام کروگے۔ اور.......''

''اور اندھیرا ہونے پر یہاں لے آنا ہے۔'' کاشف نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے تو تم نے یہ کمرہ بھی پہلے سے بک کروالیا تھا اور پہلے ہی سے کمرے کی چابی لے کر بار میں آنے کو بولا تھا۔'' الوینہ ہر بات کھولتی چلی گئی۔

''تم نے یہ بھی کہا تھا کہ یہاں مجھے یہ ساری باتیں تمہارے علم میں لانی ہیں۔''

''لیکن امیر جان نے تم کو یہاں آنے کیسے دیا؟'' کاشف کے لہجے میں ایک بار پھر شک کی پرچھائیں ابھری۔

''یہ بھی جادو کے پٹارے کے زور پر ہونے والا ویسا ہی قصہ ہے جیسے انیس اگست کو ہوا تھا۔ سترہ اگست کو ہی تم نے بتا دیا تھا کہ انیس اگست کو میں لاہور اور گوادر جاؤں گی۔ ٹھیک ویسے ہی چوبیس اگست کو جب تم نے کہا کہ میں چھبیس اگست کو تم سے بار میں ملوں تو میں نے کہا تھا کہ ملوں گی تو تب ہی جب امیر جان مجھے امیر آباد سے باہر جانے دے گا تو تم نے اپنی سدا بہار پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا کہ امیر جان تمہیں خود بھیجے گا۔''

''اور وہی ہوا؟''

''سو فیصد ہوا۔'' الوینہ بولی۔

''اور جب یہ بتاؤں گی کہ اس نے مجھے کیوں بھیجا ہے تو اچھل پڑو گے۔''

''وہ کس خوشی میں۔''

''اس نے مجھے تمہیں اپنی باتوں کے جال میں پھنسا کر اپنے ساتھ امیر آباد لانے کا کام سونپا ہے۔''

''اوہ۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

''اور وہی تم کر رہی ہو۔''

''بڑی عجیب مصیبت ہے میری۔ چوبیس اگست کو تم نے کہا تھا کہ چھبیس اگست کو مجھے تم سے اس کمرے میں مل کر ساری باتیں بتانے کے بعد تمہیں امیر آباد لے جانا ہے اور آج جب کافی ٹارچر کے بعد بھی سرتاج نہیں ٹوٹا تو امیر جان نے مجھے بلا کر تمہیں امیر آباد لانے کا حکم

دے دیا۔"

"مصیبت عجیب کہاں ہوئی۔ یہ تو بہت آسان ہوگیا۔ جو امیر جان نے کہا ہے وہ کام کردو۔ ایک ہی جھٹکے میں دونوں کا حکم پورا ہوجائے گا۔"

"میں ایسا نہیں کرسکوں گی۔"

"وجہ......؟"

"امیر آباد میں اپنے داخلے کی جو ترکیب تم نے مجھے بتائی تھی اس کا مطلب تھا کہ امیر جان کو تمہارے داخلے کی بھنک نہ لگ سکے۔"

"تو۔"

"اگر تمہارا حکم مانا' تو بھلا وہ ایسا کب برداشت کرے گا کہ اسے بھنک تک نہ لگے۔"

"کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔"

"اس لیے دونوں کے حکم ایک ہوتے ہوئے بھی ایک نہیں ہیں۔"

"وہ مجھے امیر آباد میں کیوں بلوانا چاہتا ہے؟"

"پوچھنے کے باوجود نہ اس نے اپنا مقصد بتایا اور نہ تم نے۔ دونوں نے بس حکم صادر فرما دیئے ہیں۔ میں اس کے مقصد کا کم سے کم اندازہ تو کرسکتی ہوں۔ لیکن تمہارے مقصد کا نہیں۔"

"اس کے مقصد کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے۔"

"مشین کی خرابی' وہ اسے ٹھیک کروانا چاہتا ہوگا۔" الوینہ نے کہا۔

"اس بات کا اندازہ میں اس لیے بھی لگا سکتی ہوں کہ جیسے ہی مشین کی خرابی کا پتہ لگا اس نے اپنی ہی جانب سے صادر کیا ہوا تمہاری موت کا فرمان کینسل کر دیا تھا۔"

"وہ ان کرشماتی واقعات کا راز بھی تو جاننا چاہتا ہو جو کل یعنی پچیس اگست کی صبح سے ہی میرے ساتھ ہو رہے ہیں۔" کاشف نے کہا۔

"ان واقعات کا راز وہ جانتا ہے۔"

"جج جانتا ہے۔" کاشف چونکا۔

"وہ ان واقعات کا راز جانتا ہے جو مجھ سمیت کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہے ہیں؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" الوینہ بولی۔

"اور جب مجھے لگا تھا تو میں نے جاننے کی کوشش کی مگر وہ بتاتے بتاتے رک گیا تھا۔ بات کو گول مول گھمانے لگا' مگر۔"

"مگر؟"

"مگر مجھے لگتا ہے کہ اس کا تعلق بھی تمہاری بنائی ہوئی مشین سے ہی ہے۔"

"ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟" کاشف نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"جب تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر غور کیا جا رہا تھا اور سب ہی لوگوں کے دماغ گھومے ہوئے تھے تو کچھ دیر تک تو امیر جان اور سرتاج صدیقی کا رویہ بھی دوسرے لوگوں جیسا ہی تھا۔ لیکن پھر ان کے بیچ کچھ ایسی باتیں ہوئیں جو کم سے کم اس وقت میرے اور ڈاکٹر بابر نعیم کی سمجھ میں بالکل نہیں آئیں۔ وہاں سے وہ سیدھے مشین کے پاس گئے اور اس کے بعد سے میں نے محسوس کیا کہ تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعات میں امیر جان کو کوئی کرشمہ نظر نہیں آرہا تھا۔"

"تب تو مجھے امیر جان سے پہلے اس مشین تک پہنچنا ہوگا۔"

"تم نے مجھے یہ کام سونپا تھا۔" الوینہ نے کہا۔

"یہ کہ میں تمہیں اس مشین تک پہنچاؤں۔"

"تم یہ کام کس طرح سے کروگی۔"

"مظاہرے کے ذریعے۔"

"کیا مطلب؟" کاشف نے چونکتے ہوئے کہا۔



کار جہاں رکی وہاں ایک نیون سائن بورڈ لگا ہوا تھا اور اس پر لکھا تھا۔ "مظاہرہ"

اور یہ لفظ لال' زرد اور سیاہ رنگوں سے لکھا ہوا تھا۔ اس

بار کار دوسری تھی یعنی سانا ہوٹل سے لائی ہوئی مرسڈیز کی بجائے ہونڈا سٹی تھی۔ اس کا انتظام بھی الوینہ نے ہی کیا تھا اور وہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ کار رکنے پر دونوں اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آئے ہی تھے کہ کسی انگلش گانے کی آواز آنے لگی۔

الوینہ نے پرس سے بہت ہی عجیب شیپ کا فون نکالا اور اسے آن کرتی ہوئی بولی۔

''ہاں جان۔ بولیے۔''

''کیا رہا۔'' امیر جان کی آواز کاشف کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔

''سب گڑ بڑ ہو گیا۔ آپ کو ہمت خان نے بتا ہی دیا ہوگا۔''

''ہمت خان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''کک...... کیا۔'' الوینہ ایک جھٹکا لے کر بولی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو جان۔''

''وہی۔'' امیر جان کی افسوس میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''جو رپورٹ ہمیں ملی ہمت خان کے ساتھیوں سے ملی۔''

''مم...... مگر ہمت خان کو کیا ہوا تھا؟''

''سی آئی اے والے یہ سوچ کر گلمو ہر کے مین گیٹ پر مورچہ سنبھالے ہوئے تھے کہ تم اور کاشف نکلو گے تو وہیں سے۔ یہ دیکھ کر ہمت خان کو لگا کہ اس وقت اس کی ڈیوٹی تمہاری حفاظت کرنا اور تمہارے لیے راستہ بنانا ہے۔ تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کے مقابلے پر آ گیا اور اسی مقابلے کی نظر ہو گیا ہمت خان۔''

''اوہ۔'' الوینہ بولی۔

''ہوٹل میں یہ ذکر تو ہو رہا تھا کہ دو گروپوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا ہے۔ اس میں ایک آدمی مارا بھی گیا ہے۔ لیکن میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ۔''

''ہمیں ملی رپورٹ کے مطابق اس کی لاش کو سی آئی اے والوں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔'' پھر امیر جان ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔

''خیر۔ تم اپنی رپورٹ دو۔ کیا ہوا تھا؟''

''جب میں ہمت خان کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچی تو دیکھا کہ میرے میک اپ میں پہلے سے ہی ایک لڑکی کاشف کو پھنسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے اور کاشف کے درمیان تھری اسٹار ہوٹل میں ہونے والی باتوں میں سے ایک بات بتا کر میں نے اسے یقین دلا دیا کہ میں ہی اصلی الوینہ ہوں۔ بس اسی وقت حملہ ہو گیا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ نقلی الوینہ بھی شاید انہی کی چال تھی۔ اپنی چال کو ناکام ہوتا دیکھ کر انہوں نے حملہ کیا ہوگا۔ حملے کے نتیجے میں افراتفری مچ گئی تھی۔ بھیڑ اتنی زیادہ تھی اور دھکم پیل کا یہ حال تھا کہ بھاگتے وقت اپنی پوری کوشش کے بعد بھی خود کو کاشف کے ساتھ نہیں رکھ پائی۔

''رپورٹ کے مطابق تو تم نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔''

''وہی تو بتا رہی ہوں۔ کوشش میری یہی تھی کہ اسے الگ نہ ہونے دوں مگر تب ہی بھگدڑ کے درمیان جانے کیسے پورے علاقے کی لائٹ چلی گی اور میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔''

''کیا اس نے خود تم سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا؟''

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔'' الوینہ نے کہا۔

''کیونکہ وہ خود بھی مجھ سے بات کرنے کا خواہشمند لگ رہا تھا۔ وہ اپنے دماغ میں گھومتے سینکڑوں سوالوں کے جواب چاہتا تھا۔ ہوا یہ کہ اندھیرے میں کوئی ہمارے بیچ سے بھاگا اور کاشف کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد میں اسے ڈھونڈتی ہی رہ گئی۔ خیال تو میرا یہ ہے کہ وہ بھی مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ کیونکہ اسے بھی میری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ہمیں اس کی۔''

''لیکن ہمارے خیال سے اب وہ گلمو ہر تو کیا اس کے آس پاس بھی نہیں ہوگا اور فی الحال تم بھی واپس آ جاؤ۔''

''وہ کیوں جان۔ میں جس مشن کے لیے نکلی ہوں۔''

''اس وقت تمہارا وہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے وینا۔'' امیر جان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''رپورٹ ملی ہے کہ عمران کی ماتحتی میں سی آئی اے والے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کارکردگی دکھانے کے موڈ میں ہیں۔ انہیں تمہاری تلاش ہے۔ تم ان کے ہاتھ لگ گئیں تو۔''

''اوہ جان تم میری فکر مت کرو۔'' الوینہ نے کہا۔

''اب میں اپنا مشن پورا کر کے ہی لوٹوں گی۔''

''بے وقوفی مت کرو وینا۔ وہاں ابھی خطرہ ہے۔ فی الحال لوٹ آؤ' ہمت خان کے کئی آدمی اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پتہ لگتے ہی تمہیں واپس بھیج دیا جائے گا۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو جان۔ میں کسی بھی وقت اس تک پہنچ سکتی ہوں۔ یا یوں کہوں تو شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ کسی بھی لمحے مجھ تک پہنچ سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے یہاں اپنے طور سے معلومات کی تو پتہ لگا کہ روم نمبر 811 کاشف کے نام بک ہے۔ ریکارڈ کے مطابق یہ کمرہ بھی انیس اگست کو ہی بک کروالیا گیا تھا۔ ابھی تک وہ یہاں پہنچا نہیں ہے مگر میرا خیال ہے کہ کمرہ بک کرایا تھا تو دیر بدیر یہاں پہنچے گا بھی۔ ایسا سوچ کر میں اس کے اسی کمرے میں جمی ہوئی ہوں۔''

''تم روم نمبر 811 کے اندر سے بول رہی ہو۔'' امیر جان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تم اندر کیسے پہنچ گئیں؟''

''یہ بات اتنی اہم نہیں ہے کہ فون پر بتائی جائے۔ پہنچنے پر ساری باتیں سکون کے ساتھ بتا دوں گی۔ فی الحال بس اتنا سمجھ لو کہ کمرہ باہر سے بند ہے اور میں کمرے کے اندر اس کے یہاں آنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ جیسے ہی آئے گا میں اسے شیشے میں اتار لوں گی۔''

''اوہ۔''

''اب تم سمجھ گئے ہو گے۔ سی آئی اے کا باپ بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں بند کمرے کے اندر ہوں۔ ہاں اگر باہر ہوتی تو یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی۔''

''مم...... مگر وہ بھی تو پتہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کمرہ کاشف کے نام سے بک ہے۔''

''پہلی بات تو ایسا ہوگا نہیں۔ ہو بھی گیا تو کیا کریں گے؟''

''کمرے کی نگرانی کر سکتے ہیں۔''

''کرتے رہیں۔ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ انہیں یہ الہام تو ہونے سے رہا کہ میں بند کمرے کے اندر ہوں۔ یہاں سے نکلی بھی تو دروازے سے تو نکلنے سے رہی۔ وہیں سے نکلوں گی جہاں سے اس کمرے میں آئی ہوں۔''

''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جب کاشف اپنے کمرے تک پہنچے تو اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی اندر گھس آئیں؟'' امیر جان نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

تم نے مجھے میدان میں اتارا ہے تو اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا نا جان۔ حالات جیسے بھی ہوں' نمٹنا تو ہوگا نا ان سے۔'' الوینہ نے امیر جان پر اپنا عزم ظاہر کیا۔

''اگر ہم یونہی اپنی سوچوں سے ڈرتے رہے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اگر وہ آ گیا تو صبح اسے لے کر امیر آباد پہنچ جاؤں گی۔ نہیں آیا تو اکیلی آ جاؤں گی۔''

''یعنی تم ساری رات وہاں اس کا انتظار کرو گی؟''

''میرے خیال سے اتنا سا کام تو مجھے بھی کرنا ہی چاہیے۔'' الوینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ ہم اپنے باقی آدمیوں کو کمرے کے باہر نگرانی پر لگا دیتے ہیں۔ اگر وہ کوئی خطرہ دیکھیں گے تو تمہیں۔''

''ہرگز نہیں جان۔ ایسا کسی بھی حالت میں مت کرنا۔'' اس نے تیزی سے امیر جان کی بات کاٹ کر کہا۔

''یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہو جائے گی۔ اگر سی آئی اے میں سے کوئی بھی ان پر نظر رکھے ہوئے ہوا تو تو ان کے ذریعے ہی انہیں اس بات کا علم بھی ہو جائے گا کہ اس کمرے میں کوئی خاص بات ہے اور وہ اس کمرے کو۔''

''سمجھ گئے' ہم سمجھ گئے۔''

''دو فکر مت کرو۔ پہلے بھی میرے کئی کام دیکھ چکے ہو۔ تمہاری وینا ذہنی طور پر اتنی کمزور ہے کہ کہیں پھنس جائے اور نہ جسمانی طور پر اتنی بے ہمت ہے کہ پھنس جائے تو نکل نہ پائے۔ بس دعا کرو کہ کامیاب ہو کر ہی لوٹوں۔''

''او کے دینا۔ ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے۔ ٹیک کیئر۔'' اور دوسری طرف سے لائن ڈس کنیکٹ ہو گئی۔

فون آف کرتے ہوئے الوینہ نے کاشف سے کہا۔

''دیکھا تم نے۔ ایک بار پھر وہی ہوا نا جو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔''

''کیا بتا دیا تھا؟'' کاشف کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔

''کمرے میں ہی میں نے بتا دیا تھا کہ ہمت خان مارا گیا ہے۔''

''اور وہ بات تم نے کس بنیاد پر کہی تھی؟''

''بتایا تو تھا۔ یہ بات تم نے مجھے چوبیس اگست کو ہی بتا دی تھی کہ اندھیرے کے درمیان ہمت خان گھوم ہر کے باہر ہونے والی فائرنگ میں مارا جائے گا۔''

''اب یہ بتاؤ کہ ہمت خان کی موت کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا یا میں نے تمہیں!'' کاشف مزا لیتے ہوئے بولا۔

''تت...... تم نے۔''

''پھر یہ دعویٰ کیوں کر رہی ہو کہ یہ بات تم نے مجھے بتائی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جن نظروں سے الوینہ کی طرف دیکھا' الوینہ نے جب ان کا مطلب سمجھا تو بے ساختہ قہقہہ لگانے لگی۔

''اوہ۔ تو تم شرارت پہ اتر آئے ہو۔'' وہ بولی۔

''اب چلیں مظاہرے کی طرف۔'' کاشف نے اس دوکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے اوپر ''مظاہرہ'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

''ضرور۔'' الوینہ نے دوکان کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔



''یہ۔'' الوینہ نے کاٹھ کباڑ سے اٹی میز پر ایک فوٹو رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ شکل چاہئے ہمیں۔''

ایک گندی سی ریوالونگ چیئر پر بیٹھے موٹے لینس کے چشموں والے دبلے پتلے شخص نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں کو استعمال میں لاتے ہوئے وہ فوٹو اٹھایا جو کسی سانولے سے آدمی کا تھا۔ اس نے تصویر کو ٹیبل لیمپ کے دائرے میں لا کر غور سے دیکھا پھر ایک ایسی حرکت جس سے کاشف سٹپٹا کر رہ گیا۔

اس نے ایک ہی جھٹکے میں ٹیبل لیمپ کا رخ میز کے نزدیک کھڑے کاشف کی چہرے کی طرف گھما دیا تھا۔ کاشف نے تیز روشنی کی وجہ سے آنکھیں میچائیں تو اس نے کہا۔ ''نو...... نو...... آنکھیں بند مت کرو۔''

''ارے مگر۔''

مگر اس نے کاشف کی بات کو بیچ سے اچکتے ہوئے کہا۔

''کوشش کرو۔ ہو جائے گا۔ لیمپ میں لگے بلب کی طرف دیکھو۔''

مجبوراً کاشف کو ایسا کرنا پڑا اور جب کیا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ دیر بعد وہ اس روشنی کا عادی ہو گیا۔ اب وہ معمول کے مطابق بلب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر بھی کاشف کو سکون تب ملا جب اس نے لیمپ کا رخ دوبارہ اپنی طرف گھمایا۔ اب وہ فوٹو کو دیکھ رہا تھا اور ایک بار پھر اس نے لیمپ کا رخ کاشف کے چہرے کی طرف کر دیا۔

کئی بار اس عمل کو دوہرانے کے بعد بولا۔

''ہو جائے گا۔''

''ٹائم کتنا لگے گا؟'' الوینہ نے پوچھا۔

''پہلے پیسے پوچھو۔'' اس نے کرسی سے کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے پیسے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔''

''اور ہمارے لیے ٹائم اہمیت رکھتا ہے۔''

''کب تک چاہتی ہو؟''

''صبح سے پہلے۔''

اس شخص نے اپنی جیب سے پاکٹ واچ نکالی اور ٹائم دیکھ کر بولا۔

''اس سے بہت پہلے ہو جائے گا۔''

''شکریہ۔''

''گدھے ہیں لوگ۔ کام ہونے سے پہلے گن گانے لگتے ہیں۔ پیسے تو پوچھ لو۔'' اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پیسے سن کر میں نے بہت سوں کو ریس لگاتے دیکھا ہے۔ تیار تو ہو جانے دو مجھے۔''

''بتاؤ۔''

''ایک لاکھ۔''

''یہ تو بہت زیادہ۔''

''اس سے کم نہیں۔'' وہ بات کاٹتا ہوا بولا۔ دروازہ اس طرف ہے۔ اس سے کم میں کہیں اور ہو جائے تو کروالو۔''

''او کے۔ آپ کام شروع کریں۔''

''پچاس میز پر رکھ دو۔''

الوینہ نے پانچ ہزار کے دس نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ لیکن اس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔

''میں نے کہا میز پر رکھ دو۔ تو رکھ دو میز پر۔''

الوینہ بھنا سی گئی اور نوٹ میز پر رکھ دیے۔

وہ نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

''دونوں یہیں بیٹھو۔ میں اندر تیاری کرتا ہوں۔ جب تیاری ہو جائے گی تو بلا لوں گا۔ جلدی مت مچانا۔ مجھے شور ذرا بھی پسند نہیں ہے۔''

وہ تیزی سے مڑا اور ایک دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ یہ لوگ کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ وہ دروازہ شاید اس کی لیبارٹری کا تھا۔

اس کے جانے کے بعد کاشف اور الوینہ سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

''عجیب آدمی ہے۔ جب نوٹ جیب میں ہی رکھنے تھے تو میز پر رکھنے کو کیوں کہا؟'' الوینہ ابھی بھی بھنائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''ہوتے ہیں۔'' کاشف نے پھر شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جو حسینوں کے ہاتھ سے پیسے نہیں لیتے۔''

''بہت شرارت سوجھ رہی ہے تمہیں۔'' الوینہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کام کی بات کروں۔''

''وہی کرتے زیادہ اچھے لگتے ہو۔''

''فوٹو کس کا ہے؟''

''شمس الدین کا۔''

''کام کیا کرتا ہے؟''

''اس ہیلی کاپٹر کا پائلٹ ہے جس سے میں آئی ہوں۔''

''پائلٹ؟''

''چونکے کیوں؟''

''اور تم میرے چہرے پر اس کا میک اپ کرواؤ گی؟''

''مظاہرہ۔'' وہ بولی۔

''کچھ تو مظاہرہ ہونا ہی ہے نا۔''

''لیکن پھر ہمیں امیر آباد کون لے کر جائے گا۔'' کاشف نے حیرت سے پوچھا۔

''ہیلی کاپٹر کون اڑائے گا۔''

"تم۔"

"مم...... میں۔" وہ چونک کر بولا۔

الوینہ کے ہونٹوں پر بہت ہی پراسرار مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"اب تو تم کو یقین آ گیا ہوگا کہ میں نے اب تک جو کہا وہ سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"مطلب۔" کاشف کا دماغ ہوا میں اڑ رہا تھا۔

"مطلب یہ میرے راجہ کہ ہوٹل کے کمرے میں میرے اتنے لمبے چوڑے بیان کے بعد بھی آخر میں تم نے یہی کہا کہ کیسے مان لوں کہ تم سچ ہی بول رہی ہو۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم امیر جان کے لیے کام کرتے ہوئے مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔ تب میں نے پوچھا تھا کہ تمہیں کیسے یقین آئے گا۔ تو تم بولے جب میں نے تمہیں اتنی ساری باتیں بتائی تھیں تو ایسی بھی کوئی بات بتائی ہوگی جو اگلے کچھ وقت میں کیا ہونے والا ہے اور جسے سنتے ہی مجھے پتہ لگ جائے کہ تم سچ بول رہی ہو۔ تب میں نے کہا تھا کہ کچھ دیر بعد مجھے امیر جان فون پر ہمت خان کی موت کی خبر سنائے گا اور رہی کوئی ایسی بات تو ہاں بتائی تو تھی ایسی ایک بات۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ وہ بات مجھے یہاں اس کمرے میں نہیں بلکہ مظاہرہ پہنچنے کے بعد بتانا۔ تب کہیں جا کر تم میرے ساتھ یہاں تک آئے ہو۔"

"تو اب بتا دو وہ بات۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم ہیلی کاپٹر اڑا سکتے ہو۔"

کاشف اس کی طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگا جیسے ایک ہی پل میں الوینہ کے سر پر دو سینگ ابھر آئے ہوں۔

"چوبیس اگست کو تم نے کہا تھا کہ جب تم مجھے یہ بات بتاؤ گی تو میں سمجھ جاؤں گا کہ یقیناً میں تمہارے اتنے نزدیک آ گیا تھا جتنا تم کہہ رہی ہو اور سارے کام تم ہی سے کروائے تھے کیونکہ میرے پائلٹ ہونے کے راز کو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔"

وہ کہہ رہا تھا اور الوینہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ کاشف بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ واقعی یہ بات اسے کسی اور سے پتہ نہیں لگ سکتی تھی۔



شمس الدین ایک ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا۔ وقت گزارنے کا اس سے بہتر طریقہ اس کے پاس ہوتا بھی نہیں تھا اور وقت گزارنا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ امیر جان۔ ڈاکٹر بابر نعیم' سرتاج صدیقی' الوینہ میڈم اور ثمن ہی آیا جایا کرتے تھے اس کے ہیلی کاپٹر سے۔ ان میں سے بھی اب ثمن نہیں رہی تھی۔

وہ اگر اس شہر میں آتے تھے تو ہیلی کاپٹر یہیں لینڈ ہوتا تھا اور شہری سفر کے لیے کوئی کار پہلے سے موجود رہتی تھی اور ان کے جانے کے بعد کام ہوتا تھا ان کے لوٹ کر آنے کا انتظار کرنا۔ اور اس ویرانے میں جہاں اسے کوئی انسانی آبادی نظر نہیں آتی تھی ٹائم پاس کرنے کے لیے اس کے پاس ڈائجسٹ پڑھنے کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اس لیے وقت گزاری کے لیے اب یہ ڈائجسٹ ہی اس کے سب سے اچھا دوست تھے۔

وہ رات گیارہ بجے کے قریب الوینہ کو لے کر یہاں آیا تھا اور وہ ایک ہونڈا سٹی میں صبح لوٹ کر آنے کا کہہ کر چلی گئی تھی۔ ایک کیا اس نے تو کئی کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ کیونکہ اسے ہیلی کاپٹر اکیلا چھوڑ کر جانے کی اجازت ہی نہیں تھی اور وہ جانتا تھا کہ امیر جان کی حکم عدولی کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔

اس نے نظر اٹھا کر ہیلی کاپٹر کی اسکرین سے باہر کی طرف جھانکا۔ پو پھٹ رہی تھی اور سمندر کے اس پار لالی آنی شروع ہوگئی تھی۔

ابھی وہ ایک سلسلہ وار کہانی کے اختتام تک پہنچا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں کسی کار کے انجن کی آواز گونجی۔ وہ آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ دور بہت دور سے ایک کار کا سایہ نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم واپس آ رہی ہیں۔ اس کا پورا دھیان کہانی کی طرف تھا اس لیے میڈم کا اس

وقت آنا اسے بہت کھل رہا تھا۔

"صبح آنے کا کہہ کر گئی تھی میڈم۔" وہ بڑبڑایا۔
"ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ ابھی تو سورج بھی نہیں نکلا۔"

لیکن اس کی یہ بڑبڑاہٹ کار کو آنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابھی اتنی روشنی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پہچان سکتا کہ وہی کار ہے جس میں میڈم بیٹھ کر گئی تھی یا کوئی دوسری ہے۔ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ ان کے علاوہ اور کون آ سکتا ہے اس ویرانے میں۔

اس نے دل مسوس کر صفحہ موڑ کر نشان لگایا اور ڈائجسٹ بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اگلے چند منٹوں میں کار ہیلی کاپٹر سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رک رہی تھی۔

آگے کے دونوں دروازے کھلے۔ ایک سے میڈم اور دوسرے سے کوئی آدمی باہر نکلا۔ ابھی روشنی اتنی نہیں پھیلی تھی' اس لیے اتنی دور سے اس آدمی کی شکل واضح نہیں ہو رہی تھی۔ مگر یہ ضرور دکھ رہا تھا کہ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر وہ دونوں ریت پر قدم سے قدم ملاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف آنے لگے۔ شمس الدین کی نظریں اس آدمی پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میڈم کسے اپنے ساتھ لائی ہے۔ مگر صورت ٹھیک سے نظر آتی تب نا۔

تب تک شمس الدین یہ بات نوٹ کر چکا تھا کہ میڈم نے اپنے اور اس آدمی کے بیچ ایک فاصلہ رکھا ہوا تھا اور وہ بھی سگریٹ پیتے ہوئے دھواں میڈم کی مخالف سمت میں چھوڑ رہا تھا اور اب وہ ہیلی کاپٹر کے کافی نزدیک آ چکے تھے۔

جب وہ پانچ قدم کی دوری پر رہ گئے تب وہ بری طرح سے چونکا اور بات تھی بھی چونکانے والی۔

"ارے۔" وہ ہڑبڑا کر بڑبڑایا۔

"یہ تو میں ہی ہوں میڈم کے ساتھ' ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا میں پاگل ہو گیا' یا میری نظر مجھے دھوکہ دے رہی ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہیلی کاپٹر کے اندر۔" اس نے سر کو جھٹکا کہ شاید اس جھٹکے سے منظر بدل جائے اور وہ جلدی سے ہیلی کاپٹر سے باہر آ گیا۔

اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یا تو کم روشنی کی وجہ سے میں الٹا سیدھا دیکھ رہا ہوں یا ساری رات جاگ کر گزارنے کی وجہ سے ایسا دیسا نظر آ رہا ہے۔ یا پھر یہ اس کہانی کا اثر ہے جسے اسے نے میڈم کے آنے پر ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"جب میں یہاں ہوں تو میڈم کے ساتھ کیسے نظر آ سکتا ہوں۔" وہ آنکھیں ملتا ہوا سوچنے لگا۔

مگر جب وہ اس کے نزدیک پہنچے تب بھی اس آدمی کی شکل ویسی ہی رہی۔ اس کی اپنی شکل۔

"میڈم۔" اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اس نے کوئی جادوئی شے دیکھ لی ہو۔

"مجھے معاف کرنا۔ شاید میری آنکھوں میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ یہ صبح صبح جانے کیا نظر آ رہا ہے مجھے؟"

الوینہ نے کاشف کی طرف نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"

"مم...... میں خود کو آپ کے ساتھ' مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" اس کی عقل سوکھی گھاس چرنے لگی تھی۔ "میں تو یہاں کھڑا ہوں۔"

"تم ٹھیک دیکھ رہے ہو شمس الدین۔" الوینہ نے کہا۔

"ارے کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہیر پھیر ہے۔ آپ بھی مزے لے رہی ہیں مجھ سے۔ جب میں یہاں کھڑا ہوں تو' اور پھر آپ جانتی ہیں کہ میں سگریٹ۔"

کاشف نے جان بوجھ کر اس کی طرف دھواں چھوڑا اور وہ کھانسنے لگا۔

"شمس الدین یہ تمہارا جڑواں بھائی ہے قمر الدین۔" اس نے میڈم کی آواز سنی۔

"ج۔ جڑواں بھائی۔" اسے اپنی ہی آواز بہت دور

سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے اس کی آواز میں کوئی اور بول رہا ہو۔ اس کی سوچیں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور شاید یہ آخری سوچ تھی کیونکہ اس کے بعد اس کے دماغ نے مزید اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ لہرا کر دھڑام سے ریت پر ڈھیر ہو گیا۔



گڑگڑاتی آواز کے ساتھ ہیلی کاپٹر سمندر کے بیچ میں بنے جزیرے کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔ ایسا جزیرہ جس کے چاروں طرف سینکڑوں کلومیٹر تک پانی ہی پانی تھا۔ جہاں سے دور دور تک زمین کا کنارہ دیکھنا محال تھا۔ زمین تھی تو صرف اس جزیرے کے روپ میں۔ جزیرے کا زیادہ تر حصہ ہریالی سے بھرپور تھا۔

''یہ ہے امیر آباد۔'' بغل میں بیٹھی الوینہ نے کہا۔

''مگر یہاں تو کوئی عمارت نظر نہیں آ رہی ہے۔'' شمس الدین کے میک اپ میں ہیلی کاپٹر اڑاتے کاشف نے کہا۔

''جزیرہ تو ہر طرف سے ویران ہی نظر آ رہا ہے۔ چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے۔''

''یہی تو امیر جان کی کلاکاری ہے۔'' الوینہ نے ہلکی مسکان کے ساتھ کہا۔

''اوپر سے بھی جب تک ایک خاص کونے پر پہنچ کر جزیرے کو نہ دیکھا جائے تب تک بستی نظر نہیں آ سکتی۔ اسی لیے تو اس کے اوپر سے گزرنے والے جہازوں کو بھی کبھی یہ گمان نہیں ہو سکا کہ اس جزیرے پر کوئی انسانی آبادی بھی موجود ہے۔''

''مطلب؟''

الوینہ نے اسے مخصوص کونے کا راستہ سمجھایا جہاں سے بستی نظر آ سکتی تھی۔ کاشف اس کی ہدایات کے مطابق ہیلی کاپٹر کا رخ بدلتا رہا۔

اور پھر اس وقت اس کے منہ سے اوہ نکل گیا جب جزیرے کے بیچوں بیچ ایک حصے میں عمارات نظر آنے لگیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تقریباً دس کلومیٹر کے احاطے میں ایک چھوٹا سا شہر بسا ہوا تھا۔

اس کے چاروں طرف میلوں تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اتنا بڑا اور گھنا کہ کم از کم کوئی پیدل تو اسے پار کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا اور اس کے بعد تھا وسیع و عریض بحیرہ عرب جہاں سے دوسری بستی جانے کتنی دوری پر تھی۔

ہیلی کاپٹر تھوڑا نیچے آیا تو چھوٹے سے شہر کی سڑکوں پر فراٹے بھرتی گاڑیاں ہی نہیں بلکہ انسانوں کی چہل پہل بھی نظر آنے لگی تھی۔ یہاں تین تین منزلہ عمارات بھی تھیں۔

یہ سب دیکھ کر کاشف کے منہ سے بے ساختہ تعریف نکل پڑی۔

''واقعی کمال کر دیا ہے، کمال کر دیا ہے امیر جان نے۔ آج تک جنگل میں منگل کی صرف کہاوت ہی سنی تھی۔ آج پہلی بار دیکھ بھی رہا ہوں۔''

''دوسری بار۔'' الوینہ نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

''بلکہ تم اس جنگل کے منگل میں چار سال گزار بھی چکے ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس عرصے کے بارے میں تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔''

''کیا اس وقت بھی میں نے اتنی ہی حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔؟''

''اتنی حیرت کا اظہار تو تب کرتے جب کبھی جزیرے کو اس طرح اوپر سے دیکھا ہوتا۔ ویسا موقع اس عرصے میں کبھی نہیں آیا۔ تمہارا کام صرف اپنے بنگلے سے لیبارٹری تک جانا اور کام کرنے کے بعد سونے کے لیے بنگلے میں واپس آنا ہی تھا۔''

''کیا میں کبھی گھومنے پھرنے کے لیے بھی کہیں نہیں گیا؟''

''بہت کم۔ حالانکہ تم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ پھر بھی چار سال میں دو تین بار ہی پکنک کے لیے گئے ہو گے۔ اتنی ہی بار مارکیٹ اور وہ بھی ہمیشہ میرے ساتھ۔''

''تمہارے ساتھ؟'' کاشف نے اس کی طرف

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''گئے تو میرے ساتھ ہی تھے۔ اب تم میرے دل کے راجہ بن گئے ہو تو وہ الگ بات ہے۔''

''امیر جان کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا؟''

''بتا چکی ہوں۔ اس نے میری ڈیوٹی لگائی تھی تم پر نظر رکھنے کی۔'' الوینہ بولی۔

''تا کہ تم جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش میں نہ لگ جاؤ۔''

''اور تم اپنی ڈیوٹی بھول کر میرے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھانے میں مصروف ہو گئیں۔''

''دل پر کسی کا زور نہیں۔ کوئی اگر مجھ سے پوچھے تو خود بھی نہیں بتا سکتی کہ وہ کون سا لمحہ تھا جب سے تمہارے لیے میری سوچوں میں تبدیلی آئی۔ پتہ نہیں کب تم چپکے سے میرے دل میں اتر گئے۔''

کاشف نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ وہ تو اس وقت الوینہ سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہا تھا۔ کافی دیر تک خود میں گم رہنے کے بعد بولا۔

''کیا کبھی اس جزیرے سے کوئی فرار بھی ہو سکا ہے؟''

''کبھی نہیں۔''

''مگر تم نے کہا کہ تمہاری ڈیوٹی مجھ پر نظر رکھنا تھی۔''

''کاشف۔ تم نے اس جزیرے پر عام آدمی نہیں بلکہ بہت ہی خاص فرد کی حیثیت سے قدم رکھا تھا۔ اس بات کو بھلا امیر جان سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ جزیرے کے حفاظتی انتظامات کے تحت بغیر اجازت نہ کوئی باہر سے اندر آ سکتا ہے اور نہ اندر سے باہر جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے مجھے تم پر نظر رکھنے کو کہا تو صرف اس لیے کہا کہ تم تنہائی محسوس کر کے بور نہ ہو جاؤ۔ یا تمہیں کسی ذریعے سے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے اور وہ کسی بھی صورت میں تمہارا نقصان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔''

''نقصان کیسے پہنچ سکتا تھا؟''

''اگر کسی لمحے تمہارے ذہن میں جزیرے سے نکلنے کا خیال آ جاتا اور تم جنگل کی طرف نکل جاتے تو ہو سکتا ہے کسی جنگلی جانور کا بھی شکار بن سکتے تھے۔''

''کیا یہاں جنگلی جانور بھی ہیں؟''

''دیکھ نہیں رہے کیا۔'' اس نے آنکھوں سے نیچے نظر آتے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جزیرے کے صرف دس فیصد حصے میں شہر بسایا گیا ہے۔ وہ بھی بیچوں بیچ۔ اس کے چاروں طرف گھنا جنگل ہے اور یہ جنگل ہر قسم کے جنگلی جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔ یعنی اس جنگل کو پار کرنا ناممکن کی حد تک ہے اور اگر کسی طرح پار کر بھی گیا تو خود کو سمندر کے کنارے پر پائے گا۔ ایسے کنارے پر جہاں سے دوسرا کنارہ جانے کتنے فاصلے پر ہے۔ اور یہاں سمندر پار کرنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہوگا۔ تیر کر جانا چاہے گا تو اس سمندر میں ایک سے بڑھ کر ایک آدم خود مچھلیاں موجود ہیں۔''

''مطلب یہ ہوا کہ یہاں سے آنے جانے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ یہ ہیلی کاپٹر۔''

''یہ ذریعہ صرف چند مخصوص لوگوں کے لیے ہے۔'' الوینہ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

''عام لوگوں کے لیے دو چھوٹی چھوٹی بوٹ ہیں۔ شہر سے ساحل پر بنی جیٹی تک جانے کے لیے صرف ایک ہی راستہ بنایا گیا ہے۔ جس پر سے ہو کر گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ آنے اور جانے والے لوگوں کی فہرست پر باقاعدہ امیر جان کے دستخط ہوتے ہیں۔ جو یہاں سے جاتے یا یہاں آتے ہیں انہیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ یہ جزیرہ سمندر میں کس سمت میں ہے۔ اسی لیے تو یہ سوال امیر جان کے دماغ کے لیے وبال جان بنا ہوا ہے کہ تم نے کیسے گوادر جا کر رجسٹری کروا دی اور واپس بھی چلے آئے؟''

''اور کیا حفاظتی انتظامات ہیں یہاں؟'' کاشف نے پوچھا۔ وہ بغور نیچے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''جغرافیائی لحاظ سے ہی یہ جزیرہ اتنا محفوظ ہے کہ نہ

یہاں کوئی آ سکتا ہے اور نہ یہاں سے فرار ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ امیر جان کی اپنی فورس ہے۔ جو کسی بڑے شہر کی پولیس کی طرح کام کرتی ہے۔ جنگل کے بیچ بنائے گئے راستے کے چپے چپے پر ان کا پہرہ رہتا ہے۔ شہر میں بھی وہ ہر مرکزی جگہ پر تعینات ہوتے ہیں۔''

''لیکن یہ اتنے سارے لوگ یہاں کام کیا کرتے ہیں؟''

''یہاں کئی خاندان آباد ہیں۔ ہر خاندان کا کم سے کم ایک آدمی آئی ٹی کی دنیا سے ضرور جڑا ہے۔ جو امیر جان کے کسی نہ کسی پروجیکٹ پر کام کرتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے خاندان کے باقی لوگوں کو بھی یہاں لے آئے ہیں اور یہ بات بھی انہیں مطمئن رکھتی ہے کہ کراچی جیسے آتش فشاں شہر کی بہ نسبت ان کا خاندان یہاں ہر طرح سے محفوظ تو رہتا ہے۔ یہاں باقاعدہ مارکیٹیں ہیں۔ دوکانیں ہیں۔ ہر وہ چیز ہے جو کسی بھی شہر کے لیے ضروری ہوتی ہے اور روزمرہ کی چیزیں بوٹس کے ذریعے باہر کی دنیا سے لائی جاتی ہیں۔ یہاں رہنے والے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کے پاس باہر کی دنیا میں جینا عذاب سے کم نہیں تھا اور یہاں وہ خوش ہیں کہ یہاں ان کے پاس سب کچھ ہے۔''

''یہ امیر جان بزنس کیا کرتا ہے؟''

''یہ کمپیوٹر بناتے ہیں۔ جو الگ الگ ناموں سے دنیا بھر میں سپلائی کیے جاتے ہیں۔'' الوینہ نے بتایا۔

''یوں سمجھ لو کہ اس کا بہت بڑا نیٹ ورک ہے۔''

''یہ تو کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے۔'' کاشف نے الوینہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر سی آئی اے کو اس کی تلاش کیوں ہے اور وہ خود بھی یہاں کیوں چھپا رہتا ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ دنیا بھر کے جس بھی ملک میں وہ کمپیوٹر سپلائی کرتا ہے وہ وہاں چلنے والی بڑی برانڈڈ کمپنیوں کے نام سے بیچتا ہے یعنی ان کمپنیوں کا نام استعمال کرتے ہوئے جعلی کمپیوٹرز سپلائی کرتا ہے اور یہ سب زیادہ تر اسمگلنگ کے ذریعے ہوتا ہے جس سے ان ملکوں کو کسٹم اور ٹیکسوں کی مد میں بھاری نقصان ہو رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کمپیوٹرز کا معیار بالکل اوریجنل ٹائپ کا ہوتا ہے دوسری بات یہ کہ وہ وائرس پھیلا کر دنیا بھر کے نیٹ ورکس کو فیل کر کے اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنا برانڈ بنا کر مارکیٹ میں پھیلا سکے۔ اسی کام کے لیے وہ دشمن کو یہاں لایا تھا جسے وہ پورا نہیں کر سکی تھی اور اب اس کی ساری امیدیں تمہاری بنائی ہوئی مشین سے وابستہ ہیں۔ یہ اندازہ اس بات سے لگایا کہ جیسے ہی اسے تمہاری مشین کی خرابی کا پتہ لگا اس کی حالت ایسی ہوگئی جیسے اس کا دیوالیہ نکل گیا ہو۔''

''تم اس کے چنگل میں کیسے آئیں؟''

''کسی بھی قیمت پر پیسے کا حصول۔'' الوینہ نے صاف گوئی سے کہا۔ اتنے صاف جواب پر کاشف کچھ چپ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد الوینہ بولی۔

''اب چلیں نیچے۔''

''چلنا تو پڑے گا۔'' کاشف مسکرا کر بولا۔

''آدمی ہواؤں میں کب تک اڑتا رہے گا۔''

''ویسے ہی کرنا جیسے بتا چکی ہوں۔'' الوینہ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''ہیلی پیڈ پر میرے لیے رولز رائس ہوگی اور تمہارے لیے جیپ۔ جیپ تمہیں شمس الدین کے فلیٹ پر لے جائے گی۔ وہ اکیلا رہتا ہے اس لیے تمہیں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی۔ ہاں اس کا کوئی دوست دوست مل سکتا ہے اسے تم خود سنبھال لینا۔ فریش ہونے کے بعد میرے بنگلے پر پہنچ جانا جس کا پتہ میں تمہیں سمجھا ہی چکی ہوں۔ عام طور پر یہاں اس بات سے کسی کو کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ ڈیوٹی کے بعد کوئی کہاں جا رہا ہے کس سے ملنے جا رہا ہے۔ پھر بھی دھیان رکھنا۔ شمس الدین اور میرے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔ اس لیے تمہارا میرے بنگلے پر آنا کسی کی نظر میں کھل سکتا ہے تو ذرا ہوشیاری بھی برتنا ہوگی۔ تب تک میں بھی امیر جان کو

رپورٹ دینے کے بعد بنگلے پر پہنچ چکی ہوں گی۔"

"اسے کیا رپورٹ دو گی؟"

"یہی کہ اس کے شکار کو اپنی باتوں کے جال میں پھنسا کر شمس الدین کے میک اپ میں امیر آباد لے آئی ہوں۔" الوینہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اور شکار خود کو تیس مار خان سمجھ رہا ہے۔"

"ایسی ہوتیں تو یہاں میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا ہوتا کہ میں پائلٹ بھی ہوں۔" کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کہہ دوں گی کہ ساری رات انتظار کرنے کے بعد بھی کاشف کمرے میں نہیں آیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے گلمو ہر میں ہونے والے واقعے نے اسے ضرورت سے زیادہ ہی ڈرا دیا تھا۔"

جزیرے کا ایک چکر لگانے کے بعد اس نے ہیلی کاپٹر کو ہیلی پیڈ پر اتار دیا جسے سیاہ وردی والے کمانڈوز نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے لینڈ ہوتے ہی ایک جیپ اور ایک سیاہ چمچماتی ہوئی رولز رائس ہیلی پیڈ کے نزدیک پہنچ گئیں۔



الوینہ کا بنگلہ شمس الدین کے فلیٹ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے لیے وہاں سواری موجود تھی مگر کاشف نے پیدل جانا پسند کیا تا کہ شہر کے ماحول کا اچھی طرح سے جائزہ لے سکے۔ وہ چھوٹا سا شہر دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ شہر کی برابری کر سکتا تھا اور کاشف اس کی سڑکوں، بازاروں اور معیار پر حیران ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ شہر دیکھ کر دوبئی اور ابوظہبی کی یاد آ رہی تھی۔ ویسے ہی بازار، ویسی ہی عمارتیں۔

اسے بچوں کا ایک اسکول بھی نظر آیا۔ وہاں گھومتے ہوئے ذرا سا بھی یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ یہاں سے باہر نکلنے کا کہیں کوئی راستہ نہیں ہے۔ جگہ جگہ سیاہ وردی والے کمانڈوز تعینات تھے جو پولیس کی طرح لوگوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر لگے بورڈز پر کالونیوں کے نام لکھ کر تیر کے نشان بنائے گئے تھے۔ ان پر اس طرف کی قطار میں موجود مکانوں کے نمبر بھی لکھے ہوئے تھے۔

کاشف انہی بورڈز کے سہارے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے فلیٹ سے ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد وہ ٹھٹھک کر رکا۔ ایک خوبصورت بنگلے کے باہر گرینائٹ کے پتھر پر پیتل اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کا اپنا نام۔ "کاشف سلیم۔"

یہ سوچ کر اسے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چوبیس اگست کی رات تک یہاں رہتا تھا۔ الوینہ نے بتایا تھا کہ اس سے اگلا بنگلہ اس کا ہے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

اگلے بنگلے کا بھی وہی نقشہ تھا۔ اس کے باہر بھی پتھر پر پیتل سے الوینہ کا نام لکھا ہوا تھا۔

اس نے چور نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ اور پیتل کا بنا بھاری بھرکم دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے الوینہ اس کے انتظار میں گیٹ سے ہی لگی کھڑی تھی۔

"اتنی دیر لگا دی تم نے۔" وہ گیٹ کھولتے ہوئے بولی۔

"اس جادو نگری کا جلوہ دیکھنے کے لیے ٹہلتا ہوا آیا ہوں۔"

"میں نے گھر میں آتے ہی سارے نوکروں کو چھٹی دے دی ہے۔" کاشف کے اندر داخل ہونے کے بعد الوینہ دروازہ بند کرتی ہوئی بولی۔

"وہ بھی خوش۔ ہم بھی خوش۔ تمہاری موجودگی سے وہ بات کا بتنگڑ بنا سکتے تھے۔"

"لان سے گزرتے ہوئے کاشف نے پوچھا۔

"کیا رہا؟"

"کس کا کیا رہا۔" الوینہ نے الٹا سوال کر دیا۔

"رپورٹ دے آئیں امیر جان کو؟"

"ہاں۔ تمہارے نہ ملنے سے بہت مایوس ہوا ہے بیچارہ۔ ہر پندرہ منٹ بعد فون کر کے ان پر چلا رہا ہے۔

جن پر' تمہیں ڈھونڈنے کی ذمہ داری سونپ رکھی ہے۔ کبھی سی آئی اے والوں پہ نظر رکھنے کی ہدایت دیتا ہے تو کبھی تمہارے نام سے ریز رور گلمو ہر کے روم پر تو کبھی سارے لاہور کو کھنگال ڈالنے کے لیے کہتا ہے۔"

"اور میں تمہاری مہربانی سے یہاں موجود ہوں۔ عین اس کی ناک کے نیچے اور اس کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے کہ جسے وہ لاہور میں تلاش کرتا پھر رہا ہے وہ اسی کے شہر کی سڑکوں پر آزادی سے گھوم پھر رہا ہے۔" کاشف نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی دوران وہ باتیں کرتے ہوئے صدر دروازے سے اندر ہوتے ہوئے شاندار ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے تھے۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے الوینہ خود بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"مہربانی میری نہیں' تم پر خود تمہاری ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" کاشف نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"جب ساری باتوں پر غور کرتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ثمن کی موت کے بعد ہی تم نے واپس یہاں آنے کے لیے بہت مضبوط منصوبہ بندی کرلی تھی۔ کراچی کے اپنے گھر سے یہاں آنے تک پورا سفر طے تھا۔ قدم قدم پر وہی ہوا جو تم چاہتے تھے یا جس کے تم نے بیج بوئے تھے۔ یہ تم نے مجھے چوبیس تاریخ کو ہی بتادیا تھا کہ مجھے تم سے کہاں ملنا ہے اور پھر کس طرح شمس الدین بن کر یہاں لانا ہے۔ میں نے تو صرف تمہاری ہدایات پر عمل ہی کیا ہے اور بس۔"

"مجھے ایسا نہیں لگتا۔" کاشف ایک گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔

"اس سارے قصے نے صرف اس لیے جنم لیا کہ میرے اکاؤنٹ سے رقم نکال لی گئی تھی۔ وہ ہوتی تو شاید میں بینک نہ جاتا بلکہ اپنے مستقبل کے کمپیوٹر پر کام کرتا۔ بینک نہ جاتا تو پارسل نہ ملتا اور پارسل نہ ملتا تو۔"

"رقم بھی تو تم نے خود ہی امیر جان کے اکاؤنٹ

میں ٹرانسفر کی تھی۔'' الوینہ نے کاشف پر حیرت کا ایک اور تیر چھوڑتے ہوئے کہا۔

''اور یہ کام تم نے یہیں رہتے ہوئے انیس اگست کو انٹرنیٹ کے ذریعے انجام دیا تھا۔''

''کک...... کیا۔'' یہ سن کر کاشف صوفے سے اچھل ہی پڑا تھا۔ حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی پڑی تھیں۔ وہ بھونچکا سا بولا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''صرف وہی جو تم نے چوبیس تاریخ کو مجھے بتایا تھا۔''

''چوبیس تاریخ کو میں نے تمہیں کیا کیا بتا دیا تھا اور۔''

''اور؟''

''اگر ایسی بات تھی تو دوسری باتوں کے علاوہ تم نے یہ بات بھی مجھے گلمو ہر کے کمرے میں ہی کیوں نہیں بتا دی تھی؟''

''کیونکہ کچھ باتوں کے لیے تمہارا حکم ہی یہ تھا کہ یہ باتیں ستائیس تاریخ کو تب بتانی ہیں جب تم میرے بنگلے میں بیٹھے ہوگے۔''

''بینک والی بات کے علاوہ بھی کوئی ایسی بات ہے کیا؟''

''ہاں۔''

''وہ کون سی؟''

''تم نے مجھے اپنی سگریٹ کے کرشمے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ کہا تھا کہ سگریٹ کا جو پیکٹ پارسل میں رکھا گیا ہے ان سگریٹوں کے دھوئیں سے میرے علاوہ سب بے ہوش ہو جائیں گے۔ میں نے جب پوچھا کہ تم کیوں نہیں ہوگے تو تم نے بتایا کہ تم چوبیس کو سونے سے پہلے اس سگریٹ کا اینٹی ڈوز لے لو گے جو سو گھنٹے تک کام کرے گا اور سو گھنٹے سے بہت پہلے ہی وہ مشن پورا ہو جائے گا جس کے لیے یہ سب کیا ہے۔''

حیرت کے مارے کاشف نے پوچھا۔

''اپنے مشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا میں نے تمہیں؟''

''میری کافی کوشش کے باوجود بھی نہیں۔''

''اور کیا بتایا تھا؟''

''تم نے کہا تھا کہ میں اٹھارہ تاریخ کو تم سے ایک بات چھپا گیا تھا۔ وہ بات میرے دل پر بوجھ بنی ہوئی ہے اس لیے آج بتا رہا ہوں۔ جب میں نے پوچھا ایسی کیا بات ہے تو تم نے بتایا کہ چھبیس کو سمانا ہوٹل میں خدا جانے عمران انصاری کی گولی سے مارا جائے گا۔ جب میں نے چونک کر کہا یہ کیا بات کر رہے ہو تم، تو تم بولے دیکھ لو کیسا تماشہ ہے۔ یہ بات میں آج جانتا ہوں مگر اسے بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے پوچھا ایسا کیوں، تو تمہارا جواب تھا کہ ہوتا وہی ہے میڈم جو ہونا ہوتا ہے۔ آدمی کی بساط ہی کیا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت ہونی کو ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اوپر والے نے جو لکھ دیا ہے وہ اٹل ہے۔''

''کیا میں نے اور بھی کچھ بتایا تھا؟''

''کیا ان باتوں سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا یہ کہ اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے وہ تم نے پوری منصوبہ بندی کر کے کیا ہے۔'' الوینہ بولی۔

''تم نے اپنی رقم امیر جان کے اکاؤنٹ میں ڈالی ہی اس لیے ہوگی کہ اکاؤنٹ خالی دیکھ کر تم بھاگتے ہوئے بینک جاؤ گے۔ جب پتہ لگے گا کہ رقم امیر جان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوگئی ہے تو وہ تمہارے ٹارگیٹ پر آ جائے گا۔ ادھر، مجھے سب کچھ بتا کر تم پہلے ہی مجھے اس مشن پر متعین کر چکے تھے کہ مجھے اس اس طریقے سے یہاں پہنچنا ہے۔ تمہیں جب جب جو جو باتیں اپنے علم میں لانی تھیں ان سب کا وقت بھی بتا دیا تھا تم نے۔''

''اگر ایسا ہے بھی تو میں نے ایسا کیوں کیا، کیوں کیا میں نے یہ سب؟'' کاشف نے جیسے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''کیا چاہتا ہوں میں، آخر میرا مشن کیا ہے، ایسا کون،

سا مشن ہے جسے پورا کرنے کے لیے اپنے سو کروڑ کی بھی پرواہ نہیں کی میں نے۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے نکال کر واپس امیر جان کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا؟''

''بس تم نے مجھے اپنے مشن کے بارے میں ہی نہیں بتایا تھا۔''

''اس لیے نہیں بتایا ہوگا کہ میں اس وقت تم پر پورا بھروسہ نہیں کر پایا ہوں گا۔ میں نے سوچا ہوگا کہ اگر تم میرے ساتھ دھوکہ کر گئیں تو سارے پتے ہی کھل جائیں گے۔''

''ہوسکتا ہے یہی وجہ رہی ہو۔''

کاشف الجھ کر کافی دیر تک اپنی سوچوں سے لڑتا نظر آ رہا تھا' خود سے پوچھتا نظر آ رہا تھا کہ آخر میں چاہتا کیا ہوں؟ کیوں میں نے اپنے سو کروڑ روپے داؤ پر لگا دیئے؟ لیکن اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو ملتا۔

کافی دیر تک خاموشی کے بعد الوینہ بولی۔

''کبھی کبھی انسان خود بھی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ جو کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے؟ مجھے ہی لے لو۔ آج جب میں نے امیر جان کو تمہارے لیے بے چین دیکھا اور محسوس کیا کہ تمہیں میں نے چھپا رکھا ہے تو دل و دماغ میں یہ سوال اٹھا کہ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں۔ میں اس شخص کو دھوکہ کیوں دے رہی ہوں جس نے کبھی میرا برا نہیں چاہنا تو دور' کبھی سوچا تک نہیں۔ جس نے ہر عیش و آرام میرے قدموں میں بچھا رکھا ہے۔ میں اسے فریب کیوں دے رہی ہوں۔ یہ ساری باتیں میں خود بھی خود کو نہیں سمجھا پا رہی ہوں۔''

''تم یہ سب اپنے پیار کی خاطر کر رہی ہو۔'' کاشف نے کہا۔

''اس پیار کی خاطر' جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ میں کبھی اور کسی حالت میں بھی اسے حاصل نہیں کر سکتی۔ کاشف۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے وینا۔'' کاشف اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم نے خود کہا تھا کہ پیار کب ہو جاتا ہے' خود کو بھی پتہ نہیں لگتا اور یہ بات ہم سب پر لاگو ہوتی ہے۔''

''اب شاید تم مجھے آزمانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''ایسا کیوں سوچا تم نے۔''

''میری باتوں سے تمہیں ایسا لگا ہوگا کہ میں آگے کے مشن پر پوری مضبوطی سے کام کر بھی سکوں گی یا نہیں۔ ان سب کاموں کو میں ویسے ہی انجام دے پاؤں گی جو طے شدہ ہیں۔ تم شاید اس لیے بھی مجھے آزمانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم بھی مجھ سے پیار کرنے لگے ہو۔''

الوینہ جذبات کی رو میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

''نہیں کاشف۔ اپنا کام نکالنے کے لیے مجھے آزمانے کی کوشش مت کرو۔ مجھے دکھ ہوگا اس بات سے جو طے ہو چکا ہے وہ تو میں ہر حال میں کروں گی ہی۔ انجام چاہے جو بھی ہو۔ میں اب یہاں سے نکلنے والی ہوں اور رات سے پہلے امیر جان کے بیڈ روم میں رکھے اس ٹی وی کا کنکشن لیبارٹری سے کاٹ آؤں گی جس پر وہ وہاں کی کارروائی دیکھتا ہے۔ اس کے لیے مجھے تمہاری جھوٹی سچی 'ہاں' کی ضرورت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر الوینہ اٹھی اور کاشف کی طرف دیکھے بغیر صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کاشف نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ آنسو جنہیں کاشف سے چھپانے کے لیے وہ تیزی سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔

''وینا۔ وینا۔'' کاشف آواز دیتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔

وہ بغیر رکے۔ بغیر مڑے یہ کہتی ہوئی ہوا کے جھونکے کی طرح وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

''یہیں انتظار کرنا۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گی۔'' اس کا لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔



الوینہ کے جانے کے بعد کاشف بہت دیر تک گم کھڑا رہا۔ جیسے سمجھ ہی نہ رہا ہو کہ کیا کرنے۔ اسے

ڈرائنگ روم میں گھٹن محسوس ہونے لگی تو وہ تازہ ہوا کے لیے باہر لان میں آ گیا۔ لان میں آتے ہی اسے چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ آواز ایک چھ فٹ دیوار کی دوسری طرف سے آ رہی تھیں۔ چڑیوں کے چہچہانے کی یہ عام سی آوازیں نہیں تھیں بلکہ چڑیاں مسلسل شور مچا رہی تھیں۔ جیسے بہت بے چین ہوں۔

کاشف بھی اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ اسی وقت اس کے دماغ میں یہ خیال ابھرا کہ دیوار کے اس طرف تو اس کا بنگلے کا لان ہونا چاہیے۔ اس کے اس بنگلے کا لان جس میں اس نے اپنے گمشدہ چار سال گزار دیئے تھے۔

اس نے پنجوں کے بل اونچا ہو کر دیوار کی دوسری طرف جھانکا۔ دو چڑیاں ایک پنجرے میں قید تھیں اور دونوں اسی کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ رہی تھیں اور کاشف کو دیکھ کر تو جیسے پاگل سی ہو گئی تھیں اور ان کی آوازیں مزید بلند ہونے لگی تھیں۔ وہ ایسے پھڑ پھڑا رہی تھیں جیسے پنجرہ توڑ کر اس کے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ خود کاشف کے دل میں بھی یہی سوچ ابھر رہی تھی۔

کوئی بات تو تھی'

اس کا اور چڑیاؤں کا کوئی نہ کوئی تعلق تو تھا کہ وہ بھی چڑیاؤں کی طرح بے چین ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تعلق صرف انہیں پالنے کی حد تک ہی رہا ہو۔ چڑیاں اسے بلا رہی تھیں اور ان کی پکار کو سمجھتے ہوئے کاشف نے دیوار پر ہاتھ جمائے اور ایک ہی چھلانگ میں پار کر کے دوسرے بنگلے کے لان میں پہنچ گیا۔

اسے لان میں کودتے دیکھ کر اب چڑیاں خوشی سے شور مچا رہی تھیں۔ جیسے اسے خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے پنجرہ کھول دیا۔ اور چڑیاں بھاگنے کی بجائے اڑ کر اس کے کندھوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کی آنکھوں کے سامنے پارسل میں موجود کاغذ چمکنے لگا۔

وہ کاغذ جس پر لکھا تھا۔ ''چڑیا کے نیچے۔''

''کیا؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''چڑیا کے نیچے کیا؟'' اس چڑیا کے نیچے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

اس کی نظر پنجرے میں بچھے ایک اخبار پر پڑی۔ اس اخبار پر جو پنجرے میں اس مقصد کے تحت بچھایا گیا تھا کہ ان کے ننھے پنجے پنجرے میں نہ پھنسیں۔

کاغذ ایک بار پھر دماغ میں لہرایا۔ چڑیا کے نیچے۔

اس نے جلدی سے اخبار اٹھایا اور اس کے ہاتھ میں ایک ٹکٹ آ گیا۔ لاٹری کا ٹکٹ۔ کاشف کے پورے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس کی آنکھیں ٹکٹ کے نمبروں کا جائزہ لینے لگیں۔ آٹھ ہندسوں کا وہ نمبر اسے ازبر تھا۔ اس ٹکٹ پر بھی وہی نمبر تھا۔ کاشف کا دل چاہا کہ وہ خوشی سے چلانے لگے اور وہ بار بار لاٹری کے ٹکٹ کو چومنے لگا۔



دھپ دھپ کی آوازیں ابھریں اور اس کے ساتھ ہی۔

''کون ہے؟'' دھاڑتے ہوئے کمانڈو نے اس طرف گن تان لی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ کمانڈو آنکھیں پھاڑ کر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے دوبارہ دہاڑا۔

''کون ہے وہاں؟''

جواب میں وہی سناٹا۔ کمانڈو نے سر جھٹکا۔

''وہم ہے میرا۔'' وہ گن کندھے پر ٹانگ کر گیٹ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دوبارہ دھپ کی آواز ابھری۔

''ابے کون ہے۔'' اس بار وہ جھلا گیا۔ گن کندھے سے اتار کر اس طرف تان کر گرجا۔

''بولتے کیوں نہیں' ہمت ہے تو ایک بار پھر آواز کر کے دکھا۔''

پھر وہی خاموشی'
تب اسے آواز آئی۔
"کیا ہوا گلو؟"
"ادھر کوئی ہے۔" گلو نے گن سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"تم نے کیسے جانا؟" دوسرا کمانڈو اس کی طرف آتے ہوئے بولا۔
"دھپ کی آواز آئی ہے۔" گلو بولا۔
"گدھے ہو تم۔ پانچ سال سے تو میں یہاں ڈیوٹی کر رہا ہوں۔ آج تک تو کوئی آیا نہیں۔"
"مگر میں نے خود آواز سنی تھی۔"
"وہم ہوگا تمہارا۔ رات کو بلی تک تو یہاں آتی نہیں۔"
"پہلے میں بھی وہم ہی سمجھا تھا۔ لیکن دوبار میں نے خود آواز سنی ہے۔" گلو بولا۔
"پہلے ایک ساتھ دو آوازیں پھر پانچ منٹ بعد صرف ایک بار۔"
"وہم کا علاج تو دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے۔" لیکن آج میں تمہارے وہم کا علاج دعوے کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ آؤ۔ ڈر کیوں رہے ہو۔ اندھیرا ہی تو ہے اس طرف۔ ہمارے پاس حفاظت کے لیے گنیں ہیں۔ آؤ اس طرف ٹہل کر آتے ہیں۔"
یہ بات گلو کے دل کو بھی لگی کہ جس طرف سے آواز آئی تھی اس طرف جا کر دیکھا جائے اور اب تو وہ دو ہیں۔ گنیں بھی ہیں' پھر ڈر کس بات کا؟ اور پھر اس کے ساتھی کی یہ بات بھی درست تھی کہ رات کے اس پہر کوئی آئے گا بھی کیوں۔ اس عمارت میں کون سا خزانہ چھپا تھا۔
دونوں لاپرواہی سے ٹہلتے ہوئے اندھیرے میں داخل ہو گئے۔ اور یہ لاپرواہی انہیں لے ڈوبی۔ دو سائے ایک ساتھ ان دونوں پر جھپٹ پڑے تھے۔ اور ان کے منہ دبوچ لیے۔ جس سے ان کے منہ سے صرف گوں گوں کی آوازیں ہی نکل پا رہی تھیں۔ وہ دونوں حملہ آوروں کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہے تھے اور ان کی کنپٹیوں پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ پہلے گلو کی آنکھوں کے سامنے سیاہ چادر پھیلی اور دوسرے کمانڈو کے سامنے بھی اندھیرا چھا گیا اور دونوں بے ہوش ہو کر لڑھک گئے۔
"ویری گڈ۔" اندھیرے میں الوینہ کی آواز ابھری۔
"چلیں اندر۔" کاشف بولا۔
"ہاں۔ ان کی گنیں ہمارے کام آ سکتی ہیں۔" اور دونوں نے کمانڈوز کی گنیں اٹھالیں۔
"کیا ہمیں گنوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟"
"پتہ نہیں۔" الوینہ نے اندر کی طرف لپکتے ہوئے کہا اور کاشف کو بھی اس کے پیچھے چلنا پڑا۔
ایک دروازہ پار کرنے کے بعد وہ اسٹیل کے بنے اس کوریڈور میں تھے جس میں امیر جان کا شیشے کا آفس واقع تھا۔ وہاں سفید رنگ کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت دونوں کے جسم پر سیاہ چست لباس اور پیروں میں ربر سول کے سیاہ جوتے تھے۔
الوینہ کوریڈور میں دونوں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔
"بس اتنا ہی اندازہ ہے مجھے کہ بیسمنٹ والی لیبارٹری کے لیے راستہ اسی کوریڈور سے جاتا ہے۔ اب راستہ کہاں ہے نہیں معلوم۔"
"یہاں تو صرف ایک ہی دروازہ ہے۔" کاشف نے بائیں طرف کو اشارہ کیا۔
"وہ تو بڑی لیبارٹری کا دروازہ ہے۔" الوینہ نے چاروں طرف متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں امیر جان کا آفس بھی ہے۔"
"وہ مجھے یاد ہے۔"
"کیوں نہیں ہوگا۔ انجیکشن لگنے سے پہلے وہاں میرے ہی ساتھ تو آئے تھے تم۔ وہیں بیٹھ کر تم نے معاہدہ کیا تھا۔"
"صرف آنا یاد ہے۔ جانا نہیں۔" کاشف نے مسکرا کر کہا۔
"جانا کیسے یاد ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے انجیکشن

لگ چکا تھا۔"

"لیکن ان دونوں دروازوں کے علاوہ یہاں کوئی تیسرا دروازہ نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ ایک باہر جانے کے لیے دوسرا بڑی لیبارٹری میں جانے کے لیے۔"

"ہونا تو یہیں چاہیے۔ کوئی خفیہ دروازہ ہوسکتا ہے۔" الوینہ بولی۔

"وہ جتنی بار بھی نیچے والی لیبارٹری میں گیا ہے اسی کوریڈور کے ذریعے گیا۔"

"تو پھر وہ دروازہ کہاں ہوسکتا ہے۔" کاشف کوریڈور کی دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ پھر اسے ایک جگہ دیوار میں ایک درز نظر آئی جیسی اے ٹی ایم مشین میں ہوتی ہے۔

"مل گیا۔" کاشف نے کہا اور جیب سے پارسل نکال کر اس میں سے اے ٹی ایم کارڈ جیسا کارڈ نکال کر اس درز میں ڈال دیا۔

دونوں کے دل بڑی زوروں سے دھڑک رہے تھے اور دونوں ہی امید بھری نظروں سے اس کارڈ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ دیوار میں ایک آدمی کے گزرنے کا راستہ بن گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پہلے الوینہ اس راستے سے دوسری طرف پہنچ گئی۔

"آؤ۔" وہ بولی۔

کاشف نے درز سے کارڈ واپس نکالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

"اب آجاؤ۔" الوینہ نے بے چینی سے کہا۔

"کارڈ واپس نہیں نکل رہا۔"

"اسے چھوڑ دو۔ ہوسکتا ہے اس کا اتنا ہی کام ہو۔"

یہ بات کاشف کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اور وہ بھی دروازہ پار کرکے اندر داخل ہوگیا۔ اب وہ پانچ فٹ لمبی اور چوڑی لفٹ میں تھے۔ ان کی نظریں ایسا بٹن ڈھونڈنے لگیں جس سے لفٹ کا دروازہ بند ہوکر اپنا سفر شروع کرسکے۔ اسی تلاش میں کاشف کی نظریں اپنے اسی کارڈ پر پڑیں جس کا کونا درز سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس نے کارڈ کا کونا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو کارڈ ہاتھ میں آتے ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا اور اب انہیں لفٹ کو حرکت میں لانے والے سوئچ کی تلاش تھی اور جلد ہی پچھلی دیوار میں ویسی ہی درز نظر آئی تو کاشف نے کارڈ اس درز میں ڈال دیا۔

کارڈ ڈالتے ہی ایک اسکرین واضح ہوئی جس پر صفر سے پانچ تک کے ہندسے نظر آرہے تھے۔ ہر نمبر کے سامنے ایک سوئچ تھا۔

"وہ لیبارٹری گراؤنڈ فلور پر ہے۔ ہمیں صفر دبانا چاہیے۔" اور کاشف کے کچھ کہنے سے پہلے ہی الوینہ نے صفر کے سامنے والا سوئچ دبا دیا۔

سوئچ دبتے ہی لفٹ نے نیچے کی طرف سفر شروع کر دیا۔

"تم کہہ رہی تھیں کہ کارڈ کا کام وہیں ختم ہوگیا۔ یہ تو نیچے اوپر جانے کی مکمل چابی ہے۔" اس کی بات ٹھیک تھی اس لیے الوینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی ہی دیر وہ نیچے اسٹیل کے بنے ٹنکی نما چمکدار کمرے میں پہنچ گئے۔

الوینہ وہاں باقی مشینوں سے بڑی مشین کو دیکھتے ہی چیخ پڑی۔

"کاشف یہی ہے۔ یہی ہے تمہاری بنائی ہوئی مشین۔ تمہاری چار سال کی محنت کا نتیجہ۔ اس مشین کو میں کئی بار امیر جان کے بیڈ سے ٹی وی پر دیکھ چکی ہوں۔"

کاشف بھی اپنے اس شاہکار کو دیکھ کر سن تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے لگاتار اسے ہی دیکھے جارہا تھا۔

وہ مشین کے ایک ایک انچ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی باپ اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھتا ہے۔ اس بڑی سی مشین کا پچھلا حصہ کمرے کی گول دیوار کے ساتھ ساتھ تقریباً بیس فٹ اوپر تک چلا گیا تھا اور اس کے ساتھ تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور لاتعداد سوئچز اس کے علاوہ تھے۔ ڈیش

بورڈ تک پہنچنے کے لیے تین سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ سب سے اوپر والی سیڑھی کے بعد ایک چبوترہ اور چبوترے پر رکھی چمڑے سے منڈھی الیکٹرانک چیئر۔

کرسی کے ٹھیک سامنے اور ڈیش بورڈ یا بلیک بورڈ کے سائز جتنی بڑی ٹی وی اسکرین آویزاں تھی۔ کاشف اس کے ایک ایک تار۔ ایک ایک سوئچ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی۔

وہ اپنی ہی بنائی ہوئی مشین کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس مشین سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس مشین میں ایسی کیا خوبی ہے جس کے لیے اسے سو کروڑ روپے دیے گئے تھے اور امیر جان کے پورے مستقبل کا دار و مدار اسی مشین پر تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کاشف آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا چبوترے پر پہنچا۔ کچھ دیر تک ڈیش بورڈ پر لگے سوئچز کو دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ کس سوئچ سے کیا ہوسکتا ہے اور پھر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ الیکٹرانک چیئر پر بیٹھ گیا۔

اس نے تاروں کے ہیٹ کا جائزہ لیا اور پھر اسے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ جس نے ہیلمٹ کی طرح اس کی کنپٹیوں سمیت سارے سر کو کور کرلیا تھا اور جھجکتے ہوئے اس نے سب سے اوپر لگے سبز سوئچ کو دبایا اور کمرے میں مشین کے انگڑائی لے کر جاگنے کی آواز ابھرنے لگی ساتھ ہی سینکڑوں چھوٹے بڑے بلب جلنے بجھنے لگے اور بڑی سی اسکرین روشن ہوگئی۔

پھر اس نے کرسی کے ہتھے پر لگا ایک بٹن دبایا اور اسکرین پر تاروں بھرا آسمان نظر آنے لگا۔ رنگ و نور بکھیرتا ہوا آسمان۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسکرین پر روشن ستاروں کی کہکشاں ابھر آئی ہو۔ چند دائرے بھی گردش کررہے تھے اور پھر اسکرین پر بڑے بڑے الفاظ میں ''ERROR'' لکھا ہوا نظر آنے لگا۔

کاشف کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سرکٹ ٹوٹا ہوا ہے۔

اس نے تیزی سے اسکرین سے نظریں ہٹا کر ڈیش بورڈ کی طرف دیکھا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اس پر جھکا اور یہ تو اسے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ وہ یہاں سے جانے سے پہلے اس مشین کا سرکٹ توڑ گیا تھا اور اب اسے اسی سرکٹ کو سمجھنا تھا۔

اس کا آئی ٹی انجینئر والا دماغ تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ وہی دماغ جس کی وجہ سے امیر جان اسے یہاں لایا تھا اور جس کے لیے اس نے چار سال کے سو کروڑ روپے دیے تھے وہی دماغ جس سے اس نے یہ مشین بنائی تھی۔ اپنے ہی بنائے ہوئے سرکٹ کو اسے اب نئے سرے سے جوڑنا تھا۔

سرکٹ کو بغور دیکھنے کے بعد اس نے ڈیش بورڈ پر موجود کمپیوٹر کے کی بورڈ کو دیکھا اور پھر باری باری دونوں پر نظریں دوڑانے لگا اور چند ہی منٹوں میں اس کے تیز دماغ نے اسے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ سرکٹ کی بورڈ کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔

اس پر غور کرتے ہی کاشف کے دماغ میں بجلی کی سی تیزی سے داڑھی سے برآمد ہوا کاغذ گھومنے لگا اور اس نے فوراً جیب سے پارسل نکالا اور پارسل سے کاغذ کو۔ اس نے کاغذ پر لکھی تحریر اور کی بورڈ کا جائزہ لیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ یہ سرکٹ کی بورڈ ہی کی بنیاد پر بنایا گیا ہے مگر اس کا بیچ کا وہ حصہ غائب ہے جو کاغذ پر بنا ہوا ہے۔ ساری بات پلک جھپکتے ہی اس کی سمجھ میں آگئی۔

اس کے دونوں ہاتھ سرکٹ پر وہاں پہنچے جہاں کی بورڈ پر H, I, U, Y اور J کے نوٹ ہوتے ہیں۔ اس نے وہاں لگے ننھے ننھے بلبوں کو دھیان سے دیکھا۔ بہت باریکی سے دیکھنے پر پتہ لگ رہا تھا کہ وہ بھی دوسرے بلبوں کی طرح بھلے ہی جل بجھ رہے ہیں مگر وہ رنگ دوسرے بلبوں سے الگ پھینک رہے تھے۔

اب اس نے ان بلبوں کو جوڑنے والے تاروں کو چھیڑا جو انسانی رگوں کی مانند باریک تھے۔ اتنے باریک کہ انہیں انگلیوں میں ٹھیک سے پکڑا بھی نہیں جارہا تھا۔ ان میں کچھ

کے منہ کے برابر فیوز لگے ہوئے تھے۔ اس نے تیزی سے ڈیش بورڈ کی دراز کھول کر اس میں سے چمٹی نکالی۔ اس چمٹی سے تاروں کو آسانی سے پکڑا جا سکتا تھا۔

وہ ایک ایک کر کے سارے تاروں کے فیوز جوڑنے لگا اور آخری فیوز جڑتے ہی ''جھپاک'' کی آواز کے ساتھ اسکرین پر نظر آنے والا ایرر کا لفظ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ لکھا تھا۔

''خوش آمدید' اب آپ اپنی زندگی میں داخل ہونے والے ہیں۔''

کچھ دیر بعد وہ الفاظ بھی غائب ہو گئے اور ان کی جگہ کاشف کی اپنی تصویر نظر آنے لگی۔ اس کی اوریجنل تصویر۔ وہ شکل نہیں جس میں وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

''کوائف''

نام: کاشف سلیم

ولد: محمد سلیم

تاریخ پیدائش: 5-7-1978' بوقت: صبح 5:05

جائے پیدائش: ناظم آباد' کراچی

پیشہ: الیکٹرانک انجینئر

کاشف ہی نہیں' الوینہ بھی وہ سب بڑے غور سے پڑھ اور دیکھ رہی تھی۔ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر مشین کے دونوں طرف لگے اسپیکرز سے آواز آنے لگی' کاشف کی اپنی آواز۔ جو اسکرین پر لکھا تھا وہی بول کر بتایا جا رہا تھا۔

ادھر آواز نے پورے کوائف پڑھے ادھر اسکرین سے وہ سب غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ موٹے موٹے الفاظ میں لکھا تھا۔

''ہوشیار' آپ کے سر پر ہیلمٹ ہے اور میری کرسی پر بیٹھے ہیں اس لیے میں آپ کے پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک کا منظر دکھانے والا ہوں۔''

وہی اب کاشف کی آواز میں بول کر بھی بتایا جا رہا تھا۔

اب اسکرین پر ایک اسپتال کے لیبر روم کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر' دو نرسیں اور میز پر چیختی چلاتی عورت۔

کاشف نے اپنی ماں کو پہچان لیا۔ اب بچے کے رونے کی آواز۔ اسے سنبھالتی ڈاکٹر اور نرسیں۔ ماند پڑتی عورت کی چیخیں۔ نرسیں بچے کو صاف کر رہی تھیں۔

اسکرین پر سب کچھ فلم کی مانند چل رہا تھا۔ کاشف اور الوینہ منہ پھاڑے سب دیکھ رہے تھے۔

مناظر عام فلم کی نسبت زیادہ رفتار سے چل رہے تھے۔ کاشف کی پوری زندگی دکھائی جا رہی تھی اور اپنی گزری ہوئی زندگی کو وہ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے فاسٹ فارورڈ کا بٹن دبایا اور پلک جھپکتے میں وہ خود کو اسکرین پر پلتا اور بڑا ہوتا دیکھتا رہا۔ خود کو کھیلتا کودتا' پڑھتا' مستیاں کرتا دیکھتا رہا۔ کب وہ بڑا ہوا اور کب اس نے تعلیم کے ساتھ ساتھ پائلٹ کی تربیت حاصل کی۔ اس نے کب کون سا وقت' کس کے ساتھ گزارا۔

یہ سب کچھ اس نے تیزی سے نکال دیا۔ منظر کے ساتھ ساتھ اسکرین پر ایک طرف تاریخ' دن' سن اور وقت بھی چل رہا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک ایک واقعہ فلم کی صورت میں ان کے سامنے چل رہا تھا۔

اس کا آئی ٹی انجینئر بن جانا۔ دماغ میں مستقبل کے کمپیوٹر کا پروجیکٹ بنانا۔ آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کے چکر لگانا۔ وہاں کے سب سے بڑے افسر سے جھگڑا ہونا۔ وزیر کے پاس جانا' وہاں بھی شنوائی نہ ہونا۔ فرسٹریشن۔ تھری اسٹار ہوٹل میں الوینہ سے ملنا۔ امیر جان سے رابطہ۔ امیر آباد کے کمرے میں جاگنا۔ امیر جان سے ہوئی نوک جھونک۔ شیشے کے آفس میں معاہدے پر دستخط کرنا۔ امیر جان کے اکاؤنٹ سے رقم اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کرنا۔ ڈاکٹر بابر نعیم کا انجکشن لگانا۔

اسکرین پر سب کچھ دوہرایا جا رہا تھا۔ لیکن منظر کی

اسپیڈ وہ اپنے حساب سے کم اور زیادہ کر رہا تھا اور اب تھی امیر آباد میں اس کی گزری زندگی کے چار نامعلوم سال۔
اسٹیل کے بنے اسی گول کمرے کا منظر۔ مشین بنانے میں مگن کاشف۔ بازار میں الوینہ کے ساتھ گھومتا پھرتا کاشف۔ اس کے ساتھ پکنک مناتا کاشف۔ چڑیوں کو دانہ ڈالتا کاشف۔
پھر وہ دن جب اس نے مشین بنالی تھی۔ اسی گول کمرے میں امیر جان۔ سرتاج صدیقی اور ثمن کے ساتھ کامیابی کی خوشی مناتا کاشف۔
مشین کو جانچنے کے لیے ثمن کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہتا امیر جان۔ اس کے حکم پر ہیلمٹ سر پر رکھ کر کرسی پر بیٹھتی ثمن۔ اسکرین کے اندر ابھرتی اسکرین پر فلم کی طرح نظر آتی ثمن کی پوری زندگی۔
پھر ایک ایسا منظر جس کے مطابق ثمن مستقبل میں گولی مار کر امیر جان کا قتل کرنے والی ہے۔ وہ منظر دیکھ کر پورے کمرے میں پھیل جانے والا سناٹا۔
ثمن کے علاوہ وہاں امیر جان، کاشف اور سرتاج صدیقی سب نے وہ منظر دیکھا کہ مستقبل میں ثمن امیر جان کو قتل کردے گی۔
اس منظر کو دیکھ کر ثمن کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے ہیلمٹ اتار کر ڈیش بورڈ پر پھینک دیا اور کرسی گھما کر امیر جان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ چلائی۔
''نہیں امیر جان صاحب۔ یہ مشین جھوٹ کہتی ہے۔ جھوٹا مستقبل دکھاتی ہے۔ میں آپ کو کیسے مار سکتی ہوں۔''
سرتاج اور کاشف نے امیر جان کی طرف دیکھا۔ امیر جان ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور ثمن کو شوٹ کردیا اور ثمن پلٹ کر کرسی سے نیچے گرگئی۔



''ویل ڈن ویل ڈن کاشف۔'' اسکرین پر امیر جان تالی بجاتا ہوا کاشف کو سراہ رہا تھا۔
''کمال کی مشین بناڈالی ہے تم نے۔ ٹھیک ویسی جیسی ہم چاہتے تھے۔ بس اب اس میں جو چھوٹی موٹی کمیاں رہ گئی ہیں انہیں بھی جلد مکمل کرلو۔''
مگر کاشف کے چہرے پر خوشی کی بجائے پریشانی کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہ سوچوں میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔
اب پارٹی کا منظر چل رہا تھا۔ ایک ہجوم ہے اس پارٹی میں اور سب خوش ہیں۔ امیر جان اور کاشف کو مبارک باد دے رہے ہیں۔ مشین اب یہ بھی بتارہی ہے کہ کاشف جب لوگوں میں گھرا ہوا ہے تو خود کو خوش ظاہر کررہا ہے۔ لیکن اکیلے میں اندر سے دکھی نظر آتا ہے۔ اب وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا سوچ رہا ہے اور اسکرین پر اس کی سوچ تک لکھی جارہی تھی۔ وہ سوچ رہا ہے۔
''یہ تو غلط چیز بن گئی۔ بہت ہی غلط۔ قدرت کے عمل میں دخل دے دیا ہے اس نے۔ ہونی کے مطابق ثمن مستقبل میں امیر جان کو مارنے والی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ اس مشین پر دیکھنے کے بعد امیر جان نے ثمن کو مار ڈالا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ امیر جان کو مستقبل کا پتہ لگ گیا تھا۔ مشین پر اپنا انجام دیکھ لیا تھا اس نے۔ اگر اسی طرح ہونے لگا اور بہت ساری مشینیں بن گئیں تو؟
تو سب کچھ الٹا ہوجائے گا۔ لوگ وقت سے پہلے ہی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ دنیا اسی طرح ٹھیک چل سکتی ہے جیسے چل رہی ہے۔ اس کے لیے اوپر والے نے ایک بہترین نظام قائم کر رکھا ہے۔ مستقبل ہر ایک کے لیے تجسس لیے ہوتا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ اگلے پل کیا ہونے والا ہے اور یہ تجسس برقرار رہے تو بہتر ہے۔
اگر ہر کسی کو اپنے مستقبل کے بارے میں معلوم ہوجائے تو دنیا میں افراتفری مچ سکتی ہے تباہی پھیل سکتی ہے۔ اس مشین کو باقی نہیں رہنا چاہئے۔ تباہی کا یہ سامان پہلے ہی تباہ کردینا چاہئے۔ ورنہ لوگ وقت سے پہلے ہی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگیں گے۔

اسپیڈ وہ اپنے حساب سے کم اور زیادہ کر رہا تھا اور اب تھی امیر آباد میں اس کی گزری زندگی کے چار نامعلوم سال۔

اسٹیل کے بنے اسی گول کمرے کا منظر۔ مشین بنانے میں مگن کاشف۔ بازار میں الوینہ کے ساتھ گھومتا پھرتا کاشف۔ اس کے ساتھ پکنک مناتا کاشف۔ چڑیوں کو دانہ ڈالتا کاشف۔

پھر وہ دن جب اس نے مشین بنالی تھی۔ اسی گول کمرے میں امیر جان۔ سرتاج صدیقی اور ثمن کے ساتھ کامیابی کی خوشی مناتا کاشف۔

مشین کو جانچنے کے لیے ثمن کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہتا امیر جان۔ اس کے حکم پر ہیلمٹ سر پر رکھ کر کرسی پر بیٹھتی ثمن۔ اسکرین کے اندر ابھرتی اسکرین پر فلم کی طرح نظر آتی ثمن کی پوری زندگی۔

پھر ایک ایسا منظر جس کے مطابق ثمن مستقبل میں گولی مار کر امیر جان کا قتل کرنے والی ہے۔ وہ منظر دیکھ کر پورے کمرے میں پھیل جانے والا سناٹا۔

ثمن کے علاوہ وہاں امیر جان، کاشف اور سرتاج صدیقی سب نے وہ منظر دیکھا کہ مستقبل میں ثمن امیر جان کو قتل کردے گی۔

اس منظر کو دیکھ کر ثمن کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے ہیلمٹ اتار کر ڈیش بورڈ پر پھینک دیا اور کرسی گھما کر امیر جان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ چلائی۔

"نہیں امیر جان صاحب۔ یہ مشین جھوٹ کہتی ہے۔ جھوٹا مستقبل دکھاتی ہے۔ میں آپ کو کیسے مار سکتی ہوں۔"

سرتاج اور کاشف نے امیر جان کی طرف دیکھا۔ امیر جان ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور ثمن کو شوٹ کر دیا اور ثمن پلٹ کر کرسی سے نیچے گر گئی۔



"ویل ڈن ویل ڈن کاشف۔" اسکرین پر امیر جان تالی بجاتا ہوا کاشف کو سراہ رہا تھا۔

"کمال کی مشین بنا ڈالی ہے تم نے۔ ٹھیک ویسی جیسی ہم چاہتے تھے۔ بس اب اس میں جو چھوٹی موٹی کمیاں رہ گئی ہیں انہیں بھی جلد مکمل کر لو۔"

مگر کاشف کے چہرے پر خوشی کی بجائے پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ سوچوں میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔

اب پارٹی کا منظر چل رہا تھا۔ ایک ہجوم ہے اس پارٹی میں اور سب خوش ہیں۔ امیر جان اور کاشف کو مبارک باد دے رہے ہیں۔ مشین اب یہ بھی بتا رہی ہے کہ کاشف جب لوگوں میں گھرا ہوا ہے تو خود کو خوش ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن اکیلے میں اندر سے دکھی نظر آتا ہے۔ اب وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا سوچ رہا ہے اور اسکرین پر اس کی سوچ تک لکھی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا ہے۔

"یہ تو غلط چیز بن گئی۔ بہت ہی غلط۔ قدرت کے عمل میں دخل دے دیا ہے اس نے۔ ہونی کے مطابق ثمن مستقبل میں امیر جان کو مارنے والی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ اس مشین پر دیکھنے کے بعد امیر جان نے ثمن کو مار ڈالا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ امیر جان کو مستقبل کا پتہ لگ گیا تھا۔ مشین پر اپنا انجام دیکھ لیا تھا اس نے۔ اگر اسی طرح ہونے لگا اور بہت ساری مشینیں بن گئیں تو؟

تو سب کچھ الٹا ہو جائے گا۔ لوگ وقت سے پہلے ہی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ دنیا اسی طرح ٹھیک چل سکتی ہے جیسے چل رہی ہے۔ اس کے لیے اوپر والے نے ایک بہترین نظام قائم کر رکھا ہے۔ مستقبل ہر ایک کے لیے تجسس لیے ہوتا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ اگلے پل کیا ہونے والا ہے اور یہ تجسس برقرار رہے تو بہتر ہے۔

اگر ہر کسی کو اپنے مستقبل کے بارے میں معلوم ہو جائے تو دنیا میں افراتفری مچ سکتی ہے تباہی پھیل سکتی ہے۔ اس مشین کو باقی نہیں رہنا چاہئے۔ تباہی کا یہ سامان پہلے ہی تباہ کر دینا چاہئے۔ ورنہ لوگ وقت سے پہلے ہی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگیں گے۔

اب اس مشین کو کیسے ختم کروں؟ اگر میں نے ایسا کیا تو امیر جان مجھے امیر آباد سے جانے نہیں دے گا اور نہ ہی مرنے دے گا اور نہ ہی کبھی مجھے ڈاکٹر بابر نعیم کے انجیکشن سے آزادی دے گا۔ ایک کے بعد دوسرا انجیکشن لگتا رہے گا۔ تو کیا کروں' کیا کروں میں؟''

پھر ایک منظر ابھرا۔ مشین کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھا کاشف۔ سر پر ہیلمٹ چڑھائے اسکرین پر اپنا مستقبل دیکھتا کاشف۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ کوئی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔

اب منظر تھا کہ امیر جان کے آدمی پتلی گلی کی کھڑکی سے کاشف کو اس کے فلیٹ میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ صبح وہ بدحواس سا اٹھتا ہے اور لالو کے ساتھ تھوڑے شور شرابے کے بعد وہ اپنے کمپیوٹر میں بینک اکاؤنٹ چیک کرتا دکھائی دیتا ہے اور اس میں پوری رقم دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن ٹھیک چھ گھنٹے بعد سی آئی اے والے اسے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور تشدد کرتے ہیں۔ وہ ٹوٹ کر سگریٹ مانگتا ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس سگریٹ نہیں ہوتی۔ جگی باہر جا کر سگریٹ لاتا ہے۔ وہ سب کچھ اپنے دماغ میں نوٹ کرتا جاتا ہے کہ مجھے سب سے پہلے اپنے اکاؤنٹ میں سے رقم نکال کر امیر جان کے اکاؤنٹ میں منتقل کرنی ہے۔ جس سے میں امیر جان تک پہنچنے کی کوشش کر سکوں۔ وہ دوبارہ پیچھے جاتا ہے' جب وہ شیشے کے کمرے میں امیر جان کے اکاؤنٹ سے رقم اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر رہا تھا۔ وہ اس کے اکاؤنٹ کے پاس ورڈ کو اپنے دماغ میں بٹھا لیتا ہے اور پھر مناظر کو فارورڈ کرتا ہے۔

لیکن یہ کیا؟

اب منظر تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ پر اکاؤنٹ میں رقم دیکھتا ہے تو اس میں صرف پانچ ہزار روپے ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوچ ابھری کہ اگر میں کچھ کرنے کا فیصلہ لوں تو مستقبل بدل سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر میں منصوبہ بندی کروں یہاں امیر آباد میں دوبارہ پہنچ سکتا ہوں اور اس لنکا کو جلا کر اس مشین کو تباہ کر سکتا ہوں۔ اب وہ اپنے منصوبے کو باقاعدہ شکل دینے لگتا ہے۔ ایک ایک قدم پر کس کس مصیبت سے کیسے کیسے بچنا ہے اور کیسے اسے اپنی منزل کے لیے سمت بنانی ہے۔ سب کچھ بہت باریکی اور آرام سے کئی دنوں کی مغز خوری کے بعد وہ اسے ایک شکل دینے لگتا ہے۔

وہ روزانہ پلان کرتا اور اپنے سامان کی فہرست میں اپنے مستقبل میں کام آنے والی چیز بھی شامل کر کے الوینہ کو دے دیتا تھا اور یہ سب اس لیے آسان ثابت ہو رہا تھا کہ امیر جان نے اسے ہر طرح کی آزادی سے نوازا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی منگوا سکتا تھا۔ کوئی اس کے سامان پر انگلی نہیں اٹھاتا تھا۔

اپنے منصوبے کے مطابق اس نے شیو کرنا اور بال کٹوانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ایک منظر میں وہ اپنی رقم امیر جان کے اکاؤنٹ میں منتقل کرتا نظر آ رہا ہے۔

اب وہ سگریٹ میں وہ کیمیکل ملاتا نظر آ رہا ہے جو اس نے باہر سے منگوایا تھا۔ ایک منظر میں وہ تار کو زیڈ کی شکل میں موڑ رہا ہے۔ گھڑی میں وقت اور الارم سیٹ کر رہا ہے۔ داڑھی کے بالوں میں کاغذ پھنسا رہا ہے۔ موبائل اور محدب عدسہ وہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔

سترہ اگست کی شام کو وہ الوینہ سے باتیں کر رہا ہے۔ وہی باتیں جو الوینہ اسے بتا چکی تھی کہ سترہ اگست کو اس نے کیا کہا تھا۔

اٹھارہ اگست کو وہ پارسل الوینہ کو دے رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے کئی ہدایات بھی دے رہا ہے اور یہ سب وہ دونوں اس وقت اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔

تیئیس اگست کو وہ اس مشین کا سرکٹ توڑ رہا ہے۔

چوبیس اگست کو وہ دوبارہ الوینہ سے باتیں کر رہا ہے۔

یہ سب دیکھ کر الوینہ بولی۔

''کاشف! تمہیں اب تو یقین آ گیا ہوگا کہ میرا ایک بھی لفظ جھوٹ نہیں تھا۔ اپنی بنائی ہوئی کرشماتی مشین پر تم

خود دیکھ رہے ہو ہمارے بیچ یہی باتیں ہوئی تھیں۔ اپنی مدد کے لیے تم نے مجھے خود ہدایات دی تھیں۔'' وہ بولتی رہی۔

''انسان جھوٹ بول سکتا ہے لیکن تمہاری یہ مشین تو جھوٹ نہیں بول رہی نا۔''

لیکن کاشف نے جیسے اس کی باتیں سنی ہی نہیں۔ اس کی ساری توجہ تو اسکرین پر مرکوز تھی۔ اس اسکرین پر جس پر وہ اس وقت خود کو سگریٹ کے کیمیکل کا اینٹی ڈوز لیتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پھر سو رہا ہے۔ چار آدمی دبے پاؤں کمرے میں آئے۔ اسے کچھ سونگھایا۔ اٹھایا اور اس کے فلیٹ پر چھوڑ دینے کا پورا منظر دیکھ رہا تھا وہ۔

پھر اس کے بعد ہونے والے تمام واقعات کی فلم اسکرین پر اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔ حتیٰ کہ الوینہ کے ساتھ اس کمرے اور اس کرسی پر بیٹھنے تک کے پورے مناظر اس کے سامنے تھے۔ وہ اسکرین پر خود کو اسی کرسی پر بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہر منظر کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔

اب اسکرین پر آگے کا وقت نظر آ رہا ہے۔ یعنی اس وقت کاشف کی گھڑی میں بارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے اور اسکرین پر بارہ بج کر بیس منٹ کا منظر چل رہا تھا۔ اس کے مستقبل کا منظر۔

کاشف پارسل میں سے ایک روپے کے برابر کا سکہ نکال کر اسے ڈیش بورڈ کے ایک کھانچے میں فکس کرتا ہے۔ تاروں کی چرچراہٹ ہوتی ہے اور شارٹ سرکٹ ہوجاتا ہے۔ مشین سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ ڈیش بورڈ اور اسکرین کا بھی وہی حال ہے۔

جس دروازے سے وہ آئے تھے اسی سے امیر جان اندر آتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ شمس الدین بھی ہے۔ امیر جان کچھ کہہ رہا ہے۔ اچانک ٹنکی جیسے کمرے میں چھ کھڑکیاں کھلتی ہیں اور ان میں سے کمانڈوز کود کر اندر آتے ہیں۔ باہر سے دھماکوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

اب کاشف اوپر جانے والی چڑھائی پر بھاگ رہا ہے۔

بارہ بج کر چونتیس منٹ۔

شمس الدین کے ریوالور سے گولی نکلی اور کاشف کے سینے میں دھنس گئی۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ گرتا چلا گیا اور نیچے پہنچنے تک اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔

اسکرین اب بالکل صاف ہو چکی تھی۔ اس پر کوئی منظر نہیں تھا۔

اب ایک لکیر نظر آنے لگی۔ جیسے آدمی کے مرتے ہی اس سے لگی ای سی جی مشین پر ایک سیدھی لکیر بن جاتی ہے۔

کچھ دیر تک تو وہ ہکا بکا سے بلینک اسکرین کو دیکھتے رہ گئے۔ دونوں کے دماغ یہ منظر دیکھ کر سن ہو گئے تھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور جب کاشف کی سمجھ میں ساری باتیں آئیں تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی سے کھڑا ہو گیا اور تاروں کا ہیلمٹ اتار کر ڈیش بورڈ پر پھینکا۔

''بھاگو۔ کاشف۔ بھاگو۔'' ساری باتیں سمجھ میں آتے ہی الوینہ حلق پھاڑ کر چیخی۔

''تم دیکھ چکے ہو کہ کچھ دیر میں امیر جان یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی بھاگو۔''

''بھاگنے سے کچھ نہیں ہوگا وینا۔ میرا مستقبل تم دیکھ چکی ہو۔'' کاشف چبوترے پر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''اس کے ساتھ شمس الدین بھی ہوگا۔ میں اس کی گولی سے مارا جاؤں گا۔ وہ ہونی ہے۔ ٹل نہیں سکتی۔ تم میرے لیے کیوں اپنی جان کی دشمن بن رہی ہو۔ تم بچ سکتی ہو۔ تمہارا مستقبل ابھی اندھیرے میں ہے۔ سسپنس میں ہے۔ یہی ٹھیک ہے آدمی کے لیے۔ تم خود کو بچانے کی کوشش کرو۔''

''نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔'' الوینہ پاگلوں کی طرح بولی۔

''تم دیکھ چکے ہو کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔''

''پاگل مت بنو۔'' کاشف پارسل میں سے ایک روپے کے برابر کا سکہ نکالتے ہوئے بولا۔

''ایسے آدمی سے پیار کر کے کیا کرو گی جو کچھ ہی منٹوں میں گولی کا شکار ہونے والا ہے۔''

''سب بدل سکتا ہے کاشف۔ سب بدل سکتا ہے۔ اگر ٹمن امیر جان کی گولی سے ماری جا سکتی ہے تو سمجھ لو مستقبل بدل سکتا ہے۔ تم کوشش تو کرو۔ یوں ہمت ہارنے سے کام نہیں چلے گا۔ تم پیچھے آ ؤ۔''

''اس مشین کو ختم کرنے سے پہلے ہرگز نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھ میں سکہ لیے ڈیش بورڈ کی طرف گھوما ہی تھا کہ کمرے میں امیر جان کی دھاڑ گونجی۔

''تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میری گولی تمہارا بھیجا اڑا دے گی۔''

الوینہ اپنی جگہ بت بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چند لمحوں بعد اپنے محبوب کی موت کا سوچ کر ہی اس کے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ایک دم جام ہو چکی تھی۔

امیر جان کے ساتھ شمس الدین بھی اندر آ گیا تھا۔ مشین نے جو دکھایا تھا وہ سچ ہونے جا رہا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں کوئی ریوالور نہیں تھا۔

ایک پل کے لیے تو کاشف جہاں تھا وہیں کھڑا رہا مگر اگلے ہی پل اس کے ہونٹوں پر بہت ہی زہریلی مسکراہٹ ابھری۔

''تم نہیں جانتے بے وقوف۔ چاہے جتنی بھی گولیاں برسا لینا۔ تمہاری گولی سے نہیں مروں گا میں اور جب مارا جاؤں گا تو اس سے پہلے تمہاری یہ مشین دھواں دھواں ہو کر جل چکی ہو گی۔'' کاشف نے چیخ کر کہا۔

''دیکھ چکے ہیں۔ ہم سب دیکھ چکے ہیں کہ ابھی ابھی اس مشین پر تم نے کیا دیکھا ہے۔'' امیر جان بولا۔

''مگر تم شاید بھول چکے ہو۔ یاد کرو۔ اس مشین نے وہ بھی نہیں دکھایا تھا جو ٹمن کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے بالکل برعکس دکھایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مغالطے میں مت رہنا کہ ہر حال میں وہی ہو گا جو اس مشین نے دکھایا ہے۔ اس کے الٹ بھی ہو سکتا ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ میں مشین جلنے سے پہلے یہاں آ گیا ہوں۔ گولی گولی ہوتی ہے انسانی جسم میں جب دھنستی ہے تو۔''

''نہیں جان۔'' الوینہ چیخی۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''کمال کر دیا تم نے ویناڈارلنگ' اصلی کمال تو تم نے کر دیا ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے بولا۔

''ہم اور باقی لوگ تو یہی سوچتے رہے کہ کاشف کمال کر رہا ہے۔ مگر نہیں' وہ کمال یہ نہیں' وہ سارا کمال جو مستقبل دکھانے والی یہ مشین کر رہی ہے۔ یہ مشین جس پر یہ پہلے ہی اپنا مستقبل دیکھ چکا تھا۔ یہ دیکھ چکا تھا کہ مستقبل میں اس کے ساتھ کیا کیا ہونے والا ہے۔ تب ہی تو ٹمن کی موت کے بعد اس نے بال بڑھانے شروع کر دیئے تھے۔ تب ہی تو سترہ' اٹھارہ' تئیس اور چوبیس اگست کی تاریخ کو ہی اس نے تمہیں آگے ہونے والے سارے واقعات بتا دیئے تھے۔ تب ہی تو یہ دعوے سے کہتا تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ کرائے پر حاصل کیے ہوئے آدمی کا نام خدا جانے ہی ہو گا۔ فلاں فلاں کمرہ اور سیٹ نمبر بک کروائی ہو گی تم نے۔ میں تمہیں انیس اور چھبیس اگست کو لاہور اور گوادر بھیجوں گا۔ اپنے مستقبل میں ہونے والے ایک ایک واقعے کو پہلے سے دیکھ لینے والے اس شخص کے ترکش سے ''مستقبل سازی'' جیسا تیر نہ نکلتا تو اور کیا نکلتا اور اسی مستقبل سازی کو اس نے پارسل کے عملی روپ میں اپنے بینک کو بھیج دیا تھا اور اسی کے سہارے یہ آج یہاں آ پہنچا ہے اور ہم نے اسے مستقبل ساز کہا ہے تو غلط نہیں کہا۔ اس نے اپنا مستقبل خود لکھا۔ لیکن آگے کے لیے یہ چوک گیا اور پارسل کو تیر اس لیے کہا کہ اس کے کہیں چوک جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ جسے تیار ہی مستقبل میں ہونے والے ہر واقعے کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا اور ہاں' اس دھوکے میں مت رہنا کہ اس نے جو کام تم سے کروائے وہ تمہارے پیار پر بھروسہ کر کے کروائے۔ اس کم بخت کو

تو یہ مشین یہ بتا چکی تھی کہ الوینہ تمہارے پیار میں پاگل ہو چکی ہے۔ وہی تمہارے لیے سارے کام کر سکتی ہے۔ وہ تم سے وفا کرے گی اور امیر جان سے بے وفائی۔ اس نے کوئی جوا نہیں کھیلا۔ اسے ہر بات پہلے سے ہی پکے طور پر معلوم تھی۔ جوا تو وہ کھیلتے ہیں جن کے لیے مستقبل اندھیرے میں ہوتا ہے۔ جس کی آنکھوں نے مستقبل ہی دیکھ لیا اس کے لیے آگے کا منصوبہ بنانا کون سا مشکل کام تھا۔" امیر جان بول رہا تھا۔

"اسے پتہ لگ گیا تھا کہ کب سی آئی اے والے اسے پکڑ لیں گے۔ کب وہاں سے نکل کر کون سی ٹرین کی کون سی سیٹ پر بیٹھے گا۔ کب کوئی لڑکا اس کی انگوٹھی چھین کر بھاگے گا۔ جس نے مستقبل میں ہونے والے ہر واقعے کو دیکھ لیا ہو اس کے لیے کچھ بھی کرنا بھلا کون سے کمال کی بات تھی' اصلی کمال تو تم نے کیا۔ یہ کمال کہ تم مجھے دھوکہ دینے کا کام انجام دے بیٹھیں۔ تم نے اتنا بڑا جوا کھیلا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔"

"اگر میں نے اپنے پیار کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے ساتھ بے وفائی کی ہے تو تم نے کون سی وفا نبھائی ہے میرے ساتھ' تم نے میرے بدن کو ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت ہی کب دی ہے۔ میرے ہزار بار کہنے پر بھی تم نے میرے ساتھ شادی نہیں کی۔" الوینہ بولی۔

"میں نے تم سے اس مشین کے بارے میں کتنی بار پوچھا تھا' تم کو تو مجھ پر اتنا بھی بھروسہ نہیں تھا کہ اس کے بارے میں کچھ بتاتے۔ ہر بار یہی کہہ کر بے وقوف بناتے رہے کہ سرپرائز دو گے۔ جس پر تم بھروسہ نہیں کرتے تھے تو اس سے یہ امید کیسے کر سکتے ہو کہ وہ تم سے وفا کرے گی۔"

"واقعی۔ تم پر بھروسہ کرنے کی بے وقوفی تو ضرور ہوئی ہم سے۔ تمہیں یہ حکم دے کر لاہور بھیجنے سے پہلے تم پر رتی برابر بھی شک نہیں کر سکتے تھے کہ کاشف کو اپنی باتوں میں پھنسا کر امیر آباد لے آؤ۔ شک تو تب ہوا جب تمہارے منع کرنے کے باوجود ہم نے ہمت خان کے ساتھیوں کو گلمو ہر ہوٹل کے کمرے میں بھیجا جس میں تم نے خود کو چھپا ہوا بتایا تھا۔ لیکن' تم وہاں نہیں تھیں۔ اس کے بعد شمس الدین نے فون پر تمہارا کارنامہ بتایا۔ پھر تم دن میں ہمارے بنگلے پر آ گئیں۔ ہمیں اپنے بدن میں الجھانے کا کھیل کھیل کر اس کمرے سے ٹی وی کا کنکشن اڑا دیا۔ ہم نے بھی سوچا۔ کرتی رہو جو کر رہی ہو۔ ہمارا حکم بھی تو یہی تھا کہ کاشف کو یہاں لے آؤ۔ تاکہ وہ اس مشین کے سرکٹ کی خرابی کو دور کرے۔ ایرر ختم کرے اور مشین دوبارہ درست حالت میں کام کرنے لگے۔"

"ہو چکی امیر جان' مشین درست ہو گئی۔ دیکھو۔" اور کاشف نے چبوترے سے سیدھا مشین پر چھلانگ لگائی اور چند ہی لمحوں میں مشین سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ ہلکے ہلکے دھماکے ہونے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ٹرانسفارمر جل رہا ہو۔

امیر جان کو الوینہ سے باتوں میں الجھا دیکھ کر کاشف نے سکہ اس کھانچے میں لگا دیا تھا جس سے مشین شارٹ سرکٹ کا شکار ہو چکی تھی۔

"دھائیں۔" امیر جان نے تیزی سے اس کی طرف گھوم کر فائر کیا۔ مگر گولی ہوا میں تیرتے ہوئے کاشف کو نہیں لگی۔ اس کے بعد امیر جان کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا کاشف کا جسم ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر آ کر گرا تھا۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر دونوں لڑھکتے چلے گئے۔ ریوالور امیر جان کے ہاتھ سے نکل کر جانے کہاں جا گرا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کمرے کی دیوار میں تقریباً دس فٹ اوپر ایک ساتھ چھ کھڑکیاں کھلیں اور ایک ساتھ چھ کمانڈوز اس کمرے میں اتر آئے۔ تب تک الوینہ کندھے سے گن اتار کر میز کے پیچھے پوزیشن لے چکی تھی۔ کمانڈوز کے لیے کاشف کو نشانہ بنانا دشوار ہو رہا تھا کیونکہ اس پر گولی چلانے میں خدشہ تھا کہ امیر جان بھی اس کی زد میں آ جاتا۔

اب مشین میں آگ لگ چکی تھی اور وہ دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور پھر اچانک اوپر سے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بم پھٹ رہے ہوں۔ شمس الدین کمرے سے باہر بھاگ نکلا۔ میز کے پیچھے پوزیشن لیے ہوئے الوینہ نے کمانڈوز پر فائر کھول دیا اور دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ الوینہ فولادی میز کے پیچھے محفوظ تھی جبکہ کمانڈوز کوئی آڑ نہ ہونے کے باعث ایک ایک کرکے اس کی گولیوں کا نشانہ بن کر چیختے چلاتے ڈھیر ہوتے چلے گئے۔

وہاں امیر جان' کاشف کے سینے پر سوار دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبا رہا تھا اور کاشف کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ اس کے باوجود بمشکل غراتے ہوئے بولا۔

''تیرے ہاتھوں سے نہیں مروں گا گدھے۔ تم اس بات کو کیوں نہیں مانتے کہ تمہارے ہاتھوں سے نہیں مر سکتا ہیں۔''

''ثمن بھی مری تھی۔ تم بھی مرو گے۔'' اس نے دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

کاشف نے اپنی دونوں ٹانگیں موڑ کر اس کے سینے پر ٹکائیں اور اتنی زور کا جھٹکا دیا کہ نہ صرف اس کے ہاتھ کاشف کی گردن سے ہٹ گئے بلکہ وہ ہوا میں اچھلتا ہوا دور جا گرا۔ اور کاشف تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کھانستے ہوئے اپنی گردن مسل رہا تھا۔

امیر جان ایک کونے میں پڑے اپنے ریوالور کے نزدیک جا کر گرا تھا۔ اس نے وقت گنوائے بغیر ریوالور جھپٹ لیا اور کاشف پر گولی چلائی۔ تب ہی الوینہ چھٹے کمانڈو کو بھی ڈھیر کر چکی تھی اور امیر جان کے گولی چلانے سے پہلے ہی کاشف' الوینہ کو آواز دیتا ہوا اوپر سے نیچے آنے والی چڑھائی کا موڑ گھوم چکا تھا۔

''آ ؤ وینا۔ بھاگو۔''

ریوالور ہاتھ میں لیے امیر جان بھی ان کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ الوینہ دھاڑی۔

''رک جاؤ امیر جان۔'' امیر جان کے قدم وہیں تھم گئے۔

''ایک قدم بھی کاشف کی طرف بڑھایا تو بھون کر رکھ دوں گی۔''

امیر جان نے اس کی طرف دیکھا۔ میز کے پیچھے سے دھواں اگلتی گن کی نال اسی کو گھور رہی تھی۔

''اب یہاں صرف میں اور تم ہیں۔ باقی سب مردے ہیں۔ میری انگلی کے ہلکے سے اشارے پر تم بھی مردے میں تبدیل ہو جاؤ گے۔''

''وینا ڈارلنگ۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟'' موت کو سامنے دیکھ کر جیسے امیر جان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

''ہم تمہاری ساری خطائیں معاف کر دیں گے۔ شادی کرلیں گے تم سے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے سنہرے مستقبل کو۔''

''مستقبل تو تمہارا یہی ہے امیر جان۔'' وہ غرائی۔

''یہی کہ تم اپنی وفادار ساتھی کے ہاتھوں مارے جانے والے تھے۔ ثمن نہیں رہی تو کیا ہوا۔ میں تو ہوں' میں تو ہوں' میں تو ہوں۔''

ہر''میں تو ہوں'' پر وہ اپنی انگلی کو جنبش دیتی گئی اور امیر جان کے بدن میں تین گولیوں نے اپنا راستہ بنا لیا۔

''حرامزادی۔ کتیا۔'' فرش پر گرتے وقت بس یہی امیر جان کے آخری الفاظ تھے۔



''بھاگو وینا بھاگو۔ اس کے پاس ریوالور ہے۔'' کاشف تیزی سے چڑھائی پر چڑھ رہا تھا۔ اسے یہ دیکھنے کا بھی ہوش نہیں تھا کہ الوینہ بھی اس کے ساتھ ہے یا نہیں اور جب ہوش آیا تو وہ ٹھٹکا۔ اپنے ساتھ الوینہ کو نہ دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔

''وینا'' وہ زور سے چیخ کر واپس نیچے کی طرف بھاگا۔

ابھی وہ پہلے موڑ پر ہی پہنچا تھا کہ سامنے سے الوینہ

آتی نظر آئی۔ گن ہاتھ میں لیے وہ بھی اسی طرف دوڑی چلی آرہی تھی۔

اور پھر دونوں ایک موڑ پر آمنے سامنے ٹکرا گئے اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ جیسے چھوڑا تو بچھڑ جانے کا ڈر ہو۔ الوینہ اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اس کا کیا ہوا۔'' کاشف نے پوچھا۔

''مر گیا وہ۔'' الوینہ نے روتے ہوئے کہا۔

''کیسے؟''

''ایک وفادار ساتھی کے ہاتھوں' یہی اس کا مستقبل تھا۔''

کاشف نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اس کے شانے پکڑ کر بولا۔

''تم نے مارا اسے' تم نے؟''

''میں نے وہی کیا' جس کے وہ لائق تھا۔''

''تو اسی لیے وہ اسکرین پر مرتا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔ اسے میری آنکھوں کے سامنے نہیں مرنا تھا اور مشین تو صرف میرا مستقبل دکھا رہی تھی۔''

''تمہارا مستقبل تو۔'' الوینہ کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

اسی وقت الارم زور سے بجا۔ کاشف نے اپنی بائیں کلائی میں انجیکشن لگنے جیسی تیکھی چبھن محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی گھڑی کے چھوٹے سے اسپیکر سے آواز ابھرنے لگی۔

''بھاگو' بھاگو' کاشف بھاگو۔''

اور کاشف نے بغیر سوچے سمجھے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی وقت دھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی اور اس دیوار سے جا ٹکرائی جہاں ایک ثانیے پہلے کاشف موجود تھا۔

ابھی وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ لگاتار دو فائر ہونے کی آواز گونجی اور اس بار ایک چیخ ابھری۔ کاشف اور الوینہ نے ایک ساتھ بوکھلا کر اس سمت دیکھا جہاں ایک ستون کے پیچھے سے شمس الدین فرش پر گرتا نظر آرہا تھا۔ دونوں گولیاں اس کے سر میں لگی تھیں۔ اس کے قریب پڑے ریوالور سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔

کاشف کے ہاتھ میں بندھی گھڑی ابھی بھی چیخے جا رہی تھی۔

''بھاگو' بھاگو' کاشف بھاگو۔''

''تم بچ گئے' تم بچ گئے کاشف۔ تم بچ گئے۔'' الوینہ خوشی سے چلاتی ہوئی بولی۔

''وہ..... وہ جس کے ہاتھوں تم مرنے والے تھے وہ تو وہ..... وہ مرا پڑا ہے۔''

''بس بچ ہی گئے۔'' اوپر کھڑا عمران انصاری ہاتھ میں ریوالور لیے مسکراتا ہوا بولا۔

''عین اسی وقت اگر تم نے چھلانگ نہ لگائی ہوتی تو اس کی چلائی ہوئی گولی تمہارے سینے میں دھنسی ہوتی اور تم۔''

اس کے پیچھے آرمی کے دو کمانڈوز کھڑے تھے۔

''کیا۔ شمس الدین کو تم نے مارا؟'' کاشف نے پوچھا۔

''کون شمس الدین۔'' عمران نے پوچھا۔

کاشف نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ۔''

''مجھے خوشی ہے کہ اس کا دوسرا فائر کرنے سے پہلے ہی میں پہنچ گیا۔'' عمران بولا۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ منظر' اس کی چلائی ہوئی گولی ٹھیک وہاں سے گزر کر دیوار میں گھسی ہے جہاں ایک پل پہلے تم کھڑے تھے۔ میں تو سمجھا تم گئے کام سے۔ بس نصیب نے بچا لیا تم کو۔''

''نصیب نے نہیں۔ نصیب نے نہیں۔'' الوینہ مارے خوشی کے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

''اس گھڑی نے بچایا ہے کاشف کو۔ اس کے نصیب میں تو شمس الدین کی گولی سے مرنا لکھا تھا۔''

''کیا بک رہی ہو تم۔'' عمران بولا اور پھر کاشف

سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اور یہ گھڑی ابھی تک کیا بکے جارہی ہے؟''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے عمران۔'' کاشف بولا۔

''شاید وینا ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ مجھے اس گھڑی نے بچالیا۔ یہ عین اسی وقت سے چلائے جارہی ہے کہ بھاگو کاشف بھاگو۔ جس وقت شمس الدین نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اور عین اسی وقت مجھے ہوشیار کرنے کے لیے میری کلائی میں سوئی بھی چبھی تھی۔ تب ہی تو میں بھاگا اور وہاں سے ہٹ گیا جہاں کے لیے گولی چلی تھی۔''

''شاید تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔''

''جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ نصیب کا لکھا کبھی ٹل نہیں سکتا۔ جو ہونا ہے' ہو کر رہتا ہے۔ موت جہاں لکھی ہوتی ہے' وقت آدمی کو وہیں کھینچ کر لے جاتا ہے۔ وہیں یہ بھی سنا ہے کہ برا وقت اگر ایک بار نکل جائے تو نصیب کا لکھا یہ بھی ہے کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ ٹل جاتا ہے۔'' کاشف کہتا رہا۔

''شاید یہی سوچ کر میں نے اس بری گھڑی کو ٹالنے کے لیے اس گھڑی میں الارم لگا دیا تھا۔ سوچا چانس لیتا ہوں' ہوسکتا ہے کہ میں اس کا کہا مان لوں اور وقت ٹل جائے۔''

''اور وقت ٹل گیا کاشف۔ وہ وقت ٹل گیا۔'' الوینہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔

''تمہاری یہ اوٹ پٹانگ باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔'' عمران کی کھوپڑی گھوم رہی تھی۔

''گھڑی میں تم نے اس لیے الارم لگایا تھا کہ وہ ٹھیک اسی وقت بجے جب شمس الدین تم پر گولی چلائے۔ تو کیا تم پر الہام ہوا تھا کہ وہ تم پر ٹھیک اسی وقت گولی چلائے گا؟''

کاشف نے گھڑی کا الارم آف کیا تب کہیں جاکر اس کی رٹ بند ہوئی۔ وہ عمران کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم یہ بتادو کہ تم یہاں کیسے ٹپک پڑے' تو میں یہ بتا دوں گا کہ مجھے یہ الہام کیسے ہوا۔''

جواب میں عمران بھی مسکرا دیا۔

''اپنی ہیرے کی انگوٹھی چیک کرو۔''

''کیا مطلب۔'' کاشف نے چونک کر اپنی انگلی میں پہنی ہیرے کی انگوٹھی کی طرف دیکھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔''

''میری یہ نصیحت یاد رکھنا کہ سی آئی اے تمہیں جب بھی کچھ دے' چاہے تمہاری چیز ہی تمہیں لوٹائے' اسے خوردبین سے ضرور چیک کرنا۔''

''یا..... یعنی۔''

''ہم لوگ فری فنڈ میں کچھ نہیں دیا کرتے۔'' عمران نے کہا۔

''اس ہیرے کے نیچے مائیکروفون چھپا ہوا ہے۔ جو تمہاری سمت اور فاصلہ بتا رہا ہے۔ اسی کی رہنمائی میں ہم یہاں پہنچ گئے اور اب یہ پورا جزیرہ پاک فوج کے قبضے میں ہے۔''

یہ سن کر الوینہ جھپٹ کر کاشف کے گلے لگ گئی۔

''اب تم بھی بتادو کہ تمہیں موت کو شکست دینے کا الہام کیسے ہوا؟''

جواب میں کاشف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا پھر الوینہ کی طرف۔ پھر فضا میں کاشف اور الوینہ کے قہقہے گونجنے لگے اور عمران انصاری ان دونوں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

(تمت بالخیر)



سیلز گرل

سویرا فلک

انسان بہت کچھ چاہتا ہے مگر زندگی مجبوریوں اور خواہشوں کے درمیان سے گزر کر کامیابی کی طرف جاتی ہے لیکن اس کے لیے محنت اور ہمت دونوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔
ایک ایسی ہی لڑکی کی روداد' جو مجبوری کے تحت گھر سے نکلی' لیکن راستے میں پرانی یادیں اس کی منتظر تھیں۔

"یااللہ اتنی سخت گرمی میں بھی لوگوں کو چین نہیں آتا۔" ستمبر کی ستم گر گرمی میں دوپہر کے تین بجے دروازے پر بار بار دستک کی آواز سن کر مجھے سخت غصہ آرہا تھا کیونکہ اس پہر عموماً فقیر' ٹکڑے مانگنے والے یا سیلز گرل وغیرہ ہی منڈلاتے تھے۔ میرے سسرال والے بھی لاہور میں تھے اور میکہ بھی۔ کراچی میں ایسی کوئی خاص واقفیت نہ تھی اور شوہر نامدار تو آفس میں موجود تھے اور لنچ ٹائم میں بات ہوجانے پر اطمینان ہوتا تھا کہ وہ بھی وقت پر ہی آئیں گے۔ ایسے میں بچوں کے اسکول سے آنے پر لنچ سے فارغ ہوجانے پر میں بچوں کے ساتھ خود بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹنے میں مصروف تھی۔

مسلسل دستک کے باعث طوعاً و کرہاً مجھے اٹھنا ہی پڑا تو اے سی کی مزیدار کولنگ سے لبریز کمرے سے تپتے صحن میں آنا مجھے مزید کوفت میں مبتلا کررہا تھا۔ دروازہ پیٹنے والے کی ڈھٹائی نے میرا طیش اور بھی بڑھادیا سو میں نے سخت غصے کے عالم میں دروازہ کھولا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ میرے لہجے کی ناگواریت کو نظر انداز کرکے عادتاً اپنی پراڈکٹ کی تعریفیں کرنا شروع ہوگئی۔

"میڈم یہ دیکھئے یہ واشنگ پاؤڈر بازار میں سو روپے کا ہے اور ہم آپ کو اسی روپے کی تعارفی قیمت میں دے رہے ہیں اس کے استعمال سے ٹینو پال اور نیل کی اضافی ضرورت بھی نہیں رہتی جبکہ ہاتھوں کو بھی نقصان نہیں۔"

"ارے نہیں لینا بھئی' جاؤ یہاں سے۔" میں نے قدرے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی اور دروازہ بند کرنا چاہا تو کمپنی یونیفارم میں ملبوس اس سانولی سی لڑکی نے ہاتھ جوڑ لیے۔

"میڈم پلیز...... میں تین گھنٹے سے آپ کے محلے میں گھوم رہی ہوں اب تک کوئی پراڈکٹ نہیں بکی۔ میڈم پلیز صرف ایک لے لیں اگر میں نے اپنا ہدف پورا نہیں کیا تو میری نوکری چلی جائے گی۔" اب وہ باقاعدہ رونے لگی تھی' میں ایک لمحے کے لیے اس کی بے چارگی دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کروں پراڈکٹ خریدوں یا نہیں مگر اسی اثناء میں وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی۔

صورت حال گمبھیر ہوتے دیکھ کر مجھے گھبراہٹ شروع ہوگئی' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی مدد کروں یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں اسے اٹھانے گرل کھول کر باہر نکلوں تو وہ اسلحہ نکال کر گھر میں گھس آئے۔ میں نے اطراف میں جھانکا کہ کہیں وہ کسی گروہ کی فرد تو نہیں' اس کا کوئی ساتھی آس پاس موجود ہو مگر گلی میں حد نگاہ سناٹے کا راج تھا۔ لو کے تھپیڑوں نے لوگوں کو گھروں تک محصور کر رکھا تھا۔ یکبارگی شیطان نے بہکایا کہ اس پر لعنت بھیج کر اندر چلی جاؤں مگر پھر ضمیر کی آواز نے جھنجوڑ ڈالا تو میں نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے دروازہ کھولا اور کسی نہ کسی طرح سہارے سے اسے برآمدے میں لے آئی۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی' میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی اور جلدی سے گلوکوز بنا کر لائی اور گلاس اسے تھمادیا۔ اس نے گھونٹ

گھونٹ گلاس خالی کرنا شروع کیا تو میں نے بھی تفصیل سے اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔

وہ سانولی رنگت والی دبلی پتلی سی لڑکی تھی' چہرے پر زردی مائل نقاہت اور تھکن تھی۔ پانی ختم کر کے اس نے شکریہ کہہ کر میری جانب گلاس بڑھایا تو میں اس کی نچی آنکھیں دیکھ کر بُری طرح چونک گئی۔ اس کی کنچے جیسی آنکھوں نے مجھے یک دم ماضی میں پہنچا دیا تھا۔

''سیما تم...... یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے؟'' میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا تو وہ مجھے حیرت سے تکنے لگی۔

''میں رابعہ...... پہچانا نہیں مجھے......'' میں نے پوچھا تو اس نے بغور میرے شادی اور بچوں کے بعد پھیلے ہوئے جسم اور آنکھوں پر لگے چشمے کو دیکھا اور یکدم گلے لگ کر سسکنے لگی۔ میری آنکھیں بھی اپنی بچپن کی دوست کی حالت پر بھر آئیں' سیما میرے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی' ہم نے آٹھویں پاس ہی کی تھی کہ سیما کے ابو کا تبادلہ اسلام آباد سے کراچی ہوگیا۔ بی اے کرنے کے بعد میں شادی کر کے کراچی آ گئی۔ ہم اسکول کے بعد کبھی نہ ملے بلکہ کوئی رابطہ ہی نہ رہا' اس زمانے میں موبائل و انٹرنیٹ جیسے ذرائع بھی نہ تھے مگر مجھے خوب یاد تھا کہ سیما بڑی گوری چٹی ہوا کرتی تھی اور اس کے گھر کے حالات بھی ایسے نہ تھے کہ وہ یوں دربدر پھرتی پھر ایسی کیا نوبت آئی کہ یہ صورتحال پیدا ہوئی؟ میں نے اسے دلاسہ دے کر پھر پانی پلایا اور ڈرائنگ روم میں لے آئی' ساتھ ہی ذہن میں مچلتے سوالوں کو لفظوں کی زبان دے دی۔

''سیما یہ سب کیا ہے...... کیسے ہوا یہ سب...... تم اس حالت میں کیونکر ہو؟''

''رابعہ! قسمت کا دھارا جانے کب کس کو کہاں لے جائے یہ کوئی نہیں جانتا۔ میں بھی جانتی تھی کہ کراچی ہمیں راس نہ آئے گا' یہاں آنے کے دو برس بعد ہی ابو کا انتقال ہوگیا تھا۔ ابو کے بعد تو جیسے بھائی کے پَر نکل آئے' ایک تو اس نے کراچی کی رونق دیکھ کر یہاں سے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ ابو کے روپے پیسوں پر قابض ہو کر سب دو دن میں اڑا دیا' امی اس کی عیاشیاں اور آوارہ حرکتیں دیکھ کر دل کا روگ لگا بیٹھیں اور تڑپتی سسکتی سال سے پہلے ہی ابو سے جا ملیں۔ اب تو بھائی بالکل آزاد ہوگیا اس نے میری پڑھائی چھڑوا کر مجھے جاب کرنے کو کہا' میں کیا کرتی نکل آئی۔''

''بہت بے غیرت ہے تمہارا بھائی' ایک ہی بہن ہو اسے ذرا احساس نہیں۔ تمہیں در در بھٹکنے چھوڑ دیا اور خود مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ اسے تو چاہیے تھا کہ باپ بن کر تمہارے سر پر ہاتھ رکھتا' تمہاری شادی بیاہ کا سوچتا نہ کہ تمہاری کمائی کھا رہا ہے۔'' میں نے تنفر سے کہا۔

''نہیں وہ تو بہت غیرت مند ہے' ہمارے محلے سے میرے لیے رشتہ آیا تو اس نے انہیں منع کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی خوب مارا کہ میں عشق لڑاتی پھر رہی ہوں۔ بے غیرت ہوں مگر آج جب میں تنہا گلیوں میں اس بات سے انجان کہ جانے کس دروازے کے پیچھے سے کوئی شیطان نکل آئے دروازے بجاتے پھرتی ہوں تو اسے نہ شرم آتی ہے نہ غیرت اور نہ ہی اس کی عزت رسوا ہوتی ہے۔'' سیما زہر خند لہجے میں کہہ کر پھر بلکنے لگی تو میں نے اسے گلے لگا لیا اور اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے سوچنے لگی کہ ''جانے ہم کب اس دہرے معیار رکھنے والے سسٹم اور معاشرے سے نجات حاصل کریں گے کیونکہ معاشرہ تو لوگوں سے ہی بنتا ہے نا......؟''



مقدر کا سکندر

سلیم اختر

جہالت عقل کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ
علم حاصل کرو ''چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔''
ایک شخص کا احوال' جو اپنا مقدر تلاش کرنے سمندر پار جاتا ہے
اور آخر میں شہر کا مقدر بن جاتا ہے۔

ایک کھاتے پیتے زمیندار نے اپنی ساری جائیداد اپنے دو بیٹوں کے درمیان برابر حصوں میں تقسیم کردی اور خود اللہ کو پیارا ہوگیا' بڑے بیٹے کے حصے کی زمین سونا اگلتی تھی اور چھوٹے بیٹے کے حصے کی ساری زمین سیلاب بہا کر لے گیا۔ ایک دن دوپہر کے وقت بڑا بھائی اپنی حویلی میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اس کی نظر کھڑکی سے باہر زمین کے ایک خطے پر پڑی' جہاں اس کا لاڈلا بھائی تیز دھوپ میں کدال سے زمین کھود رہا تھا' بڑے بھائی نے ایک نوکر بلا کر حکم دیا کہ وہ چاندی کے برتنوں میں کھانا لے جا کر اس کے بھائی کو دے آئے اور یہ بھی تاکید کی کہ برتن اس سے واپس نہ لائے۔

چھوٹا بھائی نے جانا کب سے بھوک کے مارے نڈھال ہو رہا تھا کہ اس نے جلدی سے کھانا کھالیا اور برتن ایک طرف رکھ کر دوبارہ کام میں مشغول ہوگیا۔ شام کو حسب معمول گھر جا کر سوگیا' آدھی رات کو آنکھ کھلی تو خیال آیا کہ وہ چاندی کے برتن زمینوں پر ہی چھوڑ آیا ہے' یہ خیال آتے ہی وہ اندھیری رات میں برتن لینے کے لیے چل پڑا' دور سے دیکھا کہ وہ برتن اندھیرے میں چمک رہے ہیں اور ان کے پاس کوئی بزرگ کھڑے ہیں' اس نے پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟''

جواب ملا ''میں مقدر ہوں' تمہارے بھائی کا مقدر...... اور ان برتنوں کی حفاظت کے لیے یہاں کھڑا ہوں۔''

چھوٹا بھائی حیران ہو کر بولا ''اگر آپ میرے بھائی کا مقدر ہیں تو میرے مقدر کے بارے میں کچھ فرمایئے۔''

مقدر نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''تمہارا مقدر تو سمندر کے اس پار سویا ہوا ہے۔''

چھوٹے بھائی نے مسرت سے کہا۔ ''اس تک میری رسائی کیسے ہوسکتی ہے؟''

مقدر نے کہا۔ ''تم ہمت کرو تو رسائی بہت آسان ہے۔''

یہ سن کر وہ بولا ''اچھا آپ ان چاندی کے برتنوں کی حفاظت کرتے رہیے' صبح کو بھائی کا نوکر خود ہی آ کر لے جائے گا' میں اپنے مقدر کی تلاش میں جاتا ہوں۔''

کئی روز دیوانوں کی طرح جنگل بیاباں طے کرتے ہوئے وہ برابر آگے ہی بڑھتا رہا' راستے میں اس نے ایک ببر شیر کو دیکھا جو سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا' شیر نے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

کہنے لگا ''میں اپنے مقدر کی تلاش میں جا رہا ہوں۔''

شیر بولا۔ ''اب جو تم مقدر کو جگانے جا رہے ہو تو مہربانی فرما کر یہ پوچھ لینا کہ میرے اس جان لیوا سر درد کا بھی آخر کوئی علاج ہے' جس کے مارے بے بس ہو کر میں موت کی گھڑیاں گن رہا ہوں۔'' نوجوان نے شیر سے وعدہ کیا کہ وہ مقدر سے ضرور اس کے سر درد کا

خادموں سے حسن سلوک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کا خادم گرمی اور دھواں برداشت کرتے ہوئے کھانا تیار کر کے لائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ خادم کو بھی اپنے ہمراہ بٹھا لے اور خادم کو بھی چاہیے کہ (وہ احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوتے ہوئے) کھانے میں شامل ہو جائے۔ ہاں اگر کھانا تھوڑا ہو تو (کم از کم) اس کے ہاتھ پر ایک دو لقمے ضرور رکھ دے۔''

(مسلم، مشکوٰۃ باب النفقات)

مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے گھر یا بازار میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں جماعت سے نماز پڑھنا پچیس گنا زائد ثواب رکھتا ہے' وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر مسجد کی طرف چلتا ہے اور نماز کے سوا گھر سے نکلنے کا مقصد کچھ اور نہیں ہوتا تو جو قدم بھی اٹھاتا ہے اس کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بڑھا دیا جاتا ہے اور ایک گناہ (صغیرہ) معاف کر دیا جاتا ہے پھر جب وہ نماز پڑھنا شروع کرتا ہے تو جب تک وہ نماز کی جگہ رہتا ہے' فرشتے اس پر ان الفاظ کے ساتھ رحمت بھیجتے ہیں کہ یا اللہ اس کی مغفرت فرما، یا اللہ اس پر رحم کر اور جتنی دیر وہ نماز کے انتظار میں بیٹھتا ہے اسے نماز ہی کا ثواب ملتا ہے' جب تک کہ وہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔''

(بخاری و مسلم)

علاج دریافت کرے گا یہ کہہ کر وہ پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

رات ہوئی تو وہ ایک چھتنار درخت کے نیچے لیٹنے کے ارادے سے ابھی درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی نظر تنے کے ایک ایسے حصے پر پڑی جو بالکل خشک تھا اب جو نظر اٹھا کر غور سے دیکھا تو آدھا درخت ہرا اور آدھا سوکھا ہوا تھا۔ درخت اپنی نامعلوم بیماری کا دکھڑا سناتے ہوئے بولا۔

''نوجوان تم جو اپنے مقدر کو جگانے جا رہے ہو تو میری طرف سے بھی پوچھ لینا کہ میرے نصیب کب جاگیں گے؟''

نوجوان نے درخت کی لاعلاج بیماری کا سبب دریافت کرنے کا وعدہ کیا اور صبح اٹھ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جنگل بیاباں طے کرنے کے بعد آگے حد نظر تک سمندر ہی سمندر نظر آ رہا تھا' جسے عبور کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی تو نوجوان ناامید ہو کر واپس لوٹنے والا تھا کہ سمندر سے ایک آواز آئی۔

''نوجوان ہمت سے کام لو'' دیکھا تو کوئی بھی قریب نہ تھا' نوجوان پلٹنے لگا تو پھر کنارے کے قریب سے آواز آئی۔ نوجوان نے اپنے پیروں تلے کسی چیز کو حرکت کرتے دیکھا اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بے خیالی میں سمندر کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے پاؤں ایک بڑی مچھلی پر ہیں' وہ دیو ہیکل مچھلی بڑی نقاہت بھری آواز میں بولی۔

''نوجوان میں ایک عجیب و غریب بیماری میں مبتلا ہوں' کھانا پینا تو درکنار مجھ پر سانس لینا بھی بھاری ہے۔ ذرا میرے مقدر سے پوچھ لینا کہ مجھے اس بیماری سے کیسے نجات ملے گی؟''

نوجوان بولا ''میں مقدر سے یہ بات تو پوچھ ہی لوں گا لیکن وہاں تک پہنچوں گا کیسے؟''

مچھلی نے کہا ''میں تمہیں اپنی پیٹھ پر اتار دوں گی۔''

نوجوان دوسرے کنارے پہنچا تو سوئے ہوئے مقدر کی

تلاش کا کام شروع کر دیا لیکن سویا ہوا مقدر بھلا اسے کہاں ملتا۔ کئی روز کی بے سود تلاش کے بعد نوجوان تھک کر سو گیا' خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ وہی معقول آدمی' وہی بزرگ جو اس روز کھیتوں میں چاندی کے برتنوں کی رکھوالی کر رہے تھے اس کی سرہانے ہنس رہے ہیں' نوجوان خواب میں انہیں دیکھتے ہی ان کے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا۔

''حضرت آپ مجھ سے کوئی امتحان لے رہے ہیں یا یہ خوفناک مذاق ہے؟ خدارا مجھے اصل حقیقت سے آگاہ کیجیے۔''

یہ سن کر وہ بزرگ مسکرا دیے اور کہنے لگے ''میں تمہارا امتحان لے رہا تھا اور تم امتحان میں کامیاب ہو گئے' اب تم جو بھی چاہو گے تمہیں مل جائے گا۔''

نوجوان نے کہا ''جناب میری خواہش ہے کہ میں اپنے بھائی سے بھی زیادہ دولت مند بن جاؤں۔''

مقدر نے کہا ''ٹھیک ہے کوئی اور خواہش؟''

کہنے لگا ''راستے میں ایک شیر نے مجھ سے یہ وعدہ لیا تھا کہ میں اس کے مسلسل سر درد کا علاج آپ سے معلوم کروں۔''

جواب ملا ''اس شیر کے سر درد کا صرف ایک ہی علاج ہے کسی بے وقوف اور جاہل آدمی کا مغز...... شیر سے کہہ دینا کہ کسی کم عقل آدمی کو ہلاک کر کے اس کا مغز کھالے سر کا درد ہمیشہ جاتا رہے گا۔''

''جناب ایک درخت نے اپنے سوکھے کی بیماری کا علاج دریافت کیا تھا؟'' نوجوان نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

جواب ملا ''اس درخت کی جڑوں میں سات خزانے دفن ہیں' وہ خزانے کوئی نکال لے تو وہ درخت پوری طرح سرسبز ہو جائے گا۔''

ایک آخری سوال ''مجھے سمندر پار اتارنے والی مچھلی

نے بھی پوچھا ہے کہ اس کے گلے کی تکلیف کیسے دور ہوگی؟"

"اس کے گلے کا سبب ایک قیمتی ہیرا ہے' جو اس کے گلے میں اٹک کر رہ گیا ہے' اگر وہ مچھلی کسی طرح قے کر کے اس قیمتی ہیرے کو اگل دے تو وہ صحت یاب ہو جائے گی۔"

یہ سن کر نوجوان کو اپنی تکلیف کا احساس ہوا اور پوچھنے لگا" مجھے اس سفر سے کب فراغت ملے گی؟"

مقدر نے ایک قہقہہ سا لگا کر کہا" اب میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہارے سارے کام سنوار دوں گا اب اٹھو اور واپسی کا بندوبست کرو۔" یہ سن کر نوجوان کی آنکھ کھلی اور اس نے سمندر کے کنارے پھر اس مچھلی کے کراہنے کی آواز سنی' نوجوان خوشی خوشی مچھلی کی طرف بڑھا اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر دوسرے کنارے پہنچا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے مچھلی کو گلے کی تکلیف کا سبب بتایا اور مچھلی نے قے کر کے وہ ہیرا اگل دیا جو اس کے لیے عذاب بن گیا تھا' مچھلی نے کہا۔

"نوجوان اس ہیرے کو سنبھال کر رکھنا....." لیکن نوجوان نے مچھلی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہارے ہیرے کی کیا پروا ہے' میرا مقدر میرے ساتھ ہے۔" یہ کہہ کر نوجوان آگے بڑھ گیا۔ وہ درخت کے پاس سے گزرا تو درخت پکارا۔

"حضور کچھ اس دکھی کا علاج بھی کرتے جایئے۔"

نوجوان نے کہا" تمہاری جڑوں کے نیچے سات خزانے دفن ہیں' انہیں کوئی نکال لے تو تم ہرے بھرے ہو جاؤ گے۔"

درخت نے کہا۔" اے خوش بخت تُو میرے کہنے کا کیا انتظار کر رہا ہے ہاتھ اٹھا کر یہ ساتوں خزانے تیرے ہیں۔"

نوجوان نے کہا" مجھے کسی خزانے کی کیا ضرورت ہے مقدر میرا غلام ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

اب ببر شیر کی باری تھی جو درد کے مارے زور زور سے دہاڑ رہا تھا نوجوان نے اس سے کہا۔

"اے ببر شیر! تُو جا کر کسی بے وقوف انسان کا مغز کھا لے تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

شیر نے نوجوان کو پیار سے بلا کر پوچھا" میاں دم تو لو' کچھ اپنے سفر کی سناؤ کچھ میری سنو۔" نوجوان نے کھڑے کھڑے مچھلی اور درخت کا واقعہ سنایا اور آگے جانے لگا' شیر نے کہا۔

"میری ایک درخواست ہے میں تم سے پھر اس کی تصدیق چاہتا ہوں کہ واقعی تم نے ہیرے اور خزانوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔"

نوجوان بولا" ہاں اب مقدر میرا غلام ہے مجھے کسی کی کیا پروا ہے۔"

شیر نے کہا" آؤ آخری بار مجھ سے گلے تو مل لو۔"

جب نوجوان شیر کی بانہوں میں اچھی طرح سما گیا تو اس نے پھر مقدر کے قہقہوں کی آوازیں سنیں' مقدر کہہ رہا تھا۔

"اے جنگل کے بادشاہ! تُو یقیناً مقدر کا سکندر ہے اور اس آدمی سے زیادہ بے وقوف اور جاہل کوئی اور کیا ہوگا' جس کا مغز کھا کر تُو عمر بھر کے درد سے نجات حاصل کر لے گا۔"



قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ ہنر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

جسپال اور بانیتا حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پیچھے دو، دائیں بائیں دو اور ایک سامنے پسٹل تانے کھڑا تھا۔ وہ بھاگنا تو کیا لڑنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔

"کون ہو تم اور اس طرح ہمیں کیوں......" جسپال نے پوچھا تو سامنے والے نے کھردری آواز میں تلخی سے جواب دیا۔

"بھونکتا کیوں ہے، بتایا نہیں سوال صرف ہم نے کرنا ہے، تم نے صرف جواب دینا ہے؟"

"پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟" جسپال نے یوں کہا جیسے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔

"وہ جمال کدھر ہے، جسے تو نے جزیرے سے اٹھایا تھا۔ اب یہ مت کہنا کہ تجھے پتہ نہیں۔" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"میں ہی جمال ہوں۔ بولو کیا کہنا ہے؟" جسپال نے اعتماد سے کہا۔

"جب تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ ہوگا تو تیرے بدن کی بوٹی بوٹی بولے گی کہ جمال کدھر ہے۔" وہ انتہائی نفرت سے بولا۔

"سندو کدھر ہے؟" جسپال نے جواب دینے کی بجائے پوچھا تو اس نے غصے میں کہا۔

"میرے پاس ہے، وہ بھی سب بکے گا۔ جس طرح تم بکو گے۔" یہ کہہ کر اس نے پسٹل تانتے ہوئے جسپال پر نگاہیں جمائے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"چلو، انہیں لے چلو۔" ایسے میں ان چاروں نے انہیں آکر پکڑ لیا اور پاس کھڑی ایک ہائی ایس کی جانب بڑھے۔ ابھی وہ دو قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک دو لوگوں کی چیخیں بلند ہوئیں اور انہوں نے بے ساختگی میں بانیتا اور جسپال کو چھوڑ دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جس کا فائدہ انہوں نے اٹھایا۔ گولی کسی نے بھی چلائی ہو، فی الوقت گرفت تو انہی کی کمزور ہوئی تھی۔ انہوں نے پہلے پسٹل والے ہاتھ کو قابو کیا، دوسرا زوردار پنچ ان کے چہرے پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گئے۔ دونوں نے بیک وقت اپنے گھٹنے کا استعمال کیا، وہ ایک دم سے چیخے اور ان کی گرفت مزید ڈھیلی پڑ گئی۔ دونوں نے حملہ آوروں کے پسٹل چھین لیے۔ تب تک ایک اور فائر ہوا، وہ پانچواں جس نے پسٹل تان کر باتیں کی تھیں، وہ کراہتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔ بانیتا اور جسپال دونوں ہائی ایس میں گھس گئے۔ تبھی جسپال نے باہر کا منظر دیکھا۔ پارکنگ میں چند لوگ موجود تھے۔ جو ملگجی روشنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"جسپال گھبرانا مت، ہم پہنچ چکے ہیں۔" نوتن کور کی سامنے سے آواز آئی تو وہ باہر نکل آئے۔ ان پانچوں کی فائر لگ چکا تھا۔ لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ کون زندہ ہے اور

کون زندہ نہیں رہا۔ جسپال اسی پانچویں بندے کے پاس گیا اور ٹھوکر مارتے ہوئے پوچھا۔

''اب جواب دو گے یا مرنا پسند کرو گے؟''

''میں مر رہا ہوں، مجھے بچاؤ۔'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''ایک شرط پر، ابھی اسپتال لے جاؤں گا، بولو تم لوگ کون ہو اور سندو کہاں ہے؟''

''ہمیں آفیشل آرڈر ملے ہیں کہ یہاں سے سندو نامی بندے کو اٹھانا ہے اور جو بھی اس کی معلومات کے لیے آئے، اسے بھی پکڑنا ہے۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''کس نے دیئے یہ آرڈر، آرمی، را، پولیس؟'' جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

''پولیس کا......'' اس نے مشکل سے بتایا

''سندو کہاں ہے؟'' جسپال نے پوچھا۔

''ہمارے ہی ایک سیف ہاؤس میں ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے بتایا

''رابطہ کرو اور بتاؤ کہ تم کس حالت میں ہو۔ اسے واپس لایا جائے، ورنہ تم پانچوں تو گئے۔'' جسپال نے کہا۔

''وہ ابھی تک میری ہی کسٹڈی میں ہے۔ میں مر گیا تو وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ مجھے اسپتال لے چلو۔'' اس کے کہنے پر جسپال نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور پھر ایک دم سے پسٹل نکال کر اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔

''ہمیں اس کی اتنی ضرورت نہیں، بھلے مار دو اُسے۔ لیکن اب ممبئی پولیس کے ساتھ ہماری جنگ شروع ہے۔ لو، مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے فائر کر دیا۔ اس نے دوسرا سانس بھی نہیں لیا اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ پھر اس نے باقی چاروں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ان چاروں کو دیکھو۔ جو زندہ ہو اس سے پوچھو، سندو کہاں ہے؟ جو جواب نہ دے اسے گولی مار دو۔ اور ان کے سیل فون نکال لو۔'' جسپال نے تیزی سے کہا۔

''ایک کو گولی نہیں لگی۔ باقی تینوں مر چکے ہیں۔'' بانیتا کی آواز گونجی تو قریب پڑا شخص نے جو زندہ بچا تھا تیزی سے بولا۔

''وہ اسی علاقے کے سیف ہاؤس میں ہے۔''

''کہاں ہے وہ سیف ہاؤس؟'' بانیتا نے پوچھا تو اس نے پتہ بتا دیا۔ وہ قریب ہی دیوکی نگر میں تھا۔

''تم لوگ اسے لے کر نکلو، ہم دیکھ لیتے ہیں۔ اگر اس نے غلط بیانی کی ہو تو اسے راستے میں مار کر پھینک دینا۔ جلدی، وقت کم ہے، فائرنگ کی آواز بہت دور تک گئی ہوگی۔'' نوتن کور نے کہا تو جسپال نے قریب پڑے بندے کو اٹھایا اور ہائی ایس میں پھینک دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ باقی مرے ہوئے لوگ لہولہان ہو رہے تھے۔ چند لمحوں ہی میں وہ وہاں سے چل دیئے۔ نوتن کور کے ساتھ آئے لوگ ان کی وین کے آگے پیچھے تھے۔ اگرچہ فائرنگ سے کافی سارے لوگ متوجہ ہو گئے تھے لیکن کوئی قریب نہیں آیا تھا۔ وہ کسی مزاحمت کے بغیر وہاں سے نکل گئے تھے۔ سڑک پر آتے ہی ان سب کے راستے جدا ہو گئے۔ ذرا سا فاصلہ طے پایا تھا کہ اس زندہ بندے کا سیل فون بول پڑا۔ وہ مضطرب ہو گیا تو بانیتا نے اسے کہا۔

''کرو بات۔''

''میرے آفیسر کا فون ہے۔'' اس نے اسکرین پر دیکھ کر کہا تو اس نے فون پکڑ کر اسپیکر آن کر دیا۔

''جی سر!''

''کہاں ہو تم لوگ، ادھر فائرنگ کی آواز......''

''سر باقی سب مر گئے ہیں۔ میں ہی بچا ہوں اور ان کی گرفت میں ہوں۔'' اس نے صورت حال بتا دی

''وہاٹ، یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' دوسری طرف سے انتہائی حیرت میں کہا گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر۔ اگر اس بندے کو آزاد نہ کیا گیا تو میں بھی مر جاؤں گا سر۔'' اس نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ سب کیسے ہو گیا۔'' آفیسر نے پوچھا تو بانیتا نے اس سے فون پکڑ کر کہا۔

"اوئے الو کے پٹھے، تجھے لوگوں کو جان سے مارنے کا حق ہے، تو کیا دوسروں کو جان بچانے کا بھی حق نہیں۔ سنو، اگر اگلے پانچ منٹ میں سندو آزاد نہیں ہوا تو ہم اس بندے کو تو مار ہی دیں گے اور پھر اگلا ٹارگٹ تم اور تیرے اگلے پیچھے ہوں گے۔"

"دیکھو، تم لوگ مجرم ہو، اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو، میں....." اس نے کہنا چاہا تو بانیتا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لگتا ہے تم فلمیں زیادہ دیکھتے ہو، فضول باتیں مت کرو، پانچ منٹ شروع ہوئے پانچ سیکنڈ ہو گئے ہیں۔"

"او کے میں اسے واپس کر دیتا ہوں۔ لیکن اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم میرے جوان کو نہیں مارو گے۔" آفیسر کی آواز آئی۔

"وقت کم ہے، ڈیل کرو، ورنہ ہمارا آدمی تو سمجھو مر ہی گیا ہے، لیکن پھر کیا ہوگا، یہ تم جانتے ہو۔" بانیتا نے غصے میں کہا۔

"یہ جو تمہارے پاس بندہ ہے، اسے معلوم ہے۔ یہ تم لوگوں کو لے آئے گا۔" آفیسر نے پھر کٹ کجتی کی تو بانیتا نے فون بند کر دیا۔ پھر وہ فون اپنے ہاتھ ہی میں رکھتے ہوئے بولی۔

"دیکھ جوان، سوچ کر جواب دینا، جو پہلے پتہ بتایا تھا، وہی درست ہے یا....." اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تو وہ سوچتے ہوئے ہی بولا۔

"سو فیصدی درست ہے، اب اگر وہ لوگ بندے کو آگے پیچھے کر دیں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"او کے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور رونیت کو آفیسر کا نمبر دے کر کہا کہ اس کی لوکیشن دیکھ کر بتاتی رہو۔ اگر یہ کہیں ادھر ادھر حرکت کرے تو فوراً بتانا۔

ان کی وین تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ جسپال کا دماغ اس سے بھی تیز بھاگ رہا تھا۔ اسے کہیں نہ کہیں گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دم سے ان کے گرد گھیرا تنگ ہو جانا بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس کا پہلا خیال گوپال سندھ کی طرف گیا، کہیں اس نے تو بے غیرتی نہیں کی۔ مگر وہ تو بات رات تک ختم ہو گئی تھی۔ اگر اس کی طرف سے ایسا کچھ ہوتا تو وہ رات ہی دھر لیے گئے ہوتے۔ جس طرح آفیسر نے اُسے وہاں بلایا تھا، وہ اکیلا تو نہیں ہوگا۔ وہ تو ان کے لیے پوری فیلڈنگ لگا ئیں گے۔ تو کیا سندو کو ان کی گرفت میں مر جانے دیں؟ یہ سوال ابھرا تو اسے ایک دم سے تکلیف ہوئی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، چاہے چند دن کا ساتھ تھا، وہ اسے چھڑانے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہ سوچتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا۔ جو بھی ہوگا اب دیکھا جائے گا۔ اس کے خیالات کی ترتیب ٹوٹی جب، بانیتا کا فون بج اٹھا۔ وہ چند لمحے بات کرتی رہی، پھر فون بند کرتے ہوئے بولی۔

"یہ جوان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہی لوکیشن ہے۔"

"چلو، پھر نوتن کو بتاؤ، ادھر ہی نکلیں۔" جسپال نے کہا۔ ہی تھا کہ زوردار سنگھ کا فون آ گیا۔

"جی انکل۔" بانیتا نے فون ریسیو کرتے ہی کہا۔

"کہاں پر ہو؟" اس نے پوچھا تو اس نے اپنی صورت حال بتا دی۔

"اس بندے کو قابو میں رکھو اور فوراً کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچو۔ ادھر گل مہر روڈ والے ٹھکانے پر مت جانا۔ وہاں اگر کوئی ساتھی ہے بھی تو اسے وہاں سے نکل جانے کا کہو۔ میں بعد میں فون کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

بانیتا نے جسپال کو بتائے بغیر پہلے رونیت کو فون کیا کہ وہ وہاں سے پوری احتیاط کے ساتھ فوراً نکل جائے اور وہیں پہنچے جہاں سے آئی تھی۔ وہ اس سے بعد میں رابطہ کرے گی۔ بعد میں اس نے جسپال کے کان میں بتایا۔ اس نے وین کی اسپیڈ بڑھا دی۔ یہ اس کی اضطراری کیفیت کا لاشعوری اظہار تھا۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ بانیتا نے نئی صورت حال کے بارے میں نوتن کور کو بھی آگاہ کر

دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ کچھ دیر بعد جسپال نے ایک مارکیٹ کی پارکنگ میں وین روک دی۔ اس وقت تک انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کس علاقے میں ہیں۔ بانیتا نے اس بندھے ہوئے زخمی جوان پر ترپال ڈال دی۔ اس کا سیل فون اٹھا کر وین سے نیچے اتر آئی۔ جسپال پہلے ہی نیچے اتر آیا تھا۔ نوتن کور اپنے ساتھیوں سمیت ان سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ نوتن اور بانیتا کے درمیان مسلسل رابطہ تھا۔ وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ایک اسٹور میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے جوس لیے اور بڑے آرام سے پیتے ہوئے باہر آ گئے۔ اس دوران میں انہیں آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ گیا۔ انہیں زوردار سنگھ کے فون کا شدت سے انتظار تھا۔ تبھی ان کا فون آ گیا۔

''اس وقت تم لوگ کہاں ہو؟''

''ہمیں زیادہ تو نہیں معلوم، پر اسٹور کا نام بتا دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بتا دیا۔

''اوہ، تم تو اس وقت بھیم نگر کے سولہ نمبر روڈ پر ہو۔ یہ مارکیٹ اسی روڈ پر ہے۔ یہ چار کوپ گاؤں کے آس پاس ہے۔ خیر، میں ایک نمبر دے رہا ہوں، اس کے ساتھ رابطے میں ہو جاؤ۔ ابھی کچھ دیر بعد تم لوگوں سے کچھ بندے ملیں گے۔ ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنا، یقین نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں ہو گی۔ بہت ساری باتیں تمہاری منتظر ہیں۔ میں بعد میں رابطہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر زوردار سنگھ نے پھر فون بند کر دیا۔ جیسے ہی اس نے جسپال کو بتایا تو اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تیرا انکل زوردار سنگھ جی، کہیں زیادہ اسمارٹ تو نہیں ہو گیا۔ اتنا سسپنس پھیلایا ہوا ہے۔'' اس نے آخری سپ لیا اور خالی ڈبا ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ اس سے پہلے بانیتا اس کی بات کا جواب دیتی اس کا فون بج اٹھا۔

اس کی ہیلو کے جواب میں کسی نے کہا۔

''ہم لوگ دس منٹ تک پہنچ پائیں گے، اپنا خیال رکھنا۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

انہیں دس منٹ گزارنے بہت بھاری ہو رہے تھے۔ اس دوران بانیتا فون ہی کرتی رہی کبھی نوتن کور اور کبھی زوردار سنگھ کو۔ تبھی ایک شاندار فور وہیل مارکیٹ کی اسی پارکنگ میں آ رکی۔ وہ دونوں ایک طرف کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا، کچھ گاڑیاں آگے پیچھے سڑک پر ہی رک گئی تھیں۔ ایسے میں بانیتا کا فون بجا۔ اس نے کال ریسیو کی تو کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

''ہم اسٹور کی پارکنگ میں ہیں، تم لوگ کہاں ہو۔''

''تم فور وہیل میں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ، تو یہ تم دونوں ہو۔ آ جاؤ۔'' فور وہیل کا سیاہ شیشہ نیچے ہوا تو ایک بھاری بدن والے بندے کا کلین شیو چہرہ دکھائی دیا جوان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ تبھی دروازہ کھلا تو وہ حیران رہ گئے۔ سامنے آنکھیں بند کیے سندو پڑا تھا۔

''کیا یہ......؟'' بانیتا سے کہا نہیں گیا۔

''نہیں، صرف بے ہوش ہے۔ تم لوگ بیٹھو، چلیں۔'' اس بھاری بدن والے نے کہا تو وہ فور وہیل میں بیٹھے ہی تھے کہ وہ چل پڑے۔ جسپال نے وین میں پڑے بندے کا سیل فون نکال کر پھینکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سب کیسے؟''

''تمہیں سکون ملتا ہے تو پوری تفصیل سے بتاؤں گا۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ممبئی میں ہی ہیں، جہاں ہم جا رہے ہیں، وہ کافی محفوظ جگہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''میری ایک دوست میرا انتظار کر......''

''نوتن کور نا، اسے بھی بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں وہ لڑکا، جو تھائی لینڈ سے آیا ہے، کیا نام ہے ہاں اروند سنگھ، وہ بھی پہنچ جائے گا۔ اب تم محفوظ ہو۔'' اس نے کہا تو جسپال نے بانیتا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ سڑک سے اتر کر آنند پارک کے علاقے میں داخل ہوگئے۔ پھر دریائے دھاوئی سر کے کنارے بنے ایک خوب صورت دومنزلہ فارم ہاؤس میں جا پہنچے۔ اگرچہ رات کے وقت اتنا دکھائی تو نہیں دے رہا تھا، لیکن پھر بھی یہ احساس تھا کہ سرسبز پہاڑیوں کے درمیان، پودوں اور بیلوں سے لدا ہوا وہ فارم ہاؤس کافی بڑا تھا۔ ممکن ہے وہ بہت حسین دکھائی دینے والا ہو، مگر رات کے اندھیرے اور گاڑیوں کی روشنی میں فقط اندازہ ہی کیا جا سکتا تھا۔ پورچ میں فوروہیل رکی تو سبھی نیچے اتر آئے۔ اندر سے چند ملازمین باہر آئے، انہوں نے بے ہوش سندو کو اٹھایا اور اندر لے گئے۔

"ابھی ڈاکٹر آجاتا ہے، یہ ہوش میں آجائے گا۔ تم سب لوگ فریش ہوجاؤ۔ ابھی ڈنر پر ملتے ہیں۔" بھاری بدن والے نے کہا اور اندر کی جانب چلا گیا۔ جسپال کو اگرچہ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ پھر بھی اس نے ملازم کے کہنے پر اس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے، جدھر وہ لے جانا چاہتا تھا۔

ڈنر پر ان دونوں کے علاوہ وہی بھاری بدن والا موجود تھا۔ اس نے میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر نیپکن درست کرتے ہوئے کہا۔

"سندو کو ہوش آگیا ہے۔ ڈنر کے بعد ہم اسے دیکھ پائیں گے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، وہ ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا، پھر جیسے اسے یاد آگیا۔ "اور ہاں نام تو میرا تیجا سنگھ ہے، لیکن لوگ مجھے ٹی ایس کے نام سے جانتے ہیں۔ تم لوگ بھی کہہ سکتے ہو، لو شروع کرو۔" آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ بانیتا کی طرف دیکھ کر پھر بولنے لگا۔

"بانیتا! دراصل یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی، جب وہ فلم تمہارے کسی ہمدرد نے لاکر تمہیں دی۔ دراصل وہ تمہارا ہمدرد نہیں، سب سے بڑا دشمن تھا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"آگے سنو گی تو تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، اور تم لوگوں کو کتنے بڑے طوفان سے بچا لایا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں کی جانب دیکھا

"کیسا طوفان؟" بانیتا نے پوچھا۔

"اصل میں انہیں وہ شخص چاہیے، جو سندو کے ساتھ جزیرے سے فرار ہوا تھا، اس نے ڈیوڈ ربینز کو مارا، اور ان کے زمین ہاؤس کو تباہ کر کے غائب ہوگیا۔ یہ ایک طرح سے ممبئی فورسز اور را کے لیے تو چیلنج بن گیا تھا، موساد کے لیے بھی ایسا ہی ہے۔ زمین ہاؤس سے تمہاری تصویر ملنے کے بعد انہوں نے اس کلیو کو ضائع نہیں ہونے دیا اور اسی کو استعمال کرنے کا سوچا، جیسے کے جسپال کے بارے میں بھی پتہ چلا۔ یہ کارڈ انہوں نے اس لیے کھیلا کہ گھبراہٹ میں یا ایک دوسرے کو بچانے کے لیے تم لوگ نکلو گے۔ وہی ہوا۔ تم لوگ نکلے اور بڑا کام یہ ہوا کہ تم لوگوں نے اوگی میں سی بی آئی والوں سمیت بندے مارے اور وہاں سے نکلے۔ ان لوگوں کو تمہارے جالندھر میں ہونے کے بارے میں یقین ہوگیا۔ وہ لوگ ادھر جالندھر میں ہی تم لوگوں کو گھیرنا چاہتے تھے کہ تم سب ایک بار پھر گم ہوگئے۔ یہ جو ہے بلی کا کھیل وہ خود کھیلنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اس کھیل کے سرے تک پہنچ سکیں۔"

"وہ سی بی آئی والے اسی مقصد کے لیے وہاں گئے تھے؟ مطلب مجھے پکڑنے؟" جسپال نے پوچھا۔

"جی، اسی مقصد کے لیے، مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے پکڑا کیوں نہیں؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟" ٹی ایس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل۔" جسپال نے کہا۔

"تم لوگ تو سامنے تھے ہی، اصل میں وہ جمال کو تلاش کررہے تھے جو پاکستانی تھا اور یہیں کہیں غائب ہوگیا تھا۔ وہ اس تک پہنچنا چاہتے تھے۔" ٹی ایس نے بتایا

''تو پھر یہ سندو......'' جسپال نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔
''بتا رہا ہوں نا، جالندھر میں تم لوگ غائب ہوئے تو یہ سندو انہیں امرتسر ائر پورٹ پر دکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ بھی ممبئی اس کے ساتھ آ گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ جمال یہیں ممبئی میں ہے۔ دو دن کسی نے رابطہ نہ کیا تو انہوں نے خود ایکشن کیا اور سندو کو پکڑ لیا۔ تا کہ کوئی تو باہر آئے گا۔ وہی ہوا، تم لوگ باہر آ گئے۔''
''اب میرا سوال یہ ہے کہ تم کون ہو اور یہ سب کچھ تمہیں کیسے پتہ ہے؟'' جسپال نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''جس دن نریمن ہاؤس میں تباہی مچی ہم اسی دن سے اس جمال کو تلاش کر رہے تھے۔ کیونکہ اس کا اور ہمارا مقصد ایک ہی ہے۔ یہ کیوں اور کیسے ہے، یہ بعد میں بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکا، پھر کہنے لگا۔
''تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم پوری قوت لگا کر یہ معاملہ دیکھ رہے تھے کہ زوردار سنگھ جی نے ہمیں بتایا کہ سندو کو نکالنا ہے۔ وہ ہم نکال لائے ہیں۔ زوردار جی کی شرط یہ تھی کہ ہم نے تم لوگوں کو بھرپور مدد دینی ہے اور زوردار سنگھ جی کا نام تک نہیں لینا، وہ اس سارے معاملے سے الگ ہیں۔ اب یہ دھیان میں رہے کہ ہم نے زوردار سنگھ جی کو درمیان میں نہیں لانا، انہیں بھول جانا ہے۔ سمجھیں وہ اس معاملے میں ہیں ہی نہیں۔ وہ ہمارے محسن ہیں اور ایک جھٹکے میں ہمارا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے سوال کا ابھی تم نے جواب نہیں دیا۔'' جسپال نے اسے یاد دلایا۔
''دِلّی میں بہت اوپر کی سطح پر تم لوگوں کا ذکر چل رہا ہے۔ جہاں فورسنسز تم لوگوں کو پکڑنا چاہ رہی ہیں، وہاں سیاست دان بھی دو طرف ہیں۔ ایک جو یہودیوں کو بھارت میں داخلے کی اجازت دے رہے ہیں، اور دوسرا وہ جو شدید مخالف ہیں۔ بھارت سرکار یہودیوں کے حق میں ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے سرمایہ ہی اتنا لا پھینکا ہے کہ یہ انکار کر ہی نہیں سکتے۔'' ٹی ایس نے تیزی سے کہا۔

''تم کہاں ہو؟'' جسپال نے پوچھا۔
''ظاہر ہے یہودیوں کے مخالف ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر یوں چونکا جیسے اسے یاد آ گیا ہو ''اور ہاں، رام تیواری بھی اسی لائن میں تھا، جنہوں نے تم لوگوں کے ذریعے جمال کو پکڑنا تھا۔ لیکن مجھے یہ شک ہے کہ وہ تم لوگوں کو بھی ڈبل کراس کریں گے، کیونکہ وہ سیاست دانوں کے اسی گروپ سے ہے جو یہودیوں کے مخالف ہیں۔''
''یہ شک تمہیں کیسے ہوا؟'' بانیتا نے تیزی سے پوچھا۔
''کیا انہوں نے کسی پولیس آفیسر کو مارنے کی بات کی تھی، اس بارے کوئی بات ہوئی اس کے کسی کارندے سے؟'' اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا
''یہ تو ہوا۔'' یہ کہہ کر جسپال نے اس رات والی ساری روداد سنا دی تو اس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے جوش سے کہا۔
''تو بس، بات صاف ہو گئی۔ وہ پہلے ہی دو پولیس آفیسر اسی طرح پار کروا چکا ہے۔ ہر وہ آفیسر، جو اس کی فائل لیتا ہے۔ اس کے دن گنے جاتے ہیں۔ اس بار اس کی کرپشن کی فائل جگجیت بھر بھرے کے پاس ہے۔''
''وہ کیسا آفیسر ہے؟'' بانیتا نے پوچھا۔
''وہ دیانت دار، بہادر اور وطن پرست ہے۔ کرپٹ نہیں ہے۔ اسی لیے فائل اسے دی گئی ہے۔'' ٹی ایس نے سوچتے ہوئے کہا۔
''اس کا مطلب ہے کہ ہم بہت بڑی سازش سے بچ گئے۔'' بانیتا نے زیرلب کہا۔
''وہ تم سب کو اکٹھے پکڑنا چاہتے تھے اور یہودی نواز لابی پوری طرح سرگرم ہے۔ انہیں خاص طور پر جمال مطلوب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ انہیں پھر نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' ٹی ایس نے وضاحت کی۔
''تم کیا چاہتے ہو؟'' جسپال نے پوچھا۔
''صاف بات ہے، یہودی لابی کی تباہی اور اپنا مفاد۔ خیر ابھی یہاں رہو۔ حالات کو دیکھتے ہیں پھر کوئی

پلان کرتے ہیں، یہ پھیلاؤ صرف بھارت ہی میں نہیں پاکستان تک پھیلا ہوا ہے۔'' ٹی ایس نے کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کھانے کے بعد وہ سندو کے پاس چلے گئے۔ اس پر کافی تشدد ہو چکا تھا۔ اس نے یہی بتایا کہ اس نے تشدد تو سہہ لیا مگر بات کوئی نہیں بتائی۔ انہوں نے اسے آرام کرنے دیا اور دونوں اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ انہیں نوتن اور اروند سنگھ کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ یہاں آنند پارک کے علاقے میں آنے کے لیے چل پڑے تھے۔



میں لاہور میں گھر کی چھت پر کھڑا مشرق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اُفقی لکیر پر ابھی اندھیرا تھا۔ اُفق پر پھیلی ہوئی سرخی اندھیرے پر چھا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے گھر سے دور اُفق تک گھر ہی گھر پھیلے ہوئے ہیں۔ ساری رات گذر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے گیت نے بتایا تھا کہ علی نواز، سلمان اور زویا نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ جنید اور اکبر لاہور کے لیے پرواز کر چکے تھے۔ میں پرسکون ہو کر چھت پر آ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوئی ہوا میں خوشگواریت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری سوچوں میں اضطراب تھا۔ مجھے لگا کوئی مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے غور کیا تو کوئی کہہ رہا تھا۔

''خود سے مقام خودی تک رسائی دینے والی قوت صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے عشق۔ جب حضرت عشق طلوع ہوتا ہے تو وہ انسان کے سر سے پیر تک اپنی سلطانی قائم کر لیتا ہے۔ عشق میں بے ساختگی ہے۔ عشق کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور نہ اسے بنایا جا سکتا ہے۔ یہ خود قدم اٹھاتا ہے۔ اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا کہ حالات کیا ہیں۔ کوئی اس کے ساتھ چلتا ہے یا نہیں۔ عاشق کا کام تو اپنی ذات کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ ایک سفر پر جانا ہے۔ کتنے ابوجہل ہیں یا کتنے ابولہب، راستے کی دشواریاں کیا ہیں اور مصیبتیں کس حد ہیں۔ یہ اس کی نگاہ میں نہیں ہوتیں اور نہ ہی اس کے عشق کے والہانہ پن میں کمی کا باعث بن سکتی ہیں۔ حالات عشق پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ عشق کی تکمیل کسی وجہ کی محتاج نہیں ہے۔''

''مجھے اپنی ذات میں عشق کی تکمیل کیسے کرنا ہوگی؟''

''عشق کی تکمیل نہیں ہوتی، یہ تو نہ اپنی حد رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی کنارا ہے، بلکہ ذات کو اپنی طرح لامحدود ہونے کے ظہور کی وجہ بنتا ہے۔ اصل میں عشق کرتا کیا ہے؟ زندگی کو بنانے کے لیے عدم کو جلاتا ہے، زندگی کو جلانے سے وجود کو بناتا ہے اور اس سے ایک نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے جو عشق کے اپنے مطابق ہوتی ہے، بلکہ عین عشق ہوتی ہے۔ کیونکہ عشق اپنی نئی تخلیق کرتا ہے جو کہ سر بکف، جانباز اور مجاہد بناتا ہے۔

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریب تمام
ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

عشق کا مظہر خود انسان ہے، اس میں سے عشق کا ظہور ہوتا ہے انسان میں سے ہی عشق کو دیکھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عشق میں بے ساختگی ہے لیکن زندگی کی پہلی ساخت کو توڑ کر اپنی ساخت پر لے آتا ہے۔ یہی خودی کی طرف پہلا قدم ہے۔ کیونکہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے مردِ مومن عیاں ہوتا ہے۔''

''اس کا ظہور کیسے ہے؟''

''انسانی ذات ہی میں تو ہوتا ہے۔ یہ عشق اس کے اندر ہی تو پڑا ہوا ہے۔ یہ انسان کا ارادہ ہی تو ہے کہ وہ مسلکِ عشق اختیار کرے، گویا کہا جا سکتا ہے کہ انسان ہی عشق کو اپناتا ہے۔ تب ذات کا ظہور، باطل کے مقابلے میں حق کو نمایاں کرنے سے ہوتا ہے۔ یہ ظہور ظاہری اور باطنی ہے۔ باطل جس، غرور و تکبر اور قوت سے سامنے آتا ہے، حق بھی اسی سرکشی و بے باکی تندی شوخی اور قوت کے ساتھ آئے گا۔ حق کے ہاتھ میں آ جانے والے وسائل اور قوت نعمت بن جاتے ہیں، جبکہ باطل نری موت ہے۔''

''باطل کیا ہے؟''

''ہر وہ شے جو انسان کو اس کی انسانیت سے غافل کر دے، وہ باطل ہے۔ شیطان کا پہلا کام ہی یہی ہے کہ وہ انسان کو غافل بناتا ہے، اور انسان کا اصلی چہرہ اس کے سامنے واضح نہیں ہونے دیتا۔ انسان تو اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور انسان جب اپنے آپ کو پہچانتا ہے تو اسے اپنی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو اسے مقام خودی تک پہنچاتا ہے، جہاں خودی ہر شے کو مغلوب کر دیتی ہے۔ انسان اپنے وجود میں پڑے ہوئے عدم کو نکال باہر پھینکتا ہے۔ انسان کا سیدھا ہونا ہی حق ہے۔ حق کا بڑھنا یا باطل کا مٹانا، ایک ہی بات ہے۔ انسان اپنے آپ کو پہچانے۔ باطل نے سارے مسائل پیدا ہی اسی لیے کیے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو پہچان نہ پائے۔ باطل ہے ہی اس لیے کہ تم اس پر غلبہ پاؤ۔ خوف باطل کیا ہے کہ غارت گر باطل بھی تو۔''

''اسے قوت کہاں سے ملتی ہے؟''

''اس کے اپنے اندر سے اور عشق اسے ہر طرح کی قوت دیتا ہے۔ یہ انسان پر ہے، جہاں وہ اپنی ذات کی نفی کرے گا، وہاں وہ کمزور ہوگا اور جہاں وہ اپنی ذات کا اثبات کرے گا، وہیں قوت ہوگی۔ ہر وہ شے جو ذہنی غلامی پیدا کر کے حوصلہ پست کرے، وہی اصل میں باطل اور شیطانیت کا معیار ہے۔ شیطان نظریاتی کمزوری کی تاک میں ہوتا ہے۔ اور یہیں سے انسان کے اندر بُت بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایمان کی کمزوری، تفرقہ بازی، تعصب، منافقت، عیش کوشی جاگیرداری اور سرمایہ داری کی تمام تر خباثتیں یہیں سے پیدا ہوتی ہیں۔ درویش میں ہو تو وہ عیار ہے اور بادشاہ میں ہو تو وہ بھی عیار ہوتا ہے۔ یہی وہ پہچان ہے جہاں بندہ مومن حق و باطل کی لکیر کھینچ کر عشق کی طاقت کے ساتھ آواز حق بلند کرتا ہے۔''

''میں خود سے خودی تک کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میرے اندر عشق کی گہرائی کیا ہے میں کیا ہوں، میری قوت کیا ہے۔''

''عشق اپنے راستے اور وسائل خود بناتا ہے۔ اصل میں جب تک دل زندہ نہیں ہوتا، اس وقت تک خود زندہ نہیں ہوتا، سفر پر جانا چاہتے ہو تو یہ تمہارے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ یہی بقا کا راستہ ہے۔ فنا خود اختراعی ہے، نابصیری ہے اور خود پیدا کردہ ہے۔ تخریب کو ختم کرنا ہی دراصل تعمیر ہے۔ شیطان کو پکڑ، اس پر غلبہ لے، انسان کا چہرہ خود بخود نکھر جائے گا۔ شیطان کے قبضے میں گئے وسائل کو چھین کر انسانیت کو لوٹانا ہے۔ اصل پیغام بنی نوع انسان کے لیے ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو، دنیا کا ہر انسان اپنے مثبت پہلو کی طرف دیکھے۔ یہی تیرا سفر ہے۔''

''میں تو سفر شروع کر چکا ہوں۔''

''تو پھر اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کی حسرت نہ کرو بلکہ اپنے خواب کی تعبیر میں لگ جاؤ۔''

''خواب کی تعبیر......؟''

''خواب دیکھنا ہی خواب کی تعبیر کی طرف بڑھنا ہے، تعبیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے خوابوں سے پیار کرو، انہیں محبت دو، انہیں اہمیت دو۔''

شاید میرے اندر مزید باتیں چلتیں، تاہم میری توجہ اس بجتے ہوئے فون کی طرف ہوگئی، جس کا کہیں بھی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ بھارت سے کال تھی۔ میں نے وہ رسیو کی تو دوسری طرف جسپال تھا۔ اس نے رات ہونے والے واقعات کے بارے میں بتایا تو میں نے کہا۔

''ربّ کا شکر کرو کہ تم لوگ ایک بہت بڑی سازش سے بچ گئے، لیکن اب بھی بہت احتیاط سے، کب، کون اور کہاں بدل جائے، اس بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔''

''ہاں' یہ تو ہے۔ لیکن مجھے بانیتا کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا چاہتی ہے؟'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، اس کے لیے اب سب سے بڑا مسئلہ اپنی بقا

ہے۔ ایک طرح سے تم لوگ سامنے آچکے ہو اور پھر خاص طور پر جب معاملہ یہودیوں کا ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ بھارت کا وہ طبقہ جو سارے وسائل پر قابض ہے وہ اُس گدھے کو بھی باپ مانتے ہیں جس کے پاس سرمایہ ہو اور یہ بے دریغ سرمایہ بھارت میں پھینک رہے ہیں۔"

"ارے ہاں، ٹی ایس نے مجھے یہ بتایا کہ پاکستان میں براہ راست تو نہیں مگر چند سیاست دانوں کے ذریعے یہودیوں کے ایجنڈے کے لیے راہ ہموار کی جا رہی ہے اور اس پر باقاعدہ کام ہو رہا ہے۔"

"کون ہیں وہ؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا کیونکہ اسی لمحے میرے بدن میں سنسنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔

"بظاہر تو کوئی بندہ بھی سامنے نہیں ہوگا، لیکن اس نے صرف اتنا اشارہ دیا ہے کہ این جی اوز ہیں، جو کام کر رہی ہیں۔ یہ اس وقت پاکستان میں اپنی جگہ بنا پائی ہیں، جب زلزلہ آیا تھا۔" اس نے بتایا

"اس سے کہو کہ وہ مزید بتائے، اندر تک سراغ لگائے۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"میری پوری کوشش ہوگی کہ میں ان کا سراغ لگا لوں۔ لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ سکون سے بیٹھ جائیں یا کچھ......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سکون سے کیوں بیٹھو۔ انہیں اس حد تک مجبور کر دو کہ وہ صرف تمہاری بات مانیں۔ مجھے فقط وقت دو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ تم میری اس نوجوان اروند سنگھ سے بات کروانا، پھر کوئی کام کی بات سوچتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی کچھ دیر میں کراتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ہو سکے تو آن لائن ہی بات ہو، تاکہ باقی بھی سن لیں گے اور ان سے بھی تعارف ہو جائے۔" میں نے کہا اور پھر ہمارے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا۔

سورج روشن ہو چکا تھا۔ میں چھت سے نیچے آیا تو جنید اور اکبر کنٹرول روم میں مہوش اور فہیم کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ملنے ملانے کے بعد باتیں ہونے لگیں۔ دوسری طرف سلمان، زویا اور گیت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب باتیں سن رہے تھے۔ تب میں نے جسپال سے ہونے والی باتیں بتا کر اسی تناظر میں کہا۔

"ہماری پہلی ترجیح ایسے لوگوں کو تلاش کرنا ہے۔"

"ہم ابھی سے کام شروع کر دیتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ دنیا بھر میں سے جو زیادہ انسانی حقوق کی پامالی کر رہے ہیں، انہوں نے ہی انسانی حقوق کی تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں۔ اسی کی آڑ میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔" گیت نے اپنی رائے دی تو فہیم تیزی سے بولا۔

"بالکل، میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ جس طرح کسی بھی ملک کی خبر رساں ایجنسی کہنے کو تو غیر جانبدار ہوتی ہے لیکن اس میں اپنے ملک وقوم کی جانبداری پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ مثلاً بی بی سی، کیا ان کے ملک میں کوئی جرم نہیں ہوتا، کوئی کرپشن نہیں، کوئی قتل نہیں لیکن دنیا بھر سے وہ اپنی پالیسی جو کہ مسلمان مخالف پالیسی ہے، اس پر عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی انتہائی جانبدار ہیں۔ انہیں وہی کچھ دکھائی دیتا ہے، جنہیں وہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ امریکہ کا نائن الیون ہوا، تو دنیا بھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ لیکن مسلمانوں پر ہونے والا ظلم کہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

"تو بس پہلے انہیں دیکھو اور میرے خیال میں آج شام تک اس کا نتیجہ سامنے آجانا چاہئے۔" میں نے کہا تو سبھی اس پر مختلف باتیں کر کے اپنی اپنی رائے دینے لگے۔ اسی دوران جسپال آن لائن ہو گیا۔ اس کے ساتھ اروند سنگھ تھا۔ وہ پتلا سا نوجوان تھا، بہت گہری آنکھیں، گلابی ہونٹ، چوڑی پیشانی سفید رنگ اور سیاہ پگڑی باندھے، ہونٹوں پر مسکان سجائے صاف انگریزی میں بولا۔

"سب کو میری طرف سے ست سری اکال، آداب اور میری طرف سے سلامتی کی بہت زیادہ دعائیں۔"

''اروند سنگھ، تمہیں دیکھ کر اچھا لگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ان دوستوں سے بات کرو۔ ہمارے درمیان جو رابطہ ہے، وہ زیادہ سے زیادہ بہتر ہو۔'' میں نے کہا۔

''میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے یہاں آتے ہی رونیت کور کی صورت میں ایک بہترین کام کرنے والی ساتھی مل گئی ہے۔ یہ اس کی قابلیت ہے کہ اس نے جو بھی سیکھا، اپنی مدد آپ کے تحت۔ ہم دونوں مل کر آپ دوستوں سے رابطے کی پوری کوشش کریں گے۔'' اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا اور سب میں باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ ساری ٹیکنیکل باتیں تھیں۔ اس کے نتیجے میں دونوں میں بہت ساری معلومات کا اضافہ ہو گیا۔ اس نے سلمان کو مزید معلومات دیں۔ کچھ چیزیں لینے اور کچھ دینے کو کہا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میں اب ممبئی میں بہت حد تک رسائی کر جاؤں گا۔ چاہے بھارت کمپیوٹر میں جتنا آگے ہے، بلیک مارکیٹ اس سے بھی تیز ہے۔ یہ تو کسی شے کو استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کتنا بڑا فنکار ہے۔ ایک چھوٹے سے چاقو سے پھل کاٹا جاتا ہے اور کسی کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔



آنند پارک کے علاقے میں دریائے دھائی سر کے کنارے بنے ہوئے فارم ہاؤس کے عقبی گیٹ سے نکل کر جسپال اور بانیتا پیدل چلتے ہوئے دریا کنارے تک چلے گئے تھے۔ وہ وہیں کنارے پر اُگے سبزے پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان کافی بحث ہو چکی تھی اور اس وقت ان میں خاموشی تھی۔ شاید وہ اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ تبھی بانیتا نے دریا کی لہروں کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''کیا کہتے ہو؟''

''وہی جو تم نے سوچا۔'' جسپال نے دھیمے سے جواب دیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا کنکر دریا میں پھینک دیا۔

''تو پھر اٹھو، اس سالے گوپال نند تک پہنچنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔'' بانیتا کور نے ایک دم جوش سے اٹھتے ہوئے کہا تو جسپال سنگھ نے جیب سے فون نکالا، اس پر نمبر پش کیے اور اٹھ کر چل دیا۔ وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ جسپال کا ملایا ہوا نمبر مل گیا تو اس نے کہا۔

''ٹی ایس ہمیں جانا ہے گوپال نند سے ملنے کے لیے۔''

''یہ تمہارا فیصلہ ہے۔'' ٹی ایس نے پوچھا۔

''آج نہیں تو کل ان سے سامنا تو ہونا ہی ہے۔ کیوں نہ آج ہی سہی۔'' جسپال نے کہا۔

''اوکے ہو گیا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سامنے ہی فارم ہاؤس کا عقبی گیٹ تھا۔ وہ اس تک پہنچے ہی نہیں تھے کہ گیٹ کھلا اور ایک سیاہ فور وہیل باہر آ گئی۔ اس میں ٹی ایس بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اور نوجوان تھا۔ وہ گیٹ کھول کر بیٹھے اور چل دیئے۔ ان کا رخ براویلی کے علاقے کی طرف تھا۔ راستے میں مختلف جگہوں سے کئی لوگ ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں تھے۔ جسپال اور بانیتا کو بھی ایک کار مل گئی۔ وہ اسی کارواں کے ساتھ رہے لیکن ان سے الگ آگے بڑھتے گئے۔

وہ ایک مصروف بازار تھا، جس کے ایک ریستوران میں وہ دونوں جا بیٹھے تھے۔ ٹی ایس اور اس کے ساتھی ارد گرد پھیل گئے تھے۔ وہ انہیں دکھائی تک نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے گوپال نند کو وہیں بلایا تھا۔ اس نے وہیں آنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں تھے۔ تبھی داخلی دروازے سے گوپال نند آتا ہوا دکھائی دیا تو جسپال نے مخصوص اشارہ دے دیا۔ وہ آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور اپنی مخصوص دھیمی مسکراہٹ سے بولا۔

''اتنی ایمرجنسی کیا آن پڑی کہ یوں بلوا لیا۔''

''دیکھو گوپال! ہمارے پاس وقت نہیں ہے فضول قسم کی بھاگ دوڑ کے لیے۔ جتنا ہو گیا سو ہو گیا۔ اب بولو اس پولیس آفیسر کا کام تمام کرنا ہے یا

نہیں، جس کا ایڈوانس تم لوگ ہمیں دے چکے ہو؟''
جسپال نے پوچھا۔
''کیسی باتیں کررہے ہو۔ ارے کام تو کرنا ہے، تبھی ایڈوانس دیا لیکن تم اتنی جلدی کاہے کو کررہے ہو؟ ارے وہ پولیس آفیسر ہے۔ کوئی ٹپوری نہیں جو تم یوں بات کررہے ہو۔'' گوپال نے کافی حد تک الجھتے ہوئے پوچھا۔
''تمہاری کل والی فضول سی گیم نے ہمارا بہت سا وقت ضائع کردیا۔ اگر کام ہے تو ٹھیک، ورنہ ہمیں آج ہی ملائشیا کے لیے نکلنا ہے، اپنا ایڈوانس واپس لو۔'' بانیتا کور نے کہا تو اس پر گوپال نند نے اسے غور سے دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
''اب یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ تم لوگ بھارت سے کہیں بھی نہیں جاسکتے۔ کسی بھی ائیرپورٹ پر تم لوگ دھر لیے جاؤ گے۔ میرا تو خیال ہے ممبئی سے بھی......''
اس نے کہنا چاہا مگر جسپال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا
''یہ ہمارا مسئلہ ہے، تم اپنی کہو، کام ہے یا نہیں؟''
''ہے۔'' اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔
''تو پھر ڈن تم نے کرنا ہے یا تیواری نے؟'' بانیتا نے روکھے لہجے میں پوچھا۔
''میں ان سے بات کرلوں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولا۔
''اس کا مطلب، تم کچھ نہیں کرسکتے۔ اٹھو اور بھاگ جاؤ۔ دوبارہ ہم سے رابطہ نہیں کرنا اور اگر ہماری ضرورت محسوس ہو تو تیواری سے کہنا کہ رابطہ کرے، چلو بھاگو۔'' بانیتا کور نے اس قدر درشتی سے کہا کہ گوپال نند کا منہ چند لمحے کھلا رہ گیا، پھر اسے ہوش آیا تو اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ بانیتا بولی۔
''ایک لفظ بھی کہا تو یہیں تیرا حلیہ بگاڑ دوں گی سالے، چل بھاگ۔''
اس نے دونوں کی طرف دیکھا، دھیرے سے اٹھا اور تیزی سے باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ بھی بل دے کر باہر کی جانب نکل پڑے۔ وہ باہر کھڑی کار کے پاس آئے۔ انہیں کچھ فاصلے پر ٹی ایس دکھائی دیا۔ وہ کار میں بیٹھ گئے تو ٹی ایس کا فون آگیا۔
''سالا پوری فوج کے ساتھ آیا تھا، کم از کم بارہ لوگ تھے اس کے ساتھ۔'' اس نے بتایا
''ان میں سے اب بھی کوئی ہے؟'' جسپال نے پوچھا۔
''تیری بائیں طرف سیاہ ہنڈا اکارڈ میں چار لوگ اب بھی ہیں، لگتا ہے تعاقب کریں گے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔
''چل پھر ان کا تو کام کریں۔'' جسپال نے کہا اور کار بڑھا دی۔ وہ ہنڈا بھی حرکت میں آگئی اور ان کے پیچھے چلنے لگی۔ جسپال کے آگے ٹی ایس کی فوروہیل تھی۔ وہ مہا دیو بھائی ڈیسائی روڈ کی طرف بڑھے اور پھر مین روڈ پر آگئے۔ کافی آگے جاکر کلو پوادی روڈ سے بھی آگے نکل کر نیشنل پارک کے پاس دائیں جانب کھلے میدان میں اتر گئے۔ وہ کار مسلسل ان کے پیچھے تھی۔ جیسے ہی جسپال نے میدان میں کار روکی تو وہ ہنڈا بھی رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری کاروں نے بھی انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ہیڈلائیٹس کی تیز روشنی میں وہ کار صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جسپال نے اپنا پسٹل نکالا اور کار سے باہر نکل کر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے والے دونوں ٹائر برسٹ کردیے۔ اسی کے چند لمحے بعد کسی نے دوسری طرف سے فائر کیے تو کار کے پچھلے ٹائر بھی پھٹ گئے۔ جسپال نے اندر بیٹھے لوگوں کا چند لمحے انتظار کیا۔ ان میں سے کوئی باہر نہیں نکلا تو وہ سامنے آگیا۔ اس نے اشارے سے انہیں باہر نکلنے کو کہا۔ وہ نہیں نکلے تو جسپال نے جیب میں سے دستی بم نکالا۔ اسی لمحے باقی کاریں پیچھے کی طرف بڑھ گئیں۔ اس نے بم کی پن نکال کر اس کار کی طرف پھینک دیا۔ اسی لمحے کار کے چاروں دروازے کھلے اور وہ تیزی سے باہر نکل کر پوری قوت سے بھاگے۔ مگر تب تک جسپال اپنی کار میں بیٹھ چکا تھا۔ بانیتا نے کار کو گیئر لگا لیا تھا۔ انہیں عقب میں

دھما کا سنائی دیا۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ سب اسی طرح واپس مین روڈ کی طرف چل پڑے۔ تبھی جسپال کے سیل پر گوپال کا فون آگیا

''تیری تیواری کے ساتھ ملاقات فکس کر دی ہے۔ آج رات ہی کو.....''

''بہت دیر کر دی بھڑ دے تم نے۔ ہم پر نگاہ رکھنے والے تیرے بھیجے ہوئے اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' جسپال نے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تو کسی کو نہیں بھیجا۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''پھر وہ کسی دوسرے کے لوگ ہوں گے۔ چل کس وقت کرا رہا ہے تیواری سے ملاقات۔'' اس نے پوچھا۔

''بس دو چار گھنٹوں میں، تو فوراً آجا۔'' اس کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''گوپال، اب جگہ میری ہوگی، آنا ہے تو ٹھیک ورنہ تو اپنا آپ سنبھال، میں دیکھتا ہوں تیرے تیواری کو۔'' یہ کہہ اس نے فون بند کر دیا۔

دس منٹ نہیں گذرے ہوں گے، اس کا سیل بج اٹھا۔ جسپال نے فون رسیو کیا تو دوسری طرف کسی نے بڑی ملائمیت سے کہا۔

''ارے جسپال۔ ہم ہیں رام تیواری لعل، بھئی کدھر ہو تم، آؤ، بیٹھ کے کام کی بات کرتے ہیں۔''

''بات تو ہو گئی ہے، ہاں اگر مزید بات ہی کرنی ہے تو جہاں ہم چاہیں گے وہاں آنا ہوگا۔'' جسپال نے کہا۔

''دیکھو ہم چاہیں تو ابھی تمہیں کان سے پکڑ کر اپنے سامنے لے آئیں۔ مگر ہم ایسا کریں گے کیوں۔ تم خود آؤ گے یا ہم لائیں تمہیں۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو پھر اسی بات پر لگ گئی تیواری، اگر آج رات یا اگلے چوبیس گھنٹوں میں تم مجھے اپنے سامنے لے آؤ تو جو تم کہو گے میں کروں گا۔ اگر نہ لا سکے تو جہاں میں کہوں وہیں آجانا۔'' جسپال نے اس سے بھی زیادہ طنزیہ لہجے میں کہا۔

''دیکھو۔ ہمیں مجبور مت کرو کہ تمہارے بارے میں کچھ غلط سوچیں۔'' اس نے غصے میں کہا۔

''سوچ کے دیکھ لو۔'' اب کہ جسپال کا انداز چڑانے والا تھا۔ اس نے مزید بات نہیں کی اور فون بند کر دیا۔ اس پر جسپال مسکرا دیا۔

بانیتا کور، جسپال اور ٹی ایس تینوں فور وہیل میں تھے۔ باقی سب ان کے تعاقب میں بڑھے چلے آرہے تھے۔ نوجوان جیپ تیزی سے بھگائے چلا جارہا تھا۔ ٹی ایس نے ساری بات سن کر کسی کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ آرہے ہیں۔ ایک خاص مقام پر آکر وہ سب رک گئے۔ صرف فور وہیل آگے بڑھتی گئی۔

وہ پرسکون، سرسبز و شاداب اور صاف ستھری سرکاری کالونی تھی۔ الیکٹرک پول کی روشنی سے ماحول خاصا خواب ناک سا ہو رہا تھا۔ وہاں اتنے بڑے گھر نہیں تھے لیکن سبھی روشن تھے۔ فور وہیل دھیمی رفتار سے آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ ایک پارک کی باؤنڈری کے پاس آگئے تو ٹی ایس نے رُکنے کو کہا۔ نوجوان نے فور وہیل روک دی۔

''ٹی ایس، تمہیں یقین ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا؟'' بانیتا کور نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بانیتا! مجھ پر یقین رکھو۔'' اس نے بانیتا کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا اور گیٹ کھول کر نیچے اتر گیا۔ فرنٹ سے وہ بھی باہر نکل گئی تو جسپال بھی جیپ چھوڑ کر نیچے آگیا۔ وہ ذرا سا ہی پیدل چلے تھے کہ ایک سادہ لباس میں پولیس مین تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ بات کرتا، ٹی ایس بولا۔

''صاحب کو بتاؤ، ٹی ایس آیا ہے۔''

''صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور چل دیا۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے پارک میں جا پہنچے۔ ایک مخصوص جگہ پر وہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ تبھی ایک طرف سے دراز قد جوان آگیا۔ اس نے ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کا

ایک ہاتھ جیب میں تھا۔ بال سنورے ہوئے، کلین شیو اور گورے رنگ کا تھا۔

''ویلکم۔'' اس نے بھاری آواز میں کہتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''یہ جسپال اور بانیتا ہیں۔'' ٹی ایس نے تعارف کرایا تو اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تصویر میں دیکھا ہے انہیں۔ مجھے ونود رانا کہتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ان تینوں سے ہاتھ ملایا۔

''ابھی ہم نے تیواری.....'' ٹی ایس نے کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ سے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے وہ ہذیانی انداز میں یہ حکم دے چکا ہے کہ میں ہر حال میں ان دونوں کو تلاش کروں۔ اس نے مجھے صرف بارہ گھنٹے کا وقت دیا ہے۔ ابھی آٹھ بجے ہیں، صبح آٹھ بجے تک۔'' یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''مطلب، تم نے اس کی دم میں آگ لگا دی ہے۔''

''یہ حکم اس نے ذاتی طور پر دیا ہوگا؟'' ٹی ایس نے پوچھا تو ونود رانا نے تلخی سے کہا۔

''ہاں، سالا سمجھتا ہے کہ ہم اس کے ذاتی ملازم ہیں۔''

''کیا وہ سمجھتا نہیں ہے کہ ہم اس سے کھیل رہے ہیں۔'' جسپال نے کہا۔

''ہمیشہ تیراک ہی ڈوبتا ہے اور طاقت کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے، جس میں اکثر اوقات ساری حسیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے ایک نہیں اب تک تین پولیس آفیسروں کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے اور اب وہ اُن کے گرد جال بُن رہا ہے، جس کے پاس اس کی فائل آ گئی ہے۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''تو پھر آپ اسے کیوں نہیں پکڑتے؟'' بانیتا نے پوچھا تو وہ یوں بولا جیسے وہ بہت تکلیف محسوس کر رہا ہو۔

''ثبوت نہیں ہیں اور قانون ثبوت مانگتا ہے۔ یہ سیاست دانوں کے اس کلب سے تعلق رکھتا ہے جو سبھی کریمنل ہیں۔ خیر میری ٹی ایس سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ اور شاید یہ میرے بارے میں نہیں جانتا کہ میں روائتی انداز میں مجرم کو نہیں پکڑتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم لوگ میرے سامنے بیٹھے ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' جسپال نے کہا۔

''اتنا سمجھ لو کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ میں نے جب ٹی ایس سے بات کی تھی، تب میں نے تم لوگوں کے بارے میں بہت اسٹڈی کیا۔ جتنا کچھ بھی مجھے مل سکا، اس کے مطابق میں آپ لوگوں سے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول سے ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ بھول جانا کہ ہم ایک دوسرے سے ملے تھے۔'' اس نے جسپال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی ڈیل؟'' اس نے پوچھا۔

''اس مہم میں تم لوگ میری مدد کرو، تیواری کو مارنا بڑا کام نہیں، میں یہ کام بہت اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں، مجھے وہ پورے ثبوت کے ساتھ چاہئے، اور..... اس کے عوض میں یہ ثابت کروں گا کہ تم دونوں محب وطن ہو اور وہ فلم ایک سازش کے تحت تیار کی گئی تھی جو ''را'' کے پاس ہے۔'' اے سی پی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ڈن۔'' جسپال نے ایک دم سے کہہ دیا، پھر لمحہ بھر بعد بولا۔

''مجھے کسی گارنٹی کی ضرورت نہیں۔ میں یہ کام کروں گا۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ مجھے استعمال کرنے کا سوچا بھی نہ جائے۔''

''دیکھو، میں ہندو گھرانے میں پیدا ہوا، میرا نام ہندوؤں والا ہے۔ لیکن میں انسان اور انسانیت کا قائل ہوں۔ اگر کسی کے ساتھ ظلم ہوتا ہے تو اسے انصاف ملنا چاہئے۔ کیونکہ بے انصافی ہی بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ ایسا ہندو، مسلمان، سکھ یا کسی کے ساتھ بھی ہو۔ خیر آپ لوگ کیا پینا پسند کریں گے۔'' یہ پوچھتے ہوئے اس نے گویا بات ختم کر دی تھی۔

''کچھ نہیں۔ اب ہم چلیں گے۔'' ٹی ایس نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑنے تو ونود رانا نے کہا۔

"یہ یاد رہے کہ ہم چاروں اور صاحب کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں کہ ہم رابطے میں ہیں۔" اس نے یاد دلا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ وہ پھر وہاں نہیں رکے۔

وہ بھی اس وقت آشا نگر کے علاقے میں تھے، جہاں سے وہ ہائی وے پر آ کر آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کا رخ سدھارتھ نگر کی جانب تھا، جو ہائی وے کی بائیں جانب تھا۔ وہ وہیں ایک گھر میں کچھ دیر رکنا چاہتے تھے کہ رونیت کور کا فون آ گیا۔ اسے گوپال نند کا فون نمبر دے کر کہا گیا تھا کہ اسے تلاش کرے۔

"وہ گوپال نند مسلسل حرکت میں ہے۔ اس وقت وہ بوریولی ہی کے علاقے میں ہے۔ میرے سامنے جو نقشہ ہے، اس کے مطابق وہ گل مہر روڈ سے آگے پنجابی گلی کے پاس رکا ہوا ہے۔ اب پتہ نہیں وہ وہاں رکتا ہے یا نہیں۔" رونیت کور نے تیزی سے بتایا۔

"یہ آشا نگر ہی کا علاقہ ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔" ٹی ایس نے کہا اور ڈرائیور کو بتانے لگا کہ کدھر جانا ہے۔ اگلے یوٹرن سے اس نے فوروہیل موڑ لی۔

آشا نگر کے اس علاقے میں بڑی بڑی بلڈنگیں تھیں۔ جس کے ایک بڑے سے کراس پر موجود مارکیٹ کے پاس وہ آ رکے۔ رونیت کور مسلسل بتا رہی تھی کہ گوپال نند اب گل مہر روڈ پر نہیں ہے۔ وہ انہیں یہ تو بتا سکتی تھی کہ اس کی لوکیشن کیا ہے، مگر حتمی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کہاں اور کس جگہ پر ہے۔

"میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس جگہ کا مجھے پتہ مل جائے۔ مجھے امید ہے مل جائے گا۔ آپ اس علاقے کا ایک چکر لگاؤ۔" رونیت نے کہا تو وہ پھر سے چل دیئے۔ یہ آنکھ مچولی آدھا گھنٹہ چلتی رہی۔ تبھی رونیت کور نے ایک بلڈنگ کے بارے میں بتایا۔ اس کے خیال میں وہ وہیں ہو سکتا ہے۔ وہ اس بلڈنگ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ وہیں ٹھہرے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اسے باہر کیسے نکالا جائے کہ ایک دم سے بانیتا کی نگاہ دوسری طرف ہوئی تو وہ پرجوش انداز میں بولی۔

"وہ دیکھو، جسپال، ادھر وہ سامنے گوپال نند۔"

جسپال نے فوراً ادھر دیکھا، وہ بلڈنگ سے نکل کر ایک سرخ کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو سیکورٹی گارڈ تھے۔ سرخ کار میں ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹی ایس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"اسے گھیرو۔"

اس وقت تک گوپال نند کار میں بیٹھا تو کار چل پڑی تھی۔ تبھی نوجوان نے فوراً ہی فوروہیل تیزی سے ادھر موڑی اور سیدھا اس کار کے سامنے جا رکا۔ کار والے کو بہت زور سے بریک لگانا پڑے تھے۔ بریکوں کی چرچراہٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جسپال اور بانیتا نے پسٹل نکال کر فائر کر دیئے، جس سے سرخ کار کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا بھی پھٹ گیا۔ سرخ کار والے تیزی سے باہر نکلے تو جسپال بھی انتہائی رسک لے کر باہر آ گیا۔ اس نے انہیں پسٹل سے کور کرتے ہوئے زور سے کہا۔

"رک جاؤ گوپال، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

جیسے ہی اس نے جسپال کی آواز سنی اس نے انتہائی حیرت سے پلٹ کر دیکھا اور پھر اپنا پسٹل نکالتے ہوئے پوری قوت سے چیخا۔

"یہی ہے جسپال۔ جسے ہم تلاش کر رہے تھے۔"

اس کا جوش رائگاں گیا۔ سیکورٹی گارڈز نے اپنی گنیں سیدھی کی ہوئی تھیں کہ ایک ہی وقت میں دو فائر ہوئے اور وہ لڑکھتے ہوئے سڑک پر گر گئے۔ اس وقت تک باقی کاریں بھی ان کے اردگرد آن رکیں اور اس میں سے کئی نوجوان باہر آ گئے۔ گوپال نند نے فائر کرنا چاہا مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔

"نہیں، فائر کیا تو جان سے مار دوں گا، پھینک دو پسٹل، جلدی۔" جسپال نے کہا تو اس نے اردگرد دیکھا اور مایوسانہ انداز میں پسٹل نیچے پھینک دیا۔ تبھی چند نوجوان اس کی طرف محتاط انداز میں بڑھے اور اسے قابو

س کرلیا۔ ڈرائیور یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جسپال اس کے قریب گیا اور اس کے ماتھے پر پسٹل کی نال رکھ دی۔

''مم...... مم...... میرا تو کوئی...... قص...... قصور نہیں۔ میں تو......'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا تو جسپال نے کہا۔

''میں نے تجھے مارنا بھی نہیں ہے۔ یہاں سے سیدھے جاؤ اور تیواری سے کہنا اگر وہ اپنے باپ کا ہے تو مجھے پکڑ لے، جاؤ۔''

اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا تو ڈرائیور تیزی سے نکلا اور ایک جانب کو بھاگ اٹھا۔ گوپال کو وہ قابو کر کے ایک کار میں ڈال چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ٹی ایس نے کال ملائی اور کسی سے کہنے لگا کہ تیواری کا خاص کارندہ پکڑ لیا ہے۔ اس سے پوچھ تاچھ خود کر لیں۔ فون کر کے اس نے گوپال کا فون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سو جسپال کے بیٹھتے ہی وہ اسے لے کر چل دیئے۔

وہ آشا نگر کے علاقے سے نکل کر ستا نگر میں پہنچ گئے۔ وہاں بنگلہ نما ایک بڑا سا را گھر تھا۔ نوجوان گوپال کو لا کر ایک کمرے میں پھینک چکے تھے۔ جسپال، بانیتا اور ٹی ایس اس کمرے میں جا پہنچے۔ گوپال فرش پر پڑا تھا۔ وہ سہا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف چھلک رہا تھا۔ جسپال اس کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''دیکھ اگر تجھے یہ امید ہے نا کہ تیواری تجھے بچا لے گا، تو یہ امید اب ختم کر دے۔ تو جانتا ہے نا کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟''

''میں کیا جانوں۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ابے کتے کے بچے، تو ایک تیر سے کئی نشانے لگانے کا دعویٰ کرتے ہو اور یہ تجھے پتہ نہیں، کمال ہے بھئی۔'' جسپال نے بڑے تحمل سے کہا اور ایک مکا اس کی آنکھوں کے درمیان دے مارا وہ تڑپ اٹھا، ایک لمحے کے لیے اس کا سانس ہی گم ہو گیا پھر جب اس کا سانس بحال ہوا تو وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''اس نے تجھے پکڑنے کے لیے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہے۔''

تبھی بانیتا کور غصے میں آگے بڑھی اور اس کی پسلی میں ٹھوکر مارتے ہوئے بولی۔

''ہاں، لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کی زندگی کا اب یہی وقت ہے، اور تمہاری زندگی کا بھی۔''

''مجھے معاف کر دو، میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ تیواری کو بھی سمجھا دوں گا۔'' اس نے رو دینے والے انداز میں کہا تو ٹی ایس ہنستے ہوئے بولا۔

''اس بے غیرت کا ڈرامہ دیکھ۔ اُدئے بھڑ دی کے، تجھے کسی تھیٹر میں کام کرنا چاہئے تھا۔ وہاں زیادہ کامیاب رہتا۔'' یہ کہہ کر اس نے جسپال کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اسے ہم نے نہیں مارنا، اسے وہی مارے گا، جس پولیس آفیسر کو یہ مارنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ہڈیوں سے اور بہت کچھ نکلوا لے گا، اس پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ آؤ، تیواری والا کام کریں، اسے بولو مرغا پھنس چکا ہے۔''

''چلو۔'' جسپال نے فوراً کہا اور اٹھ گیا۔ وہ تینوں چند قدم دروازے کی جانب بڑھے ہی تھے کہ گوپال بولا۔

''تم لوگ جو چاہتے ہو، میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں، پلیز مجھے......'' اس نے مزید کہنا چاہا تھا کہ بانیتا کور آگے بڑھی اور زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ وہ اس پر پل پڑی۔ وہ چیخنے لگا۔ اس کی دھنائی کرنے کے بعد وہ اس سے بولی۔

''چل لگا فون اپنے اس بے غیرت تیواری کو اور اسے بول کہ تو ہمارے پاس ہے۔ اسے کہہ اپنی فوج بھیجے۔ میں دیکھتی ہوں اسے۔'' یہ کہہ کر وہ گالیاں دینے لگی۔ جب اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو اس نے فون نکالا پھر رک کر بولا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں، اس پر ذرا سوچ لیں۔" وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

"تجھ پر کم از کم مجھے اعتماد نہیں، کتے پر تھوڑا اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ اسے روٹی ڈالو تو وہ نہیں کاٹتا، مگر تیرے جیسے منافق، کب دھوکہ دے جائیں، اس بارے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ تجھ سے پولیس والے ہی پوچھیں گے۔"

جسپال نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے باہر چل دیئے۔

جسپال کو یوں لگا تھا کہ ابھی سویا تھا اور ابھی جاگ گیا۔ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر کسی نے بھی اسے نہیں جگایا تھا۔ گوپال نند کو رات ہی ونود رانا خود لے گیا تھا، اس کے ساتھ اس نے کیا کیا، انہیں بالکل خبر نہیں تھی۔ وہ فریش ہو کر ڈرائینگ روم میں آیا تو بی ایس اور بانیتا بھی فریش بیٹھے ہوئے تھے۔

"کچھ کھا پی لو تو چلیں۔" بانیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تیواری کی کوئی خبر؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی براہ راست خبر نہیں ہے لیکن رانا نے یہی بتایا کہ اس کے لوگ شہر بھر میں اور خاص طور پر بورویلی میں پھیلے ہوئے ہیں۔" بی ایس نے بتایا

"کیا خیال ہے، ابھی خاموش......" اس نے کہنا چاہا تو بی ایس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ہم نے اسے کچھ نہیں کہنا۔ چوبیس گھنٹے گذر جائیں۔ پھر اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔"

"اوکے۔" جسپال نے کہا اور پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ آنند پارک کی طرف جانے کے لیے نکل پڑے۔

دوپہر ہو چکی تھی، جب وہ سبھی آنند پارک والے فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں نوتن کور، رونیت کور، گرلین کور، سندیپ سنگھ، جسپال سنگھ، بی ایس اور بانیتا کور جمع تھے۔ ان کے سامنے اروند سنگھ کھڑا تھا۔ سلمان نے انہیں وہ ساری چیزیں مہیا کر دی تھیں، جو وہ چاہتا تھا۔ وہ انہیں کہہ رہا تھا

"بے تو رسک، لیکن اس کا ایک چھوٹا سا تجربہ ہم اسی تیواری پر کریں گے۔ اس کا سارا کال ڈیٹا میرے پاس آ گیا ہے۔ شہر کے ہر کونے سے اسے کال جائے گی۔"

"اروند ہم نے اسے پکڑنا ہے۔" بانیتا نے کہا۔

"لیکن اگر اس کے ساتھ کھیل لیا جائے تو کیسا ہے؟ اسے بھی اندازہ ہو کہ اس نے کن لوگوں کو چھیڑ دیا ہے۔" اس نے دلچسپی سے کہا۔

"اروند تم، کسی دوسرے ٹریک پر سوچ رہے ہو، یہ چوہے بلی کا کھیل ہم افورڈ نہیں کر سکتے، تمہارا اصل فوکس یہ ہونا چاہئے کہ یہاں جو یہودی لابی کام کر رہی ہے اس بارے زیادہ سے زیادہ معلومات لو اور دوسرا ہمیں اپنے دھرم کے لیے کام کرنا ہے۔ یہی ہمارے دو مقصد ہیں۔" بانیتا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اوکے، میں ایسا ہی کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا، پھر رونیت کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم بتاؤ کہ اب تک ہم نے اس بارے کیا کچھ معلوم کیا ہے۔"

"ہماری اب تک کی یہی کامیابی ہے کہ ہم نے تیواری اور اس سے متعلق چند لوگوں کے سیل فون تک رسائی لے لی ہے۔ جس فون کے بارے میں ہم چاہیں گے۔ جیسے ہی وہ کہیں کال کرے گا، ہمیں یہاں معلوم ہو جائے گا۔" رونیت کور نے سکون سے کہا۔

"گڈ، یہ تو بہت اچھی بات ہے، کیا تیواری کا فون سن سکتے ہو تم؟" جسپال ایک دم سے خوش ہو گیا۔

"جی، وہ بہت شارپ بندہ ہے، فون پر بہت کم بات کرتا ہے، اس کے چند آدمی ہیں جو سارا کچھ دیکھتے ہیں۔ میں انہیں بھی دیکھ رہی ہوں۔" اس نے بتایا

"تو کیا ہے ان کے بارے....." اس نے تجسس سے پوچھا تو سبھی اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے۔

''وہ گوپال نند کی گم شدگی کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں۔'' اس نے بتایا

''سمجھو، وہ اب ماضی ہے۔ میں بتاتا ہوں اب کرنا کیا ہے۔'' یہ کہہ کر ٹی ایس نے سب کی طرف دیکھا پھر بولا۔

''میں چند نام اور فون نمبر دیتا ہوں۔ انہیں دیکھو، ان میں سے کوئی نہ کوئی بندہ سامنے آجائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہودی لابی کے حق میں ہیں۔''

''تمہاری رانا سے بات ہوئی؟'' نوتن نے ٹی ایس سے پوچھا۔

''ہاں، وہ کافی پرامید ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں تیواری کو دیکھتا ہوں۔ میں اور بانیتا ابھی کچھ دیر کے لیے نکلتے ہیں۔'' جسپال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں باہر آگئے۔ ان کا رخ دریا کنارے کی طرف تھا۔ فارم ہاؤس سے نکلتے ہی بانیتا نے کہا۔

''یہ ٹی ایس ہمیں اپنے انداز میں تو نہیں چلا رہا؟''

''بالکل، ایسا ہی ہے۔ وہ جو ہمارا سیٹ اپ جالندھر میں بننا تھا، یہاں بن گیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی دوسری طرف دھکیلا جا رہا تھا اور ہم ان میں پھنس کے رہ گئے ہیں۔'' وہ سوچتے لہجے میں بولی۔

''پھر کیا کہتی ہو؟'' جسپال نے پوچھا۔

''دیکھو، ہم جانتے ہیں کہ ہم اپنے دھرم کے لیے کتنا کام کر رہے ہیں۔ ہم گیانی نہیں بن سکتے لیکن مجرم ضرور بن گئے ہیں۔'' وہ حسرت سے بولی۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' جسپال نے حیرت سے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''کسی کی گیم سے نکل کر صرف اپنی گیم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ممبئی فتح نہیں کرنی، لیکن امرتسر پر حکومت ضرور کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے جسپال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی کیا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ان دونوں میں تیواری کا فیصلہ کرو، اور یہودی لابی میں دہشت پھیلا دو۔ دونوں طرف کے اہم بندے مارو۔ ممبئی میں اپنی جتنی قوت بھی ہے، جمع کر لو، پھر جو ہلچل ہوگی، دیکھا جائے گا کہ ہم اسے اپنے مقصد کے لیے کیسے استعمال کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے بانیتا کور کی آنکھوں میں غضب اتر آیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' جسپال نے کہا تو وہ اس کی تفصیلات طے کرنے لگے۔



لاہور پر رات کے سائے پھیل چکے تھے۔ میں دوسری منزل پر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے سبھی نے ڈنر لیا تو وہیں انسانی حقوق کی تنظیموں بارے جو معلومات مل چکی تھیں، اس بابت کافی گفتگو ہوئی تھی۔ میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے ٹی ایس کی انفارمیشن کا بھی انتظار تھا۔ میں یونہی محض شک میں کسی پر دھاوا بولنے والا نہیں تھا۔ میں کسی سرے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ سب اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ ایسے میں میرے سیل فون پر چھاکے کی کال آگئی۔ میں نے فون رسیو کیا تو وہ بڑے ضبط کے ساتھ حال احوال پوچھنے لگا۔

''تجھے ہوا کیا ہے چھاکے؟'' میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تو وہ لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں بس کل سے سویا نہیں ہوں، اس لیے آواز بھاری ہو رہی ہے۔''

''مجھے سچ بتاؤ، تجھے ہوا کیا ہے؟'' میرا تجسس بیدار ہو گیا تو اسی نرم لہجے میں بولا۔

''یار یہ تو پوچھ لے، میں نے فون کیوں کیا ہے؟''

''چل، بول کیا بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''اصل میں کل سے اماں کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔ وہ کہتی تو نہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ وہ تجھے یاد کرتی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''چھاکے مجھے سیدھی بات بتا۔'' مجھے کچھ اور ہی

شک ہونے لگا تھا۔ اس لیے تیزی سے پوچھا۔

"تو تو ایویں ہی گھبرا گیا ہے۔ یہی موسمی بخار ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم مصروف نہیں ہو تو ایک چکر نورنگر کا لگا لو، اماں کا دھیان بھی ذرا ہٹ جائے گا اور ہم بھی تم سے مل لیں گے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں یوں کہا جیسے وہ مجھ سے شکوہ کر رہا ہو۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی نکلتا ہوں۔"

"میں انتظار کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تب مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں گیا۔ میں نیچے آیا، جنید اس وقت باہر جانے کے لیے کنٹرول روم سے نکلا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔

"کدھر جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں مارکیٹ تک، مجھے کچھ ......" اس نے جواب دیا تو میں کہا۔

"تم تیار ہو جاؤ، ہم ابھی کہیں جا رہے ہیں۔"

"او کے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور واپس اپنے کمرے کی جانب مڑ گیا۔ میں کنٹرول روم میں جا کر انہیں جانے کا کہہ آیا۔

لاہور سے نکلے تو رات کا دوسرا پہر تھا۔ سیاہ ہنڈائی میرے پیروں کے نیچے تھی اور میں اسے اڑائے لیے چلا جا رہا تھا۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی، جب میں نورنگر میں حویلی کو جانے والے راستے پر مڑ رہا تھا۔ میں آہنی گیٹ تک پہنچا تو سامنے چھاکا کھڑا تھا۔ گیٹ کھل گیا تو میں نے جنید کو گاڑی پارک کرنے کا کہہ کر خود اتر آیا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ میں آگے بڑھا اور چھاکے کے گلے لگ گیا، وہ بڑی گرم جوشی سے مجھے ملا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"چھاکے، سچ بتانا، خیریت ہی ہے نا؟"

"سچی بات تو یہ جمال، اماں بہت بیمار ہے، تجھے بلانے کے لیے ہم سب نے کہا مگر وہ مانتی ہی نہیں ہیں۔ اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔" وہ روہانسا ہوتا ہوا بولا۔

"تو نے اچھا کیا مجھے بلا لیا، چل آ اماں سے ملتے ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور حویلی کی جانب چل پڑا تو اس نے بھی میرے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔

دوسری منزل کے بڑے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہولے سے بجایا تو اندر سے اماں نے کہا۔

"آ جاؤ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ اماں بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے قرآن مجید کھلا ہوا تھا۔ ان کے بیڈ سے ذرا فاصلے پر بڑی سی چادر سے اپنا آپ ڈھانپے سوہنی نماز پڑھنے میں محو تھی۔ دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ایک نور تھا جو اس سے پھوٹ کر متاثر کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں چند لمحے اس کے چہرے کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے اماں کی طرف دیکھا وہ مجھے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے کلام پاک بند کر دیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ ان کے قریب گیا اور ان کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے میرا سر اٹھایا، اسے چوما اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"خیر سے آئے ہو نا پتر۔"

"جی اماں، بس دل کیا اور آ گیا۔" میں نے سکون سے کہا تو میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"چل تو منہ ہاتھ دھو کے تازہ دم ہو جا۔ میں یہ منزل ختم کر لوں تو پھر تیرے ساتھ باتیں کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے اماں۔" میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے ایک نگاہ سوہنی پر ڈالی۔ وہ قعدہ میں تھی۔ میں نے رکنا مناسب نہیں سمجھا اور باہر آ گیا۔

"یار اماں تو ٹھیک ہے، میں تو ایویں ڈر گیا تھا۔" باہر کھڑے چھاکے کو دیکھ کر میں نے کہا تو وہ خاموش رہا۔ میں آگے بڑھا تو اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر ہے تمہارا کمرہ۔ سوہنی نے رات ہی بتا دیا

تھا۔''

ہم اس طرف چل پڑے۔ میں اس کے ساتھ کاریڈور سے گذر رہا تھا تو میں نے دیکھا۔ حویلی کی دائیں جانب باہر کی طرف ایک میدان تھا۔ جہاں کبھی فصلیں اگا کرتی تھیں۔ وہاں کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ورزش کر رہے تھے۔ وہ سبھی ٹریک سوٹ میں تھے۔ ان لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان ایک لمبی دیوار تھی۔ دونوں طرف سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آؤ، پہلے یہی دیکھ لو۔'' اس نے کہا اور کاریڈور میں آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ سرے تک گیا تو سارا منظر واضح ہو گیا۔ وہ سب ایک منظم انداز میں ورزش کر رہے تھے۔ لڑکوں کی طرف تانی کھڑی تھی اور انہی کے ساتھ پوری طرح مصروف تھی۔ میں دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بدن گرم ہو جانے تک یہی چلتا رہا، پھر وہ زور زور سے انہیں حکم دینے لگی۔ ایک دم سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگے۔ بالکل روہی کی تربیت والا انداز تھا۔ دوسری جانب لڑکیاں بھی وہی کر رہی تھیں۔ تانی پورے جوش کے ساتھ۔ کبھی کسی کے ساتھ فائیٹ کرنے لگتی اور کبھی کسی کے ساتھ۔ کافی دیر تک یہی چلتا رہا۔ جہاں کوئی غلطی کرتا اسے سمجھاتی۔ یہ مرحلہ ختم ہوا تو اس نے ہدایات دینی شروع کر دیں۔

''کب سے یہ چل رہا ہے؟'' میں نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

''کافی عرصہ ہو گیا۔'' چھاکے نے جواب دیا

''سارا اور اس کے بیٹے کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''وہ دونوں خوش ہیں، شعیب کئی بار یہاں انہیں آ کر مل چکا ہے۔ وہ دوبئی میں ہوتا ہے، اس نے سارا کو لے جانا چاہا مگر وہ نہیں گئی۔''

اوکے آؤ، چلیں۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

میں تازہ دم ہو کر اوپر ہی ڈرائینگ روم میں آیا تو سبھی وہیں تھے۔ چھاکا، سارا، تانی سوہنی اور اماں۔ ناشتہ تیار تھا۔ میں جا کر سب سے ملا۔ تانی نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، کچھ دیر پہلے والی تانی لگ ہی نہیں رہی تھی۔ اس وقت میں چھاکے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پتلون اور شرٹ پہنی ہوئی تھی اور ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔

''اوئے چھاکے یہ کیا؟'' میں نے خوشگوار حیرت سے کہا تو اماں نے ایک دم سے کہا۔

''جمال! آج کے بعد تم نے اسے چھاکا نہیں کہنا، اشفاق کہنا ہے، چوہدری اشفاق۔''

''وہ تو ٹھیک ہے اماں، پر اسے یہ سکھایا کس نے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میری بیٹی سارا نے سکھایا ہے۔ دیکھنا یہ میرا پتر اب بہت بڑا آدمی بنے گا۔'' اماں نے رسان سے کہا تو میں نے اسے چوہدری اشفاق کہنے کا پورا ارادہ کر لیا۔ ناشتہ ختم ہونے تک باتیں چلتی رہیں۔ تبھی سارا اٹھ گئی

''مجھے اجازت، میں دوپہر کے بعد آپ سے باتیں کروں گی مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے۔''

''اس وقت کہہ لو ضروری باتیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، مجھے اسکول جانا ہے۔ میں پہلے ہی لیٹ ہو چکی ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تو اماں بولیں۔

''یہ یہاں کا سارا اسکول سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ رہتی ہی وہیں اسکول میں ہے۔ یہ تو چھٹیاں گذارنے یہاں آتی ہے حویلی میں۔''

''اماں آپ بھی تو وہیں ہوتی ہیں۔'' سارا نے کہا اور چل دی۔ میں نے سوہنی کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ایک میٹھی مسکان تھی۔ اس نے اب تک ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پیاس کے ساتھ ایسی نادیدہ لہریں پھوٹ رہی تھیں جنہیں میں کوئی نام تو نہیں دے پایا مگر وہ مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔

''اماں، اس چھاکے نے فون کر کے اس طرح کہا

کہ میں ڈر ہی گیا۔اس لئے تو......" میں نے کہنا چاہا تو سوہنی ایک دم سے بولی۔

"ٹھیک کہا اس نے، اماں ٹھیک نہیں ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹرز نے جو کہا وہ اگر سن لیں تو تم بھی پریشان ہو جاؤ۔اماں ہماری نہیں سنتیں۔ میں نے چھاکے سے کہا کہ وہ تمہیں بلائے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں ایک دم سے پریشان ہو گیا

"اب میں تفصیل بتاتی......" اس نے کہنا چاہا تو اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"او پتر مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ایویں پریشان ہیں سب۔اب عمر کا بھی تقاضا ہے، کمزوری تو آئے گی۔" اماں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش رہا، پھر تائی کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اماں اٹھ کر اندر چلی تو سوہنی انہیں چھوڑنے ساتھ چلی گئیں۔

"بات کیا ہے؟" میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"وہ سوہنی ہی بتا دے گی آپ کو۔" اس نے کہا ہی کچھ اس طرح تھا کہ میں نے اس موضوع کو ایک طرف رکھ دیا اور میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ تم نے بہت خوب کیا کہ یہاں کے نوجوانوں کو تربیت دے رہی ہو۔ یہ خیال کیسے آیا؟"

"میری مجبوری تھی۔ مجھے اپنی فٹنس رکھنا تھی۔ دوسرے یہاں رہتے ہوئے میں فضول نہیں بیٹھ سکتی، مو میں نے اماں سے اجازت لی اور یہ سب شروع کر دیا۔ شروع میں تھوڑا مخالفت ہوئی، پھر سب ٹھیک ہو گیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"تم یہاں خوش تو ہونا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دم خوش۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر سو رنگ بکھر گئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اسے یہاں کی سیکورٹی کا پورا احساس تھا۔ میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ سوہنی آگئی۔ وہ آتے ہی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"اماں بہت سیریس ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ ایک وقت ہی میں انہیں دو طرح کے مرض لاحق ہو گئے ہیں۔ایک دل اور دوسرا انہیں ہائی بلڈ پریشر ہے۔"

"مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" میں نے چونکتے ہوئے کہا تو تیزی سے بولی۔

"اماں نے منع کیا تھا۔وہ تو اب بھی نہیں چاہتی تھیں کہ تمہیں بتایا جائے، بس دوا کھا لی تو ٹھیک۔"

"تو پھر تیاری کرو، اماں کو کسی بھی باہر کے ملک لے چلتے ہیں، اس پر تو کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی نا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

"میں پتہ نہیں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ وہ نہیں مانتیں۔ تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔تم کہو تو شاید مان جائیں۔"

"ٹھیک ہے میں بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا تو اٹھ کر اندر جانے لگا۔تب سوہنی نے مجھے روک دیا

"اس وقت وہ دوا کے اثر میں سونے لگی ہیں۔ جگایا تو ان کی طبعیت......"

"ٹھیک ہے میں شام کو بات کروں گا۔" میں نے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔ میرے پیچھے ہی تائی بھی اٹھ آئی۔ چوہدری اشفاق میرے انتظار میں تھا۔ ہم نیچے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ کچھ دیر بیٹھنے اور وہاں کے بارے معلومات لینے کے بعد میں اور اشفاق، سارا کا سکول دیکھنے چل پڑے۔ واپسی پر ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ میں نے مسافر شاہ کے تھڑے پر مسافروں کے لیے کچھ سہولیات مہیا کرنے کا کہا تھا۔ اشفاق نے وہاں کافی کام کروا دیا تھا۔ میں نے اس کام کے بارے میں پوچھا تو اس نے کار کا رخ اُدھر موڑتے ہوئے کہا۔

"چل ادھر کا بھی ایک چکر لگا لیں۔تو خود ہی دیکھ لے کیا کچھ کیا ہے، جو رہ گیا ہو وہ بتا دینا۔"

اس نے وہاں کافی کام کروا دیا ہوا تھا۔ایک طرف

کمروں کی قطار تھی اور اس کے ساتھ برآمدے تھے، جہاں مسافر کچھ دیر بیٹھ کر سکون لے سکتے تھے۔ پانی کا بہترین انتظام کر دیا گیا تھا۔

''بس اب یہاں بجلی پہنچ جائے تو مزید بہتر ہو جائے گا، میرے خیال میں وہ جلد لگ جائے گی۔'' اشفاق نے بتایا۔ پھر ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

''وہ دیکھو، کافی قطعات پر گھاس لگوا دی ہوئی ہے لیکن یہ سبز تبھی ہوں گے جب یہاں ٹیوب ویل لگ جائے گا۔'' وہ بتا رہا تھا لیکن میں وہاں کھڑا دیکھ رہا تھا، کنوئیں پر چند لڑکیاں پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا مسافر شاہ کے میدان کے ایک سرے پر بڑی رنگین جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہ وہیں سے آئی تھیں۔ میں نے غور کیا، وہ خانہ بدوش نہیں تھیں۔ خانہ بدوش جو ہر طرح کا جانور، کتے بلے، خنزیر تک کھا جاتے ہیں، مقامی زبان میں انہیں ''بوریے'' کہا جاتا ہے۔ ان میں ایک طرح کی نفاست تھی، یہی شے مجھے ان میں دلچسپی پیدا کر رہی تھی۔ جب وہ پانی بھر چکیں تو میں نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک بڑی لڑکی سے کہا۔

''وہ سامنے جھونپڑیاں تم لوگوں کی ہیں۔''

''ہاں ہماری ہیں۔'' اس نے تصدیق کی۔ اس کا لہجہ اندرون روہی اور سندھی کا ملا جلا تاثر دے رہا تھا۔

''تم میں جو بڑا بزرگ ہے نا، اسے یہاں بھیجو، میں اس سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا تو انہوں نے کوئی جواب دیئے بغیر گھڑے سر پر اٹھائے اور تیز قدموں سے چل دیں۔

میں مسافر شاہ کے تھڑے پر بیٹھ گیا تھا۔ اشفاق بھی ذرا فاصلے پر میرے پاس براجمان ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جھونپڑیوں سے ایک لمبے قد کا، پتلا سا آدمی نکلا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل پڑا۔ اس نے گیروے رنگ کا کرتا اور سفید دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ سر پر سفید بھاری پگڑی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ اس کے کپڑے صاف اور دھلے ہوئے تھے۔ خانہ بدوشوں کی طرح میلے کچیلے نہیں تھے۔ اس کے پیچھے تین مختلف عمر کے نوجوان بھی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس کی بڑی بڑی سفید مونچھیں اور بے تحاشا داڑھی اس کے پیلے چہرے پر عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ تینوں نوجوان اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پرنام کیا۔ وہ ہندو تھے۔ بوڑھے کا نام رام لعل تھا۔ وہ جوگی تھا۔ وہ لوگ دو ہفتوں سے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک بات میں نے محسوس کی۔ جب تک وہ اپنا تعارف کراتا رہا، اس دوران وہ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اتنی گہری نگاہ کہ مجھے احساس ہو گیا کہ اس کے انداز میں ایک طرح کا غرور ہے۔ چند لمحے بعد وہ روہی اور سندھی ملے لہجے میں بولا۔

''جی حضور، فرمائیں، کس لیے بلایا؟''

''تم لوگ یہاں کیسے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اگر آپ کو ہمارے یہاں رہنے پر اعتراض ہے تو ہم آج ہی چلے جاتے ہیں۔'' اس نے لہجہ مودب رکھا لیکن اس میں ایک خاص اکھڑ پن تھا۔

''مجھے یہاں تمہارے ڈیرہ لگانے پر اعتراض نہیں ہے، میں نے یہاں میلے کے علاوہ کبھی کسی خانہ بدوش کا ڈیرہ نہیں دیکھا۔ اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم یہاں کیسے؟ کوئی خاص مقصد ہے اس علاقے میں آنے کا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا جو کسی سانپ کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہا پھر اسی لہجے میں بولا۔

''میں ایک جوگی ہوں۔ میں خاص سانپوں کو پکڑنے کے لیے مختلف علاقوں کا سفر کرتا رہتا ہوں یہاں میں ایک خاص قسم کے سانپ کی تلاش میں آیا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ یہاں پایا جاتا ہے۔'' اس نے مودب لہجے میں کہا۔

''کیا وہ سانپ یہاں ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی موجودگی کے آثار تو ہیں لیکن دو ہفتے ہو گئے، وہ ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ پوری کوشش کے بعد

بھی اسے تلاش نہیں کر پائے ہیں۔'' اس بار وہ ذرا عجیب سے لہجے میں بولا جیسے بے بس ہو گیا ہو۔

''کیا وہ اتنا ہی نایاب سانپ ہے، جس کی تلاش تمہیں یہاں تک لے آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں' وہ اتنا ہی نایاب ہے۔ لیکن لگتا ہے وہ اب یہاں نہیں ہے۔ میرے آتے ہی شاید یہ جوہڑ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔'' اس نے قدرے فخریہ لہجے میں بتایا

''مطلب وہ سانپ تم سے ڈر گیا اور یہاں سے بھاگ گیا۔ یہی کہنا چاہ رہے ہو نا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''لگتا تو یہی ہے؟'' اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا

''ایسی کیا بات ہے تم میں؟'' میں نے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''اس روئے زمین پر کوئی ایسا سانپ نہیں ہے جو اپنے زہر سے مجھے نقصان پہنچا سکے۔ سنا ہے اس سانپ کا زہر بہت تیز ہے اتنا تیز کہ جیسے ہی وہ کسی بندے کو ڈستا ہے اس کا جسم پھٹنے لگتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کا زہر مجھ پر اثر کرتا ہے کہ نہیں۔'' جوگی نے یہ کہتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔

''اس سانپ کی تلاش تمہیں اس لیے ہے کہ تم اس کے زہر پر تجربہ کر سکو؟'' میں نے پوچھا تو چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''ہاں، ایک تو تجربہ کرنا تھا، دوسرا......'' یہ کہتے ہوئے وہ یک دم سے رک گیا، لمحہ بھر بعد بولا۔

''جب وہ سانپ ہی نہیں ہے تو اس کا کیا ذکر، ویسے بھی ہم آج کل میں جانے والے ہیں۔''

''تمہیں تو وہ سانپ نہیں ملا لیکن اگر میں وہ سانپ یہاں بلالوں تو کیا پھر خود کو ڈسواؤ گے۔'' میں نے کہا تو اس نے شدید حیرت سے میری طرف دیکھا، چند لمحے اسی کیفیت میں رہا تو میں بولا۔

''میں دیکھنا چاہوں گا کہ اس سانپ کے کاٹنے سے بدن کیسے پھٹتا ہے۔''

''حضور یہ آپ بہت بڑی بات کر رہے ہیں؟'' اس نے یوں کہا جیسے میں پاگل ہوں اور یونہی بڑ میں کہہ رہا ہوں۔ اس کے لہجے میں تیز طنز تھا۔

''اگر میں بلالوں تو؟'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا، پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''ہاں، بلالیں۔''

میں نے ایک نگاہ پورے میدان پر ڈالی۔ ایک طرف چٹیل میدان، ایک طرف ٹیلے اور دو طرف جھاڑیاں اور درخت اُگے ہوئے تھے۔ میں چند لمحے دیکھتا رہا۔ مجھے لگا کہ میرے اندر سے کوئی قوت اس سارے میدان میں پھیل رہی ہے۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا، کہ ایک سانپ تیزی سے رینگتا ہوا جوہڑ کی جانب آ رہا تھا۔ میں نے خود پہلی بار ایسا سانپ دیکھا تھا۔ اس کا رنگ ہلکا نیلا، جس میں کہیں کہیں سیاہ دھبے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین فٹ کا رہا ہوگا۔ پتلا سا، چمکتا ہوا سانپ جس پر نگاہ نہیں ٹک رہی تھی۔ وہ جوہڑ سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا۔ میں نے واضح طور پر اس جوگی کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلتی ہوئی محسوس کی۔ تبھی میرے قریب اشفاق نے ہولے سے کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ جوگی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یہی ہے وہ سانپ، اسی کی تلاش تھی تمہیں؟''

''یہی ہے سانپ، میں اسی کی تلاش میں یہاں تک آیا ہوں۔'' اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا تو میں بولا۔

''چلو، اب اسے خود کو ڈسواؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ تمہارا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔''

میرے یوں کہتے ہی وہ ساتھ کھڑے تینوں نوجوان ایک دم سے بول پڑے۔ یہ ان کی اضطراری کیفیت تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھی

ایک نوجوان نے کہا۔

''نہیں گرو جی، یہ بڑا زہریلا سانپ ہے، اس کا ڈسا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے ہم، بس پکڑلیں ان کو۔''

''ایسے نہیں پکڑ سکتے تم اسے، اپنے آپ کو ڈسواؤ تو پکڑو۔'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو جوگی نے میری طرف دیکھا پھر اپنے نوجوانوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''نہیں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

جوگی سانپ پکڑنے کو آگے بڑھا تو سانپ غضب ناک ہوگیا۔ اس کی پھنکار میں شدت تھی۔ وہ سبھی چوکنا تھے۔ لیکن کسی کی بھی ہمت نہیں پڑرہی تھی کہ آگے بڑھ کر اسے اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ تبھی جوگی نے حوصلہ پکڑا اور سانپ پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ سانپ اس کے ہاتھ سے لپٹ گیا۔ واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ سانپ نے اسے ڈس لیا تھا۔ کیونکہ اس کے ماتھے پر ایک دم سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ جھومنے لگا جیسے اسے سانپ کے ڈسنے سے سرور آرہا ہو۔ وہ اپنے پاؤں سے ہل گیا۔ اس کے چیلے بالکے اسے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے کوئی شے ہاتھ سے نکلی جارہی ہو۔ چند منٹ تک وہ اسی کیفیت میں رہا۔ پھر اسے ہوش آنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ نارمل حالت میں میرے سامنے کھڑا تھا مسکرا رہا تھا۔

''بہت زہریلا ہے یہ سانپ، جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔'' وہ جوگی خوش ہوتے ہوئے بڑبڑایا۔

''یہ تجربہ تم نے کرلیا کہ اس میں کتنا زہر ہے۔ اب چھوڑ دو اسے۔''

''نہیں یہ نایاب سانپ مجھے چاہیے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''کیا کرنا ہے تم نے سانپ کا، کیوں چاہیے تمہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ خاموش رہا، جیسے وہ مجھے بتانا نہ چاہتا ہو کچھ دیر بعد میں نے پھر پوچھا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تمہیں یہ سانپ کیوں چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''حضور آپ کیا کریں گے پوچھ کر، مجھے سانپ مل گیا۔'' اس نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

''ہوسکتا ہے اب یہ تمہارے کام کا نہ رہا ہو اس نے تمہیں ایک بار ڈس لیا ہے......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بڑے غرور سے بولا۔

''نہیں، یہ ایک ہی وقت میں کئی بار ڈس سکتا ہے، ہر بار اس کا اثر اتنا ہی رہتا ہے۔ میں نے جو اس سے کام لینا ہے وہ لے لوں گا۔''

''لیکن تمہیں بتانا ہوگا کہ یہ کس مقصد کے لیے لے کر جاؤ گے، کیا کام لوگے اس سے؟'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو اس نے سرور میں آتے ہوئے بڑے غرور سے کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ تم نے سانپ کو یہاں بلالیا، کچھ تو ہو، لیکن اگر اسے ڈسوالو تو میں بتادوں گا۔''

''ایسا ہے، تو لاؤ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اپنا وہ ہاتھ آگے کیا جس میں اس نے سانپ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے پکڑا اور اپنے ہاتھ پر رکھ لیا۔ سانپ کی فطرت ہے ڈسنا، اس نے مجھے ڈس لیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ خود بل کھانے لگا۔ میں نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ وہ جوگی حیرت اور غم میں زور زور سے چیخنے لگا۔

''یہ کیا ہوگیا۔ یہ مرگیا...... یہ مرگیا۔'' وہ زمین پر پڑے ہوئے سانپ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''تمہیں کیسے پتہ یہ مرگیا ہے؟'' میں نے سکون سے کہا تو اسی طرح دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''جب سانپ الٹ جائے تو وہ مرجاتا ہے۔''

''نہیں، یہ ابھی مرا نہیں، جس طرح سانپ کے زہر نے تمہیں ہلا کر رکھ دیا تھا، اسی طرح جب سانپ نے مجھے ڈسا تو وہ خود بے خود ہوگیا ہے۔ انتظار کرو، ابھی ہوش میں آجائے گا۔''

''ایسا ہے، کیا میں اسے اپنے ساتھ لے جاپاؤں گا۔''

وہ ایک دم خوشی سے بولا۔

"ہاں ایسا ہی ہے، لیکن اسی وقت لے جاسکو گے جب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ اس کا کرنا کیا ہے۔"

میری بات سن کر وہ چند لمحے خاموشی سے کھڑا سوچتا رہا۔ اس کے بالکے بھی ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے سانپ پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کا زہر چاہیے۔ اس کے زہر میں خاص نایاب قسم کے جز ہیں۔ میرا ایک بیٹا بہت بڑا کیمسٹ ہے۔ مجھے نایاب سانپ ڈھونڈنے کا شوق ہے تو اسے زہر کی خاصیتوں پر تجربات کرنے کا جنون ہے۔ اس نے بہت ساری اختراع کرلی ہیں۔ یہ سانپ اسے چاہیے۔"

"اور وہ یہ سارا کام دولت بنانے کے لیے کر رہا ہوگا۔ اسے یہ کوئی غرض نہیں ہوگی کہ انسانیت کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔" میرے یوں کہنے پر وہ خاموش رہا۔ میں نے سانپ کی طرف دیکھا، وہ سیدھا ہو کر معمولی سی حرکت میں تھا۔ میں نے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کراہت سے کہا

"اٹھاؤ اس سانپ کو اور لے جاؤ۔" وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ دم سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور گڑگڑاتا ہوا بولا۔

"مجھے خود پر بہت زعم تھا، بڑا ناز تھا، مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا جب آپ نے سانپ کو بلایا۔ میں سمجھ گیا ہوں، آپ بہت بڑے گیانی ہو۔ مجھے بس اپنے چرنوں میں جگہ دے دو، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"کیوں رہنا چاہتے ہو تم یہاں۔ تمہیں سانپ چاہیے لے جاؤ، اور چاہیے تو مزید لے جاؤ۔" میں نے یوں کہا جیسے یہ اب کچھ بھی اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ وہ مزید گڑگڑانے لگا۔ میں اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر کہا۔

"تم ٹھیک سمجھے ہو، آج کے بعد تیرے بیٹے کے ہاتھ میں وہ اثر نہیں رہے گا اور نہ تم میں یہ صلاحیت، ایک چھوٹے سے سانپ کا زہر تمہیں مار سکتا ہے۔"

"رحم حضور رحم......" وہ گڑگڑانے لگا۔

"یہاں رہو، اپنے بیٹے کو بلاؤ، وہ مجھے مطمئن کرے گا تو ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔ جاؤ، اپنے سب لوگوں کو ان کمروں میں لے آؤ۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

"جیسے آپ کا حکم سرکار۔" اس نے کہا اور سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے چیلے بالکوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ فوری ہی پلٹ گئے۔

بظاہر وہ معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن ایک بے چینی میرے اندر اب بھی تھی۔ مجھے سکون نہیں آ رہا تھا۔ تبھی میں نے اس جوگی سے پوچھا۔

"یہاں اس میدان میں یا اس کے ارد گرد تم لوگ ہی ہو یا کوئی دوسرا بھی ہے؟"

"یہاں تو ہم لوگ ہی ہیں، ہم سب آپس میں رشتے دار ہیں۔ ہمارے گھر شہر میں ہیں۔ لیکن اس طرح رہنا ہماری مجبوری ہے کہ ہم سانپ......" اس نے مزید کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، تم لوگوں کے علاوہ کوئی اور ہے اس علاقے میں۔"

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے چونکا۔ میری طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

"ایک ملنگ ہے، اس طرف بڑے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے کا وہاں پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہیں رہتا ہے، ہم نے کبھی اسے ادھر یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا، اس کے معمولات کیا ہیں یہ بھی نہیں پتہ۔"

"کیا اب وہ وہاں پر ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" اس نے جواب دیا تو میں اس جانب دیکھنے لگا۔ مجھے کافی کچھ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے سانپ کو دیکھا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جانے دو اسے، پھر جب چاہے بلا لیں گے اسے، تمہیں تو صرف اس کا زہر ہی چاہیے نا۔ وہ مل جائے گا۔'' میں نے کہا اور اس سمت چل پڑا، جس طرف اس ملنگ کے ہونے کا جوگی نے بتایا تھا۔

اس پورے میدان میں برگد کا درخت صرف مسافر شاہ کے جھڑے کے پاس ہی تھا، یا پھر وہ برگد کا درخت تھا، جس کے نیچے وہ ملنگ گدڑی بچھائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی کچھ برتن پڑے تھے۔ دو ایک پوٹلیاں تھیں۔ قریب ہی ایک بکری بندھی ہوئی تھی، جس کے آگے کافی سارا چارہ پڑا ہوا۔ اس کے سامنے مٹی کا ایک بڑا سا کونڈا دھرا ہوا تھا، جس میں وہ پورے جذب سے اس بھنگ کی طرف متوجہ تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''بابا! مجھے پیاس لگی ہے، پانی تو پلاؤ۔''

ملنگ نے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''جو پانی تھا وہ میں نے اپنے گھڑے میں ڈال لیا، اب میرے پاس تو یہی ہے، اگر تم چاہو تو یہ پی لو۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں بھنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جیسے مجھے وہ پینے کے لیے اکسا رہا ہو، اسی لیے میں نے پوچھا۔

''کیا یہ کوئی خاص شے ہے جو میں پی نہیں سکتا؟''

''یہ بھنگ ہے جو میں گھوٹ چکا ہوں۔ شاید یہ تیرے جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''کیا ہوتا ہے اس سے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے، نشہ کر دیتی ہے یہ بھنگ، یہ میری طرح کے رند ہی پی سکتے ہیں۔'' اس ملنگ نے یوں کہا جیسے میری اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہو۔

''مجھے تمہاری بھنگ سے کوئی غرض نہیں ہے، اور نہ اس کے نشے سے کوئی مطلب ہے، میں تو اسے پانی سمجھ کر پی لوں گا۔ دیتے ہو کیا مجھے؟''

''ہاں ہاں' آؤ بیٹھو، یہاں میرے سامنے۔'' اس ملنگ نے پھر اسی استہزائیہ لہجے میں کہا تو میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان کونڈا دھرا ہوا تھا، جس میں لبالب بھنگ پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی نفاست سے مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ اسے لبالب بھرا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ دوسرا بھرا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ لو جام فلک سیر..... لیکن فلک سے گر نہ جانا یہ رندی کی توہین ہے۔'' اس نے مجھے یوں متنبہ کیا جیسے وہ مجھے گرانے پر تلا ہوا ہو۔ میں نے وہ مٹی کا پیالہ پکڑا اور اس میں پڑی ''فلک سیر'' کو پی گیا۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے پیالہ بھرا اور پی گیا۔ اس طرح ہم نے چار چار پیالے ایک گھنٹے میں پی کر ختم کر لیے۔ ملنگ کی آنکھیں سرخ بوٹی کی مانند ہو چکی تھیں۔ وہ جھومنے لگا تھا تو مجھے احساس ہو گیا کہ اب یہ پورے نشے میں ہے۔ آدھے سے زیادہ کونڈا بھنگ سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس کے جھومنے پر مسکرا دیا اور پوچھا۔

''بابا جی کہاں پر ہو، کون سا آسمان ہے؟''

ملنگ نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور نشے میں لتھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں ایک نیا آسمان بنا رہا ہوں.....'' وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ تب میں نے کہا۔

''بابا جی! آپ اکیلے اکیلے ہی نیا آسمان بنا رہے ہیں، مجھے بھی ساتھ میں شامل کر لو۔''

ملنگ میری بات سن کر چونک گیا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تمہاری سیر ابھی شروع نہیں ہوئی؟''

''نہیں بابا جی میری تو ابھی تک پیاس بھی نہیں بجھی، میں نے سیر کیا خاک کرنی ہے۔ اگر اجازت دیں تو یہ باقی پڑی فلک سیر پی لوں یا ابھی آپ پئیں گے؟''

"جانے دو اسے، پھر جب چاہے بلالیں گے اسے، تمہیں تو صرف اس کا زہر ہی چاہئے نا۔ وہ مل جائے گا۔" میں نے کہا اور اس سمت چل پڑا، جس طرف اس ملنگ کے ہونے کا جوگی نے بتایا تھا۔

اس پورے میدان میں برگد کا درخت صرف مسافر شاہ کے تھڑے کے پاس ہی تھا، یا پھر وہ برگد کا درخت تھا، جس کے نیچے وہ ملنگ گدڑی بچھائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی کچھ برتن پڑے تھے۔ دو ایک پوٹلیاں تھیں۔ قریب ہی ایک بکری بندھی ہوئی تھی، جس کے آگے کافی سارا چارہ پڑا ہوا۔ اس کے سامنے مٹی کا ایک بڑا سا کونڈا دھرا ہوا تھا، جس میں وہ پورے جذب سے اس بھنگ کی طرف متوجہ تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"بابا! مجھے پیاس لگی ہے، پانی تو پلاؤ۔"

ملنگ نے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"جو پانی تھا وہ میں نے اپنے نڈے میں ڈال لیا، اب میرے پاس تو یہی ہے، اگر تم چاہو تو یہ پی لو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں بھنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جیسے مجھے وہ پینے کے لیے اکسا رہا ہو، اسی لیے میں نے پوچھا۔

"کیا یہ کوئی خاص شے ہے جو میں پی نہیں سکتا؟"

"یہ بھنگ ہے جو میں گھوٹ چکا ہوں۔ شاید یہ تیرے جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"کیا ہوتا ہے اس سے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے، نشہ کر دیتی ہے یہ بھنگ، یہ میری طرح کے رند ہی پی سکتے ہیں۔" اس ملنگ نے یوں کہا جیسے میری اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہو۔

"مجھے تمہاری بھنگ سے کوئی غرض نہیں ہے، اور نہ اس کے نشے سے کوئی مطلب ہے، میں تو اسے پانی سمجھ کر پی لوں گا، دیتے ہو کیا مجھے؟"

"ہاں ہاں' آؤ بیٹھو، یہاں میرے سامنے۔" اس ملنگ نے پھر اسی استہزائیہ لہجے میں کہا تو میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان کونڈا دھرا ہوا تھا، جس میں لبالب بھنگ پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی نفاست سے مٹی کا پیالہ اٹھایا، اسے لبالب بھرا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ دوسرا بھرا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ لو جامِ فلک سیر...... لیکن فلک سے گر نہ جانا یہ رندی کی توہین ہے۔" اس نے مجھے یوں متنبہ کیا جیسے وہ مجھے گرانے پر تلا ہوا ہو۔ میں نے وہ مٹی کا پیالہ پکڑا اور اس میں پڑی "فلک سیر" کو پی گیا۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے پیالہ بھرا اور پی گیا۔ اس طرح ہم نے چار چار پیالے ایک گھنٹے میں ہی ختم کر لیے۔ ملنگ کی آنکھیں سرخ بوٹی کی مانند ہو چکی تھیں۔ وہ جھومنے لگا تھا تو مجھے احساس ہو گیا کہ اب یہ پورے نشے میں ہے۔ آدھے سے زیادہ کونڈا بھنگ سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس کے جھومنے پر مسکرا دیا اور پوچھا۔

"بابا جی کہاں پر ہو، کون سا آسمان ہے؟"

ملنگ نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور نشے میں لتھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں ایک نیا آسمان بنا رہا ہوں......" وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ تب میں نے کہا۔

"بابا جی! آپ اکیلے اکیلے ہی نیا آسمان بنا رہے ہیں، مجھے بھی ساتھ میں شامل کر لو۔"

ملنگ میری بات سن کر چونک گیا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تمہاری سیر ابھی شروع نہیں ہوئی؟"

"نہیں بابا جی میری تو ابھی تک پیاس بھی نہیں بجھی، میں نے سیر کیا خاک کرنی ہے۔ اگر اجازت دیں تو یہ باقی پڑی فلک سیر پی لوں یا ابھی آپ پئیں گے؟"

اس نے لاچارگی والے انداز میں ہاتھ ہلا کر اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"اب اس سے زیادہ پینے کی میری گنجائش نہیں ہے، تم اگر پی سکتے ہو تو پی لو۔"

میں نے ایک بار پھر اس گرتے ہوئے ملنگ کو دیکھا، پھر پیالے اور کونڈے کو، میں نے کونڈا اٹھایا اور منہ کو لگا کر پینے لگا۔ کونڈا خالی کر کے جب میں نے رکھا تو وہ ملنگ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ میرے پینے سے نشہ اسے ہی ہو گیا ہو۔ وہ حیرت کی انتہا پر تھا، مگر کوئی بات نہیں کر پا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کا جھومنا بند ہو گیا اور وہ بائیں کروٹ زمیں بوس ہو گیا۔

میں نے ارد گرد دیکھا، مجھے ایک گھڑا دکھائی دیا۔ میں اس گھڑے کی طرف بڑھا تا کہ پانی لے سکوں، مگر وہ خالی تھا۔ میں نے پانی کے لیے ادھر ادھر دیکھا لیکن مجھے پانی نہیں ملا۔ میری نگاہ قریب بندھی ملنگ کی بکری پر پڑی۔ میں نے پیالہ اٹھایا اور بکری کا دودھ دھونے لگا۔ آدھے سے زیادہ پیالہ بھر گیا۔ میں واپس اس ملنگ کے پاس آیا اور دودھ کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر کچھ کہے بنا دودھ پینے لگا۔ پیالہ خالی ہوا تو میں نے الگ رکھ دیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ کب ہوش میں آتا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے ہوش آ گیا لیکن اس کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کبھی خالی کونڈے کی طرف اور کبھی میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ وہ کچھ کہے۔ تبھی اس نے پوچھا۔

"تمہیں کچھ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا

"یہ کمال تو بلانوش رند کا ہے۔ تم نے اسے کیسے حاصل کیا؟" اس ملنگ نے عاجزی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں تم پوچھنا کیا چاہتے ہو اور یہ رند کیا ہوتا ہے؟" میں نے جان بوجھ کر اس سے سوال کیا

"رند، مطلب وہ جو بلانوش ہو، جو نشے پر قابو پا لے۔" ملنگ نے کہا۔

"نہیں، میرے نزدیک رند وہ ہوتا ہے جو نشے میں سے ہوش حاصل کر لیتا ہے۔ میرے لیے یہ رندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔" میں نے اسے بتایا تو حیرت سے بولا۔

"لیکن، تمہیں نشہ کیوں نہیں ہوا، جبکہ میں تو چار پیالوں ہی میں اپنا نشہ پورا کر لیا کرتا ہوں۔ اتنی زیادہ تو کوئی برداشت نہیں کر سکتا جتنی تم پی گئے ہو۔"

"تم کیا چاہتے تھے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں ...... میں تمہیں گرانا چاہتا تھا۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم ایک دو پیالوں میں گر جاؤ گے۔"

اس کے اعتراف پر میں نے اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پردے ہی میں کہا۔

"مجھے نشہ اس لیے نہیں ہوتا کہ میں نے شرابِ عشق پی ہوئی ہے۔ جو شرابِ طہورہ کے نام سے مشہور ہے۔"

"یہ کون سی شراب ہوتی ہے، میں نے تو سنی نہیں۔ میں یہ پینا چاہتا ہوں تا کہ میں بھی تمہارے جیسا کمال حاصل کر سکوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔ اس کے یوں کہنے پر میں مسکرا دیا اور بولا۔

"یہ ایسے نہیں مل جاتی، اس کے لیے تھوڑا وقت لگانا پڑتا ہے، کیا تم میرے کہنے پر صبر کر سکو گے؟"

"جیسے آپ کہو۔" اس نے عاجزی سے جواب دیا تو میں نے اسے سختی سے کہا۔

"وہ سامنے بابا مسافر شاہ کا تھڑا دیکھ رہے ہو؟"

اس نے نگاہ اٹھا کر تھڑے کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی جی دیکھ رہا ہوں۔"

"تو چلو وہاں جاؤ اور روزانہ صبح سے شام تک وہاں

جھاڑو لگایا کرو، تیرے نشے کا بندوبست کرتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا۔'' اس نے کافی حد تک بے پروائی میں کہا۔
''نہیں اب تم نہیں بھی جانا چاہو گے تو میں وہاں پر رکھوں گا۔ اٹھو، ورنہ لے جانے والے تجھے یہاں سے لے جائیں گے۔'' میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔
''جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ وہ اپنی چیزیں اٹھانے لگا پھر اس نے اپنی بکری کھولی اور سارا ساز و سامان اکٹھا کر کے کاندھے پر رکھا اور ٹھڑے کی جانب چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی تھا۔
ہم واپس مسافر شاہ کے ٹھڑے پر آ گئے۔ جوگی اور اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی وہیں آ گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کمروں کے نزدیک اپنی جھونپڑیاں لگانا شروع کر دی تھیں۔ میں نے جوگی کو اپنے پاس بلایا اور اس ملنگ کے بارے میں ہدایات دیں۔ اس نے وہ سب غور سے سنا اور عمل کرنے کی یقین دہانی کروا دی۔ تب میں اشفاق کو لے کر وہاں سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔



ممبئی پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ سورج مغرب کی اوٹ چھپنے کو بے تاب تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ایسے میں بانیتا کور فارم ہاؤس کے ایک لان میں اکیلی ٹہل رہی تھی۔ اس کے ٹہلنے میں اضطراب واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی فیصلے تک پہنچنا چاہتی تھی۔ جسپال سنگھ ایک کمرے میں کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود بھی ایسی حالت میں تھا۔ وہ فیصلہ تو کر چکا تھا کہ اب جو بھی گیم کرنی ہے، وہ خود ہی کرنی ہے۔ تیواری کا نیٹ ورک پورے ممبئی میں تو نہیں پھیلا ہوا تھا، لیکن بوراولی میں اسے پوری دسترس حاصل تھی۔ جس طرح اس نے ونود رانا جیسے پولیس آفیسر کے بارے میں سنا تھا اور ملاقات میں اس نے محسوس بھی کر لیا تھا، وہ بندہ یوں تیواری جیسے مجرموں کی لعنت ملامت سنے، ایسا ہو نہیں سکتا تھا، مگر وہ مجبور تھا، سامنے اسے قطعاً جواب نہیں دے پا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ اس کے خلاف سرگرم تھا۔ اصل بات جو سوچنے والی تھی، وہ یہی تھی کہ ونود رانا یہ ثابت کر پائے گا کہ جو کچھ بھی ان کے خلاف ثبوت اکٹھے کیے گئے ہیں وہ جعلی ہیں اور جھوٹے ہیں؟ فوری طور پر دماغ اس بات کو ماننے سے انکاری تھا۔ کیا وہ فقط جھانسا دے کر ہمیں استعمال کر رہا ہے یا وہ ایسا کر پائے گا؟ لازمی بات ہے کہ بانیتا کور کے ذہن میں بھی یہی سوال ہوگا، تبھی اس نے اپنے استعمال ہو جانے کی بابت کہا۔ اب انہیں کرنا کیا ہوگا؟ کیا وہ تیواری والے معاملے کو چھوڑ دیں؟ یہودی لابی والے معاملے کو بھول جائیں؟ چونکہ را ان کے پیچھے ہے، وہ یہاں سے نکل جائیں؟ کیونکہ یہاں پر تیواری جیسے بندے سے نپٹنے کے لیے ان کے پاس وہ قوت نہیں تھی کہ اکیلے گیم کر سکیں۔ دوسری صورت میں وہ دوسرے کے ہاتھوں میں استعمال ہونے پر مجبور تھے۔
ایسے میں اس کے پیچھے نوتن کور آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے باہر بانیتا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کیا بات ہے؟ تم دونوں اتنا پریشان کیوں ہو؟''
اس پر جسپال سنگھ نے اس کے چہرے پر دیکھا، جہاں سکون پھیلا ہوا تھا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا
''میرے دماغ میں تیواری ہے اس وقت، اس کا دیا ہوا وقت ختم ہونے میں ایک آدھ گھنٹہ ہی رہتا ہے۔''
''تم خوف زدہ ہو اس سے؟'' نوین کور نے کسی تردد کے بغیر کہا تو جسپال نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ بولی۔
''مجھے بتاؤ، کیا کرنا ہے تمہیں؟''
اس پر جسپال نے طویل سانس لی اور بولا۔
''اس کے نیٹ ورک کی مجھے تھوڑی بہت شدبد آ گئی ہے۔ مجھے وہ توڑنا ہے لیکن.....''
''وہ اتنی جلدی ٹوٹ نہیں سکتا، تم اکیلے ہر جگہ

تو نہیں پہنچ سکتے۔ ظاہر ہے جب تک پوری معلومات نہ ہو، ان پر ایک بے وقوفی ہے، وغیرہ وغیرہ۔‘‘

’’تم کہنا کیا چاہتی ہو؟‘‘ جسپال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

’’تیرے اور میرے درمیان بانیتا نہیں جمال ہے اور میں نے جمال کے لیے ہی کام کرنا ہے، جو تم سوچ رہے ہو، وہ میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں پیپر پر سمجھاؤں کہ تمہیں کرنا کیا ہوگا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے نوتن نے بڑے نرم انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔

چند کاریڈرو پار کرنے کے بعد وہ اسے لیے اپنے کمرے میں آن پہنچی۔ اس نے جسپال کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود الماری کی جانب بڑھی۔ اس میں سے کچھ کاغذ اور قلم لے کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ کاغذ پر کچھ نشان تھے۔ وہ اسے سمجھانے لگی کہاں پر کیا کرنا ہے اور یہ سب کیسے ہوگا، وہ بھی اسے بتا دیا۔

’’ڈن ہو گیا، آؤ بانیتا سے......‘‘ جسپال نے جوش بھرے لہجے میں کہا اور اٹھ گیا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

’’یہ کبھی بانیتا کور پر ظاہر نہیں ہونے دینا کہ میں نے تمہیں یہ سب بتایا ہے، میں چاہے کام اسی کے لیے کر رہی ہوں، لیکن یہ سب جمال کے لیے ہے اور میں اسی کے لیے یہ سب کرتی رہوں گی۔ یہ میرا نیٹ ورک ہے۔ جو تمہارے لیے کام کرے گا۔ اس پر یہی ظاہر ہونا چاہئے کہ یہ سب تم نے کیا ہے، یہ سب تمہاری طاقت ہے۔ تم چاہو تو جانی بھائی کو بھی اپنے ساتھ شامل کر سکتے ہو۔ وہ جوہو کے علاقے کا سب سے بڑا بھائی ہے۔ بانیتا کے پاس صرف زوردار سنگھ کا نیٹ ورک ہے اور اب ٹی ایس ایس، یہ بھی بڑا گروہ ہے، لیکن اس کے اپنے مفاد ہیں۔‘‘

’’اوکے۔ میں اپنے مطابق چلوں گا۔‘‘ جسپال نے کہا اور باہر نکل پڑا۔ اس کے انداز میں تیزی اور جلدی تھی۔ اس وقت وہ بانیتا کے پاس پہنچا ہی تھا کہ جانی بھائی کا فون آ گیا۔ اس نے تمہیدی باتوں کے بعد کہا۔

’’ارے اوہ جسپال، اماں کدھر ہو، ممبئی میں ہوتے ہوئے تنہائی محسوس کرو، اپنا تو پھر ادھر نہ ہونے کا ہوا نا۔‘‘

’’میں بھائی فون کرنے ہی والا تھا۔‘‘ جسپال نے کہا۔

’’تو بس بول، کرنا کیا ہے، باقی میں دیکھ لوں گا۔‘‘ جانی بھائی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

’’ہم نے مل کر ہی کرنا ہے۔ میں پلان......‘‘

’’تم نے جو کرنا ہے کرو، میں ایک لڑکے کا نمبر دے رہا ہوں، اس سے بات کرو اور جو کہنا ہے وہ کہہ دو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے الوداعی بات کی اور فون بند کر دیا۔

’’کیا کرنے جا رہے ہو؟‘‘ بانیتا کافی حد تک سمجھ گئی تھی۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔

’’تم آؤ میرے ساتھ اروند کے پاس۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے کوئی بات کیے بنا فون جیب میں ڈالا اور مڑ گیا۔ وہیں اس نے اپنی معلومات کی بنیاد پر پلان ترتیب دینا تھا۔ وہ ایک دم سے جوش میں بھر گیا تھا۔

اس وقت ممبئی پر رات اتر آئی تھی۔ جسپال اور بانیتا فارم ہاؤس سے نکل کر آشا نگر کی طرف جانے کے لیے فور وہیل جیپ دوڑائے چلے جا رہے تھے۔ بانیتا ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ جسپال فون ہاتھ میں لیے مسلسل سوچ رہا تھا۔ تیواری کا وہ حویلی نما گھر جواہر نگر کے علاقے میں تلسی جھیل کے کنارے تھا، جس سے کچھ ہی فاصلے پر فلم سٹی کمپلیکس تھا۔ لیکن تیواری کے پیچھے جو دماغ تھے، وہ تین لوگ تھے۔ جو بوراویلی ہی کے مختلف علاقوں میں رہ رہے تھے۔ جسپال نے جو پلان ترتیب دیا تھا وہ یہی تھا کہ ایک ہی وقت میں ان تینوں کو اٹھایا جائے۔ ایک طرف نوتن نیٹ ورک کے لوگ تھے، دوسری جانب جانی بھائی کے اور تیسری طرف ٹی ایس کے لوگ۔ اس نے ونود رانا کو بتا دیا تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ پوری طرح اپنے لوگوں کے ساتھ الرٹ تھا۔

وہ پونا جانے والے روڈ پر تھا۔ ڈائمنڈ انڈسٹریل اسٹیٹ کے اسٹاپ پر پہنچ کر سڑک کے دائیں جانب ایک چھوٹا سا پختہ راستہ دھرکھاری گاؤں کی طرف جاتا

تھا۔ جسپال کے اشارے پر بانیتا نے جیپ ادھر موڑ لی۔ کافی آگے جا کر جنگل شروع ہو گیا، جہاں سے دھر کھاری گاؤں جدا ہو گیا تھا۔ وہ جنگل میں سفر کرنے لگے۔ دو کلو میٹر سے زیادہ سفر کرنے کے بعد جنگل کے درمیان کافی سارا کھلا میدان تھا۔ اس میدان کی شمال کی جانب ایک بڑا سارا گھر بنا ہوا تھا، جس میں لکڑی کا زیادہ کام تھا۔ اس کی دوسری منزل پر روشنی ہو رہی تھی۔ بانیتا نے اس گھر کے سامنے جیپ روک دی۔ وہ دونوں اترے اور بڑے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ملجگا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ راہداری پار کرتے ہی وہ ایک کھلے ڈرائینگ روم میں آ گئے۔ سامنے سیڑھیاں تھیں۔ وہ دونوں اس پر چڑھتے چلے گئے۔ وہ سیڑھیاں ایک بڑے سے ہال میں ختم ہوئیں۔ سامنے کمرے تھے۔ جس کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ سامنے اروند سنگھ، رونیت کور اور نوتن کور کھڑے تھے۔ تبھی نوتن کور بولی۔

''ممبئی میں یہ محفوظ ترین جگہ ہے۔ یہ میں نے کچھ عرصہ قبل خریدی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پرسکون وقت گذارنے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن اب یہی جگہ ہمارے لیے محفوظ پناہ گاہ ہوگی۔ یہیں بیٹھ کر ہم نے سب کچھ کرنا ہے۔''

''رات ہونے کی وجہ سے میں دیکھ تو نہیں پائی، مگر میں اسے گرین ہاؤس کہوں گی۔''

''تم جو مرضی کہو ڈارلنگ۔'' نوتن کور نے کہا۔

''بہت خوب نوتن، مجھے تمہاری ذہانت پر ناز ہے۔'' بانیتا اسے سراہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

مزید دو گھنٹوں میں اپنا سیٹ اپ بنا لیا۔ یہاں تک کہ ان کا رابطہ لاہور سے بھی ہو گیا۔ اروند اور جسپال اسکرین کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اروند اسے بتا رہا تھا۔ ''یہ گہرے سبز رنگ کے گول دائرے والے جانی بھائی کے لوگ ہیں اور یہ اپنے ٹارگٹ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ جو ہمیں یہاں ہلکے سبز رنگ کے دائرے میں دکھائی دے رہا ہے۔ میں ابھی ان کا ویڈیو لنک لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کی بورڈ کے ساتھ الجھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اسکرین پر منظر ظاہر ہو گیا۔

وہ گنیش نگر کے علاقے میں ایک کشادہ روڈ پر کھڑے تھے۔ روڈ لائیٹ سے وہاں کافی اجالا تھا۔ جس بندے کے پاس سگنل دینے والی ڈیوائس تھی، وہ باہر نکلا تو اردگرد کا منظر سمجھ میں آ گیا۔ وہ تین کاروں میں تھے۔ وہ آگے بڑھا اور مین گیٹ کے پاس چلا گیا۔ اس نے بیل دی اور انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں ہی میں ایک سیکورٹی گارڈ نے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہ کچھ بھی پوچھ نہیں سکا تھا۔ کسی نے اسے گردن سے پکڑ کر دہیں دبا لیا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ پورچ کے پاس دو سیکورٹی گارڈ بھاگ کر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ قریب نہ آ سکے، اس سے پہلے ہی ان کے فائر لگ گیا اور وہ سرمئی سڑک پر جا گرے۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ انہوں نے کاروں کی ترتیب جو بھی رکی لیکن وہ اندر ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے۔ وہیں ایک بوڑھا سا شخص بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ تبھی نوتن بولی۔

''یہی ہے، پاریل ادت جو اس کی ساری فنانس دیکھتا ہے۔ اس کے گھر میں بہو ہے اور اس کی بیوی باقی سب فارن میں ہوتے ہیں۔''

وہ حیرت سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لڑکا آگے بڑھا اور اس نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ پاریل ادت مزاحمت کرنے لگا۔ تبھی لڑکے نے اس کے سر پر زور سے پسٹل مارا۔ وہ ڈھلکتا ہوا بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ لڑکے نے اسے اپنے بازوؤں پر سہارا دیا اور باہر کی طرف نکلا۔ وہ بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے پاریل ادت کو لے جا کر کار میں ڈال دیا۔ باقی شاید کسی مزاحمت میں مصروف ہوں گے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک روڈ پر چل دوڑے۔ اسی دوران دوسری طرف سے بھی انڈیکیشن ہونے لگی۔ وہ ٹی ایس کے لوگ تھے۔ پہلے والا منظر چھوٹا ہو کر اسکرین کی اوپر کی طرف چلا گیا

منظر سامنے آ گیا۔
وہ پٹیر وادی کے علاقے کے ایک بار میں تھے۔ رنگ برنگی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مختلف لوگ ناچ رہے تھے۔ کچھ صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں ایک جوان العمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو نیم برہنہ لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں کھویا ہوا تھا۔
''یہ بمل راج ہے، جو اس کی ساری غنڈہ گردی کو دیکھتا ہے۔ یہی بندہ اس کی طاقت ہے۔'' نوتن نے بتایا
''حیرت یہ ہے کہ یہ یہاں بیٹھا ہے، اسے تو......''
بانیتا نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔
''اسے ابھی تک روکا گیا ہے پولیس اگر آج رات تک گوپال نند کو تلاش نہ کر سکی تو یہ کرے گا۔ لیکن اس کے لوگ شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ باران کا سب سے بڑا ٹھکانہ ہے۔''
''ٹی ایس کے لوگ بڑی خطرناک جگہ جا پہنچے ہیں۔'' جسپال کے منہ سے بے ساختہ نکلا
''وہ تو ہے، لیکن ابھی دیکھنا۔'' نوتن نے کہا تو وہ سب اسکرین کی طرف دیکھنے لگے۔ بمل راج کو کسی نے مخاطب کیا تو اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ پل بھر بات سننے کے بعد اس کے چہرے پر غصے کے آثار واضح ہو گئے۔ وہ ایک دم سے اٹھ گیا اور تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ وہ بار کے کاریڈور میں تھا، تبھی کسی نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا، اس میں قوت برداشت تھی کہ وہ ضرب کھا کر گرا نہیں بلکہ ایک دم سے پلٹا۔ تب تک اُسے دوسری ضرب پڑ چکی تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ کسی نے اسے سہارا دے دیا۔ اچانک وہاں پر فائرنگ ہونے لگی۔ شور اور چیخوں کی آواز بڑھ گئی۔ کچھ دیر ہی میں منظر بدل گیا۔ وہ باہر سڑک پر تھے اور کار بھاگنے لگی تھی۔ اوربند سنگھ نے وہ منظر بھی اسکرین کے اوپر چھوٹا کر دیا۔ پہلے والے منظر پر بھی بھاگتی ہوئی سڑک نظر آ رہی تھی۔
تیسرا منظر واضح ہو گیا تھا۔ وہ کرشنا کالونی کا علاقہ تھا۔ وہاں ایک گلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بوراویلی کا پرانا علاقہ تھا۔ گلی کی نکڑ پر کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، وہ جوان سا بندہ تھا جس سے جا کر نوتن کور کے لوگ باتیں کرنے لگے۔ وہ کافی حد تک سکون سے باتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اٹھ گیا۔
''یہ ہر دیک پوڑ وال ہے، تیواری کے سیاسی معاملات اور میڈیا کے مسئلے یہی حل کرتا ہے۔ یہ خود ایک اچھا صحافی ہے، تیواری نے اسے غربت کے باعث خریدا ہوا ہے۔''
''اب دیکھیں اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟'' بانیتا بڑبڑائی۔ تب تک کچھ لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اچانک ہر دیک پوڑ وال کو کسی نے دھکا دیا۔ وہ منظر سے ہٹ گیا۔ سامنے کھڑے لوگ ہکا بکا تھے۔ کیمرہ تیزی سے حرکت میں آیا، وہ بھی وین میں داخل ہو گیا۔ وین میں ہر دیک پوڑ وال نیچے پڑا ہوا تھا۔ اور وہ بھاگے جا رہے تھے۔
''چل بانیتا نکل۔'' جسپال نے تیزی سے کہا اور کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ وہ بھاگتے ہوئے نیچے آئے اور باہر نکل کر فور ویل میں جا بیٹھے۔ جسپال نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے اسٹارٹ کیا اور یوٹرن میں واپسی کی طرف پلٹا اور رفتار بڑھا دی۔
وہ پونا سے ممبئی کی جانب چل نکلا تھا۔ ایک اسٹاپ سے ذرا آگے نکل کر وہ سڑک سے اتر گیا اور کچے راستے پر گاڑی بھگاتا ہوا چلتا چلا گیا۔ وہاں بھی ایسا ہی ایک گھر تھا لیکن وہ چھوٹا تھا اور سارا لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک ندی بہہ رہی تھی، جس کا پانی ایک آبشار سے گرتا تھا۔ اس نے جا کر وہاں جیپ روک کر ہیڈ لائیٹس بند کر دیں۔ ایک دم سناٹے نے انہیں گھیر لیا۔ وہ دونوں نیچے اترے اور اس گھر کی جانب بڑھے۔ جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولا، اندر روشنی ہو گئی۔ دونوں جوان

ہاتھوں میں گنیں پکڑے الرٹ تھے۔ یہ سارا بندوبست نوتن کور کا تھا۔ یہ سارے لوگ اسی کے نیٹ ورک سے متعلق تھے۔ جسپال نے وہاں کی صورت حال کے بارے میں پوچھا تو ایک نوجوان نے بتایا کہ ارد گرد پوری سیکورٹی موجود ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔ وہ کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ وہ ایک بات اوپر گیا، نیچے ٹہلتا رہا یہاں تک کہ اس کے سیل فون پر ان تینوں کی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی گئی۔ یہ اطلاع وہاں کے سیکورٹی چیف کو بھی مل گئی تھی۔ وہ الرٹ ہو گئے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک ہائی ایس وین وہاں آ گئی۔ وہ اس طرح آ کر کھڑی ہوئی کہ وین اور گھر کا دروازہ آمنے سامنے تھا۔ وین میں فقط چار آدمی تھے۔ وہ تینوں، جنہیں اغوا کیا گیا تھا اور ایک جوان گورال، پانچواں ڈرائیور تھا۔ وہ تینوں بے ہوش تھے، جنہیں جلد ہی گھر کے اندر پہنچا دیا گیا۔ جسپال اس شخص پر بہت خوش تھا، جس نے ان تینوں کے اغوا کو منظم کیا تھا۔ اتنے لوگوں کا رش اس نے کہیں راستے ہی میں ختم کر دیا تھا۔ وہ اسی سے رابطے میں تھا۔

ان تینوں کو اس گھر میں موجود بڑے سارے تہہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ ساتھ آیا نوجوان گورال انہیں ہوش میں لا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش میں آ گئے۔ جس نے بھی آنکھ کھولی اس نے اپنے سامنے کھڑے، بانیتا اور گورال کو پایا۔ سب سے پہلے بمل راج نے اکھڑ لہجے میں سوال کیا۔

''کون ہو تم لوگ اور ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟''

بانیتا آگے بڑھی اور پوری قوت سے جوتے کی نوک اس کے منہ پر دے ماری۔ وہ بلبلا اٹھا۔ دوسرے سہم گئے۔ تبھی وہ گورال آگے بڑھا اس نے بھی ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں پر ماری۔ وہ چند لمحے اکٹھا ہو گیا۔ شاید اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ تبھی بانیتا آگے بڑھی اور اس نے تینوں کی طرف دیکھ کر سرد سے لہجے میں کہا۔

''تیواری، صرف تیواری کے بارے میں بات ہو گی۔ اس کے علاوہ صرف موت مل سکتی ہے۔ سمجھے یا نہیں؟''

''کیا چاہتی ہو تم؟'' بوڑھے پاریل ادت نے پوچھا۔

''تیواری کے وہ سارے کالے کارنامے، جو اس نے تم لوگوں کے ذریعے کیے ہیں۔ تم نہیں بتاؤ گے تو کوئی اور بتا دے گا لیکن تم لوگوں کا فقط اتنا نقصان ہو گا کہ تم لوگوں کے گھر کا ہر ہر فرد ایک ایک کر کے مار دیا جائے گا اور آخر میں تم لوگ مار دیئے جاؤ گے۔ تمہاری ہڈیاں اسی تہہ خانے کے کچے فرش میں دبا دی جائیں گی۔ اب فیصلہ تم لوگوں نے کرنا ہے کہ کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' بانیتا نے کسی دوسرے درجے کی فلم کے ولن کی مانند کہا۔

''تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی ہو......'' بوڑھے پاریل ادت نے کہا۔

''تمہارے لیے نہ سہی، لیکن اتنا تو پتہ چلا کہ اتنی گہری وفاداری ہے کہ اپنے بچے بھی اس پر......''

''نہیں تم غلط سمجھی ہو، ہم بتا بھی دیں تو اس نے کوئی جرم کیا ہی نہیں، جب اس نے جرم کیا ہی نہیں تو ثابت کیا ہو گا۔ ہم نے کیا ہے سب، سارے سیاست دانوں کے فرنٹ مین ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی عدالت اسے سزا نہیں دے سکتی۔'' اس بار اس کا لہجہ مایوسی بھرا تھا۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت گھاگ قسم کا بندہ ہے۔

''غلط کہتے ہو تم۔'' سیڑھیوں سے اترتے ہوئے جسپال نے کہا تو سبھی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ ان کے قریب آ کر بولا۔

''دراصل تم سب بھڑدے ہو۔ دلال، دھرتی کو ماتا مانتے ہو اور اپنی ماں ہی کا سودا کرنے والے دلال، ماں بیچنے والے۔'' یہ بات سن کر بمل راج غصے میں پاگل ہو گیا۔ اس نے انتہائی نفرت اور حقارت سے کہا۔

''تمہیں یہ بہت مہنگا پڑے گا''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ بانیتا نے پہلے کی

طرح ایک زوردار جوتے کی نوک اس کے منہ پر ماری۔

"کوئی بھی کسی کو باندھ کر مار سکتا ہے، میرے ہاتھ پیر کھولو تو میں تمہیں بتاؤں۔" وہ زور سے چیختے ہوئے بولا۔

"شرط یہ ہے کہ جو ہار مان جائے، دوسرا اسے قتل کر دے گا۔" بانیتا نے کچھ اس طرح کہا کہ سبھی نے ایک دفعہ اسے دیکھا تب تک اس نے گورال کو اسے کھولنے کا اشارہ کر دیا۔ بمل راج کے ہاتھ پیر جیسے ہی کھلے، وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بانیتا نے اسے پوری طرح اٹھنے ہی نہیں دیا اور لات گھما کر اس کی کمر پر دے ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار تک گیا۔ بانیتا اسے مارنے کو لپکی، لیکن وہ بجلی کی سی سرعت سے پلٹا اور اس نے ایک کھڑی ہتھیلی بانیتا کی گردن پر ماری۔ وہ ہل گئی۔ اس نے وہ لمحہ ضائع نہیں کیا، اس نے پنچ ماتھے کے درمیان میں مارا۔ وہ گھوم کر زمین پر گری، تبھی وہ اسے پکڑنے کے لیے لپکا، یہی اس کی غلطی تھی۔ بانیتا ایک طرف ہٹ گئی وہ زمین پر آن رہا۔ اس نے دونوں ہاتھ باندھے اور اس کی گردن کی پچھلی طرف پوری قوت سے مارے۔ وہ بالکل ہی زمیں بوس ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک ٹھوکر اس کی پسلی میں ماری۔ وہ تڑپ کر اٹھنے لگا مگر وہ بانیتا ہی کیا جواب اسے اٹھنے دیتی۔ وہ وحشیوں کی مانند اس پر پل پڑی۔ بمل بے ہوش ہو گیا۔ اس نے کالر سے پکڑ کر اٹھایا لیکن وہ نہیں اٹھ سکا۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے الگ ہو گئی۔ جوان آگے بڑھا اور وہ اسے ہوش میں لانے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آ گیا تو وہ نہایت غصے میں بولی۔

"کوئی بھی حلال زادہ غنڈہ گردی نہیں کرتا، امیروں کا کتا بن کر غریبوں پر نہیں بھونکتا۔ اس کے خون میں شک ہوتا ہے جو کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اٹھ، اب بتا، کس طرح مرنا چاہے گا، بول۔"

وہ اسے مارے جا رہی تھی اور انتہائی وحشت سے کہتی جا رہی تھی۔ تبھی جسپال نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، اسے مارنا مشکل نہیں ہے، اسے چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر اس نے بمل راج کو اس سے چھڑا لیا۔ وہ بے دم سا زمین پر پڑا تھا۔ چند لمحے یونہی خاموشی میں گذر گئے تو وہ بولا۔

"پاریل جی، تم جانتے ہو کہ تیواری نے دو پولیس آفیسر مارے ہیں اور اب تیسرے کی باری ہے۔ اس کے جرائم کی لسٹ بہت بڑی ہے۔ اور......"

"مگر تم کچھ بھی ثابت نہیں کر پاؤ گے۔" بوڑھے پاریل نے کہا۔

"تو جس نے کیا، اسے تو سزا ملنی چاہئے نا، مثلاً تمہیں اور تیرے ان سب کو جنہوں نے اس کے ساتھ وفاداری کرتے ہوئے بے گناہ لوگوں پر ظلم کیا۔" جسپال نے کہا تو اس پر پاریل خاموش رہا۔ کوئی کچھ نہیں بولا تو اس نے کہا، "تیواری اور تم جیسے سب لوگ اب میری ہٹ لسٹ پر ہیں۔ مجھے اب ثبوت بھی نہیں چاہیے، میں صفائی چاہتا ہوں۔ تم لوگ اگر قانون سے کھیل سکتے ہو تو تمہارے باپ بھی ادھر ہی رہتے ہیں۔ تم لوگوں نے دولت کمانے کے لیے ہر چھوٹا بڑا جرم کیا، جس نسل کے لیے تم نے دولت لوٹی ہے، وہ دولت استعمال کرنے والی نسل ہی نہیں رہے گی۔ اس دولت کا کوئی والی وارث نہیں ہوگا۔ ایک ایک فرد مار دوں، تم جیسے بے غیرتوں کی نسل ختم کرنا ہوگی، سانپ ہو یا سنپولیا۔ ایک ہی چیز ہیں۔"

وہ بہت زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس نے بوڑھے پاریل کی کے بڑھاپے کی پروا کیے بغیر اسے اٹھایا اور پوری قوت سے دیوار میں دے مارا۔ وہ دیوار کی جڑ میں بے دم سا ڈھیر ہو گیا۔ تبھی وہ ہردیک پوڑوال کی طرف بڑھا۔ وہ پرسکون تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے جسپال کو روکتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تیواری کے وہ ثبوت ہیں، جن کے بارے میں تم لوگوں کو ہوا بھی نہیں لگ سکی، میں وہ ثبوت دے دیتا ہوں، لیکن کیا گارنٹی ہے کہ تیواری سزا پا لے گا، مجھ پر یا میرے خاندان پر کوئی عتاب نہیں آئے گا، کرپٹ پولیس والے مجھے جگہ جگہ تنگ نہیں کریں گے،

حتی کہ میں کسی کتے کی طرح کسی سڑک پر مر جاؤں گا اور میری لاش بھی کوئی نہیں پہچان پائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو ہردیک، ہوتا یہی ہے، سیاست میں گند اتنا پھیل چکا ہے کہ اس کی سڑاند سے ہر آدمی کا دماغ جل رہا ہے۔ کہیں سے تو یہ گند صاف کرنا ہے، مجھے ثبوت دو اور جو تم چاہتے ہو، میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔" جسپال نے حتمی انداز میں کہا۔

"صرف یہ پتہ نہ چلے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔

"ڈن ہو گیا۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"وہ میرے پاس یہاں تو نہیں ہے۔ کچھ ویڈیوز ہیں، دستاویزی ثبوت ہیں اور وہ کچھ جو ابھی سمجھ میں آ رہا لیکن ہو رہا ہے، اس پر ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔" ہردیک نے کہا تو جسپال نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

"تمہیں اپنے کسی پر اعتماد ہے؟"

"ہاں، میرا ایک دوست یہ سب کچھ لا سکتا ہے۔" اس نے تیزی سے جواب دیا تو جسپال نے اپنا سیل فون نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"لے یہ بات کر۔"

ہردیک نے فون پکڑ لیا۔ اس نے نمبر ملائے اور اپنے کسی دوست سے بات کرنے لگا۔ اسپیکر آن تھا، ان کے درمیان ہونے والی گفتگو وہ سن رہے تھے۔ اس کا دوست پریشان تھا کہ وہ کدھر ہے؟

"یہ پریشانی چھوڑ کہ میں کہاں، کیونکہ مجھے خود نہیں معلوم یہ جگہ کون سی ہے اور وہ لوگ کون ہیں؟"

"کوئی اتا پتا، کوئی اندازہ ہے پولیس کو......"

"نہیں، پولیس کو قطعاً نہیں بتانا اگر تم میری زندگی چاہتے ہو تو۔ پولیس کو ہرگز اطلاع نہ دی جائے۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

"تو پھر میں کروں، مجھے بتاؤ۔" اس کے دوست نے بے چارگی سے کہا۔

"دیکھو، تم میرے گھر جاؤ، میرے کمرے میں جو میری الماری ہے اس میں ایک سیاہ رنگ کی فائل پڑی ہوگی، کافی موٹی ہے۔ وہ اٹھاؤ اور باہر نکلو۔" یہ کہہ کر اس نے جسپال کی طرف دیکھا تاکہ معلوم کر سکے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ جسپال نے اسے اشارہ کیا کہ بس۔ تب اس نے اپنے دوست سے کہا۔

"پھر اسی نمبر سے جیسے کہا جائے ویسا ہی کرنا۔"

"میں کرتا ہوں لیکن وہ لوگ......" اس کے دوست نے کہا تو ہردیک تیزی سے بولا۔

"اگر تم میری زندگی چاہتے ہو تو یہ فوراً کرو۔"

"او کے۔" اس نے کہا تو فون بند کر دیا گیا۔ وہ بات کر چکا تو اس نے ہانپتا سے کہا۔

"اب تیری زندگی کا انحصار اس فائل پر ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جسپال کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھایا اور واپس اوپر جانے کے لیے پلٹ گیا۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں جسپال کے سیل فون پر ہردیک کے دوست کی کال آ گئی۔ اس سے پہلے جسپال نے ونود رانا سے رابطہ کر لیا تھا۔ ونود رانا کے چند اہم بندے اس جگہ پہنچ گئے، جہاں سے ہردیک کو اٹھایا گیا تھا۔ وہ بغیر وردی میں تھے۔ اس کے قریب ہی ایک سنسان جگہ پر انہیں ملنا تھا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ مرحلہ بھی طے ہو گیا اور کچھ دیر بعد وہ فائل ونود رانا کے پاس پہنچ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جسپال کو ونود رانا کی کال ملی۔ وہ بہت پر جوش تھا۔

"بہت خوب جسپال، اگرچہ اس کے جرائم سے کہیں کم یہ ثبوت ہیں لیکن اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ تم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اب تمہیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لوں گا۔ لیکن میری ایک خواہش ہے۔" جسپال نے کہا۔

"بولو۔" اس نے ممنونیت سے پوچھا۔

''جب بھی اسے گرفتار کرنے کے لیے جایا جائے، مجھے ضرور ساتھ لے جائیں۔'' اس نے کہا تو ونود رانا چند لمحے خاموش رہا پھر ایک دم سے بولا۔

''ٹھیک ہے، لیکن میں تمہیں اس کے گھر نہیں لے کر جاؤں گا، تھانے لے جانے سے پہلے کچھ دیر ملاقات کروا دوں گا۔''

''یہ زیادہ بہتر رہے گا۔'' جسپال نے کہا۔

''میری کال کا انتظار کرنا۔'' ونود نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جسپال نے فون جیب میں رکھا اور مسکرا دیا۔

رات کا پچھلا پہر چل رہا تھا۔ جسپال اور بانیتا ابھی تک وہیں تھے جہاں ان تینوں کو رکھا ہوا تھا۔ جسپال شدت سے ونود رانا کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ہرویک بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دل میں تیواری کے لیے شدید نفرت تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا تھا کہ غربت میں اس کے پاس سوائے جرائم کی زندگی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر اس کا ضمیر ہر وقت ملامت کرتا رہتا تھا۔ دو برس پہلے اس کے غنڈوں نے اس کے ایک دوست کو صرف اس لیے مار ڈالا کہ الیکشن میں اس نے بھرپور مخالفت کیوں کی تھی۔ تب سے اس نے سوچ لیا کہ وہ صحافی تو بن ہی چکا ہے، کیوں نا تیواری سے انتقام لیا جائے۔ وہ رسک لے چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سوچ چکا تھا کہ اگر اس میں اسے ناکامی ہوئی تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ تھائی لینڈ کی طرف نکل جائے گا۔ وہ اسی پر بات کر رہے تھے کہ ونود رانا کا فون آ گیا۔ جسپال نے رسیو کیا تو وہ بولا۔

''کتنی دیر میں آ سکتے ہو؟''

''کہاں آنا ہوگا۔''

''وہیں جہاں ہم ملے تھے۔ اس کے قریب ہی۔''

''ایک گھنٹہ تو لگ سکتا ہے۔''

''کہیں تم وہیں تو نہیں ہو، جہاں وہ ابھی تک ہیں۔''

''وہیں ہوں۔'' میں نے بتایا تو اس نے کہا۔

''تمہیں شاید زیادہ وقت لگ جائے۔ تم سیدھے بوراولی پولیس اسٹیشن کے پاس آ کر مجھے کال کرو۔''

''میں آ رہا ہوں۔'' جسپال نے کہا اور بانیتا کو فون کیا۔ وہ ان تینوں کو وہاں موجود گورال کے سپرد کر کے فوراً ہی آ گئی۔ بانیتا نے اروند کو فون کیا تا کہ وہ ہمیں گائیڈ کر سکے اور وہاں سے نکل پڑے۔ وہ چالیس منٹ سے بھی کم وقت میں بوراولی پولیس اسٹیشن کے پاس ایک چوک میں آ کر رک گئے۔ وہاں سے اس نے کال کر کے ونود کو بتایا وہ اسے کافی حیرت ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کیسے پہنچ گیا۔

''اچھا کیا تم جلدی پہنچ گئے ہو، یہیں اسی چوک سے ٹرن لو بائیں جانب، آگے دو گلیاں چھوڑ کر تیسری میں بائیں جانب ہی گلی میں آ جاؤ۔ میں باہر ہی ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ وہاں پہنچے تو ونود گلی کی نکڑ پر ہی تھا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔ اس نے کار وہیں کھڑی کرنے کو کہا اور اپنے ساتھ پولیس وین میں بٹھا لیا۔ ایک بار بانیتا نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یہی تھا کہ کہیں یہ پولیس والے ہمیں دھوکے سے بڑے آرام کے ساتھ لے کر تو نہیں چلے۔ ہم تیواری کا شکار کر رہے تھے اور تیواری ہمارا شکار کر لے؟ میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ مختلف سڑکوں اور گلیوں میں سے بھگاتا ہوا ایک پرانی بلڈنگ میں لے گیا۔ جس کے سامنے کافی گند تھا اور نشئی قسم کے لوگ سوئے پڑے ہوئے تھے۔ ہم تینوں اندر چلے گئے۔ دوسری منزل پر ایک کمرے میں خاصا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ دھول بھی خاصی تھی اور ایک خاص طرح کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ وہیں چند لوگ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی پانڈی کام سے تھکے ہارے ہوں۔ اس کے اندر سے ایک مزید کمرہ کھلتا تھا۔ وہ انہیں وہاں لے گیا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے سامنے ایک کرسی پر تیواری بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ غضب ناک تھا۔ اس کے ساتھ دو گرانڈیل گارڈ کھڑے تھے۔ ونود نے جاتے

ہی بڑے ادب سے کہا۔

''جناب کیا یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے.....'' لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے تھے کہ تیواری انتہائی غصے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''انہیں تم ایسے ہی لے آئے ہو، ان کی ٹانگیں اور بازو کیوں نہیں توڑے تم لوگوں نے، کیا وہ تینوں آگئے ہیں، جنہیں یہ اغوا کر کے لے گئے تھے۔''

اس کے یوں کہنے پر بانیتا اور جسپال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بانیتا کی آنکھوں میں یہی تھا کہ کیا میں نے تمہیں پہلے نہیں اشارہ دیا تھا کہ ونود ہمارے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے۔ اس نے بھی ڈبل گیم کھیلی تھی۔ ایک طرف تیواری کے خلاف ثبوت لے لیے اور دوسری طرف انہیں لے جا کر تیواری کو خوش کر دیا۔ جسپال کے بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ ایسے تو ان کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ وہ ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ بانیتا اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کر لیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی طے شدہ حکمت عملی پر عمل کرتے ونود بولا۔

''سر! وہ تینوں بھی برآمد ہو گئے ہیں۔ وہ انتہائی زخمی حالت میں ہیں۔ انہیں میں نے اسپتال بھجوا دیا ہے، وہاں ان کی ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے۔ جیسا آپ نے کہا میں ان سے وہی سلوک کرتا مگر مجھے انہیں آپ کے سامنے بھی تو لانا تھا اور دوسرا میں نے ان کا ڈنگ نکال دیا ہے۔ یہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اب آپ جو کہیں میں وہی سلوک ان کے ساتھ.....''

''تم بولتے بہت زیادہ ہو۔ خیر انہیں ہمارے حوالے کرو، ہم دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے انتہائی نخوت سے کہا تو جسپال بولا۔

''دیکھو تیواری، اگر تم مرد ہو تو اپنی زبان پر قائم رہو، تم نے چوبیس گھنٹوں میں مجھے پکڑنا تھا، وہ تم نہیں پکڑ سکے۔ ہم نے تیرے.....''

''ابے چپ سالا مرد ہونے کی بات کرتا ہے، ہم یہاں حلف دے کر اس کا پاس نہیں کرتے، وعدوں کی پاس داری کرتے رہے تو کر لی سیاست،'' یہ کہہ کر اس نے اپنے گارڈز کی طرف دیکھا اور بولا۔

''لے چلو انہیں۔'' جیسے ہی وہ آگے بڑھے، ونود نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اسٹل سیدھا کیا اور یکے بعد دونوں کے چہروں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ گھوم کر فرش پر جا پڑے۔ ونود نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پورا میگزین ان پر خالی کر دیا۔ تیواری ایک دم حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس کی آنکھیں باہر آ گئیں۔

''یہ..... یہ کیا کیا تو نے.....؟'' وہ حیرت کی انتہاؤں پر تھا اس لیے لکنت زدہ آواز میں بولا۔

''تم نے بہت بے غیرتی کر لی، تیرے سارے ثبوت میرے پاس آ چکے ہیں۔ وہ تینوں میرے مہمان ہیں اور انہوں نے ہی وہ ثبوت دیئے ہیں۔ میں نے تو تیرے ساتھ کھیل کھیلنا ہے، تو اب میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا، اگر تجھے پھانسی نہ بھی ہوئی تو جیل میں تجھے مروا دوں گا۔ پولیس والوں کے قتل ایسے ہضم نہیں ہوتے۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، تمہاری گرفتاری پر میڈیا میں واویلا اٹھے گا، تمہاری پارٹی اور بے غیرت سیاست دانوں کا وہ کلب جس کے تم ممبر ہو وہ طوفان بدتمیزی اٹھائے گا۔ پورا بھارت ہی نہیں بلکہ دنیا بھی یہ جان لے کہ تم پکڑے گئے ہو۔ سنو، یہ سب تمہارے ہی خلاف استعمال کرنے والا ہوں۔ جگجیت بھر بھرے میرے محسن ہیں، ان کے خلاف سوچنے والے کو بھی میں موت کی نیند سلا دیتا ہوں۔''

''تم جو چاہو سو کرو، مگر مجھ سے جلدی بات کرو۔'' شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ونود اسے مارنے والا نہیں اس لیے جسپال آگے بڑھا اور اس نے اسے گریبان سے پکڑ کے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اگر کوئی غلط فہمی ہے تو دور کر لو، میں تمہارے حلق میں اب بھی گولی مار سکتا ہوں۔ باہر سے کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ وہاں سب اپنے ہی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، جو پہلے ہی تیرے ساتھ آئے قافلے کو کہیں دوسری جگہ لے جا چکے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور فرش پر گر گیا۔

"سنو، میں کیا چاہتا ہوں۔ تمہارے لوگ اس گرفتاری کو محض سیاسی رنگ دیں گے۔ یہ سیاسی رنگ رہ سکتا ہے اگر تم اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ فلم غلط ثابت کرو، جو اپنے ہی لوگوں کے ذریعے تم نے بانیتا تک پہنچائی تھی۔" ونود نے کہا۔

"اوہ، یہ ہو جائے گا۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تب تک تم میرے مہمان رہو گے۔ میں تمہاری گرفتاری نہیں ڈالوں گا، بس تم بھی اغوا ہو گئے ہو۔ دوسروں کی طرح۔ واویلا کرو گے تو تمہاری لاش کسی ویرانے سے برآمد کر لی جائے گی۔"

"ونود، تم اسے ایک دن رات رکھنا چاہتے ہو؟" بانیتا نے پوچھا۔

"ہاں، مگر تم کیوں......"

"کل رات اسے مجھ سے لے لینا۔ یہ مجھے دے دو، مجھے اس سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

"دیکھ لو، یہ رابطہ کیسے کرے گا اپنے لوگوں سے؟" ونود نے لمحہ بھر سوچ کر کہا۔

"یہ میرا دردِ سر ہے۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"لے جاؤ۔" ونود نے کہا تو بانیتا کسی چیل کی طرح اس پر جھپٹی۔ اسے دو چار ایسی لگائیں کہ وہ بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ تب تک ونود اپنے لوگوں سے رابطہ کر چکا تھا۔ وہ پولیس کی حفاظت میں تیواری کو وہیں چھوڑ گئے، جہاں وہ پہلے تینوں تھے۔



مغرب سے ذرا دیر بعد میں اماں کے پاس جا پہنچا۔

وہ کمرے میں اکیلی ہی تھیں۔ میں ان کے پاس بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

"اماں! تو نے مجھے بتایا نہیں۔ اتنی بیمار ہو گئی ہو اور......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات پر ٹوکتے ہوئے بولیں۔

"پتر، میں بیمار نہیں ہوں۔"

"اماں یہ ڈاکٹر، سوہنی، تائی یہ سب کیا جھوٹ بول رہے ہیں۔" میں نے نرم سے لہجے میں کہا تو وہ بولیں۔

"تن کا زخم سب کو دکھائی دے جاتا ہے پتر لیکن جو من میں ہو اسے صرف وہی محسوس کر سکتا ہے، جس کے من میں ہو۔"

"میں سمجھا نہیں اماں؟" میں نے جان بوجھ کر پوری بات سمجھنے کے لیے پوچھا تو بڑے نرم لہجے میں بولیں۔

"وہ سب سچے ہیں کہ انہیں یہی دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن اصل سچائی کیا ہے، یہ تو میں ہی جانتی ہوں نا۔"

"اماں تو اپنے پتر کو بھی نہیں بتائے گی؟" میں نے شکوہ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تجھے ہی تو بتانا ہے پتر۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے یوں خاموش ہو گئیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ پھر جیسے ان کے خیالات مجتمع ہو گئے تو وہ بولیں۔

"اس کائنات میں ہر جاندار شے اپنے ماحول میں خوش رہتی ہے، بعض اوقات تو ماحول پر ہی اس کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ جیسے مچھلی، پانی کے بنا مر جاتی ہے، میری حالت بھی ایسے ہی ہے پتر۔"

"کیا آپ کو یہ ماحول پسند نہیں ہے؟" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، بلکہ میں یہاں لمحہ لمحہ مرتی ہوں۔ میرا دم گھٹتا ہے یہاں۔ یہ حویلی چاہے اب سوہنی کے پاس ہے، وہی اس کی مالک ہے لیکن یہاں وہ شخص رہا ہے، جس نے تیرے باپ کو قتل کیا۔ چاہے تم نے اس سے انتقام لے لیا ہے۔ لیکن مجھے تو ہر دم احساس رہتا ہے۔ مجھے ہر دم یہی

یاد رہتا ہے۔ میں بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھلا پاتی۔ میں اگر اس ماحول سے الگ ہو جاؤں تو میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔"

"تو پھر الگ کیوں نہیں ہوئیں۔ اتنی اذیت کیوں برداشت کر رہی ہیں، کیا مجبوری ہے آپ کو۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"سوہنی ہی کی مجبوری ہے مجھے۔ وہ صرف خدمت گزار ہی نہیں میرے لیے اور بہت زیادہ اہم ہے۔ وہ کیا تھی جب میرے پاس آئی تھی، اور اب کیا ہے، یا تم نے اس میں فرق ہی محسوس نہیں کیا؟"

"اماں! وہ تو ساری کی ساری بدل گئی ہے۔" میں نے اعتراف کیا

"بس یہی، میں اسے یہ دُکھ کہہ نہیں سکتی اور اس کا بھی تو اب کوئی نہیں ہے۔ میں اب اُسے چھوڑ بھی نہیں سکتی۔" اماں نے بے چارگی سے کہا۔

"درمیان میں فقط ماحول ہی ہے نا، میں ایسا کرتا ہوں، آپ دونوں کو لندن بھجوا دیتا ہوں۔ وہاں آپ کا علاج بھی ہوگا اور آپ کا ماحول بھی بدل جائے گا، پھر اس کے بعد سوچ لیں گے۔" میں نے اس کا حل دیا تو وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"نہیں پتر، وہاں جا کر تو شاید میں زندہ ہی نہ رہ سکوں، کیا تم سارا کو بھول گئے ہو، جس نے یہاں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ تانی کا کون ہے؟ اشفاق کا کون ہے؟ بھیدہ بے چارہ کہاں جائے گا۔ وہ میرے آسرے جی رہا ہے۔ میں ان سب کی ماں بھی ہوں اور باپ بھی۔ پھر وہ سب جن کی اب میں آس ہوں۔"

"تو اماں بتاؤ، میں کیا کروں کہ تو خوش رہے؟" میں بے چارگی سے پوچھا تو ایسے میں سوہنی اندر آ گئی اور بڑے سکون سے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر بولی۔

"میں بتاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ یوں باتیں سننا انتہائی غلط بات ہے۔ لیکن ماں بیٹے کی باتیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جمال کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ سو میں اماں کے ساتھ اسی گھر میں رہوں گی۔ میں خود یہاں گھٹن محسوس کرتی ہوں۔ یہ گھر میں سارا کو دے دوں گی۔ وہ اسے جیسے چاہے استعمال کرے اور اماں اب میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"جیسے تیری مرضی پتر، میں تو زندہ ہی اب تم لوگوں کے لیے ہوں۔" اماں نے کہا۔

"چلیں آئیں، میں نے کھانا لگوا دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ میں نے اماں کو اٹھایا اور باہر چل دیا۔

کھانے کی میز پر سبھی تھے۔ تبھی اشفاق نے میری اور جوگی والی جو ملاقات ہوئی اور جو سانپ والا واقعہ ہوا، وہ سب بتا دیا۔ اس نے ملنگ والی بات شاید اس لیے نہیں بتائی کہ وہاں جو ہوا اس کا گواہ میں اور ملنگ ہی تھا۔ سوہنی اور اماں نے اس واقعہ پر اتنا تبصرہ نہیں کیا لیکن سارا اور تانی چونک اٹھی تھیں۔ انہوں نے بہت سارے سوال کر دیے۔ میں چپ چاپ سنتا رہا، کھانے کے بعد میں یہی کہہ کر اٹھ آیا کہ میں بتاؤں گا بھی تو تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

مجھے احساس تھا کہ تانی مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے اور میں بھی اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کھانے کے بعد میں اسے ساتھ لیے حویلی کی چھت پر چلا گیا۔ ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کرسیاں اور چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم ان پر نہیں بیٹھے، بلکہ ٹھنڈی اور خمار آلود ہوا کا لطف لیتے ہوئے ٹہلتے رہے۔ وہ مجھے وہاں کے بارے میں بتاتی رہی۔ کافی دیر بعد ہم چارپائیوں پر آ کر بیٹھ گئے تو تانی نے بڑے مان سے کہا۔

"جمال ایک بات پوچھوں؟"

"میں تمہیں یہاں لایا ہی اس لیے ہوں کہ تم جتنی چاہے مجھ سے باتیں کر سکو۔ تمہیں کبھی بھی مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔ پھر یک لخت سنجیدہ ہوتے

ہوئے بولی۔
''میری اس بات کو کسی منفی سوچ میں نہ لینا، میں صرف سمجھنا چاہتی ہوں کہ ایک ہی شے دو جگہ مختلف رنگ کیسے بنالیتی ہے؟''
''تم کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
''دیکھو، سوہنی بھی تم سے محبت کرتی ہے اور میں بھی، دونوں کی محبت میں کوئی غرض نہیں ہے، انتہائی خلوص ہے اس میں اور میں اپنے بارے میں جانتی ہوں۔ لیکن وہ انتہائی مطمئن ہے، اس کی ذات میں سکون ہے اور میں بے حد بے چین، افسردہ اور تنہائی محسوس کرتی ہوں، یوں سمجھ لو کہ میرا دل ہر وقت بجھا رہتا ہے۔ میں خوش نہیں رہتی ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟'' اس نے بہ مشکل اپنی بات کہی۔ جبکہ میں اس کی بات کو سمجھ چکا تھا۔
''تانی! یہ لوگ جب صبح اٹھتے ہیں تو وہ اپنا منہ کیوں دھوتے ہیں۔ حالانکہ اس پر کچھ بھی نہیں لگا ہوتا۔ آفس کے لیے یا کہیں بھی جاتے وقت۔ ہم بہت تیار ہوتے ہیں، اپنی پسند کی خوشبو لگاتے ہیں، یہ خوشبو لگانا، اپنے آپ کو سنوارنا یہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔
''میرے خیال میں ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اس میں سکون ملتا ہے، ہمیں ایسا کر کے خوشی ملتی ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔
''اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مست الست رہتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو سنوارنے یا خوشبو لگانے جیسا کام نہیں کرتے، وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔
''میرے خیال میں وہ بھی اسی حالت میں خوش رہنا پسند کرتے ہوں گے۔''
''زندگی کا اصل حاصل اس کی مسرت ہے۔ مسرت کے حصول ہی میں حسن ہے۔ جو بندہ خوش و خرم ہوگا، اس کا چہرہ اس کے اندر کی خوشی کا اظہار کر دیتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے پوچھا۔
''وہی تو، ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے۔''
''اس کا سارا تعلق دل سے ہے۔ مردہ دل صاحب زر ہونے کے باوجود چہرے پر رونق نہیں رکھتا۔ اس میں منفی جذبوں کا فروغ ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ زندگی محض ایک حادثہ ہے۔ وہ معاملے کو عقل کے تقاضوں پر لے جاتا ہے۔ اس میں منفی سوچ کا فروغ پانا عین فطری ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس میں زندگی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں جو صاحب دل ہوتا ہے اس کے پاس مادی سہولیات بھلے نہ ہو، روپیہ پیسہ بھی کم ہو پھر بھی وہ خوش رہتا ہے اور پورے زمانے کا مقابلہ کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت دنیا نہیں ہوتی اصل میں ضروریات سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی سرشار ہوتی ہے کیونکہ خوشی وجود میں انرجی پیدا کرتی ہے۔ یہ فطری ہے۔''
''مگر یہ سب ہوتا کیسے ہے؟'' تانی نے پوچھا۔
''زندہ دلی محبت کے ساتھ آتی ہے۔'' میں نے کہا وہ چند لمحے خاموش رہی پھر الجھتے ہوئے بولی۔
''کیا میری محبت میں اب بھی تمہیں شک ہے؟ کیا میرے اندر محبت نہیں ہے؟''
''مجھے تمہاری محبت پر کوئی شک نہیں اور نہ ہی انکار ہے۔'' میں نے سکون سے کہا۔
''تو پھر......؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔
''دیکھو، محبت پانی کی مانند ہے۔ بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ۔ یہ جس پیمانے میں جائے گی ویسی ہو جائے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے وہ پیمانہ کیسا ہے؟'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔
''میں سمجھی نہیں؟''
''دیکھو، تمہاری محبت صرف میرے ظاہری وجود کے ساتھ ہے اور اسے میری نسبت سے محبت ہے۔ جو کہ حقیقی وجود ہے۔ جو اصل حقیقت کو پا لیتا ہے وہ زندہ دل ہے اور جو حقیقت کا انکار کر دیتا ہے وہ مردہ دل ہوتا ہے۔ محبت ہی عشق کا روپ دھارتی ہے اور زندگی نسبت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔''

''یہ کیسے ہوتا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''مسلک عشق اختیار کرنا پڑتا ہے۔ عشق ربّ تعالیٰ کی انسان کو ودیعت ہے۔ کیا جب تک میں ہوں تبھی تک تیرا عشق ہے، محبت ہے، کیا میرے وجود کے ساتھ تیری محبت، تیرا عشق ختم ہو جائے گا؟ نہیں یہ عشق نہیں، عشق تو ناتمام ہوتا ہے۔'' میں نے سمجھایا

''یہ عشق اختیار کیسے ہوگا؟''

''ظاہری عشق تو ظاہری وجود سے ہوتا ہے اس سے انکار نہیں، لیکن انسان کیوں نہ لامحدود عشق اختیار کرے جو باطن کو خود انسان پر عیاں کر دیتا ہے۔ یہ مقصد کے ساتھ ہوتا ہے۔ مقصد جس قدر بلند ہوگا۔ خود انسان بھی اسی قدر بلند ہوتا جاتا ہے۔ آسمانوں سے بلندتر، وہ عشق حقیقی، جو ربّ تعالیٰ تک براہ راست رسائی دے دے۔''

''یہی تو میں چاہتی ہوں۔ یہ کیسے ہوگا پلیز مجھے بتاؤ'' اس نے عاجزی سے کہا۔

''سنو۔ جتنا بلند مقصد ہوگا، اس میں جتنا بڑا زخم لگتا ہے، اتنی ہی بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے۔ نئی طاقت، نئے زخم اور نئی رسائی کے لیے وجود بھی نیا ہی چاہئے ہوتا ہے اور یہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ جب چاہے نیا وجود حاصل کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ سرشاری سے بولی۔

''مجھے کچھ اور بتاؤ یہ کیا ہے''

''قلندر لاہوری'' کا ایک مصرعہ ہے نا، 'یہ دل مردہ نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ'..... دل تو پہلے بھی زندہ ہی ہوتا ہے۔ یہ مقام جان تک ہے۔ محض جان والا دل مردہ ہے۔ یہ محض حیوانیت ہے۔ اس میں حقیقی زندگی نہیں۔ جب اس میں روحانی زندگی آ جائے گی تو دراصل اس کا دل زندہ ہو جائے گا۔ جان کا نکھار اس کی روح ہے اس میں جب عشق آئے گا تو روشنی آ جائے گی۔ پھر نور علیٰ انور ہے۔ زندہ جسم کا روحانی وجود دل کی طرف راغب ہوتا ہے یہیں سے حقیقی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔''

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی یہ خاموشی طویل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد وہ بولی۔

> **گولڈن الفاظ**
>
> ☆ گناہ سے ہر وقت بچو مگر تنہائی میں بالخصوص بچو کیونکہ اس گناہ کا گواہ خود خدا ہوگا
>
> ☆ رزق کے پیچھے اپنا ایمان خراب مت کرو کیونکہ رزق انسان کو اس طرح تلاش کرتا ہے جیسے مرنے والے کو اس کی موت۔
>
> ☆ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت جھاڑو جس نے تمہیں بولنا سکھایا۔
>
> ☆ دنیا کا سب سے مخلص رشتہ ماں کا ہے۔
>
> مرسلہ: عماد علی.....اسلام آباد

''چلو۔ اب چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ گئی۔ ہم دونوں نیچے کی طرف چل پڑے۔

میں ساری رات نہیں سو پایا تھا۔ میں نے نور نگر کے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ سب کام ٹھیک چل رہا تھا۔ افضل رندھاوا کا پیغام مجھے ملا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے وہ ملاقات کل پر ٹالی اور اپنے آپ کو ایک کمرے میں مقید کر لیا۔

لاہور سے مختلف اطلاعات آ رہی تھیں۔ انہوں نے چند لوگوں کو نہ صرف تلاش کر لیا تھا۔ بلکہ ان کے بارے میں اہم ثبوت بھی لے لیے تھے۔ یہ ایسے ثبوت تھے کہ اگر انہیں کسی عدالت میں پیش کیا جائے تو تسلیم ہی نہ کیے جائیں۔ لیکن انہی ثبوتوں اور اشاروں کے سہارے پوری جرم کی جڑ تک جایا جا سکتا تھا۔ ہم صبح ہو جانے تک باتیں کرتے رہے۔ نور نگر، کراچی اور لاہور کے درمیان کانفرنس کال چلتی رہی۔ آ کر یہی فیصلہ ہوا کہ میں آتا ہوں تو یہ آپریشن شروع کرتے ہیں۔

میں اپنی عادت کے مطابق صبح صبح اٹھا اور باہر نکل گیا۔ نور نگر جاگ اٹھا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو تاحد نگاہ ہریالی ہی ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ باہر ایک نوجوان جوگی آیا ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میرے ذہن میں اسی وقت آ گیا کہ وہ کوئی نہ

کوئی مسئلہ لے کر آیا ہوگا۔ میں نے اسے بٹھانے کو کہا اور پورے طرح فریش ہو کر باہر نکلا۔ وہ نوجوان جوگی باہر فرش پر ہی بیٹھا ہوا تھا حالانکہ اس کے پاس خالی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ کل والے ان نوجوانوں میں سے ایک تھا۔

''تم کرسی پر کیوں نہیں بیٹھے ہو۔''

''بس میں کبھی بیٹھا ہی نہیں۔'' اس نے مودب لہجے میں کہا۔

''کیسے آئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے سائیں جی نے بھیجا ہے کہ آپ کو بلا لاؤں۔'' اس نے کہا۔

''خیر تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ جو کل آپ وہاں ہمارے پاس ملنگ چھوڑ آئے ہیں نا، اس کے بارے میں بات کرنی تھی سائیں جی نے۔'' اس نے اپنا لہجہ مودب ہی رکھا

''کیا بات کرنی تھی۔'' میں نے پھر پوچھا تو وہ بولا۔

''یہ تو وہی جانتے ہیں۔ اگر آپ وہیں چلے آئیں تو، یہی انہوں نے کہا ہے۔''

''ٹھیک ہے ابھی چلتے ہیں۔'' میں نے کہا اور پورچ میں کھڑی کار کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر بعد میں اس نوجوان جوگی کو لیے مسافر شاہ کے تھڑے کی طرف چل دیا۔

سورج ابھر رہا تھا جب میں تھڑے کے پاس جا پہنچا۔ رام لعل جوگی میرا منتظر تھا۔ میں کار سے اترا تو وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔

''حضور۔ آپ کو اس طرح بلانے پر بڑی معافی چاہتا ہوں، میں آپ کو کبھی نہ بلاتا اگر یہ ضروری نہ ہوتا۔'' وہ عادت کے مطابق ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''رام لعل کام کی بات کرو نا۔'' میں نے کہا۔

''وہ جو بندہ آپ نے ہمارے ذمے لگایا تھا، میں اس سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' وہ ندامت سے بولا۔

''تنگ آ گئے، مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر بات صرف بوٹی کے نشے تک رہتی تو ٹھیک تھا۔ وہ چرس کا بھی عادی ہے۔ میں نے کل سے اسے کچھ نہیں دیا اور نہ ہی اسے کوئی شے استعمال کرنے دی۔'' اس نے بتایا

''اچھا کیا، میں نے تمہیں یہی تو سمجھایا تھا۔'' میں اس کی ساری بات سمجھ گیا کہ وہ اب آگے کیا کہے گا۔

''رات ہوتے ہی اس نے مجھے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ اسے بوٹی پینے دی جائے یا پھر چرس ہی دے دوں۔ میں نے کچھ نہیں دیا تو آدھی رات کے وقت اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس کی ایک ہی ضد تھی کہ یا تو مجھے نشہ دو یا پھر میں اسے اپنا کوئی سانپ ڈسوا دوں۔'' اس نے بتایا

''پھر کیا کیا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''کرنا کیا تھا، میں نے اسے باندھ کر کمرے میں پھنکوا دیا ہے، بات یہیں تک رہتی تو بھی ٹھیک تھا لیکن.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا

''لیکن کیا؟'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وہ فقط ایک ملنگ ہی نہیں، اور کچھ بھی ہے، وہ آپ کا یہاں کے لوگوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔'' اس نے انکشاف کیا تو میں مطمئن ہو گیا۔ اسے دیکھ کر جو بے چینی ہوئی تھی، اسے سکون مل گیا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا اندازہ ہے، باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' رام لعل نے کہا میں خاموش ہو گیا، پھر اس کے ساتھ اس کمرے میں گیا، جہاں وہ پڑا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ میں نے اس کے بدن پر ہاتھ رکھا تو مجھے برف کی طرح لگا۔ میرا لمس محسوس کر کے اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا اور نہایت درد مندی سے شکوہ بھرے لہجے میں بولا۔

"تم نے بہت ظلم کیا ہے، مجھ پر۔"

"میں نے تجھے کچھ نہیں کہا، تم خود اپنے وجود کے غلام بن گئے ہو۔ تم تو کہتے تھے کہ نشے پر تم نے قابو پالیا ہے، مگر یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یہ مجبور کر دینے والی بات ہے؟" اس نے اسی لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"یہ کیفیت عارضی ہے، کیا تم جانتے اور سمجھتے ہو؟"

"ہاں میں مانتا ہوں۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں تمہارا، روزانہ کا کوٹہ مقرر کر رہا ہوں، اتنی ہی پینا، زیادہ نہیں۔ ہاں اگر بن پئے بے خود ہونے کو من چاہ تو مجھے آواز دے لینا، میں تجھے ہمیشہ کی بے خودی دے دوں گا۔" یہ کہہ میں اٹھا اور جوگی کو اشارہ کیا کہ جو مانگتا ہے اسے دے دو۔ وہ ساتھ آیا نوجوان اس کا بندو بست کرنے لگا اور میں نے جوگی کو سمجھا دیا کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھنا ہے۔ کچھ دیر وہاں گذارنے کے بعد میں وہاں سے نور نگر کی جانب چل دیا۔

حویلی کی طرف آتے ہوئے وہی میدان راستے میں پڑتا تھا، جہاں تانی روزانہ لڑکے اور لڑکیوں کو ٹریننگ دیتی تھی۔ وہاں کل کی طرح کئی لڑکے اور لڑکیاں موجود تھیں۔ ان میں تبدیلی صرف یہی تھی کہ تانی تو ان میں موجود تھی لیکن اس کا لباس بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس کے بدن کا کوئی اعضاء دکھائی نہیں دے رہا تھا، سر پر بڑا سا حجاب تھا، صرف اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے ایک دم سے شاک لگا۔ میں نے اسے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس نے اپنے لیے تبدیلی اپنائی ہو۔

میں اسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ حویلی کے گیٹ پر سے ہی میں نے دیکھا، اماں ٹیرس میں کھڑی اسی میدان کی طرف دیکھ رہی تھی، جہاں تانی موجود تھی۔ کچھ دیر بعد میں اماں کے پاس جا پہنچا۔

"اماں کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے بڑے شوق سے پوچھا تو انہوں نے میرا ماتھا چوما اور بولی۔

"ایک نئی تانی کو دیکھ رہی ہوں۔"

"نئی تانی۔ مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تانی آج صبح فجر کے وقت مسلمان ہو گئی ہے۔" اماں نے فخر سے کہا تو میرے اندر سکون کا دریا بہنے لگا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا لیکن اماں کہہ رہی تھی۔

"آج میں نے اسی خوشی میں پورے نور نگر کی دعوت کی ہے۔ اگر تمہیں جانا بھی ہو تو اس محفل کے بعد جانا۔"

"جی اماں۔" میں نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ مجھے لگا میرے اندر نور ہی نور پھیل گیا ہے۔



رات کے پچھلے پہر ہی سے میڈیا چیخنے لگا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح وہی کہے جا رہے تھے، جو کوئی انہیں کہہ دیتا۔ کسی ایک چینل نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔ بلکہ تیواری کے حامی چینل یہی کہہ رہے تھے کہ وہ اغوا ہو گئے ہیں اور مخالفین یہ واویلا کر رہے تھے کہ وہ خود کہیں چھپ گئے ہیں۔ کہیں پر بھی کوئی حتمی بات نہیں کی جا رہی تھی اور نہ سچ بتایا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ونود رانا کی پلاننگ بالکل ٹھیک سمت جا رہی تھی۔ پولیس پر یہ دباؤ تو آ رہا تھا کہ انہیں فوری تلاش کیا جا۔ لیکن یہ نہیں کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ونود دوہرا فائدہ لینا چاہ رہا تھا۔ ایک طرف وہ وقتی طور پر یہ گرفتاری چھپا کر حکومت کے دباؤ سے بچنا چاہ رہا تھا تو دوسری طرف دیئے گئے ثبوت کی تصدیق کر رہا تھا۔ اس دوران بہت ساری گرفتاریاں بھی وہ آسانی سے کرتا چلا جا رہا تھا۔

وہ رات ہی گرین ہاؤس واپس آ گئے تھے۔ تیواری کو جب ہوش آیا تو انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا بس اتنا بتا کر چلے آئے کہ جو ونود رانا نے کہا ہے وہ کر دو تو تمہاری بچت ہو سکتی ہے۔ ورنہ وہ جو کرے۔ وہی جانے۔

گرین ہاؤس کی پچھلی طرف چھوٹا سا باغ تھا دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اجڑا ہوا تھا۔ جسپال

بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ تبھی اروند بھی وہیں اپنا مگ تھامے وہیں آ گیا۔

"کافی اچھی خبریں ملی ہیں۔ یہاں پر یہودیوں نے جو جگہ بنانی شروع کی ہے، اس وقت ان کے کرتا دھرتا چند لوگ ہیں۔ ان میں سے مقامی یہودی اور دوسرے لوگوں پر جی کھول کر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ ان میں دو نام ایسے ہیں۔ جن کے بارے میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ سارے فیصلے کرتے ہیں۔" اروند سنگھ نے بتایا تو جسپال نے کہا۔

"یار مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ کرتے رہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ سکھ دھرم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سکھوں کا تعلق پاکستان سے ہے، دوسرا ہندوؤں کو خوش کرنے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔"

"ہاں میں وہ آپ کو بتانا بھول گیا کہ ہندو قوم پرست شیو سینا ان کے ساتھ پوری طرح ہے۔ کم از کم ممبئی میں وہ ان کی پوری سپورٹ کر رہے ہیں۔ ان کے دو لوگ ہیں۔ ان چاروں کی آپس میں ایک تنظیم بنی ہوئی ہے۔"

"ان چاروں کو ختم کرنا لازمی ہے جسپال؟" ایک دم سے بانیتا کور نے نمودار ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" جسپال نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ابھی ونود کا فون آیا ہے۔ اس نے ایک بڑی اہم بات بتائی ہے۔ وہ فلم جسے ہم اپنے گلے کا پھندا سمجھ رہے ہیں وہ آفیشلی نہیں ہے۔ صرف انہی لوگوں کی بنائی ہوئی ہے۔" بانیتا نے جوش سے کہا۔

"مگر یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ حقیقت ہے۔" جسپال نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

"میں مانتی ہوں اور یہ سوال میں نے بھی کیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ سی بی آئی والے لوگ جعلی تھے۔ وہ لوگ اسی تیاری کے تھے۔ یہ ایک پورا گروہ ہے جن کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اس طرح نہ جانے کتنے لوگوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔" بانیتا نے اسی جوش سے بتایا تو اروند نے پوچھا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے وہ لوگ فورسز کی معلومات کو اصل جگہ پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنی دسترس میں کر لیتے ہیں۔ پھر خود ہی مختلف فورسز کا حوالہ دے کر انہیں استعمال کرتے ہیں۔ وہ ثبوت آفیشلی رہ ہی نہیں جاتے؟"

"بالکل، ونود نے اسی اعتماد پر ہم سے کام لیا ہے۔ وہ پہلے ہی جانتا تھا، اس کی تصدیق ہر دیک کے ثبوت سے ہو گئی ہے۔ وہ اسی ثبوت کی بنا پر آج دہلی گیا ہے۔ یہاں پر جگجیت بھر بھرے پوری طرح الرٹ ہے۔" بانیتا نے بتایا تو جسپال نے سکھ کا سانس لیا اور پھر پوچھا۔

"ہم اگر چاہیں تو امرتسر یا جالندھر جا سکتے ہیں؟"

"صرف آج کا دن نہیں، جیسے ہی ونود واپس آتا ہے، وہ ہمیں گرین سگنل دے دے گا، ویسے میں اپنے طور پر بھی تصدیق کر رہی ہوں۔" بانیتا نے پورے اعتماد سے کہا۔

"او کے۔ ایک دن اور سہی۔" جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا تو بانیتا نے اروند کی طرف دیکھا اور بولی۔

"ابھی جو تم نے مجھے نام بتائے ہیں، ان کے بارے میں معلومات بعد میں لینا۔ پہلے ان کی باری ہے جنہوں نے ہمارے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی۔ ان کی نسلیں یاد رکھیں گی کہ کسی سکھنی سے پالا پڑا تھا۔ میں سب لوگوں سے کہتی ہوں کہ تیار ہو جائیں، آج کی رات ممبئی پر بہت بھاری ہو گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

شہر خرابی

حسیب جواد علی

کبھی کبھی بعض مناظر زندگی میں دل کش تبدیلی کا باعث بن جاتے ہیں

ایک ایسے شخص کی کہانی جو تنہائی سے تنگ آکر کچھ لمحوں کی تفریح کے لیے سفر پر روانہ ہوتا ہے لیکن ایک حادثے سے دوچار ہوکر ایک جزیرے پر جاپہنچتا ہے۔

صبح کی ہلکی دھوپ ماحول کو گرم کرنے سے ابھی قاصر تھی اور سمندر کی بڑی بڑی لہریں ساحل تک آتے آتے اتنی کمزور ہو جاتی تھیں کہ بمشکل ٹخنے گیلے کر پارہی تھیں البتہ جاتے جاتے بے ضرر سی مخلوقات گھونگے اور سیپیاں وغیرہ چھوڑ جاتی تھیں۔ حد نظر تک نیچے پانی پر دھند اور آسمان پر سفید اور سرمئی بادلوں کے ٹکڑے...... اس محدود اور سادہ منظر اور اس یکسانیت کے ماحول میں سعید احمد سوچوں میں گم' خشک ریتیلے ساحل پر ایک پتھر پر بیٹھے تھے پتلون اور بنیان میں' جوتے اور قمیص سامنے پتھروں پر سوکھ رہے تھے۔ یہاں ایک اور ہستی فی الحال پس منظر میں تھی' خالدہ جو پتھروں کی ایک دیوار کے پیچھے صرف ایک دوپٹہ نما چادر لپیٹے سامنے پڑے اپنے کپڑے سوکھنے کا انتظار کررہی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا' دو تین ایکڑ کا رقبہ ہوگا گنتی کے ناریل کے درخت اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اس جزیرے کی کل نباتاتی دولت تھی۔ ریت پر بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ کچھ چھوٹے چھوٹے پتھر ترتیب سے بھی رکھے ہوئے تھے' ایک بانسوں کا بنا ہوا بے چھت کا سائبان۔ لکڑی کے کچھ خالی ڈبے۔ کھجوروں کے دو پیکٹ' بسکٹ کے ڈبے جن کی تاریخ انتہا قریب الختم تھی ایک نائلون کا تھیلا ایک چھری' چند زنگ آلود مچھلی بھوننے والی سلاخیں نمک کے سفری پیکٹ ماچس کی چند نمی کھائی ہوئی ڈبیاں' یہ سب چیزیں یہاں موجود تھیں۔ ضرور اس جزیرے پر مچھیروں یا مہم جو حضرات کا قیام رہتا ہوگا لیکن شاید بہت دن سے یہاں کوئی آیا نہیں تھا۔ ایک جگہ نائلون کے کچھ تھیلے ساتھ میں پٹ سن کی دو چار بوریاں بھی مل گئیں' سب سے اہم چیز یعنی پانی...... پینے کا بھی تھا جو شاید چند روز قبل ہونے والی بارش کے بعد ایک پتھریلے نشیب میں جمع ہوگیا تھا۔ سعید احمد کی محتاط طبیعت بلکہ فطرت نے ان کو پانی کی اہمیت سے آگاہ کیا ہوا تھا لہٰذا اس سے پہلے کہ دوپہر کی دھوپ میں وہ بخارات بن کر اڑ جائے یا نیچے ریت میں جذب ہوجائے آس پاس سے جتنی بھی پلاسٹک کی بوتلیں ملیں انہوں نے پانی سے بھر کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں رکھ دیں۔ یہ پہلا کام تھا جو انہوں نے روشنی پھیلنے کے بعد اس جزیرے پر کیا اور اب شاید وہ اس بے در و دیوار کے سائبان کو نائلون کے تھیلوں پٹ سن کی بوریوں اور ناریل کے پتوں سے ایک کمرے کی شکل دینے کی پلاننگ کررہے تھے۔

جب جان پر بنی ہو تو ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگتا ہے' بچاؤ کے طریقے ڈھونڈتا ہے۔ وہ بھی حساب لگا رہے تھے کہ دستیاب اشیاء کو کس طرح استعمال کرکے زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس ویرا

جزیرے پر جیا جا سکتا ہے؟

زندگی کی ڈور کو زیادہ سے زیادہ دیر تک کس طرح پکڑے رہا جا سکتا ہے؟ اونچے درختوں سے ناریل کیسے اتارے جا سکتے ہیں؟ کرنے کے کام بہت تھے سب بہت ضروری لیکن بہت مشکل بھی۔ اس قسم کے حالات سے نبٹنے کا ان کا علم صرف کتابی تھا' عملی طور پر کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا' وہ ایک اچھے تیراک ضرور تھے لیکن جہاں حد نظر تک ساحل کا پتا نہ ہو وہاں بھلا تیرنا کیا کام آئے گا۔ بس ایک ہی امید تھی کہ شاید یہاں مچھیروں کی کوئی کشتی یا کوئی تفریحی پارٹی کا چھوٹا جہاز کشتی وغیرہ آ جائے۔ آس پاس سے گزرے تو وہ بھی شور مچا کر بلا لیں گے اور یہ دوسری ہستی جو اس جزیرے پر موجود تھی ان حالات میں کس قدر معاون ثابت ہوگی اس کا انہیں اندازہ نہ تھا۔ بہت مختلف سا تعارف تھا ان کا آپس میں......امکان یہی تھا کہ جو کام کرنے ہیں ان کو ہی کرنے ہیں' وہ تو ابھی تک سنبھل ہی نہیں پائی تھی' ابھی خوف کے سائے سے نکلی ہی نہیں تھی دو تین گھنٹے متواتر پانی میں ہاتھ پاؤں چلانے کے بعد تھکن سے بے حال تھی۔

سعید احمد کی بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں' دو بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے کی شادی ہو چکی تھی۔ بیٹا امارات میں ملازم تھا اور وہ اچھے خاصے بڑے گھر میں تنہا رہ رہے تھے' پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ تھا اور اسی میں وہ مگن تھے۔ دوستوں عزیزوں اور اولاد نے بھی اگر کبھی ان کو شادی کا مشورہ دیا تو انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ البتہ آئندہ چار پانچ سالوں میں ریٹائرمنٹ کے بعد کے سائیڈ افیکٹس سے خوف زدہ تھے۔ تنہائی اور بے کاری سے نبٹنے کے لیے سفر کو وسیلہ ظفر مانتے ہوئے اپنی آئندہ زندگی میں رنگ بھرنے کا ذریعہ جانا۔ ان کے خیال میں اس کے لیے تربیت کی ضرورت تھی جیسے ہی ان کو پتا چلا کہ ایک صاحب چھوٹے موٹے سمندری سفر کا انتظام کرتے ہیں' انہوں نے اس سفر کو اپنی تربیت کا پہلا سبق قرار دیتے ہوئے رابطہ کیا اور اگلے ہفتے کے گروپ میں اپنا نام شامل کرا دیا۔

صبح آٹھ بجے کیماڑی سے سفر کا آغاز ہوا' بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ بارہ افراد کے لیے یہ جہاز دن میں تو کافی ہوگا لیکن جب رات آئے گی تو دن بھر کی اچھل کود کے بعد تھک کر سونے والوں کے لیے جگہ کافی نہیں ہوگی۔ وہاں دو بغیر دروازوں کے کمرے ذرا گہرائی میں ایک ڈیڑھ فٹ نیچے تھے۔ ڈیک پر وافر جگہ تھی لیکن رات کو ٹھنڈی اور تیز ہوا میں وہاں کوئی سو نہیں سکتا تھا۔ سیٹیں البتہ آرام دہ کھلنے اور بند ہونے والی جہاز کے دونوں جانب ریلنگ کے ساتھ موجود تھیں' گروپ میں چار خواتین اور دو بچے بھی شامل تھے۔ تین خواتین اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ جبکہ چوتھی اپنی سہیلی اور ان کے شوہر کی دعوت پر شریک سفر تھیں۔ باقی لوگ پختہ عمر کے جو یا تو تنہائی کے ڈسے ہوئے محفل کی تلاش میں آئے تھے یا پھر اپنی دانست میں گھر کے شور شرابے اور روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ کر تنہائی کے مزے لوٹنے آئے ہوئے تھے' اب کس کو کیا مل رہا تھا کون جانے......!

سارا دن سمندر کی ہوا کے تھپیڑے اور رات گئے تک مچھلیاں تل کر کھاتے کھاتے سب ہی تھک چکے تھے' جس کو جہاں جگہ ملی اس نے غنیمت جانا اور پڑا رہا۔ ان بغیر پردوں اور دروازوں والے کمروں میں خواتین باوجود تمام تر آزاد خیال اور بے باکی سے غیر مردوں کے سامنے سونے سے ہچکچا رہی تھیں لیکن

مجبوری تھی۔ کچھ دیر مختلف کونوں سے طرح طرح کے موضوعات پر مبنی گفتگو کی آوازیں آتی رہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ معدوم ہوتے ہوئے مکمل سکوت میں تبدیل ہوگئیں' جہاز کے انجن کی گڑگڑاہٹ لہروں کی موسیقی میں مدغم ہوکر لوری کا کام کررہی تھی۔ وقت کے ساتھ خنکی میں اضافہ ہوگیا تھا اور محتاط قسم کے لوگ اگر کچھ موٹے کپڑے لے کر آئے تھے تو ان کے استعمال کا وقت آ گیا تھا۔ باقی لوگ کونوں کھدروں اور کھڑکیوں کے نیچے آڑ میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔

سعید احمد بائیں جانب ریلنگ کے ساتھ پیچھے کی طرف اپنی سیٹ کو پھیلا کر آرام کرنے کا ارادہ کررہے تھے کہ انہوں نے مسز صدیقی کی دوست کو دیکھا جو کمرے سے باہر آتے ہوئے ان کے کندھے پر لٹکے لائف جیکٹ کو غور سے دیکھ رہی تھیں' وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے رک گئے اور سیٹ ان خاتون کو پیش کردی۔

''بہت شکریہ! آپ بیٹھئے میں ذرا دیر یہاں ٹھہرنا چاہتی ہوں ریلنگ کے پاس۔'' خاتون نے اتنا کہہ کر نظریں اندھیروں کی طرف پھیرلیں۔

نشست کی پیش کش تعارف کا عنوان بن چکی تھی لیکن خاتون کی توجہ بظاہر کہیں اور تھی لہٰذا سعید احمد نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا' وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ خاتون نے محسوس کرلیا اور وہ ان سے دوبارہ بیٹھ جانے کی درخواست کرنے ہی والی تھیں کہ سعید احمد نے بات شروع کردی۔

''آپ شاید مسز صدیقی کے ساتھ ہیں' ان کی رشتہ دار یا پڑوسی وغیرہ......؟''

''جی نہیں' میں مسز صدیقی کے ساتھ کالج میں پڑھاتی ہوں' خالدہ انیس میرا نام ہے۔'' انہوں نے بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا' اندازہ ہورہا تھا کہ چوتھی دہائی ختم ہوچکی تھی یا ہونے والی تھی۔

''کیا پڑھاتی ہیں آپ؟'' سعید نے سوال کیا۔

''نفسیات! آپ کی مشغولیت کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں وہی کرتا ہوں جو آپ کرتی ہیں' پڑھاتا ہوں لیکن میرا مضمون شاید اور بھی خشک ہے۔ یونیورسٹی میں ریاضی پڑھاتا ہوں' چار پانچ سال میں ریٹائر ہوجاؤں گا اور اس دور سے نپٹنے کی تیاری کررہا ہوں' ٹریننگ پر ہوں۔ آپ اس جیکٹ کو غور سے دیکھ رہی تھیں دراصل دو ایک حادثے دیکھ چکا ہوں اور پھر سفر نامے بہت پڑھتا ہوں۔ ڈسکوری چینل بھی دیکھتا ہوں اسی لیے شاید بہت محتاط بھی ہوگیا ہوں اس طرح کے سفر میں میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی ناگہانی کے لیے تیار رہنا چاہیے ویسے بھی ہمارے یہاں موقع کی مناسبت سے انتظامات بھی تو نہیں ہوتے۔ آپ دیکھیے یہاں اتنے سارے لوگوں کے لیے ایک چھوٹی سی حفاظتی' دو ایک بوسیدہ سے لائف جیکٹ اور چند ٹیوب ہی تو ہیں۔ سب دیکھ لیا ہے میں نے' جہاز ڈوب جائے تو آخر کتنے لوگ اس کشتی پر سوار ہوسکیں گے؟ مجھے تو کیمونیکیشن کا بھی کوئی مناسب انتظام نظر نہیں آیا۔''

خالدہ کو اتنے طویل جواب کی توقع نہیں تھی' بات ختم ہوئی تو اس نے گویا اطمینان کا سانس لیا اور مسکرانے لگی لیکن فوراً ہی یہ مسکراہٹ اس کے لبوں سے غائب ہوگئی۔

''ابھی آپ نے کیا کہا تھا' اللہ نہ کرے یہ جہاز...... کیا واقعی ایسا ہوسکتا ہے؟ آپ ہی کہہ رہے تھے نا یہاں تو حالات سے نپٹنے کا ایسا کچھ بھی انتظام نہیں' ہمارے یہاں لوگ کتنے بے پروا ہوتے

ہیں۔" خالدہ کے لہجے سے تشویش عیاں تھی اور چہرے سے بھی۔

"ایسے موقعوں پر زندگی بچانے کے تمام ممکنہ طریقوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے' آپ شاید مجھے ضرورت سے زیادہ محتاط بلکہ بزدل اور ڈرپوک سمجھ رہی ہوں گی لیکن زمینی حقائق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اب دیکھئے جب میں نے محسوس کیا کہ یہاں انتظامات معقول اور مناسب نہیں تو میں نے ایک کام اور کرلیا۔" سعید احمد نے سامنے دیوار پر نائلون کی رسیوں میں بندھی پلاسٹک کی خالی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کیا ہے؟ اس سے کیا ہوگا؟" خالدہ نے بوتلوں کو سرسری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ایک لیٹر والی پانی کی چار چار بوتلیں مضبوطی سے بند کرکے دو الگ الگ رسیوں میں بندھی ہوئی ہیں' ناگہانی آفت میں کم از کم دو افراد تو اپنی جان بچاسکتے ہیں اس وقت تک تیرتے رہیں گے جب تک کوئی مدد نہ آجائے۔ ہاں اگر کوئی بڑی مچھلی نگل لے تو الگ بات ہے۔" سعید احمد نے یہ کہہ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جبکہ خالدہ کے چہرے پر جیسے خوف کے بادل چھاگئے۔

"ہم کوئی اور بات نہیں کرسکتے کیا؟ مہربانی کرکے یہ موضوع بدل دیجیے۔" خالدہ نے یہ کہتے ہوئے مسز صدیقی کی طرف نظر دوڑائی' اس نے اگر واپس لوٹ جانے کا ارادہ کیا بھی تھا تو فوراً بدل دیا' مسز صدیقی زمین پر پڑے گدے پر بے خبر سو رہی تھی اور صدیقی صاحب بھی وہاں بالکل قریب......

"آپ اجازت دیں تو میں یہاں ہی بیٹھ جاؤں' مجھے سونا نہیں ہے۔" اس نے سعید احمد کی طرف دیکھے بغیر مدھم لہجے میں اجازت طلب کی۔

"میں نے شاید آپ کو خوف زدہ کردیا' آپ بیٹھیے میں آپ کے لیے کرسی کھول دیتا ہوں۔" انہوں نے قریبی کرسی کو کھولنے کے لیے کھٹکا ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

"میں خوف زدہ نہیں لیکن اس پانی کے شور اور اس ماحول میں سو نہیں سکتی۔" خالدہ نے صفائی پیش کی۔

چلیے ایک ایک پیالی ہوجائے' صبح ہونے میں ابھی دو تین گھنٹے ہیں اور ناشتے میں تقریباً تین چار' نجانے ان لوگوں کے پاس ناشتے میں کیا ہے؟" سعید احمد نے اٹھ کر کیل پر لٹکا تھرماس اٹھایا اور خالدہ کو چائے نکال کردے دی۔

ہوا میں تیزی آگئی تھی بتدریج بڑھتی ہوئی تیزی باتوں میں محسوس ہی نہیں ہوئی' جب باتوں کا سلسلہ بند ہوا تو زیادہ احساس ہوا۔ سمندر میں لہروں کا مدوجزر ہوا کی تیزی کے ساتھ بڑھتا جارہا تھا پھر یکایک ایک دھماکا ہوا اور شدید جھٹکے نے ان دونوں کو کرسیوں سے تقریباً گراہی دیا تھا۔

"یہ تو چٹان سے لگ گیا......" اگلے حصے سے کریو کے ممبر کی گھبراہٹ بھری آواز آئی۔

"بہت بڑا کریک ہے......" ایک دوسری آواز آئی۔ "سب لوگ ہوشیار...... لائف بوٹ کھل دو......" اور پھر پانی کا بہت بڑا ریلا سامنے کی طرف سے جہاز میں داخل ہوگیا' سب سونے والے یقیناً جاگ چکے ہوں گے نیز چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں' خالدہ بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچی اور گھبرا کر سعید احمد کے کندھے سے چپک گئی۔ جہاز کا توازن بگڑ چکا تھا اور یہ دونوں پھسلتے ہوئے ڈھلان کی طرف جہاز کے پچھلے حصے میں پہنچ گئے۔

سعید احمد خالدہ کو پکڑے ہوئے جہاز کے اگلے حصے کی طرف جانے کی کوشش کررہے تھے لیکن پانی

جہاز میں بھرنا شروع ہوگیا تھا' وہ دونوں اوپر کی طرف آ نہیں پا رہے تھے جہاز جتنا چھوٹا ہوتا ہے ڈوبنے میں اتنا ہی کم وقت لیتا ہے۔ یکایک خالدہ کے ہاتھ سے ان کا کندھا چھوٹ گیا' جہاز کی مدھم باقی ماندہ روشنی میں اس کے چہرے پر خوف اور بے بسی کے آثار صاف نظر آ سکتے تھے اگر کوئی توجہ دینے والا ہوتو...... سعید احمد اسے چھوڑ کر اگلے حصے کی طرف چلے گئے تھے۔ لمحوں میں ریلنگ کو پکڑتے ہوئے واپس آئے اور راہ میں ایک ہاتھ سے رسی میں بندھی بوتلیں کھونٹی پر سے کھینچ لیں' انہوں نے تیزی سے وہ رسیاں اپنی کمر میں باندھیں اور پھر ایک ہاتھ سے خالدہ کو سہارا دے کر فرش سے اٹھایا اور اپنے کاندھے پر پڑی لائف جیکٹ اس کے گلے میں ڈال کے جیسے تیسے اس کے اسٹریپ کس دیئے۔

''دیکھو اس جہاز کا پچھلا حصہ پہلے ڈوبے گا' ہمیں یہ جہاز چھوڑ دینا ہے میں تو اوپر چلا جاؤں گا لیکن تمہارے لیے ممکن نہیں' اللہ پر بھروسہ رکھو جیسا کہوں ویسا ہی کرو' اوپر ریلنگ پر آجاؤ۔'' سعید احمد نے بہت سکون سے ہدایات جاری کیں' جیسے ہی خالداہ کو سہارا دے کر وہ ریلنگ کے لکڑی کے تختے پر کھڑے ہوئے انہوں نے اعلان کیا۔ ''لمبی سانس لے کر پانی میں اتر جاؤ۔'' جہاز کی ریلنگ کی سطح پانی سے صرف ایک فٹ اوپر ہی رہ گئی تھی' وہ دونوں آہستہ سے پانی میں اتر گئے۔

غیر ارادی طور پر خالدہ وہی کچھ کر رہی تھی جو سعید احمد کہہ رہے تھے' دو ایک ابکائیاں آئیں کیونکہ نمکین پانی حلق میں چلا گیا تھا لیکن آخر کار وہ سنبھل گئی۔

''دیکھو جب بڑی لہر آئے تو سانس روک لینا اور جب لہر گزر جائے تو لمبی سانس لے لینا اور اگلی بڑی لہر کے لیے تیار رہنا۔'' خالدہ کو یہ ہدایات بار بار مل رہی تھیں اور وہ پوری کوشش کر کے اس پر عمل کر رہی تھی۔

ہر بڑی لہر کے بعد سعید احمد جب نظریں دوڑاتے تو چاند کی مدھم روشنی میں وہ ڈوبتے جہاز کو اور دور پاتے تھے' کچھ دیر کے بعد وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا نہ جہاز اور نہ جہاز والوں کی کوئی آواز ......سعید احمد خود بھی گھبرائے ہوئے تھے لیکن خالدہ کی ذمہ داری بھی ان پر تھی چنانچہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خالداہ نے بھی بہت حد تک سمجھ داری اور برداشت کا مظاہرہ کیا' اس نے سعید احمد کا کندھا اپنے سیدھے ہاتھ سے دبوچا ہوا تھا' لائف جیکٹ نے اس کو کمر تک پانی سے اوپر رکھا ہوا تھا' حیرت انگیز طور پر طوفان بہت تیزی سے اپنا زور کھو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے تک سمندر پرسکون ہوگیا' بس پانی کی ٹھنڈک تکلیف دہ تھی' سوال یہ تھا کہ آخر کب تک وہ لوگ اس طرح بے سمت تیرتے رہیں گے' باقی لوگ شاید سب ہی کشتی میں سوار ہوگئے ہوں شاید سب ہی بچ گئے ہو۔

کریو کے لوگوں نے ضرور سب کو سنبھال لیا ہوگا' یہ سب خیال سعید احمد کے ذہن میں آتے تھے لیکن جلد ہی ان کی توجہ پھر اپنی بقا پر ہو جاتی تھی۔ اس حالت میں جب دو گھنٹے گزرے تو آسمان پر ہلکی سی روشنی نے صبح کی آمد کا مژدہ سنایا اور ساتھ ہی سمت کا پتا بھی دیا۔ دس پندرہ منٹ میں دن نکل آئے گا' اس وقت تک کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہے تھے...... جا رہے تھے یا ایک ہی دائرے میں گھوم رہے تھے؟ ہاتھ پاؤں مارتے لہروں کے تھپیڑے کھاتے' اب تک شہر کی کوئی ہلکی سی بھی روشنی ان کو نظر نہیں آئی تھی۔ اگر وہ لوگ ساحل سے بیس کلومیٹر پر تھے تو کسی روشنی کا ان لہروں کی اوٹ سے نظر آنا ممکن نہ تھا۔

سعید احمد کے ذہن میں تو یہ خیالات گاہے بگاہے آتے تھے لیکن خالدہ کو خوف، تھکن اور ٹھنڈک نے سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کی صلاحیت سے بہت حد تک محروم کر دیا تھا، وہ تو صرف مضبوطی سے سعید احمد کا بازو تھامے اس کی ہر طرح کی حرکات صرف اس عمل تک محدود ہو گئی تھیں۔

پرندوں کی آوازوں نے قریبی خشکی کے ٹکڑے ساحل یا چھوٹے موٹے جزیرے کا پتا دیا، سعید احمد نے دونوں کانوں کو باری باری ہاتھ سے رگڑ کر گویا اپنی سماعت بڑھانے کی کوشش کی، اچانک ان کے منہ سے ایک عجیب سا نعرہ سرزد ہوا۔ تھوڑی ہی دور پر خشکی نظر آ گئی تھی انہوں نے بے تحاشہ اپنا خالی ہاتھ چلانا شروع کر دیا اور خالدہ کو بھی ہوشیار کر دیا۔

''میرا ہاتھ چھوڑ دو اور بیلٹ پکڑ لو۔ دوسرا ہاتھ چلاؤ جیسے کہ میں چلا رہا ہوں۔'' خالدہ نے ہدایت مانتے ہوئے ان کا ہاتھ آزاد کر دیا، اب وہ دونوں ہاتھ چلا رہے تھے، تھوڑی ہی دیر میں ان کے پاؤں نرم ریت میں لگے تو وہ پانی میں کھڑے ہو گئے چند ہی لمحوں بعد وہ پانی کی کم ہوتی گہرائی میں چلتے ہوئے خشک ریت تک پہنچ گئے۔ دونوں ہی بے حس و حرکت ریت پر کئی منٹ تک لیٹے رہنے کے بعد بالآخر اٹھ کھڑے ہوئے لیکن خالدہ کھڑی نہ رہ سکی، اس کے پاؤں شاید اپنا کام بھول گئے تھے۔ یہ دیر تک پانی میں بے وزنی کی کیفیت میں رہنے کا اثر تھا، ان میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے کچھ حرکت اور کچھ حرارت کی ضرورت تھی۔ سعید احمد نے ادھر اُدھر نظر دوائیں، خالدہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''تم وہاں اس طرف جا کر دھوپ میں اپنے کپڑے سکھاؤ دھوپ بے شک ہلکی ہے لیکن کچھ نہ کچھ گرمی تو پہنچے گی، چلو میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' وہ خالدہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے کے سہارے سے اس کو بڑے پتھروں کی قدرتی دیوار کی طرف چھوڑ آئے۔

واپس آ کر اپنی قمیص اتار کر سوکھنے کو ڈال دی، جوتے اتار کر ایک جگہ رکھے اور خود سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور آس پاس کا جائزہ لینے لگے اور پھر واپس آ کر گویا مراقبے میں چلے گئے، عین ممکن تھا کہ ایک دو دن ان کو یہاں گزارنے پڑیں لہٰذا سب سے پہلے ہوا اور متوقع بارش سے بچاؤ کے لیے اس بے دیوار و چھت کے سائبان کو کمرے کی شکل دینی تھی۔

کھانے کی دستیاب چیزوں کو محفوظ کرنا اور بارش کے پانی کو بوتلوں میں جمع کرنا تھا، کوئی امدادی کشتی لینے آ سکتی تھی بشرط یہ کہ کسی ہیلی کاپٹر نے ان کو دیکھا؟ مگر ہیلی کاپٹر کی تو انہوں نے آواز سنی ہی نہیں پھر ان کو احساس ہوا کہ وہ امریکہ یا کسی یورپین ملک میں نہیں، ابھی تو اس حادثے کی شاید کسی کو اطلاع ہی نہ ہوئی ہو گی۔ ہاں بھولے بھٹکے مچھیروں کے اسٹیمر یا کسی تفریحی پارٹی وغیرہ کی تو امید کی جا سکتی تھی لیکن اگر کوئی بھی نہ آیا تو رات کیسے گزرے گی؟ آج کی رات اور شاید کل کی رات بھی لہٰذا امید اپنی جگہ اور احتیاطاً اپنی جگہ تیاری ضروری ہے۔

وہ قدموں کی چاپ پر چونکے، خالدہ لباس خشک کر کے اس دیوار کے پیچھے سے آ رہی تھی، وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی اور خوف زدہ بھی۔ سعید احمد جتنی دیر کام میں لگے رہے وہ ایک پتھر پر بیٹھی ان کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتی رہی، انہوں نے کسی کام میں اس کی مدد طلب کی اور نہ ہی اس سے کچھ بات کی،

کمرہ بن گیا' ہوا کے مخالف سمت دروازہ تھا تا کہ ہوا اور متوقع بارش سے بھی محفوظ رہا جا سکے جو نائلون کے تھیلی اور ٹاٹ کی بوریاں بچ گئیں انہوں نے اس سے ریت کے چبوترے پر ایک بستر بنایا تھا' ان حالات اور ان دستیاب چیزوں سے اس سے بہتر بن نہیں سکتا تھا۔ ناریل کے پتوں کی چادر بچھا کر انہوں نے باقی ماندہ فرش کو صاف کر کے بیٹھنے کی جگہ بنائی تھی یہ جگہ کھانا کھانے کے لیے استعمال ہو سکتی تھی' انہوں نے کام ختم کر کے اس خالی جگہ پر پانی کی بوتل اور بسکٹ کا ڈبہ خالدہ کے آگے رکھ دیا۔

''چلو ناشتے سے اس کمرے کا افتتاح کرتے ہیں۔'' انہوں نے اپنی طرف سے خوش دلی اور اطمینان کے اظہار کی پوری کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی کیونکہ خالدہ نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا' بہت اصرار پر اس نے دو ایک بسکٹ لیے اور پھر وہ دونوں باہر آ گئے۔ ان کا دھیان سمندر کی طرف تھا جہاں سے کوئی مدد کشتی وغیرہ کی شکل میں آ سکتی تھی' سمندر کی بیکراں دوریوں سے نظریں لوٹ آتی تھیں' وہاں وہ کچھ بھی نہیں تھا جس کا انہیں انتظار تھا۔

''دیکھو تم گھبرانا نہیں' دو تین دن ہم اس خوراک کے سہارے گزار لیں گے' اس دوران کچھ نہ کچھ اچھا ہوگا' اللہ پر بھروسہ رکھو ہم ساحل سے زیادہ دور نہیں۔ دور بہت دور بڑے جہاز نظر آ رہے ہیں مگر ہم ان کے راستے پر نہیں لیکن کسی بھی وقت چھوٹی کشتیاں اور موٹر بوٹ وغیرہ یہاں آ سکتے ہیں۔'' سعید احمد نے پھر خالدہ کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

''مسز صدیقی نے ایک بار بھی مجھے آواز نہیں دی' بالکل ہی بھول گئیں کہ کوئی اور بھی ہے ان کے ساتھ۔'' خالدہ نے بہت دیر بعد کوئی بات کی تھی' جواب میں سعید احمد نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

''ارے بھئی گھبراہٹ میں کسے یاد رہتا ہے' ہم تھے بھی تو دوسری طرف کسی کو ہوش ہی کہاں رہا ہوگا' ایسا کچھ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم دونوں کی جان تو بچ گئی ہم ان شاء اللہ خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم کبھی ان سے شکوہ نہ کرنا۔''

''آپ جب سامنے کی طرف چلے گئے تھے تو آپ بھی اس لائف بوٹ میں چلے جاتے' واپس آئے ہی کیوں؟ چھوڑ دیا ہوتا مجھے۔'' سعید احمد نے نظریں اٹھا کر خالدہ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے' ٹپکنے کے لیے بے قرار لیکن وہ بولے جا رہی تھی۔ ''مجھے یہاں رات نہیں گزارنی ہے' مجھے آج ہی واپس جانا چاہیے' یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' اس کی آواز مدھم تھی لیکن لہجہ تیز تھا۔

''یہ بھی ہمارے بس میں نہیں ہے اگر کوئی کشتی نہ آئے تو...... ہمارے پاس تو موبائل بھی نہیں رہے اگر ہوتے بھی تو شاید ناکارہ ہوتے اگر ہم ساحل سے زیادہ دور ہیں تو...... میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ اللہ پر بھروسہ رکھو' آئندہ جو ہوگا وہ بہتر ہوگا۔'' سعید احمد نے خالدہ کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے اپنا لہجہ خاصہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔

خالدہ کچھ دور جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور نظریں سمندر کی طرف کر لیں' جہاں کہیں سے اچانک ایک کشتی نمودار ہوگی یا شاید آسمان پر کوئی ہیلی کاپٹر جو ان لوگوں کو ڈھونڈنے نکلا ہوگا پھر دو تین گھنٹے میں یہ لوگ گھر پہنچ جائیں گے۔ بھائی' بھائی اور اماں خوش ہو جائیں گے ان کو حادثے کی اطلاع مل گئی ہوگی' شاید وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں مر چکی ہوں۔ ایسے میں میرا اُن کے سامنے آنا کتنی خوشی اور حیرانی کی بات ہوگی۔ اماں تو رونے لگیں گی مجھے دیکھ کر اور بھائی آئندہ کے لیے اس طرح باہر جانے پر پابندی

لگادیں گے اور یہ سعید احمد ایک بار تو سب سے ملیں گے' سب لوگ ان کے بہت مشکور ہوں گے اس کے بعد یہ چلے جائیں گے اور پھر کبھی ان سے میرا سامنا نہ ہوگا۔ وہ بھی تو اپنوں سے ملنے کو بے چین ہوں گے' وہاں ان کا بھی تو انتظار ہو رہا ہوگا' عجیب آدمی ہیں یہ بھی ریٹائر ہونے والے ہیں لیکن ہمت اور چستی ابھی تک برقرار۔ ریٹائرمنٹ عمر کو نہیں بلکہ صحت اور دماغی حالت کو مدنظر رکھ کر ہونا چاہیے' وہ ان خیالات میں غلطاں تھی کہ دھوپ کی حدت نے اس کو سائے میں آجانے پر مجبور کر دیا۔

''تم جاؤ اور اس بیڈ روم میں جا کے سو جاؤ' میں دو تین گھنٹے کے بعد کھانے پر جگا دوں گا۔ میں سمندر پر نظر رکھتا ہوں اور کچھ کام بھی کرنے ہیں۔'' سعید احمد یہ کہتے ہوئے ایک طرف کو چل دیئے' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کمرے کی طرف چل دی اور بستر پر لیٹ گئی' نہ جانے کب نیند کا غلبہ ہوا اور وہ بے خبر سو گئی۔

''اٹھو بھئی دیر ہوگئی۔'' سعید احمد کی آواز پر خالدہ چونک اٹھی اور باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی' وہاں کوئی موٹر بوٹ نہیں تھی۔

''میں سمجھی کوئی مدد آ گئی۔'' اس کی آواز سے مایوسی عیاں تھی۔ سعید احمد کو ترس تو آیا لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ شام کی آمد تھی اور اگر ایک گھنٹہ اور گزر گیا تو پھر صبح تک یہاں سے کسی کا گزر ہونے کا امکان نہیں تھا۔

حیرت کی بات ہے اب تک تو دو چار ادارے حرکت میں آجانے چاہیے تھے' وہی ہوا جس کا ڈر تھا گویا رات یہاں اس ویرانے میں گزارنی ہی پڑے گی آخر یہ سب کب بدلے گا۔ ہماری حکومت ہمارے ادارے جن کی نظر میں انسانوں کی زندگی کی کوئی اہمیت ہی نہیں اندھیرا ہونے تک وہ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہی۔

دو چار مچھلیاں لہروں کے ساتھ ساحل پر آ گئی تھیں اور سعید ان کو بنانے بیٹھ گئے تھے۔ کتنا مطمئن ہے یہ شخص' یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور یہ صاحب مچھلی پکانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ خالدہ دور ایک طرف بیٹھی ہوئی ان صاحب کی حرکات کو بغور دیکھ رہی تھی' ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں سعید احمد ایک بڑے پتھر کے پیچھے چولہا تیار کر چکے تھے۔ کوئلے اور جلانے کو لکڑی دستیاب تھی ہی انہوں نے نمی کھائی ہوئی ماچسوں کو بھی کارآمد بنالیا تھا۔ جب آگ جلی تو آس پاس کے ماحول میں روشنی اور گرمی نے زندگی کے آثار کچھ واضح کر دیئے تھے' شاید آگ کہیں دور سے گزرنے والوں کو نظر آ جائے اور وہ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔ خالدہ نے اس آگ کی چنگاریوں سے اپنے دل میں امیدوں کے چراغ روشن کر لیے۔

لکڑی کی کھپچیوں میں پروئی ہوئی مچھلی پر نمک مل کر اسے آگ پر بھونا گیا تو خاصی لذیذ بن گئی' نہ چاہتے ہوئے بھی خالدہ نے اتنا کھالیا کہ رات گزر جائے' اسے حیرت ہوئی اتنی سادہ لیکن اتنی مزیدار مچھلی اس نے کبھی نہیں کھائی تھی اس نے تحسین آمیز نظروں سے سعید احمد کو دیکھا اور پھر آگ کے شعلوں کو تکنے لگی جن کو سوکھی لکڑیاں ڈال کر سعید احمد نے اور بھی زیادہ بھڑکا دیا تھا۔

آنے والے دو گھنٹوں میں دونوں نے کچھ بات نہیں کی' ہوا کی سرسراہٹ اور لہروں کی موسیقی میں وہ دونوں ایک دوسرے سے پرے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے' اگر بات ہوتی بھی تو شاید ارباب اختیار کی بے حسی کا شکوہ ہی ہوتا۔ خالدہ خوف زدہ تھی'

لگا دیں گے اور یہ سعید احمد ایک بار تو سب سے ملیں گے‘ سب لوگ ان کے بہت مشکور ہوں گے اس کے بعد یہ چلے جائیں گے اور پھر کبھی ان سے میرا سامنا نہ ہوگا۔ وہ بھی تو اپنوں سے ملنے کو بے چین ہوں گے‘ وہاں ان کا بھی تو انتظار ہو رہا ہوگا‘ عجیب آدمی ہیں یہ بھی ریٹائر ہونے والے ہیں لیکن ہمت اور چستی ابھی تک برقرار۔ ریٹائرمنٹ عمر کو نہیں بلکہ صحت اور دماغی حالت کو مدنظر رکھ کر ہونا چاہیے‘ وہ ان خیالات میں غلطاں تھی کہ دھوپ کی حدت نے اس کو سائے میں آ جانے پر مجبور کر دیا۔

''تم جاؤ اور اس بیڈ روم میں جا کے سو جاؤ‘ میں دو تین گھنٹے کے بعد کھانے پر جگا دوں گا۔ میں سمندر پر نظر رکھتا ہوں اور کچھ کام بھی کرنے ہیں۔'' سعید احمد یہ کہتے ہوئے ایک طرف کو چل دیئے‘ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کمرے کی طرف چل دی اور بستر پر لیٹ گئی‘ نہ جانے کب نیند کا غلبہ ہوا اور وہ بے خبر سو گئی۔

''اٹھو بھئی دیر ہوگئی۔'' سعید احمد کی آواز پر خالدہ چونک اٹھی اور باہر آ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی‘ وہاں کوئی موٹر بوٹ نہیں تھی۔

''میں سمجھی کوئی مدد آ گئی۔'' اس کی آواز سے مایوسی عیاں تھی۔ سعید احمد کو ترس تو آیا لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ شام کی آمد تھی اور اگر ایک گھنٹہ اور گزر گیا تو پھر صبح تک یہاں سے کسی کا گزر ہونے کا امکان نہیں تھا۔

حیرت کی بات ہے اب تک تو دو چار ادارے حرکت میں آ جانے چاہیے تھے‘ وہی ہوا جس کا ڈر تھا گویا رات یہاں اس ویرانے میں گزارنی ہی پڑے گی آخر یہ سب کب بدلے گا۔ ہماری حکومت ہمارے ادارے جن کی نظر میں انسانوں کی زندگی کی کوئی اہمیت ہی نہیں‘ اندھیرا ہونے تک وہ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہی۔

دو چار مچھلیاں لہروں کے ساتھ ساحل پر آ گئی تھیں اور سعید ان کو بنانے بیٹھ گئے تھے۔ کتنا مطمئن ہے یہ شخص‘ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور یہ صاحب مچھلی پکانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ خالدہ دور ایک طرف بیٹھی ہوئی ان صاحب کی حرکات کو بغور دیکھ رہی تھی‘ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں سعید احمد ایک بڑے پتھر کے پیچھے چولہا تیار کر چکے تھے۔ کوئلے اور جلانے کو لکڑی دستیاب تھی‘ ہی انہوں نے نمی کھائی ہوئی ماچسوں کو بھی کارآمد بنا لیا تھا۔ جب آگ جلی تو آس پاس کے ماحول میں روشنی اور گرمی نے زندگی کے آثار کچھ واضح کر دیئے تھے‘ شاید آگ کہیں دور سے گزرنے والوں کو نظر آ جائے اور وہ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔ خالدہ نے اس آگ کی چنگاریوں سے اپنے دل میں امیدوں کے چراغ روشن کر لیے۔

لکڑی کی پھچیوں میں پروئی ہوئی مچھلی پر نمک مل کر اسے آگ پر بھونا گیا تو خاصی لذیذ بن گئی‘ نہ چاہتے ہوئے بھی خالدہ نے اتنا کھا لیا کہ رات گزر جائے‘ اسے حیرت ہوئی اتنی سادہ لیکن اتنی مزیدار مچھلی اس نے کبھی نہیں کھائی تھی اس نے تحسین آمیز نظروں سے سعید احمد کو دیکھا اور پھر آگ کے شعلوں کو تکنے لگی جن کو سوکھی لکڑیاں ڈال کر سعید احمد نے اور بھی زیادہ بھڑکا دیا تھا۔

آنے والے دو گھنٹوں میں دونوں نے کچھ بات نہیں کی‘ ہوا کی سرسراہٹ اور لہروں کی موسیقی میں وہ دونوں ایک دوسرے سے پرے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے‘ اگر بات ہوتی بھی تو شاید ارباب اختیار کی بے حسی کا شکوہ ہی ہوتا۔ خالدہ خوف زدہ تھی‘

زندگی میں پہلی بار اتنی دہشت ناک ماحول اور تنہائی میں کسی غیر مرد کے ساتھ اس دور دراز جزیرے میں بیٹھی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو ایک پل بھی یہاں نہ ٹھہرتی۔ یہ آدمی لاکھ نیک اور شریف ہو لیکن وہ آئندہ پوچھے جانے والے سوالوں اور شک وشبہ والی نظروں کا سامنا کیسے کرے گی' اس کی نیکی اور شرافت سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا' اسے تشویش کے ساتھ سعید احمد کے اطمینان پر بھی غصہ اور جھنجلاہٹ تھی۔

نجانے کیسے ان کو بھی اس کا احساس ہوگیا' ذرا گلہ کھنکار کر انہوں نے خالدہ کو متوجہ کیا۔

''تمہیں مجھ پر غصہ آ رہا ہوگا کہ میں نے اس آفت اور پریشانی کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا' دیکھو بھئی صبح تک میں بھی ڈرا ہوا تھا پھر میں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ ہم اپنی جانیں بچانے کی تگ ودو کے عمل میں گزر رہے ہیں۔ ہمارے بس میں کوشش کرنا ہے' نتیجہ وہ اوپر والے کے قبضہ قدرت میں ہے لہٰذا تم بھی وہی کرو جو میں کر رہا ہوں۔ حالات سے سمجھوتہ اور بس' تم نے کھانا کم کھایا ہے میں بسکٹ اور پانی تمہارے پاس رکھ دیتا ہوں جب ضرورت محسوس ہو تو کھالینا' میں تو سونے چلا۔ وہاں اس کمرے کے باہر میرا بھی بستر تیار ہے' اب کوئی مدد آنے والی نہیں' آگ بجھتی ہے تو بجھ جائے۔''

''آپ اندر جاکر سو جائیے' میں یہاں بیٹھی رہوں گی جب نیند آئے گی تو دیکھا جائے گا۔'' خالدہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ارے بابا یہاں کھلی جگہ میں بیٹھی رہوگی ساری رات' ڈر نہیں لگے گا اور یہ جو اتنی محبت سے کمرہ بنایا تمہارے لیے..... جاؤ تم اندر جاکے سو جاؤ' چلو جاؤ۔'' انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا' وہ اپنے ایک سطح جگہ پر بنے ہوئے ٹاٹ کے بستر تک گئے اور پھر لمحوں میں بے خبر سو گئے۔

خالدہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر کمرے میں گئی' اس نے سونے کی کوشش کی مگر نیند کہاں۔ ہوا کی سرسراہٹ مزید پراسرار لہروں کی موسیقی خوف کی علامت بن گئی تھی۔ جب اس نے تیسری بار اندر سے جھانکا تو بھی وہ بدستور بے خبر سو رہے تھے اس نے سوچا یہ شخص صبح سے مستقل مصروف رہا ہے مجھ سے کوئی مدد بھی اس نے طلب نہیں کی' ضرور تھکن بہت زیادہ ہوگی' جائزہ لینے کے لیے وہ دبے پاؤں باہر آ گئی۔ آسمان پر چاند تو موجود تھا لیکن بادلوں کے بڑے بڑے بوجھل ٹکڑے اس کو اپنی چاندنی بکھیرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے' یہ تیرتے ہوئے بوجھل بادل اب برسے کہ تب..... وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اچانک باریک بوندوں کی پھوار اس کے چہرے پر پڑی' اس نے گھبرا کر سعید احمد کی طرف دیکھا جن پر اس پھوار کا فی الحال کوئی اثر نہیں ہوا تھا' اس نے جھنجوڑ کر انہیں جگا دیا۔

''جلدی سے اندر جائیے ورنہ آپ بھیگ جائیں گے۔''

وہ گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے' ایک لمحے کو اوپر بادلوں کو دیکھا' کچھ سوچا اور پھر اپنا بوریا بستر اٹھا کر کمرے میں چلے گئے۔ نیچے کی خالی جگہ پر انہوں نے اپنا بستر ڈالا اور تھوڑی ہی دیر میں پھر بے خبر سو گئے' ان کی سانسوں کی آواز کبھی تیز اور کبھی ہلکی اس چھوٹی سی جگہ کے ماحول پر حاوی ہوگئی۔ خالدہ کے خوف میں اضافہ کرنے کو ہوا کی سرسراہٹ اور لہروں کے شور میں ایک اور آواز شامل ہوگئی تھی۔ وہ اپنے بستر پر آہستگی سے لیٹ تو گئی لیکن آنکھیں کھولے بدرنگ چھت کو تکتی رہی اسے نیند کا انتظار تھا

یا شاید صبح کا بھی نیند پہلے آ گئی۔ رات کے کسی حصے میں لہروں کے ساحلی پتھروں سے ٹکرانے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ ذرا نیچے لیٹے ہوئے سعید احمد کے کندھے پر رکھا ہوا تھا' اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بے خبر سوتے رہے' باہر شاید ہوا خاموش ہو گئی تھی اور لہریں بھی پر سکون ہو گئی۔ اس پر پھر خوف کا دورہ پڑا' گہرے سکون نے خوف کی نوعیت کو بدل دیا تھا' ہلکی ہوا سے ہلنے والے ناریل کے پتوں سے پیدا ہونے والی آواز کبھی کبھی انسانی چاپ محسوس ہوتی تھی' اس نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن خوف کے سائے اس پر چھائے رہے۔ تب اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ وہاں اس کندھے پر دوبارہ رکھ دیا جہاں سے ہٹایا تھا۔ خوف کے سائے اس کو فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے' ایک سہارے اور ایک دوسراہٹ کا' تحفظ کا احساس اس کے پورے وجود پر چھا گیا اور لمحوں میں وہ گہری نیند سو گئی۔

صبح سعید احمد کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلی' اپنی پہلی پناہ گاہ پتھروں کی قدرتی دیوار کے پیچھے سے جب وہ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو خاصی بدلی ہوئی تھی۔ اس کے رویے میں جھجک اور اجنبیت کے بجائے تازگی اور اپنائیت آ گئی تھی لیکن احترام اور عزت کے ساتھ' اب وہ سوال بھی کر رہی تھی اور سعید احمد کے سوالوں کے جواب بھی دے رہی تھی۔

''تمہاری شادی ہو جانی چاہیے تھی اب تک' اتنی پڑھی لکھی ہو' شکل بھی اچھی خاصی ہے۔ کیا تم نے خود نہیں سوچا اس بارے میں یا کوئی اور وجہ ہوئی' میرا مطلب ہے آخر کیوں......؟'' سعید احمد نے اٹکتے اٹکتے اپنا سوال داغ ہی دیا۔

''وہ...... دراصل میرے ابو کے انتقال کے بعد میں ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مشغول ہو گئی۔ ایم فل کے دوران میرا تیسرا رشتہ بھی انتظار کے بعد ٹوٹ گیا پھر شاید وقت زیادہ گزر گیا وہ جو عمر ہوتی ہے جس میں اچھے رشتے آتے ہیں وہ عمر گزر گئی۔ ہاں اب کچھ دن پہلے ایک رشتہ آیا تھا۔'' شرماتے ہوئے دیر ہونے کی وجوہات اور پھر موجودہ صورت حال بیان کر دی۔

''مجھے ضرور بلانا اپنی شادی میں' بلاؤ گی نا؟'' سعید احمد نے شفقت آمیز انداز میں کہا۔

''ہاں' کیوں نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

جب سعید احمد نے اپنے بارے میں بتایا تو خالدہ کو ان کی تنہائی پر ترس آیا' اس نے سوچا کہ وہ کم از کم اپنے بھائی بھابی اور ماں کے ساتھ تو ہے' وہ تو بالکل ہی اکیلے ہیں۔

مچھیروں کے ٹرالر کے لمبے سائرن نے ان کو چونکا دیا' وہ ہاتھ ہلا کر اور شور مچا کر اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ کچھ دوری پر تھا اور لمحوں میں بہت دور پہنچ گیا' نجانے ان لوگوں نے انہیں دیکھا بھی یا نہیں اگر نہیں دیکھا تو پھر سائرن کیوں بجا رہے تھے چنانچہ یہ امید باقی رہی کہ انہوں نے ان کو دیکھا ضرور ہوگا اور اب شاید کوئی دوسری کشتی وغیرہ آئے گی۔ کھانا کھانے کے دوران وہ ان ہی خیالات میں غلطاں رہے' وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے تھے کہ دوبارہ موٹر کی آواز مدھم مدھم سی سنائی دی۔ ایک چھوٹی تیز رفتار بوٹ نے سائرن بجا کر مدد پہنچ جانے کا اعلان کیا اور پھر کم گہرے پانی میں آ کر ٹھہری' وہاں یونیفارم میں وہ دو آدمی موجود تھے۔ سعید احمد نے ضروری چیزیں اٹھائیں اور خالدہ کا ہاتھ پکڑ کر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتے ہوئے ان لوگوں تک پہنچ

گئے۔ یہ ساحلی محافظ تھے اور مچھیروں کی اطلاع پر یہاں پہنچے تھے' پتا چلا کہ جہاز کے سب لوگ ہی بچ گئے ہیں' چند افراد کو تھوڑی بہت چوٹیں آئی ہیں۔

پولیس اسٹیشن پر بیان دینے اور دوسرے قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد سعید احمد نے خالدہ کے گھر فون کر کے اس کی خیریت بتائی' اس کی ماں اور بھائی سے بات کرائی۔ خالدہ کے اسرار پر وہ لوگ پہلے بہادر آباد اس کے گھر گئے' وہاں سب لوگ منتظر تھے۔ خالدہ نے اپنی روئیداد مختصراً سب کو بتائی۔ سب ہی لوگ سعید احمد کے ممنون تھے بلکہ وہ تو ان کی نظروں میں ہیرو بن گئے تھے وہ جلدی میں تھے' گھر پر ان کے عم زاد یوسف اور ان کی بیوی انتظار میں بیٹھے تھے۔ دوبارہ ملنے کے وعدے اور ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے کے بعد وہ رخصت ہوئے' خالدہ دروازے پر کھڑی رہی جب تک کہ ان کی ٹیکسی گلی سے سڑک پر نہ مڑ گئی۔

گھر پر ان کے عزیزوں کے علاوہ شاگرد اور پڑوسی بھی پہنچے ہوئے تھے' کئی دن تک لوگ ان سے ملنے آتے رہے اور ایک ہی کہانی بار بار سنائی جاتی رہی۔ کچھ دن بعد پھر وہ تھے اور ان کے معمولات' یونیورسٹی پڑھائی اور طالب علموں کے مسائل' ان کو ایک دو بار خیال آیا خالدہ کو فون کرنے کا لیکن انہوں نے مناسب نہیں سمجھا شاید مصروفیت میں معاملہ ٹلتا رہا۔

ہفتوں بعد ایک دن فون آیا' خالدہ پتا سمجھانا چاہ رہی تھی' اسے ملنا تھا اگلے دن کا وقت طے ہوا' سعید احمد نے اپنے کزن اور عزیز دوست یوسف اور ان کی بیگم کو بھی بلالیا' ان دونوں کو خالدہ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ خالدہ جب گھر میں داخل ہوئی تو یوسف اور سعیدہ کو دیکھ کر پریشان ہوگئیں' سعید احمد کو اندازہ ہوگیا لہٰذا جلد ہی معذرت کر کے وہ اس کو باہر برآمدے میں لے آئے۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے' مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ میرے پاس آپ سے ملنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔'' اس نے ایک ہی سانس میں تین جملے ادا کر دیئے۔

''دیکھو میرے بس میں اگر ہوگا تو ضرور میں تمہاری مدد کروں گا لیکن بات کیا ہے کچھ پتا تو چلے۔'' سعید احمد نے ملائمت سے جواب دیا۔ خالدہ نے مدھم لہجے میں بتانا شروع کیا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرا رشتہ طے ہوچکا ہے اب جب میرے گھر والوں نے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی تو ان لوگوں نے بات ختم کردی' انکار کردیا اس رشتے سے۔ ان کو اس حادثے اور میرے ایک غیر مرد کے ساتھ گزارے وقت کے بارے میں پتا چل گیا تھا یہ سب اس طرف کے کچھ لوگوں کی قیاس آرائیوں کی وجہ سے ہوا' اس حادثے میں ہم دونوں کے بچ جانے کی خبر اخبار میں بھی آئی تھی۔ ایک چینل پر بھی یہ خبر چلی' مجھ سے تو صبح کے پروگرام کی ایک اینکر نے بھی رابطہ کیا تھا لیکن میں نے انکار کردیا' وہاں جانے سے پھر ہر نیا دن مجھے ایک نئی الجھن میں ڈالتا رہا۔ کالج میں مجھے اپنے ساتھی اسٹاف ممبرز اور اسٹوڈنٹس کی نظروں میں بھی ہمیشہ سوال نظر آتے ہیں' کچھ نے تو اس بارے مجھ سے بات بھی کی' وہ آپس میں کیا باتیں کرتے ہوں گے مجھے اس کا اندازہ ہے۔'' سعید احمد نے غور سے اس کی بات سنی۔

''تمہارے بھائی کا کیا ردعمل ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ شروع دن سے بجھے بجھے سے تھے' اس اند

کے بعد ان کا رویہ تکلیف دہ ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے تو پتا تھا کہ اکیلے دو دن کے لیے باہر جانا ایک دن ضرور گل کھلائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم نے تو ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' یہ کہتے ہوئے خالدہ کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپک پڑے' رومال سے آنسو پونچھ کر وہ نظریں نیچی کر کے بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی' سعید احمد نے خاموشی کو توڑا۔

''تمہارے بھائی کا رویہ افسوس ناک ہے' شکر ہے کہ تمہاری امی سمجھ دار ہیں' یقیناً ان کو اس انکار سے دھچکا لگا ہوگا' اب تم کیا چاہتی ہو؟ تم کہو تو میں تمہارے گھر آ کر سب کو سمجھانے کی کوشش کروں' میں ان لوگوں سے بھی مل سکتا ہوں جنہوں نے مفروضوں پر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔'' اس نے نظریں اٹھا ان کو دیکھا' ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور آنسو پھر ٹپکنے کو تیار تھے۔

''آپ کے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں' ان میں سے کوئی بھی بدلنے والا نہیں۔ میں اگر کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ بھی کر لوں تو بھی یہ کہانی میرے ساتھ چلتی رہے گی۔'' اس نے رقت بھری آواز میں مشکل سے اپنی بات پوری کی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس تمہارے مسئلے کا حل نہیں' میں چاہتے ہوئے بھی تمہاری مدد نہیں کر پا رہا ہوں۔'' سعید احمد نے دکھ بھرے لہجے میں معذرت کی۔

خالدہ نے نظریں اٹھا کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن آنسو اس کی آنکھوں سے بہنا شروع ہو گئے' بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

''میرے مسئلے کا حل آپ ہی کے پاس ہے بلکہ وہ ہے ہی آپ کے پاس..... آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ آپ کو کرنی تو تھی آپ کے عزیزوں' آپ کے بچوں نے بھی آپ سے کہا تھا' آپ نے ٹال دیا تھا اگر آپ کو منظور نہیں تو کہہ دیجیے' مجھے شکوہ نہیں ہوگا۔ آپ کا احترام میرے دل میں ہے اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا۔ میں آپ کی احسان مند ہوں اور یہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔'' خالدہ کی آواز اتنی بلند تھی کہ یوسف اور سعدیہ بھی ادھر متوجہ ہو گئے۔

وہ اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ گئی' شدت جذبات سے وہ کانپ رہی تھی اور آنسو تھمنے کو نہیں آ رہے تھے اس سے پہلے کہ وہ دروازے کی طرف قدم اٹھاتی' سعید احمد نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے واپس کرسی پر بٹھا دیا۔

''ارے بھئی ٹھہرو' مجھے ذرا سا وقت دو' مجھے سوچنے دو۔'' یہ کہہ کر وہ خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور گویا اپنی عادت کے مطابق مراقبے میں چلے گئے۔

کچھ لمحوں کے بعد وہ اٹھے' خالدہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کو بھی اٹھایا اور ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوئے۔

''سعدیہ تم ان کو سنبھالو' پانی وغیرہ پلاؤ' بہت رو رہی ہیں۔ یہ تمہاری ہونے والی بھابی ہے' یوسف ذرا ان کی امی کو فون لگاؤ اور تم ہی میری طرف سے بات کرو۔'' یہ کہہ کر وہ قریبی صوفے پر دھم سے بیٹھ گئے۔



سنگ دل

محمد اعظم خان

زندگی خدا کا دیا ہوا انمول تحفہ ہے' لیکن کچھ لوگ چند پیسوں کی خاطر بارودی مواد سے بے گناہ لوگوں کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ایک ایسے شخص کا احوال' جس کی زندگی میں خوشیوں کے لمحات بھی آئے تھے لیکن ایک دھماکے نے اسے تنہا کر دیا۔

وہ سر سے پاؤں تک مجسمہ حسن تھی اور منگنی کی رسم میں آئی ہوئی سبھی مہمان خواتین سے منفرد دکھائی دے رہی تھی، اس کی شخصیت، خوبصورتی اور اعتماد کا بہترین امتزاج تھی، اس کی سادگی اور بات چیت میں رکھ رکھاؤ نے اسے مزید پرکشش اور دلفریب بنا ڈالا تھا، وہ اپنی دیگر دوستوں کی نسبت انتہائی کم گو تھی، مگر جب بولنے کے لیے لب کھولتی تو اس کے موتیوں جیسے دانت، اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر ڈالتے تھے، وہ ہلکا سا مسکراتی تو ہر سُو گھنٹیاں بج اٹھتیں، اس نے فنکشن کی مناسبت سے مناسب میک اپ کر رکھا تھا، ہوا کے جھونکے سے اس کے کھلے بال، جب اس کے چہرے پر بکھر جاتے تو ایسا دکھائی دینے لگتا، جیسے کسی بادل کے ٹکڑے نے اس کے چاند جیسے چہرے کو اپنے اندر چھپا لیا ہو، وہ قدرت کا ایسا حسین شاہکار تھی، جسے دیکھتے ہی وقاص اپنی آنکھیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

وہ پہلی ہی نظر میں اس کے دل کو بھا گئی تھی، وہ جب سے وہاں آئی تھی، کسی کی پیار بھری نگاہیں مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھیں، وہ جہاں بھی جاتی، وہ نگاہیں پھسل کر وہیں جا پہنچتی تھیں، حسن کی اس ملکہ سے زیادہ دیر تک یہ بات چھپی نہیں رہ سکی تھی کہ وہ کسی کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے، اس لیے مزید محتاط ہو گئی تھی۔

شہر کے معروف بزنس مین، ارشد علی کی بڑی بیٹی، ملیحہ کی منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے بہت سے مہمان جمع تھے، ارشد علی نے گھر کے وسیع لان میں ہی مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا تھا، صبح سے ہی کیٹرنگ والے انتظامات میں لگے ہوئے تھے، شام تک انہوں نے گھر کو دلہن کی طرح سجا دیا تھا، لان میں ہی ایک طرف مردوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا، جبکہ ان کے برابر میں ہی خواتین کے لیے جگہ مخصوص تھی، ان کے سامنے ہی ملیحہ کے بیٹھنے کے لیے سٹیج بنائی گئی تھی، جسے مختلف اقسام کے امپورٹڈ تازہ پھولوں سے انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، سٹیج پر کئی صوفے بھی رکھے گئے تھے، تاکہ رسم کی ادائیگی کے وقت، ملیحہ کے سسرال والے اور دیگر مہمان باآسانی بیٹھ سکیں۔

ارشد علی نے کاروباری حلقوں میں سے صرف چند مخصوص لوگوں کو دعوت دی تھی، ملیحہ نے بھی اپنی یونیورسٹی کی کچھ انتہائی قریبی دوستوں کو ہی بلایا تھا، اسی طرح ارشد علی کے اکلوتے بیٹے، وقاص اور چھوٹی بیٹی فریحہ نے بھی اپنے گنے چنے چند کلاس فیلوز کو ہی مدعو کیا تھا، ارشد علی اور اس کی بیوی، عطیہ

کے قریبی رشتے دار اور بہن بھائی بھی خوشی کے اس موقع پر موجود تھے۔

ارشد علی نے مہمانوں کے لیے شہر کے مشہور کیٹرنگ والوں سے کھانا تیار کروایا تھا، جبکہ بار بی کیو کا انتظام لان میں ہی کیا گیا تھا، آنے والے مہمانوں کے لیے باوردی ویٹر کولڈ ڈرنکس پیش کر رہے تھے، سبھی مہمان اپنی اپنی جگہ بیٹھے آپس میں خوشگوار موڈ میں گپ شپ لگا رہے تھے، یہی حال لیڈیز کی طرف تھا، دونوں طرف بات بات پر قہقہے بلند ہو رہے تھے، سبھی مہمان آ چکے تھے، اب انہیں ملیحہ کے سسرال والوں کا شدت سے انتظار تھا، ان لوگوں نے اپنی روانگی کی اطلاع کر دی تھی اور اب وہ کسی بھی لمحے وہاں پہنچ سکتے تھے، ان کے آنے کی اطلاع ملتے ہی، مہمانوں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے کے لیے کچھ لڑکیاں ڈسپوزیبل پلیٹوں میں پھولوں کی پتیاں ڈالے مین اینٹرنس پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔

مہمانوں کی آمد پر ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا تھا، ملیحہ کے سسرال والوں کے آتے ہی میزوں پر کھانا لگانے کے لیے ویٹروں کی دوڑیں لگ گئی تھیں اور بار بی کیو والوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا، منگنی کی رسم کے طور پر ملیحہ کو ڈائمنڈ کا سیٹ پہنایا گیا تھا، ملیحہ کام دار سوٹ میں جاپانی گڑیا دکھائی دے رہی تھی، سبھی نے اسے گلے لگا کر مبارک باد دیتے ہوئے ڈھیروں دعائیں دیں، بہت سے کیمرے کھٹا کھٹ تصویریں بنانے میں لگے ہوئے تھے، کچھ مہمان اپنے اپنے موبائل سے ویڈیو بھی بنا رہے تھے۔

وقاص نے بھی ہاتھ میں اپنا موبائل تھام رکھا تھا، اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح خوبصورتی کے اس پیکر کی کم از کم ایک تصویر تو بنا لے، جسے دیکھ کر وہ تنہا بیٹھا باتیں کرتا رہے، مگر شدید خواہش اور موقع ملنے کے باوجود بھی وہ اپنی سوچوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکا، اور مہمانوں کی رخصتی شروع ہو گئی، جب ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہونے لگے تو وہ پری بھی وہاں سے چلی گئی اور وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

رات بہت بیت گئی تھی، اس کی دونوں بہنیں اور والدین اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو وہ بھی اپنے بیڈ روم میں آ گیا، کام کرنے کے لیے گھر میں بہت سے ملازم موجود تھے، اس لیے اسے کوئی زیادہ کام نہیں کرنا پڑا تھا، پھر بھی وہ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا، وہ کمرے کی لائٹس آف کر کے بیڈ پر لیٹ گیا تھا اور لیٹتے ہی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں، اس کا خیال تھا کہ وہ لیٹتے ہی سو جائے گا، مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، لیکن وہ چہرہ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا، اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں، مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا، اس نے اپنی تسلی کے لیے کمرے میں اِدھر اُدھر بغور دیکھا تھا، لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا، اس لیے اس نے ایک بار پھر سے آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر اس بار بھی وہی چہرہ اس کے سامنے تھا۔

اس سے پہلے کبھی اس کی یہ حالت نہیں ہوئی تھی، پھر آج یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا، وہ کچھ دیر تک بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا، پھر جب بے چینی اور بھی بڑھنے لگی تو اس نے بیڈ چھوڑ دیا اور کمرے میں ہی ٹہلنے لگا، اس وقت اس کی تمام تر سوچوں کا محور وہی خوبصورت دوشیزہ بنی ہوئی تھی، کبھی اس کا آنچل اس کے چہرے کو چھو کر

گزر جاتا، جسے پکڑنے کے لیے وہ اپنے دونوں ہاتھ تیزی سے آگے بڑھا دیتا، مگر اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آتا، وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھا، وہ حیران تھا کہ اس نے زندگی میں بہت سی لڑکیاں دیکھی تھیں، یونیورسٹی میں بھی بہت سی لڑکیاں اس کی کلاس فیلو تھیں، مگر ان میں سے کسی کو بھی دیکھ کر کبھی اس کی ایسی حالت نہیں ہوئی تھی، پھر اس میں ایسا کیا تھا، جو وہ اس کے دل و دماغ پر قابض ہو گئی تھی، کہیں اسے پیار تو نہیں ہو گیا تھا لیکن پھر اس نے اپنے اس خیال کی خود ہی نفی کر دی تھی، کیونکہ وہ اس بات کی ہمیشہ سے مخالفت کرتا چلا آیا تھا کہ پہلی نظر میں بھی کسی سے پیار ہو سکتا ہے۔

جیسے تیسے رات بیت گئی تھی، مگر اس کی بے قراری کو قرار نہیں آیا تھا، وہ اپنی بہنوں اور والدین کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھا تھا، ملازم نے میز پر ناشتہ لگا دیا تھا، لیکن وہ اپنی سوچوں میں ہی گم تھا، اسے اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ناشتے کے لیے بیٹھا تھا، اس کی یہ حالت گھر کے چاروں افراد سے چھپی نہیں رہ سکی تھی، ان سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے وقاص کے بارے میں دریافت کیا تھا، مگر ان سب نے اشاروں ہی اشاروں میں اس کی حالت کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

''کچھ لے کیوں نہیں رہے بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' ماں نے بیٹے کو ناشتہ کرنے کی بجائے گم سم بیٹھے دیکھ کر پریشانی کے عالم میں دریافت کیا۔

ماں کی بات وقاص کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی تو اسے ایسا لگا، جیسے کسی نے اسے دور کہیں سے آواز دے کر بلا لیا ہو اور وہ اپنی حالت چھپانے کی غرض سے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں ٹھیک ہوں ماما۔'' یہ کہتے ہوئے وہ گلاس میں فریش جوس ڈال کر پینے لگا۔

بیٹے کے جواب سے ماں مطمئن نہیں ہوئی تھی، لیکن پھر بھی اس نے اسے مزید کریدنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

وہ تینوں بہن بھائی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے، ان تینوں کی کوئی بھی بات ایک دوسرے سے چھپی ہوئی نہیں تھی، وہ اپنی ہر بات آپس میں شیئر کرتے تھے، اس کے باوجود اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بہنوں سے حالِ دل بیان کر سکے، اُدھر اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ اس چہرے کو جس قدر بھلانا چاہتا، وہ اسی قدر شدت سے اس کی تنہائیوں میں کھنچا چلا آتا تھا، رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اسے اس چہرے کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا، پہلے پہل اس کا دیدار کرنے کے لیے آنکھیں بند کرنا پڑتی تھیں مگر اب کھلی آنکھوں سے بھی محبوب کا دیدار ہونے لگا تھا، لیکن اس کی بے قراری کو کسی بھی پل قرار نصیب نہیں ہوتا تھا۔

وہ دل نشیں سامنے بیٹھا تھا اور اس کے دیدار سے آنکھوں کی پیاس بجھائی جا رہی تھی، اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی، اس دل نشیں کو وصل کے ان لمحات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں ہوئی تھی، اسی لیے وہ روٹھ کر چلی گئی تھی، وہ آگے بڑھ کر اسے منا لینا چاہتا تھا، مگر اب وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی، اسی دوران دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی تھی۔

''آ جائیں۔'' وقاص نے بیڈ پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

اس کی طرف سے اندر آنے کی اجازت پا کر ملیحہ اور فریحہ دروازہ کھول کر اندر آ گئیں اور بیڈ کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے بھائی' آج کل مسکرانا ہی بھول گئے ہو؟" ملیحہ نے صوفے پر بیٹھتے ہی بھائی سے دریافت کیا۔

"نہیں تو ایسا کچھ بھی نہیں۔" وقاص نے اپنی اندرونی کیفیت چھپانے کی غرض سے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجا کر جواب دیا۔

"کچھ تو ہے۔" اب چھوٹی بہن نے شرارت بھرے لہجے میں بات کی تھی۔

فریحہ کے پوچھنے پر وقاص کے اندر سے ایک آواز اٹھی تھی۔

"جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو، پھر نہ جانے یہ موقع ملے نہ ملے۔" مگر اس نے اس خوف سے کہ ایسا کرنے سے کہیں وہ ان کے مذاق کا نشانہ ہی نہ بن جائے، کمال ہوشیاری سے اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز کو دبا لیا اور بولا۔

"میں تو اچھا بھلا ہوں' تمہیں ہی کوئی وہم ہو گیا ہے۔"

"مگر بات بات پر قہقہے بکھیرنا، آتے جاتے ہمیں ستا کر خوش ہونا' وہ سب کہاں گیا؟" اس بار ملیحہ نے سوال کیا تھا۔

"کیا ہم اس بات کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کر سکتے' ایسا لگتا ہے جیسے تم دونوں مجھ سے گپ شپ لگانے نہیں، بلکہ میری انکوائری کرنے آئی ہو۔"

بھائی کی بات سن کر ان دونوں نے ہی اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا اور ملیحہ کی منگنی کی باتیں کرنے لگے تھے، کچھ دیر تک وقاص بجھا بجھا سا رہا، مگر جلد ہی اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا تھا اور کچھ روز پہلے جیسا وقاص بن کر بہنوں کے ساتھ مکمل دلچسپی سے باتیں کرنے لگا تھا، اب ان کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں، وہ تینوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ باتیں کرتے جائیں، مگر رات بہت بیت چکی تھی، اس لیے وہ وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

ملیحہ اور فریحہ وہاں سے چلی گئیں تو وہ یہ سوچ کر خود کو کوسنے لگا کہ قدرت نے اسے اس حسینہ کے متعلق جاننے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا، جسے اس نے اپنی بیوقوفی کی وجہ سے گنوا دیا تھا۔

اب اسے کسی بھی پل قرار نہیں تھا، اٹھتے بیٹھتے اسے ایک ہی چہرہ دکھائی دیتا تھا، ابھی تک وہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ جان نہیں پایا تھا، مگر اسے اپنانے کے لیے سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا، ایک وہ وقت تھا، جب بہنوں کے دریافت کرنے پر بھی وہ بات گول کر گیا تھا، لیکن اب وہ اس کے بارے میں بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا، اس نے کسی بھی طرح اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا، جس کے لیے اسے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔

"تم نے منگنی پہ اپنی بہت کم دوستوں کو بلایا تھا۔" وقاص نے موقع پا کر ملیحہ سے بات کی۔

"ہاں..... کیونکہ میری خواہش تھی کہ میں اپنی خوشی میں صرف ان دوستوں کو شرکت کی دعوت دوں، جو میرے بہت قریب ہیں۔"

"میں سمجھا شاید پاپا نے تمہیں زیادہ دوستوں کو بلانے سے منع کیا تھا۔"

"نہیں' پاپا کی طرف سے تو ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔"

''میرے خیال میں جو لڑکیاں آئی تھیں، ان میں بھی زیادہ تر تمہاری یونیورسٹی کی کلاس فیلوز ہی تھیں۔'' وقاص کسی طرح گھما پھرا کر بات اپنے مطلب کی طرف لا رہا تھا۔

''نہیں ایک دو کالج کے زمانے کی بھی تھیں۔ ایک میرے سکول کے وقتوں کی دوست تھی بلکہ اسے تو تم اچھی طرح جانتے بھی ہو۔''

''تمہاری سبھی دوستوں کو میں نے کسی نہ کسی موقع پر دیکھا ہوا ہے لیکن ان میں سے ایک لڑکی کو میں نے شاید پہلی بار دیکھا ہے۔''

''کون سی لڑکی؟''

''جس نے بلیک شرارہ اور پنک لانگ شرٹ پہن رکھی تھی۔'' وقاص جس بات کو چھپانے کی کوشش میں تھا، وہ پھسل کر لبوں پر آ گئی تھی۔

وقاص کی بات سن کر ملیحہ نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا اور بولی۔

''بھائی، تم لڑکیوں کو اس قدر غور سے دیکھتے ہو؟''

''ایسی بھی بات نہیں، میں نے تو محض تمہیں سمجھانے کے لیے بتایا تھا۔''

''نہیں نہیں، پوچھو جو پوچھنا ہے اور اگر تم فائزہ کی بات کر رہے ہو تو مجھے اور بھی خوشی ہوگی، کیونکہ وہ میری سب سے فیورٹ دوست ہے۔''

''اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ وہ مجھے اچھی لگی تو تمہارا رسپانس کیا ہوگا؟'' بھائی نے دل کی بات بہن کی عدالت میں رکھ دی تھی۔

''اگر تم نے یہی بات کرنی تھی تو اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تم اس سلسلے میں میرا ساتھ دو گی ناں؟''

''یہ کام تم مجھ پہ چھوڑ دو میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر ممی، پاپا سے بات کروں گی۔'' ملیحہ نے بات کی اور وقاص کا جواب سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔



وقاص نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی بات بہن کے کانوں میں ڈال دی تھی، اب اسے ملیحہ کے بات کرنے اور اس پر والدین کی طرف سے سنائے گئے فیصلے کی گھڑی کا انتظار تھا۔

''پاپا! بھائی اس گھر کی رونق بڑھانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔'' ملیحہ نے کھانے کی میز پر بیٹھے، سب کی موجودگی میں اچانک بات کر دی تھی، وقاص کو اس بات کا ہرگز یقین نہیں تھا، اسی لیے وہ پریشانی کے عالم میں ملیحہ کو دیکھنے لگا تھا، گھر کے دیگر افراد بھی ملیحہ کی بات پر چونک گئے تھے۔

''کیا مطلب؟'' ارشد علی نے بیٹی کی بات سن کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ ہمارا بھائی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔''

''شادی مگر یہ تو شادی کے نام سے بھی دور بھاگتا تھا۔''

''وقت وقت کی بات ہے پاپا، وہ سب تب تک تھا، جب تک اسے میری کلاس فیلو، فائزہ جیسی لڑکی نہیں ملی تھی مگر اب تو ہمارا بھائی دن رات، اٹھتے بیٹھتے، اسی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔''

''کیوں بھئی وقاص، کچھ تم بھی تو کہو۔'' ارشد علی نے ملیحہ کی بات سن کر بیٹے سے دریافت کیا۔

وقاص نے اب تک اپنی آنکھیں زمین میں گاڑ رکھی تھیں، باپ کا سوال سن کر اسے مجبوراً ان کی طرف دیکھنا پڑا اور بولا۔

''مجھے اس معاملے میں آپ سے بات کرنا کچھ مناسب نہیں لگا تھا اس لیے میں نے ہی ملیحہ کو

آپ سے بات کرنے کو کہا تھا۔"

"اگر بھائی ملیحہ کی دوست فائزہ کی بات کر رہا ہے تو میرا ووٹ بھائی کے ساتھ ہے۔" کسی اور کے بولنے سے پہلے فریحہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"واقعی' فائزہ بہت کیوٹ ہے اور مجھے پسند بھی اس لیے میں بھی وقاص کے ساتھ ہوں۔" ماں نے بھی بیٹے کی حمایت کر دی۔

"بھئی جب سب لوگ فائزہ کے حق میں ہیں پھر تو ان کے گھر والوں سے ملاقات کرنی ہی پڑے گی۔" ارشد علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وقاص بہت خوش تھا، یہ مرحلہ با آسانی طے ہو گیا تھا، اسے پورا یقین تھا کہ فائزہ کے گھر والے بھی اس رشتے سے انکار نہیں کریں گے۔

جب سے گھر میں فائزہ کے بارے میں بات ہوئی تھی، دونوں بہنوں کو کسی پل چین نہیں آ رہا تھا، وہ جلدی سے فائزہ سے بات کر لینا چاہتی تھیں، مگر ان دونوں کا ہی خیال تھا کہ ایسی باتیں کرنے کے لیے رات کا وقت مناسب ہے، تاکہ وہ سکون سے بیٹھ کر بات کر سکیں، رات ہوئی تو وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئیں اور پروگرام کے مطابق ملیحہ اپنے موبائل سے فائزہ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

فائزہ بیڈ پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، اس کے موبائل پر بیل ہونے لگی تھی، اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو ملیحہ کی کال تھی، اس نے کال اٹینڈ کر کے موبائل کان سے لگا لیا اور پر جوش انداز میں بولی۔

"السلام علیکم! کیسی ہو جانو......؟"

"آج میں نے فون کر لیا تو کیسی ہو جانو' ورنہ خود سے کبھی تم نے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔" ملیحہ نے پیار بھرے انداز میں شکوہ کیا۔

"بس یار' روز سوچتی ہوں آج تمہیں فون کروں گی، پھر کسی نہ کسی کام میں لگ جاتی ہوں اور تمہیں فون نہیں کر پاتی۔"

"اچھا اور سناؤ کیسے دن گزر رہے ہیں؟"

"میں تو گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں' سچ پوچھو تو یونیورسٹی میں گزارے ہوئے دن بہت یاد آتے ہیں۔"

"ہاں یار' بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو......مگر ساری زندگی یونیورسٹی میں ہی تو نہیں بیٹھے رہنا تھا ناں۔"

کال کرنے سے قبل فریحہ نے ملیحہ کو موبائل کا سپیکر آن کرنے کو کہا تھا، مگر وہ اس کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی، اس لیے وہ بھی ملیحہ کے موبائل سے کان لگائے بیٹھی تھی، لیکن فائزہ کی کوئی بات اسے ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی، اس لیے اس نے ملیحہ سے موبائل چھین کر اپنے کان کو لگا لیا اور جلدی سے بولی۔

"آپی' ملیحہ کی تو عادت ہے بات کو گھما پھرا کر کرنے کی سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے بھائی کے لیے آپ کا رشتہ مانگنے آپ کے ہاں آنا چاہ رہے ہیں' بولو ہاں کہ ناں۔"

فریحہ کی بات سن کر اس طرف مکمل خاموشی چھا گئی تھی، اس نے کچھ دیر انتظار کیا، جب فائزہ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ یہ جاننے کے لیے کہ فائزہ لائن پر موجود تھی، بولی۔

"ہیلو آپی' آپ میری بات سن رہی ہیں ناں؟"

"میں سن رہی ہوں فریحہ۔"

"تو پھر آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟"

"میں بھلا اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں یہ تو

بڑوں کا کام ہے اگر تم لوگ رشتے کے لیے آنا چاہ رہے ہو تو اس معاملے میں گھر کے بڑے ہی بات کرتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ آپ کی ماما میری امی سے بات کرلیں پھر جیسے وہ پروگرام طے کریں۔ اسی طرح کرلیں۔"

"آپی سچ پوچھیں تو آپ کی باتیں سن کر میرے دل میں آپ کی عزت اور بھی بڑھ گئی ہے' امید ہے جلد ملاقات ہوگی' اللہ حافظ۔"

فون بند ہوگیا تھا، ملیحہ شکر گزار نظروں سے فریحہ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جو بات کرنے کے لیے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے، اس کی چھوٹی بہن نے وہی بات کس قدر با آسانی کہہ ڈالی تھی۔



وہ سبھی فائزہ کی امی سے پروگرام طے کرکے ان کے ہاں پہنچے تھے، انہیں علم تھا کہ وقاص بھی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ آئے گا، اس لیے اوروں سے زیادہ شمائلہ کو ان کے آنے کا بے صبری سے انتظار تھا، وہ جلد سے جلد اسے دیکھ لینا چاہتی تھی، وہ پہنچے تو وقاص بھی ان کے ساتھ تھا، شمائلہ دوسری لڑکیوں کی طرح اسے چھپ چھپ کر دیکھنے کی بجائے اس کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور اپنے خاندان کے ساتھ جڑنے کے خواہشمند نوجوان کو بغور دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں یہ سوچ کر مطمئن ہوگئی تھی کہ اس کی آپی کے لیے کوئی ایسا ہی جیون ساتھی ہونا چاہیے تھا، جس میں ہر وہ خوبی ہو جو کسی مرد میں ہونی چاہئیں۔

ان کے لیے کھانے کا خوب اہتمام کیا گیا تھا، ماں بیٹیاں ان کے سامنے بچھی جارہی تھیں، ان سب میں ارشد علی وہ واحد شخص تھا، جس نے فائزہ کو پہلی بار دیکھا تھا، اسے بھی اپنے بیٹے کے لیے فائزہ جیسی لڑکی کی ہی تلاش تھی، فائزہ کو دیکھ کر اس کی تلاش ختم ہوگئی تھی اور وہ اس قدر خوش دکھائی دے رہا تھا، کہ اس کی خوشی اس کے چہرے پر بھی جھلک رہی تھی۔

"بہن جی! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ ہم یہاں اپنے بیٹے وقاص کے لیے فائزہ کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔" ارشد علی نے باتوں کے دوران اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"آپ کا آنا سر آنکھوں پر' یہ بات تو آپ کے علم میں بھی ہوگی کہ ان بچیوں کا باپ نہیں' میں نے انہیں صرف ماں نہیں باپ بن کر بھی پالا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں اپنی بچی کی مرضی جانے بغیر کوئی فیصلہ کروں' اس لیے میری آپ سے یہ التجا ہے کہ مجھے چند دن کی مہلت دی جائے، تاکہ میں اپنی بچی کی بھی مرضی جان لوں۔" دردانہ نے اپنی آنکھوں میں تیرنے والے آنسوؤں کو بہنے سے روکتے ہوئے انتہائی انکساری سے بات کی۔

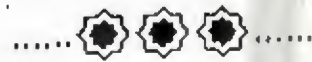
"کیوں نہیں' میں تو خود اس حق میں ہوں کہ بیٹیوں کی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرنے سے قبل ان کی مرضی ضرور جان لینی چاہیے' جب ایسا کرنے کی اجازت ہمیں ہمارا مذہب بھی دیتا ہے تو پھر پوچھ لینے میں حرج کیا ہے۔" ارشد علی نے بات کی اور پھر فائزہ اور شمائلہ کو بلا کر اپنے پاس ہی صوفے پر بٹھالیا اور پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا" جیسے ملیحہ اور فریحہ میری بیٹیاں ہیں اسی طرح تم بھی میری بیٹیوں جیسی ہو' کبھی کسی بھی موقع پر خود کو تنہا مت سمجھنا' ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔" ارشد علی نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی، اس سے پہلے کہ ارشد علی کے ضبط کے بندھن

ٹوٹ جاتے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے، اس نے دردانہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اچھا بہن جی! اب ہمیں اجازت دیں' ہمیں آپ کے فیصلے کا انتظار رہے گا۔''

ارشد علی کی بات کے جواب میں دردانہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی، اس لیے اس نے اپنی گردن ہلا دی تھی۔

بات کرتے ہی ارشد علی اٹھ کھڑا ہوا تھا، اسے اٹھتے دیکھ کر وہاں بیٹھے دیگر افراد بھی اٹھ گئے تھے، تینوں ماں بیٹیاں ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کار پورچ تک آئی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے انہیں خدا حافظ کہا تھا۔



''میں ان ماؤں میں سے نہیں جو اپنا ہر فیصلہ اولاد پر زبردستی تھونپ دیتی ہیں جو لوگ آئے تھے، انہیں تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو' آج تم نے وقاص کو بھی دیکھ لیا۔ اب کوئی بھی بات تم سے چھپی ہوئی نہیں' اس معاملے میں تمہیں پورا حق ہے کہ تم وہ فیصلہ کرو، جو تمہارا دل کہتا ہو۔'' مہمانوں کو الوداع کہنے کے بعد واپس ٹی وی لاؤنج میں آکر بیٹھتے ہی دردانہ نے بیٹی کو پیار سے سمجھایا۔

''میری طرف سے تو ہاں ہے۔'' شمائلہ نے جھٹ سے جواب دیا۔

''تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں رہ سکتی؟'' دردانہ نے شمائلہ کو ڈانٹا۔

ماں کی بات سن کر شمائلہ نے شرارت سے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ لی اور اشارے سے کہا۔ ''آپ بات جاری رکھیں، اب میں نہیں بولوں گی۔''

''تم کیا کہتی ہو۔'' دردانہ نے ایک بار پھر فائزہ سے سوال کیا۔

''آپ نے ہمیں جس قدر پیار دیا ہے وہ شاید ہی کوئی ماں دے پاتی ہوگی۔ خدا گواہ ہے، اگر آپ مجھ سے مشورہ کیے بغیر بھی کوئی فیصلہ کر لیتیں تو میں کبھی اف تک نہ کہتی لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھ ہی رہی ہیں تو پلیز امی' مجھے کچھ دن کی مہلت دے دیں تاکہ میں صحیح فیصلے تک پہنچ سکوں۔'' ماں کی بات سن کر فائزہ نے کسی سعادت مند بیٹی کی طرح بات کی۔

''ہاں ہاں' کیوں نہیں کسی جلد بازی کی ضرورت نہیں جو بھی فیصلہ کرو خوب سوچ سمجھ کر کرو۔''

''تھینک یو امی۔'' فائزہ نے بات کی اور پیار سے اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا۔



شمائلہ کے بس میں ہوتا تو فیصلہ کرنے میں ایک منٹ بھی نہ لگاتی، مگر اسے اس بات کی الجھن ہونے لگی تھی کہ کئی دن گزر گئے تھے، لیکن فائزہ نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

وہ کچن میں کھڑی کھانا تیار کر رہی تھی کہ شمائلہ بھی وہیں پہنچ گئی۔

''آپی! کوئی اور تمہارے دل میں ہے تو صاف صاف بتا دو۔'' فائزہ کے پاس آتے ہی شمائلہ نے بات کی۔

''کیا مطلب؟'' فائزہ نے بہن کے اچانک سوال پر حیران ہو کر دریافت کیا۔

''مطلب یہ کہ اتنا اچھا رشتہ آئے اور لڑکی ہاں کرنے کی بجائے سوچنے کے لیے وقت مانگے تو اس میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔''

''تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتی۔''

''ٹھیک ہے میں خاموش ہو جاتی ہوں لیکن تم

یہ بات کسی کنارے لگادو اور ہاں کردیا ناں مگر بات کولٹکا ؤ مت۔''

''تم اپنے لیے جوتا بھی خریدنے جاتی ہو تو کئی جوڑے جوتوں کے نکلوا کر کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد بمشکل تمہیں کوئی جوتا پسند آتا ہے اور مجھ سے یہ امید رکھتی ہو کہ میں اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ بغیر سوچے سمجھے کرڈالوں۔''

''میں نے کہا ہاں یا ناں۔'' فریحہ ابھی تک اپنی ضد پر قائم تھی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟''

''دیکھو آپی! سیدھی طرح ہاں کردو ورنہ۔''

''ورنہ کیا؟''

ورنہ...... ورنہ میں اپنے لیے ہاں کردوں گی وقاص بھائی اتنے ہینڈسم، تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے ہیں کہ انہیں دیکھتے ہی دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے کوئی تم جیسی بیوقوف لڑکی ہی ہوگی جو اُن سے شادی سے انکار کرے گی۔''

''تم کبھی نہیں سُدھرو گی۔''

''یہی زندگی ہے آپی کل کا کیا ہے ہم ہوں نہ ہوں لیکن ہماری باتیں تو یاد رہیں۔'' شمائلہ نے ہنستے ہوئے کہا، پھر فوراً ہی بولی۔

''مگر تم مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھانے کی کوشش نہ کرو بولو ہاں کہ ناں۔''

''ہاں...... میری ماں...... ہاں۔''

''جیتی رہو بہنا۔'' شمائلہ نے ہنستے ہوئے بات کی، پھر دونوں بہنیں گلے لگ گئیں، وہ بہت خوش تھیں اور خوب قہقہے بکھر رہے تھے، مگر پھر گلے ہی لمحے وہ دونوں ہی رو رہی تھیں، اس رونے کے پیچھے باپ کی کمی کا احساس تھا یا پھر ایک دوسرے سے جدائی کا دکھ انہیں رلا گیا تھا، ان کے رونے کی آواز دردانہ کے کانوں میں پڑی تو وہ پریشانی کے عالم میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کچن میں پہنچی، جہاں دونوں بہنیں ایک دوسرے کے گلے سے لگی رو رہی تھیں۔

''سب خیر تو ہے؟'' دردانہ نے کچن میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

ماں کی آواز سنتے ہی دونوں بہنوں نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کرلیے، شمائلہ کی شرارتی رگ ایک بار پھر پھڑک اٹھی تھی، اس لیے فوراً بولی۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''آپی نے رشتے کے لیے ہاں کردی ہے۔'' اس بار شمائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔''

''دیکھ لیں امی آپ کی ہونہار بیٹی شمائلہ کتنی خوبیوں کی مالک ہے پھر بھی غرور نہیں کرتی۔'' شمائلہ نے اپنی تعریف اس انداز میں کی کہ دردانہ اور فائزہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔



دردانہ نے فون پر ہی عطیہ کو رشتے کے لیے ہاں کردی تھی، عطیہ کئی روز سے اسی پل کے لیے انتظار کررہی تھی، اس سے یہ خبر سنبھالی نہیں جارہی تھی، اس لیے فوراً یہ بات اپنے بچوں اور خاوند کے کانوں میں ڈال دی تھی، جو خوشی سے اچھل پڑے تھے، جب تک ادھر سے ہاں نہیں ہوئی تھی، وقاص کا چہرہ لٹکا ہوا تھا، اب اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ فائزہ سے بات کرے، مگر اس کے پاس اس کا موبائل نمبر نہیں تھا، اس لیے موبائل نمبر حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی دونوں بہنوں کی خوشامد

کرنا پڑ رہی تھی، مگر وہ جان بوجھ کر بھائی کو ستا کر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''تم دونوں ہی میری کتنی اچھی بہنیں ہو کیا بھائی کا چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتیں۔'' وقاص نے ملیحہ اور فریحہ کو اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بات کی۔

''لیکن تم فائزہ آپی کا موبائل نمبر لے کر کیا کرو گے بھائی؟'' فریحہ نے جان بوجھ کر وقاص کو چھیڑا۔

''میں اسے منگنی کی مبارک باد دوں گا۔'' وقاص نے معصوم سا چہرہ بنا کر کہا۔

''یہ کام تو ہم بھی کر سکتی ہیں۔'' فریحہ بھائی کو تنگ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

''ملیحہ تم تو سمجھدار ہو تم ہی سمجھاؤ ناں اسے۔'' وقاص نے ملیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے بات کی۔

''اچھا یہ سمجھدار ہے اور میں بیوقوف ہوں، بس ٹھیک ہے اب تو نمبر کسی بھی صورت میں نہیں ملے گا۔'' اس بار بھی جواب فریحہ نے ہی دیا تھا اور ملیحہ خاموش رہی تھی۔

بھائی کے ہنستے مسکراتے چہرے پر مایوسی کے سائے دکھائی دینے لگے تو ملیحہ کو بھائی کی حالت پر ترس آ گیا اور اس نے وقاص کو فائزہ کا نمبر نوٹ کروا دیا۔

فون نمبر ملنے پر وقاص کے چہرے پر اس قدر رونق آ گئی تھی، جیسے اسے فائزہ کا موبائل نمبر نہ ملا ہو، کوئی بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو، رات کو وہ اپنے کمرے میں آ بیٹھا اور اپنے موبائل سے فائزہ کا نمبر ملانے لگا، مگر دوسری طرف سے کوئی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا، اس نے کئی بار کوشش کی تھی مگر کال اٹینڈ نہیں ہوئی تھی، دل کی بے قراری اور بڑھتی جا رہی تھی، اسے عجیب سی کوفت ہونے لگی تھی، اسی لمحے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ شاید وہ unknown نمبر کی وجہ سے فون اٹینڈ نہ کر رہی ہو، اس لیے اس نے message لکھ بھیجا کہ وہ کال اٹینڈ کرے۔

sms بھیجنے کے بعد وقاص نے پھر سے فائزہ کا نمبر ملایا تو نمبر ملنے پر اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا اور کال اٹینڈ کر لی گئی تھی، جس پر وقاص نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''شکر ہے آپ نے کال تو اٹینڈ کی۔'' کال ملنے پر وقاص نے کہا۔

دوسری طرف کوئی فون پر موجود تھا، مگر اس کی بات کے جواب میں کچھ کہا نہیں گیا تھا۔

''آپ میری بات سن رہی ہیں ناں؟'' وقاص نے ایک بار پھر بات کرنے کی کوشش کی۔

''جی میں سن رہی ہوں۔'' کچھ دیر انتظار کے بعد ادھر سے مختصر جواب دیا گیا۔

''دراصل میں مبارک باد دینے کے علاوہ آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔''

''شکریہ کس بات کا؟'' فائزہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بھئی آپ نے شادی کے لیے ہاں جو کر دی ورنہ جس روز سے ہم آپ کے ہاں سے ہو کر آئے ہیں، اس روز سے میری جان تو سولی پر ہی لٹکی ہوئی تھی اور ہر روز یہی سوچتا تھا کہ نہ جانے کب آپ کی طرف سے کیا خبر آ جائے۔''

''چلیں اب تو خوش ہیں ناں؟''

''صرف خوش نہیں، بہت خوش ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل گئی

ہو۔''

''اچھا اب آپ سے بات ہوگئی اب میں فون رکھتی ہوں اللہ حافظ۔''

وقاص ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا، مگر فائزہ نے بات کرتے ہی فون بند کر دیا تھا، اس لیے وہ لائٹس آف کر کے لیٹ گیا تھا، نینداس سے میلوں دور تھی، مگر وہ خوش تھا کہ اس نے اپنی چاہت کو پالیا تھا۔

اب کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا، جب ان دونوں کی آپس میں بات نہیں ہوتی تھی، کبھی کبھی کسی نہ کسی بہانے ان کی ملاقات بھی ہو جاتی تھی، کبھی وہ کسی ریسٹورنٹ میں ایک ساتھ بوفے بھی کر لیتے اور کبھی کبھار کہیں آئس کریم کھانے کا بھی پروگرام بن جاتا، مگر ہر بار ملیحہ یا فریحہ میں سے کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ ضرور ہوتا تھا۔



شام کا وقت تھا، ٹی وی لاؤنج میں ایک صوفے پر ارشد علی اور عطیہ بیٹھے تھے، ان کے برابر والے صوفے پر وقاص بیٹھا تھا، جبکہ اس کے ساتھ والے صوفے پر ملیحہ اور فریحہ موجود تھیں، ٹی وی لاؤنج میں بچھے ہوئے قیمتی قالینوں، دیوار پر لگی خوبصورت پینٹنگز، کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے پردوں، اور شیشے کی ٹیبل پر رکھے امپورٹڈ شو پیس دیکھ کر باآسانی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کسی امیر گھرانے کا ٹی وی لاؤنج ہے۔ پروگرام کے مطابق وقاص کی شادی میں صرف چار روز باقی رہ گئے تھے، جبکہ وقاص کے ولیمہ کے روز ملیحہ کی شادی طے تھی، اسی سلسلے میں تمام اہل خانہ ایک ساتھ ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے، بہن بھائی ایک دوسرے سے چھیڑ خانی بھی کر رہے تھے اور شادی کے انتظامات کے بارے میں گفتگو بھی ہو رہی تھی۔

''شادی میں صرف چار دن رہ گئے ہیں اور ابھی تک تم لوگوں نے اپنی شاپنگ بھی مکمل نہیں کی۔'' عطیہ نے اپنے تینوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ماما جیب میں پیسے، ATM اور کریڈٹ کارڈ ہوں، تو شاپنگ کے لیے چار دن بھی بہت ہیں۔'' وقاص نے ماں کی بات سنتے ہی جھٹ سے جواب دیا۔

''بھئی کوئی جائے نہ جائے، میں تو جی بھر کے شاپنگ کروں گی اور وہ بھی آج ہی۔'' فریحہ نے معصومیت سے دوٹوک بات کی۔

''جن کی شادی ہے ان کی تو کیا فکر کرنی ہے اسے اپنی پڑی ہوئی ہے۔'' وقاص نے فریحہ کو چڑانے کے لیے اپنا منہ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

بھائی کی بات سن کر فریحہ اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے بائیں ہاتھ کی ایک ایک انگلی پر رکھ کر گنواتے ہوئے بولی۔

''میرے بھائی کی شادی ہے، میری بہن کی شادی ہے، میں نے بھابھی لے کر آنی ہے سب سے زیادہ تو مجھے ہی شاپنگ کرنی پڑے گی ناں۔''

فریحہ نے جس انداز سے بات کی تھی، اس سے سبھی مسکرانے لگے تھے۔

ارشد علی اب تک خاموشی سے بیٹھا اپنے بیوی بچوں کے درمیان ہونے والی نوک جھونک بغور سن رہا تھا، پھر وقاص کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بات آپ ٹھیک کر رہے ہیں بیٹا، لیکن جو کام وقت پر ہو جائے، وہی اچھا ہوتا ہے پھر مہمانوں کا آنا جانا شروع ہو جائے گا تب شاپنگ کیسے جیسے

وقت نہیں نکل پائے گا۔''

''دیکھا میرے پاپا نے کیسی زبردست بات کی ہے۔'' فریحہ نے باپ کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

''پاپا آپ فکر نہ کریں آج ہم شادی کی شاپنگ پوری کر کے ہی لوٹیں گے۔'' وقاص نے باپ کو تسلی دی۔

''آپ لوگ ایسا کریں فائزہ کو بھی بلالیں وہ بھی ولیمے کے لیے اپنی پسند کا لہنگا، جیولری اور ڈریسز وغیرہ خرید لے گی۔'' اس بار عطیہ نے بات کی تھی۔

''یہ ٹھیک رہے گا ماما۔'' ملیحہ نے جھٹ سے ماں کی بات کی تائید کی۔

''اوئے ہوئے ہماری آپی بھی بولی ورنہ اس وقت سے ایسے خاموش بیٹھی تھی، جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔'' ملیحہ کے بولنے پر فریحہ نے شوخی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بولنے کے لیے تم جو ہو۔'' ملیحہ نے فوراً جواب دیا۔

''پاپا میں اتنا بولتی ہوں کیا؟'' فریحہ نے باپ کا ووٹ اپنے حق میں لینے کے لیے دریافت کیا۔

ارشد علی، فریحہ کو اپنے پاس بلا کر پیار کرتے ہوئے بولا

''نہیں تو۔''

''بس...... اب یقین آ گیا۔''

فریحہ نے جس معصومیت سے بات کی تھی، اسے دیکھ کر سب ہنس پڑے تھے، انہیں باتوں میں لگا دیکھ کر عطیہ فوراً بول پڑی۔ ''بس اب باتوں میں وقت ضائع مت کرو اور جلدی سے نکل جاؤ۔''

''میں تو کہتا ہوں تم بھی ان کے ساتھ چلی جاؤ۔'' ارشد علی نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

''میں بھلا جا کر کیا کروں گی؟ شاپنگ تو ان لوگوں نے اپنی پسند سے کرنی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر بچے پھر بھی بچے ہوتے ہیں۔''

''بات تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں بلکہ میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔''

بیوی کی بات سن کر ارشد علی ہنس پڑا اور بولا۔

''نہیں بھئی مجھے تو معاف ہی رکھو عورتوں کے کاموں میں بھلا مردوں کا کیا کام۔''

''بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔'' عطیہ نے بات کی پھر ملیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم ایسا کرو جلدی سے فائزہ کو فون کر دو۔''

''ابھی کر دیتی ہوں ماما۔'' ملیحہ نے فائزہ سے بات کرنے کے لیے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے کہا۔



فائزہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر ماں کی گود میں سر رکھے بیٹھی تھی، دردانہ پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی، ان کے برابر والے صوفے پر ہاتھ میں موبائل پکڑے، شمائلہ اپنی کسی دوست سے چیٹنگ کر رہی تھی۔

''میری بیٹی بھی اب اس گھر میں چند دن کی مہمان رہ گئی ہے پھر اس گھر سے رخصت ہو کر اپنے سسرال چلی جائے گی بس خدا میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔'' دردانہ پیار سے فائزہ کے سر پر بوسہ لیتے ہوئے بولی۔

''آمین۔'' شمائلہ چیٹنگ میں کھوئی ہوئی تھی، لیکن پھر بھی اس نے ماں کی بات پوری طرح سن لی تھی اور اونچی آواز میں کہا۔

فائزہ نے بھی ماں کی بات پر آہستہ سے آمین کہا تھا، جس سے اس کے صرف ہونٹ ہلے تھے، اس لیے کسی کے کانوں میں اس کی آواز نہیں پڑی تھی۔

اسی دوران فائزہ کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی، موبائل کی بیل سنتے ہی وہ سیدھی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی، ملیحہ کی کال تھی، اس لیے وہ موبائل کان سے لگاتے ہی چہک کر گرم جوشی سے بولی

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام! کیا ہو رہا ہے میری جان؟''

''کچھ خاص نہیں، بس امی کے ساتھ بیٹھے شادی کا پروگرام بنا رہے تھے۔''

''ادھر بھی یہی کچھ ہو رہا ہے، ہم وقاص بھائی کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکل رہے ہیں، تم بھی گھر سے نکل پڑو، مل کر شاپنگ کریں گے، تم اپنی پسند کے ڈریسز اور لہنگا وغیرہ خرید لینا۔''

''میں ماما سے بات کر لیتی ہوں، ویسے جانا کہاں ہے؟''

''فی الحال تو تم کیولری پہنچو اگر وہاں سے کچھ پسند نہ آیا تو ایم ایم عالم روڈ چلیں گے ورنہ پھر لبرٹی تو ہے ہی لیکن آنٹی سے مشورہ کر کے ابھی نکل پڑو، میں تم سے رابطے میں رہوں گی..... اللہ حافظ۔''

''کس کا فون تھا؟'' فون بند ہونے پر دردانہ نے فائزہ سے سوال کیا۔

''ملیحہ تھی۔''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

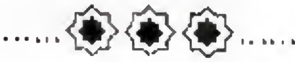
''شاپنگ کے لیے ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔''

''تو ہو آؤ بلکہ شمائلہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔''

''ہائے، کتنا مزہ آئے گا، فائزہ آپی کی شادی کی شاپنگ کرنے کا۔'' شمائلہ نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''امی آپ بھی ساتھ چلیں، مجھے اکیلے جانا اچھا نہیں لگتا۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں بھی چلتی ہوں اپنی بیٹی کے ساتھ۔'' دردانہ نے پیار سے بیٹی کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔



پروگرام فائنل ہوتے ہی وقاص نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور کار پورچ میں کھڑی سفید رنگ کی ٹیوٹا کرولا میں جا بیٹھا، ماں بیٹیوں نے بھی تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی اور وہ بھی وقاص کے پیچھے پیچھے ہی کار پورچ میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''بھئی میں تو اگلی سیٹ پر بیٹھوں گی۔'' کار پورچ میں آتے ہی فریحہ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر وقاص کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بس پھر آخری بار بیٹھ لو پھر تو وقاص بھائی کے برابر اگلی سیٹ پر فائزہ ہی بیٹھا کرے گی۔'' ملیحہ نے شرارت بھرے لہجے میں بات کی۔

''تب کی تب دیکھی جائے گی۔'' فریحہ نے بے پروائی سے کہا۔

''جہاں بھی بیٹھنا ہے جلدی سے بیٹھو اور نکلو، پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے، وہ لوگ تو پہنچ بھی گئے ہوں گے۔'' عطیہ نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فریحہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر جبکہ عطیہ اور ملیحہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں اور پروگرام کے مطابق گاڑی کا رخ کیولری کی طرف تھا۔

ملیحہ سے فون پر بات ہوتے ہی تینوں ماں بیٹیاں بھی اپنی گاڑی میں گھر سے نکل پڑی تھیں

فائزہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی، اس کے برابر میں فریحہ تھی، جبکہ دردانہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

ملیحہ نے فائزہ کے بارے میں جاننے کے لیے کہ وہ لوگ کہاں تک پہنچے ہیں اپنے موبائل سے فون ملایا تھا۔

''ہم ڈیفینس موڑ پہنچ گئے ہیں'بس تھوڑی دیر میں کیولری پہنچ جاتے ہیں۔'' فون اٹینڈ کرتے ہی فائزہ نے بات کی۔

''ٹھیک ہے'بس ہم بھی ایک دو منٹ میں پہنچ جائیں گے۔''

اوکے پھر ملاقات ہوتی ہے۔''

''اللہ حافظ۔'' ملیحہ نے خدا حافظ کہتے ہی فون بند کر دیا۔

وہ سبھی ڈیفینس سے نکلے تھے، اس لیے انہیں کیولری پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

وقاص نے ماں کے کہنے پر الفجر سلک امپوریم کے سامنے گاڑی پارک کی تھی، گاڑی پارک ہوتے ہی وہ سبھی گاڑی سے باہر نکل آئے اور گاڑی کے پاس ہی کھڑے فائزہ کے آنے کا انتظار کرنے لگے، مگر انہیں ایک منٹ سے زیادہ انتظار میں کھڑے رہنا نہیں پڑا، فائزہ نے بھی انہیں کھڑا دیکھ کر ان کے برابر ہی گاڑی پارک کر دی اور تینوں گاڑی سے نکل آئے۔

وقاص اور فائزہ کی گاڑیاں کیولری میں الفجر سلک امپوریم کے سامنے آ کر رکی تھیں، ان میں عطیہ، وقاص، ملیحہ، فریحہ، دردانہ، فائزہ اور شائلہ بیٹھ کر آئے تھے، تمام خواتین ایک دوسرے کو گلے لگا کر ملیں، عطیہ نے اپنی ہونے والی بہو کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما، دردانہ نے اپنے ہونے والے داماد کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت سی دعائیں دیں، دور ہی سے وقاص نے خاموش نگاہوں سے فائزہ کو سلام بھیجا، جس کے جواب میں فائزہ نے بھی چپکے سے وقاص کو سلام محبت پہنچا دیا تھا۔

وہ سبھی بہت خوش تھے، ایک ماں کو اپنے بیٹے کے سر پر سجا سہرا دیکھنے کی خوشی تھی اور ایک ماں کو بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کی خوشی تھی، ایک بہن کو اپنے ساتھ ساتھ بھائی کے لیے اپنی دوست کو دلہن بنا کر لانے کی خوشی تھی اور ایک بہن کو بہنوئی کے روپ میں بھائی ملنے کی خوشی تھی، جس سے اس کی زندگی کی یہ کمی بھی دور ہونے والی تھی، ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی خوشی دیدنی تھی، بات بات پر ان کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

''میرا خیال ہے پہلے اس دکان میں چلتے ہیں۔'' ملیحہ نے ایک بوتیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' سب نے ملیحہ کی تائید کی۔

وہ سبھی بوتیک میں گھس گئے، جہاں انہوں نے بہت سے ڈریسز دیکھے، انہیں وہاں کچھ ڈریسز پسند آئے تھے، جو انہوں نے خرید لیے اور پھر وہاں سے نکل کر ایک اور بوتیک میں جا کھڑے ہوئے، یوں وہ ایک کے بعد دوسری دکان میں جاتے ،انہوں نے کہیں سے جوتے، کہیں سے میک اپ کا سامان، کہیں سے جیولری خریدی، جیسے جیسے وہ دکانوں میں جاتے ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپروں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔

''کیا خیال ہے ایک چکر ایم ایم عالم روڈ کا نہ لگالیں......؟'' عطیہ نے تجویز دی۔

عطیہ کی تجویز ان سب کو پسند آئی تھی، اس لیے وہ مزید خریداری کے لیے اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر ایم ایم عالم روڈ کی طرف چل پڑے۔

ایم ایم عالم روڈ پر پہنچ کر انہوں نے اپنی گاڑیاں چیس کے سامنے لا کھڑی کی تھیں، ان کا خیال تھا کہ اگر انہیں چیس سے کچھ پسند نہ بھی آیا تو وہ گاڑیاں وہیں کھڑی رہنے دیں گے اور چیس کے سامنے ہی جو دیگر بڑی بڑی شاپس ہیں، وہاں سے باآسانی خریداری کر سکیں گے، انہوں نے اپنے اپنے شاپر گاڑی میں ہی پڑے رہنے دیے تھے اور خود اتر کر چیس میں جا گھسے تھے، خریداری کا یہ سلسلہ انتہائی تھکا دینے والا تھا، یہاں سے بھی بہت سے ملبوسات اور جیولری سے بھرے شاپر ان کے ہاتھوں میں آ چکے تھے، مگر ابھی تک ان کی خریداری مکمل نہیں ہوئی تھی اور وہ یہاں سے لبرٹی جا پہنچے تھے۔

لبرٹی آنے کی اصل وجہ میچنگ جوتوں کی خریداری تھی، مگر وہاں بھی انہوں نے جوتوں کے علاوہ دیگر ضروری اور غیر ضروری اشیاء خریدنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اسی لیے جب وہ وہاں سے فارغ ہوئے تو ہر کسی نے اپنے اپنے ہاتھوں میں کئی کئی شاپر تھام رکھے تھے، جتنی دیر تک سب خواتین خریداری میں مصروف رہیں، وقاص، فائزہ کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتا رہا، ویسے بھی اس نے اپنے لیے شاپنگ کا پروگرام اگلے دن پر رکھ لیا تھا، یوں ساری خریداری خواتین کو کرنا تھی، اس لیے بل کی ادائیگی کرنے کے علاوہ اس کا کوئی اور کام بھی نہیں تھا۔

''وقاص بھائی بہت شاپنگ کر لی، قسم سے بول بول کر میرا تو گلا بھی سوکھ گیا ہے۔'' بہت سے

دو کرسیاں

ایک اعلیٰ عہدے دار پطرس بخاری صاحب سے ملاقات کے لیے آئے۔

پطرس صاحب نے کہا۔ ''تشریف رکھیے۔''

ان صاحب کو محسوس ہوا کہ کچھ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔

چنانچہ انہوں نے کہا۔ ''میں محکمہ برقیات کا ڈائریکٹر ہوں۔''

پطرس مسکرائے اور کہا۔ ''پھر آپ دو کرسیوں پر بیٹھ جائیے۔''

مرسلہ: محمد اظہر......کورنگی، کراچی

شاپر ہاتھ میں لیے دکان سے باہر نکلتے ہوئے فریحہ نے بات کی۔

''پھر کیا کیا جائے؟'' وقاص نے دریافت کیا۔

''جلدی سے فریش جوس پلا دیں، نہیں تو میری جو حالت ہو چکی ہے، میں کسی بھی وقت یہیں سڑک پر ہی گر پڑوں گی۔''

''اچھی باتیں منہ سے نکالتے ہیں بیٹا۔'' بیٹی کی بات سن کر عطیہ نے فوراً کہا۔

''ماما آپ فکر نہ کریں، جوس پی کر ایک بہت ہی اچھی بات منہ سے نکالوں گی اور وہ ہوگی دہی بھلوں کی فرمائش۔''

فریحہ نے اس قدر شرارت بھرے لہجے میں بات کی تھی کہ سبھی ہنس پڑے اور قریب ہی جوس کی دکان کے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں پر جا بیٹھے، جہاں ان سے پہلے بھی کچھ فیملیز کے لوگ موجود تھے۔

ان کے بیٹھتے ہی جوس والا لڑکا آرڈر لینے کے

لیے ان کے پاس آ کھڑا ہوا، وقاص نے باری
دی سب سے پوچھ کران سب کی پسند کے مطابق
سے جوس کا آرڈر دے دیا تو وہ وہاں سے چلا
گیا۔

''ویسے ایک بات ہے' لڑکیاں چاہے جتنی بھی
ج فیملی سے ہوں، یا پھر کتنی بھی ماڈرن ہوں لیکن
ب کی پسند دہی بھلوں اور گول گپوں سے ہی
روع ہوتی ہے۔'' لڑکے کے جاتے ہی وقاص
نے چاروں لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ایسی بات سن کر فریحہ کہاں خاموش رہنے والی
تھی، جلدی سے بولی۔

''بھئی کوئی اور مانے نہ مانے لیکن دہی بھلے
میری تو کمزوری ہیں۔ میں تو کالج میں بھی بریک
ٹائم میں جب تک ایک دو پلیٹیں دہی بھلوں کی نہیں
کھا لیتی تھی' مجھے سکون ہی نہیں آتا تھا۔'' فریحہ کی
باتوں سے سبھی لطف اندوز ہو رہے تھے، فریحہ نے
سب کے چہروں کو بغور دیکھا اور بولی۔

''اگر آپ لوگ میرا مزاق نہ اڑائیں تو ایک
بات بتاؤں؟''

''ہم سب تمہاری باتیں سننے کے لیے ہمہ تن
گوش ہیں' جو کہنا ہے کہو۔''

''دہی بھلوں کی باتیں کرتے ہوئے اب بھی
میرے منہ میں پانی آ گیا ہے' ہائے کرارے
کرارے، تیز مصالحوں والے دہی بھلے۔''

فریحہ دہی بھلوں کی باتیں اس قدر مزے لے
کر سنا رہی تھی کہ ملیحہ، فائزہ اور شمائلہ بھی دہی بھلے
کھانے کے لیے بے چین ہو گئی تھیں۔

وقاص بھی پوری دلچسپی سے بہن کی باتیں سن
رہا تھا، اچانک اس کی نظر ایک نوجوان پر جا ٹھہری
تھی، جوان کے قریب ہی موٹر سائیکل کھڑی کر رہا
تھا، نوجوان موٹر سائکل کھڑی کرتے ہی وہاں
سے چلا گیا تھا، بظاہر یہ عام سی بات تھی لیکن وقاص
نہ جانے کیوں اس نوجوان کے متعلق سوچنے لگا
تھا، اسی دوران فائزہ کی والدہ کی آواز اس کے
کانوں میں پڑی تو اس کی توجہ اس نوجوان سے
ہٹ کر خواتین میں ہونے والی گفتگو سننے میں لگ
گئی، دردانہ کہہ رہی تھی۔

''آپ تو جانتی ہی ہیں، ان دنوں شادی ہال
والے وقت کی کس قدر سختی سے پابندی کرنے لگے
ہیں اور تو اور ڈیفنس کلب والے بھی وقت کی
پابندی میں کسی قسم کی کوئی رعائت نہیں کرتے اس
لیے کوشش کیجیے گا بارات وقت پر پہنچ جائے تا کہ
ہم شادی کی ساری رسمیں سکون سے کر سکیں۔''

دردانہ نے عطیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بات کی
تھی، مگر ماں کے بولنے سے پہلے ہی فریحہ بول پڑی۔

''آنٹی اس بات کی تو آپ فکر ہی نہ کریں'
وقاص بھائی کے بس میں نہیں ورنہ یہ آج ہی
بارات لے کر آپ کے ہاں پہنچ جائیں۔''

فریحہ کی بات پر سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ
پھیل گئی اور وہ بے اختیار قہقہے لگانے لگے، اسی
دوران پاس کھڑی موٹر سائکل سے ایک زوردار
دھماکہ ہوا، جس نے کانوں کے پردے پھاڑ
ڈالے تھے، دیسی ساخت کے بنے ہوئے بم
سے نکلنے والے ویٹ بیرنگ اور کیل کانٹوں نے
وہاں بیٹھے اور کچھ راہگیروں کی جان لے لی تھی اور
بہت سے لوگوں کو زخمی کر ڈالا تھا، ہر طرف عجیب
افراتفری پھیل گئی تھی، ہر کوئی اپنی جان بچانے کے
لیے وہاں سے دور بھاگ رہا تھا، فریحہ بری طرح
ہٹ ہوئی تھی، اس لیے زمین پر گر گئی تھی، وقاص
اور دیگر خواتین کو بھی بہت سے زخم آئے تھے، ان

کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہنے لگا تھا، وقاص نے اپنے زخموں کی پرواہ کیے بغیر جلدی سے آگے بڑھ کر بہن کو اپنی بانہوں میں لے لیا، فریحہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی، اس کی حالت دیکھ کر وقاص کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے ،فریحہ بھائی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو۔

''بھائی مجھے بچالو میں مرنا نہیں چاہتی' میں نے تو ابھی زندگی کی کوئی خوشی بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی' ابھی تو میرے دل کا کوئی بھی ارمان پورا نہیں ہوا۔'' وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن موت نے اسے اتنی مہلت ہی کہاں دی تھی، اس نے آخری ہچکی لی اور اپنے جان سے پیارے بھائی کی بانہوں میں جھول گئی، وقاص اسے اپنے سینے سے لگا کر بہت رویا مگر کسی بھی طرح اسے موت کے بے رحم ہاتھوں سے چھڑا نہ سکا۔

اس دوران وقاص کو اردگرد کی کچھ ہوش نہیں رہی تھی، اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس کی ماں اور بہن اس کے پاس کھڑی آنسو بہا رہی تھیں، جبکہ قریب ہی دردانہ اور شمائلہ، فائزہ پر جھکی ہوئی تھیں۔

''اسے میں سنبھالتی ہوں' تم جلدی سے فائزہ کو اسپتال پہنچانے کا انتظام کرو' اس کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی۔'' عطیہ نے روتے ہوئے بیٹے کو بتایا۔

وقاص ابھی بہن کے بچھڑنے پر رو رہا تھا کہ ماں نے فائزہ کی خبر سنا ڈالی تھی، جس سے وہ بری طرح تڑپ اٹھا تھا، فائزہ کے جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا' اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا، جس کی وجہ سے اسے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، اسی لمحے دور کہیں سے ایمبولینسوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔

''آنکھیں کھولو فائزہ! ہم سب ہیں ناں' ہم تمہیں کچھ ہونے نہیں دیں گے' بس تم ہمت سے کام لو۔'' وقاص نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بات کی، پھر اس کی توجہ ایمبولینسوں کی آوازوں کی طرف دلاتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھو' کچھ ہی دیر میں یہاں ایمبولینسیں بھی پہنچ جائیں گی۔''

فائزہ نے وقاص کی بات سن کر اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ آنکھیں کھول نہیں پائی تھی اور نہ ہی وہ وقاص کی باتوں کا کوئی جواب دے سکی تھی۔

''تم میری باتیں سن رہی ہوناں۔'' وقاص نے رندھی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

وقاص کی بات کے جواب میں فائزہ نے بمشکل گردن ہلائی تھی، وہ آخری بار اپنی ماں اور بہن کو دیکھنا چاہتی تھی، اپنے محبوب کو آنکھوں میں اتار لینا چاہتی تھی، مگر وہ بصد کوشش اپنی آنکھیں کھولنے میں ناکام رہی تھی، لیکن اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''تم بول کیوں نہیں رہی' خدا کے لیے کچھ تو بولو؟''

فائزہ نے اب تک اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ کر دبا رکھا تھا، اس نے ہاتھ کے اشارے سے یہ بتانے کے لیے کہ اس سے بولا نہیں جا رہا، پیٹ سے اپنا ہاتھ اٹھایا تو اس کے پیٹ سے بہت سا خون ابل کر زمین کو سرخ کر گیا، اب ایمبولینسیں انتہائی قریب پہنچتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں، اب تک کسی نہ کسی طرح وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی، مگر جب بہت سا خون ایک ساتھ بہہ نکلا تو اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں

دروہ اپنے خالق حقیقی سے جاملی۔

ہر طرف انسانی اعضاء بکھرے دکھائی دے رہے تھے، موت کا شکار ہونے والوں اور زخمیوں کے جسم سے بہنے والے خون سے وہاں کی زمین سرخ ہو چکی تھی، بہت سی امدادی ٹیمیں وہاں پہنچ گئی تھیں اور زخمیوں کو ایمبولینسوں میں ڈال کر قریبی اسپتالوں کی طرف دوڑی چلی جارہی تھیں، وقاص، ملیحہ، عطیہ، دردانہ اور شمائلہ کو بہت سے زخم آئے تھے، مگر وہ اپنے زخموں کی مرہم پٹی کروانے کی بجائے فائزہ اور فریحہ کی لاشوں کو گھر لے جانا چاہتے تھے، وقاص کی خواہش تھی کہ وہ فائزہ کی لاش کو بھی اپنے گھر لے چلے، مگر دردانہ اس کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ وہ دو ایمبولینسوں کا انتظام کرلیں تاکہ ان میں ڈال کر فائزہ اور فریحہ کو اپنے اپنے گھروں میں لے جایا جائے۔

عطیہ اور ملیحہ، فریحہ کی لاش کے ساتھ ہی ایمبولینس میں سوار ہو گئی تھیں، جبکہ دوسری ایمبولینس میں دردانہ اور شمائلہ، فائزہ کی لاش کو لے کر چل پڑی تھیں، وقاص نے پارک میں کھڑی اپنی گاڑی نکال کر ایمبولینسوں کے پیچھے لگالی تھی، اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی موبائل کے ذریعے اپنے پاپا کو تمام حالات سے آگاہ کردیا تھا اور فریحہ کی لاش گھر لانے کی خبر دے دی تھی، وہ سب سے پہلے فائزہ کی لاش لے کر ان کے ہاں پہنچے تھے، پھر کچھ دیر انہیں تسلی دینے اور ان سے رابطہ رکھنے کا کہنے کے بعد وہ فریحہ کی لاش لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑے تھے، ان کے گھر پہنچنے تک ارشد علی ان سے مسلسل رابطے میں رہے تھے اور فون کر کے ایک ایک پل کی خبر لیتے رہے تھے، ارشد علی نے ان کے فریحہ کی لاش لے کر گھر پہنچنے سے پہلے ہر طرف فریحہ کی موت کی اطلاع دے دی تھی۔

وہ فریحہ کی لاش لے کر گھر پہنچے تو علاقے میں کہرام مچ گیا، بہت سے لوگوں کو ٹیلی وژن کے ذریعے بم دھماکے میں ارشد علی کی بیٹی کی شہادت کی خبر مل گئی تھی، جس کسی کے کانوں میں یہ خبر پڑی تھی وہ ارشد علی کے ہاں دوڑا چلا آیا تھا، گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے فریحہ، باپ کی بہت لاڈلی تھی، فریحہ میں ارشد علی کی جان تھی، اب تک اس نے انتہائی حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا، مگر بیٹی کی لاش دیکھ کر ارشد علی کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا تھا، بہن بھائیوں اور عزیز رشتہ داروں نے بمشکل ارشد علی کو چپ کروایا تھا۔

وقاص نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ساتھ اپنے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے ڈاکٹر کو گھر میں ہی بلا لیا تھا، بعد میں وہ ڈاکٹر کو لے کر فائزہ کے ہاں چلا گیا تاکہ فائزہ کی ماں اور بہن کی بھی مرہم پٹی ہو سکے۔

وقاص کو علم تھا کہ فائزہ کے ہاں گھر میں کوئی مردنہ ہونے کی وجہ سے تدفین کے تمام تر انتظامات اسی کو کرنا تھے، اس لیے قبر کی کھدائی سے لے کفن کی سلائی تک اس نے ہر کام اپنی نگرانی میں کروایا تھا اور وقفے وقفے سے آنٹی دردانہ اور شمائلہ کو بھی تسلی دیتے ہوئے صبر کی تلقین کرتا رہا۔

پروگرام کے مطابق پہلے فریحہ کا جنازہ پڑھایا گیا تھا اور ہزاروں سوگواران کی موجودگی میں اسے قبر میں اتارا گیا، وقاص نے اب تک انتہائی ہمت اور حوصلے سے کام لیا تھا، مگر جب اس کی جان سے پیاری بہن کو قبر میں اتارا جانے لگا تو یہ

سوچ کر ہی بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کہ اب اس کی بہن اسے دوبارہ کبھی دکھائی نہیں دے گی اور زندگی میں پھر کبھی وہ اس کی شرارتوں بھری باتیں سن نہیں پائے گا، باپ بیٹا ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئے تھے کہ ان دونوں کی لاڈلی ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی۔

یہاں سے فارغ ہو کر تمام لوگ فائزہ کے جنازے میں شرکت کے لیے ان کے ہاں پہنچ گئے تھے، وقاص نے جس گھر سے فائزہ کو دلہن بنا کر لے جانا تھا، اسی گھر سے اس کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے، آنکھوں میں آنسو لیے قبرستان کی طرف لے جا رہا تھا، وہ اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا، ایک ہی دن میں یہ دوسرا جنازہ تھا، جسے اپنے کندھوں پر اٹھائے وہ قبرستان کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے لیے چند قدم چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا، وہ کسی بھی پل چکرا کر زمین پر گر سکتا تھا، اسی لمحے کلمہ شہادت کی صدا بلند ہوئی تھی اور کسی نے اس کے کندھوں سے جنازے کی چارپائی اپنے کندھے پر رکھ لی تھی، جس کے بعد وہ وہاں سے نکل کر دیوار سے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔



فائزہ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد، وقاص کی زندگی کی ساری رنگینیاں ماند پڑ گئی تھیں، وہ اس قدر بجھ کر رہ گیا تھا کہ مسکرانا ہی بھول گیا تھا، منگنی کے بعد وہ دونوں جہاں جہاں گئے تھے، وقاص کا جب بھی وہاں سے گزر ہوتا، اس کے سینے کے سارے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے تھے، وہ رات اس پر بہت بھاری گزرتی تھی اور وہ رات بھر سو نہیں پاتا تھا، تھوڑے ہی عرصے میں اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی، عطیہ سے بیٹے کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی، اس نے انتہائی سوچ بچار اور گھر کے دیگر افراد سے مشورے کے بعد وقاص کے لیے شائلہ کے رشتے کی بات چلانے کا پروگرام بنا لیا، مگر وقاص کسی بھی طرح اس کے لیے راضی نہیں تھا، تین چار روز تک اٹھتے بیٹھتے تمام گھر والے مسلسل اسے سمجھاتے رہے، تب کہیں وہ بمشکل شائلہ سے شادی کے لیے تیار ہوا تھا، عطیہ اپنے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈرائیور کے ساتھ تنہا گئی تھی۔

عطیہ کو اپنے سامنے پا کر دردانہ اور شائلہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے، وہ تینوں کچھ دیر تک اپنے اپنے زخموں کو یاد کر کے روتی رہیں، جب دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو وہ باتیں کرنے لگیں، شائلہ منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے وہاں سے اٹھ کر واش روم میں گئی تو عطیہ نے موقع غنیمت جان کر بات کی۔

''کیسے کیسے ارمان تھے بچوں کے دل میں مگر ان کی ساری خوشیاں فائزہ اور فریحہ کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں۔''

''ہاں بہن! یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے، خدا نے مجھے بیٹے کی نعمت سے محروم رکھا تھا مگر میں خوش تھی کہ وقاص کے روپ میں مجھے بیٹا مل گیا۔'' دردانہ نے اداس لہجے میں کہا۔

''اگر آپ چاہیں تو ایسا اب بھی ممکن ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''میں اپنے بیٹے کے لیے فائزہ کو اس گھر سے بیاہ کر لے جانا چاہتی تھی لیکن وقت نے اتنی مہلت ہی نہیں دی تب سے میرا بیٹا بجھ سا گیا ہے اگر آپ

شمائلہ کو میری جھولی میں ڈال دیں تو شاید۔'' عطیہ کی گفتگو کے دوران ہی شمائلہ واش روم سے نکل کر وہاں آ بیٹھی تھی، اس لیے اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی تھی۔

عطیہ نے اپنی خواہش دردانہ تک پہنچا دی تھی اور شمائلہ کی موجودگی میں اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے وہ بوجھل دل کے ساتھ گھر لوٹ آئی۔

''کیا کہہ رہی تھیں آنٹی......؟'' عطیہ کے جاتے ہی شمائلہ نے ماں سے سوال کیا۔

''وہ وقاص کے لیے' تمہارے رشتے کی بات کرنے آئی تھیں۔''

''انہیں کسی دھوکے میں رکھنے کی ضرورت نہیں' فون کر کے انہیں اس رشتے سے صاف انکار کر دیجیے گا۔''

''مگر اس میں حرج ہی کیا ہے بیٹا۔''

''وہ میری بہن کا نصیب تھا۔ میں اس کا نصیب اپنے نام کیسے کروا لوں۔'' شمائلہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''پھر بھی تم اچھی طرح سوچ لو شاید تم اپنا فیصلہ بدل لو۔'' دردانہ نے آخری کوشش کے طور پر ایک بار پھر بات دہرائی۔

''میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا اور پلیز امی' آج کے بعد اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہ کیجیے گا۔'' شمائلہ نے دوٹوک بات کی اور ماں کا جواب سنے بغیر وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں جا لیٹی۔

...... ❁ ❁ ❁ ......

وقاص والدین اور بہن کے سمجھانے پر بمشکل شمائلہ سے شادی کے لیے راضی ہوا تھا، لیکن جب ادھر سے انکار ہوا تو اس نے فائزہ کی یادوں کو سینے سے لگائے، ایم بی اے کرنے کے لیے انگلینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا، اس کے والدین کو بھی وقاص کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ان سے بھی اکلوتے بیٹے کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی اور وہ بھی چاہتے تھے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے وہاں سے کہیں دور چلا جائے تاکہ کسی طرح اس کا دل بہل سکے۔

وقاص کے دم قدم سے ہی گھر کی ساری رونقیں تھیں، ملیحہ کو جب بھائی کے بیرون ملک جانے کی خبر ملی تو بھائی سے جدائی کا سوچ کر ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، بہن کو موت نے اس سے جدا کر ڈالا تھا اور بھائی جیتے جی جدائی کا زخم دے کر جا رہا تھا، اس سے بھائی کی حالت چھپی ہوئی نہیں تھی، مگر وہ پھر بھی چاہتی تھیں کہ کسی طرح وہ ملک چھوڑ کر نہ جائے اور ان سب کی نظروں کے سامنے رہے۔

''شمائلہ! بھائی انگلینڈ جا رہا ہے۔'' فون اٹھاتے ہی ملیحہ نے بلا تمہید بات کی۔

''یہ تو اچھی خبر ہے۔''

''سننے میں تو بظاہر یہ بہت اچھا لگتا ہے کہ ارشد علی کا بیٹا ایم بی اے کرنے انگلینڈ جا رہا ہے لیکن اس کے پیچھے کیا کہانی ہے یہ ہم جانتے ہیں یا تم۔''

''جانے والوں کو خوشی خوشی الوداع کیا کرتے ہیں آپی تاکہ وہ اپنے ساتھ اچھی یادیں لے کر جائیں۔''

''لیکن بھائی کے جانے سے ہم سب ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور ممی پاپا تو شاید بیٹے کی جدائی کا دکھ سہہ بھی نہ پائیں۔'' ملیحہ کے لہجے میں اداسی بھی تھی اور التجا بھی۔

''لیکن آپی! آپ جس بات کی امید مجھ سے

لگائے بیٹھی ہیں' وہ میں کبھی پوری نہیں کر پاؤں گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ وقاص بھائی کو دہی کرنے دیا جائے، جو وہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں فون رکھتی ہوں لیکن ہو سکے تو فرصت کے لمحات میں میری باتوں پر غور ضرور کرنا۔'' بات کرتے ہوئے ملیحہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، قریب تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، اس لیے بات کرتے ہی اس نے فون بند کر دیا تھا۔

یہی حالت شمائلہ کی تھی، اس نے انتہائی حوصلے سے ملیحہ کی ہر بات کا محتاط انداز میں جواب دیا تھا، مگر فون بند ہوتے ہی اس کے صبر کے بھی پیمانے ٹوٹ گئے تھے اور روتے ہوئے ہچکی بندھ گئی تھی۔

شمائلہ کی طرف سے انکار سن کر وقاص نے انگلینڈ جانے کی تیاریاں تیز کر دی تھیں، اسے انتظامات کرنے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے، آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب وقاص کو ملک چھوڑ کر دیار غیر چلے جانا تھا، آخری کوشش کے طور پر ملیحہ نے ایک بار پھر شمائلہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''شمائلہ! وقاص بھائی آج رات کی فلائٹ سے انگلینڈ جا رہے ہیں۔''

''ان کی کامیابی کے لیے میری بہت ہی دلی دعائیں ان کے ساتھ ہوں گی۔''

''میں جانتی ہوں تمہیں وقاص بھائی کے بارے میں میرا بار بار بات کرنا اچھا نہیں لگتا لیکن میں پھر بھی چاہتی ہوں کہ تم ایک بار..... صرف ایک بار میرے کہنے پر ائرپورٹ چلی آؤ شاید تمہارے سمجھانے پر بھائی اپنا انگلینڈ جانے کا ارادہ بدل دے۔''

ملیحہ نے شمائلہ کو عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا، وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی، اس لیے خاموش تھی، اُدھر ملیحہ موبائل کان سے لگائے شمائلہ کے جواب کی منتظر تھی، شمائلہ خاموش تھی مگر اس کے سانسوں کی آواز سے ملیحہ کو پتہ چل رہا تھا کہ وہ بھی موبائل کان سے لگائے کھڑی سوچ رہی تھی۔

''آپی! آپ سن رہی ہیں ناں.....؟'' شمائلہ نے بات کرنے سے قبل ملیحہ سے دریافت کیا۔

''ہاں' تم جو کہنا چاہتی ہو کہو..... میں سن رہی ہوں۔''

''میں آؤں گی لیکن وقاص بھائی سے اس بارے میں ذکر نہ کرنا۔'' شمائلہ نے بات کی اور فون بند کر دیا۔

شمائلہ کی بات نے ملیحہ کو مطمئن کر دیا تھا، مگر اس نے یہ بات زبان پر نہیں آنے دی تھی، وقاص ائرپورٹ کے لیے گھر سے نکلا تو عطیہ، ارشد علی اور ملیحہ اسے خدا حافظ کہنے کے لیے اس کے ہمراہ تھے، وہاں پہنچتے ہی ملیحہ کی نظریں شمائلہ کی تلاش میں لگ گئی تھیں، اسے دور سے آتی ہوئی ہر لڑکی شمائلہ دکھائی دیتی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا، مگر لڑکی کے قریب آنے پر اسے احساس ہوتا کہ جسے وہ شمائلہ سمجھ رہی تھی، وہ کوئی اور تھی۔

اُدھر ملیحہ سے بات کرنے کے بعد شمائلہ کی نظریں وال کلاک کی سوئیوں پر لگ گئی تھیں، بار بار اس کی نگاہ وال کلاک کی طرف اٹھ جاتی تھی، وہ عجیب بے چینی کی سی کیفیت کا شکار تھی، مگر وقاص کا سامنا کرنے کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی، اس لیے بے بسی کے عالم میں مسلسل گھڑی کی سوئیوں کو دیکھے جاتی تھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، ملیحہ کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے

لگے تھے، جو وقاص سے چھپ نہیں پائے تھے، مگر وہ ان آنسوؤں کے پیچھے چھپی کہانی سے لاعلم تھا اور یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے جدا ہونے پر اداس ہے اس لیے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں، کچھ دیر بعد وقاص ان تینوں سے گلے مل کر آنکھوں میں آنسو لیے بورڈنگ کے لیے چلا گیا اور وہ تینوں وہیں کھڑے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

وقاص کی فلائٹ کا وقت ہو چکا تھا، شمائلہ اُڑتی ہوئی بھی جاتی تو کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا، بیٹی جس کرب سے گزر رہی تھی، ماں اس سے بخوبی واقف تھی، مگر اس نے کوئی روک ٹوک نہیں کی تھی، شمائلہ گردن جھکائے ماں کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''امی! کس قدر سنگدل اور بے رحم ہوتے ہیں یہ خودکش حملہ آور اور بم بلاسٹ کرنے والے لوگ۔ کیا انہیں انسانی جانوں سے کھیلتے ہوئے ذرا سا بھی احساس نہیں ہوتا' ہماری طرح کتنے ہی گھروں کو اجاڑنے کا سبب بنتے ہیں یہ...... یہ ظالم اور سفاک، درندہ صفت لوگ کتنے ہی گھروں میں صف ماتم بچھا ڈالتے ہیں' ان کے ایسا کرنے سے کچھ لوگ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور کچھ عمر بھر کے لیے روگی بن جاتے ہیں۔'' شمائلہ نے دکھ بھرے لہجے میں بات کی۔

''اگر انہیں اس بات کا احساس ہو تو وہ نہ اپنی جانوں کو داؤ پر لگائیں اور نہ ہی معصوم لوگوں کو موت کی نیند سلائیں۔'' دردانہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میرے نزدیک تو ایسے سر پھرے لوگوں کو انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔ ان وحشیوں نے آپی کی زندگی چھین لی اور ہمیں جیتے جی مار ڈالا۔ مجھ سے میری جان سے پیاری بہن چھین لی۔ ایک ماں سے اس کی بیٹی چھین لی' وقاص بھائی سے اس کا پیار چھین لیا اور آج اس کے والدین سے بیٹا بھی چھن گیا۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر تم نے بھی تو آج کم سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کیا' اگر آج تم وقاص سے ملنے ائر پورٹ چلی جاتی تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔'' دردانہ نے دکھ بھرے لہجے میں بات کی۔

''نہیں ماں اگر آج میں وہاں چلی جاتی تو وقاص بھائی کمزور پڑ جاتے اور کبھی انگلینڈ نہ جا پاتے ہو سکتا ہے وہاں رہ کر وہ کسی طرح آپی کا غم بھلانے میں کامیاب ہو جائیں۔'' شمائلہ نے انتہائی کرب سے بات کی تھی اور پھر ماں کی گود میں سر رکھ کر سسک پڑی تھی۔

دردانہ سے بیٹی کے آنسو چھپ نہیں سکے تھے، اس لیے وہ اسے تسلی دینے کے لیے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی، وہ انتہائی مضبوط اعصاب کی خاتون تھی، مگر درد کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ وہ خود پر قابو نہیں پا سکی تھی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔



نوبہار

وقارالرحمن

رشتے محبت سے مل کر وجود میں آتے ہیں' لیکن اگر اس میں غلط فہمی کی دراڑ آجائے تو یہ بکھر جاتے ہیں' لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ پھر ایک ہوجاتے ہیں۔
ایک ایسے شخص کا قصہ' جس نے بیٹی کی زندگی کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔

جب سے مالی خسارے کی بناء پر اس کا کاروبار ختم ہوا تھا وہ تنہا رہ گیا تھا۔ غیر تو غیر اپنے بھی بیگانے ہوگئے تھے اس سوچ کے جواب میں اس کا فہم خاموش تھا کہ آخر یہ سب کیا ہورہا ہے' کیوں ہورہا ہے؟ سوال کا جواب نہ پانے پر اس نے یاس کے پہلو میں پناہ لے لی تھی۔ وہ گھر کے ایک گوشے میں تنہا پڑا گھنٹوں سوچتا رہتا۔ منفی سوچیں' اسے بیکل کیے دیتیں۔ وہ اسے کسی طور جینے نہیں دے رہی تھیں لیکن بعض اوقات اسے کچھ گزرے ہوئے حسین لمحات بھی یاد آتے یوں وہ ایک عرصہ تلخ و شیریں یادوں کے سہارے تنہائی کے جنگل میں بھٹکتا رہا۔ اچانک ایک روز اسے اس بے آب و گیاہ ویران جنگل کی خاک چھانتے ہوئے ایک موہوم سی آن دکھائی دی جس نے اس کے بجھے دل کو جلا بخشی اب وہ بہتر طور پر سوچنے لگا تھا اس نے اپنے گھر کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے جانے اسے کن کٹھن رستوں سے گزرنا پڑا تھا' آج رواں سال 16 جون کی ایک گرم شام تھی جب اس نے ریل میں سوار ہوتے وقت بوگی نمبر 7 کے زینے پر قدم رکھا' اسے یاد آنے لگا۔

52 سال قبل' 17 جون 1962ء کی ایک روشن صبح کو اس نے رحیم یار خان کی سرزمین پر پہلی بار قدم رکھا تھا وہ لاہور سے بذریعہ کراچی ایکسپریس رزق کی تلاش میں کشاں کشاں' یہاں پہنچا تھا لیکن دو برس کے بعد ہی کچھ نامساعد حالات کی بنا پر اسے لاہور واپس آنا پڑا۔

آج بھی وہ اسی ریل پر رحیم یار خان کے لیے روانہ ہورہا تھا' ریل لاہور شہر کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھی تو اس کی سوچ کا دائرہ اس کے گرد ریل کے پہیے کی مانند گھومنے لگا اس نے ٹکٹ رحیم یار خان کا لیا تھا مگر ریل میں سوار ہونے کے بعد اس نے اپنا ارادہ تبدیل کرلیا وہ اس شہر میں جانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دیرینہ دوست برسوں پہلے اسے داغ مفارقت دے گئے تھے پھر بھی ابھی کچھ ہم خیال مخلص دوست یہاں موجود تھے وہ یقیناً اسے سہارا دے سکتے تھے لیکن وہ ان کے سامنے عبرت کا نشان بننا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتا تھا جہاں اس کا شناسا کوئی نہ ہوتا اچانک اس کے ذہن میں خان پور شہر کا خیال گزرا۔

یہاں سے رحیم یار خان کا فاصلہ صرف تیس منٹ کا تھا اور یہ بات اس کے لیے طمانیت کا

باعث تھی پھر ان شہروں کے مابین موسم میں بہت مماثلت تھی چنانچہ اس نے خان پور رکنے کا فیصلہ کرلیا۔ خان پور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جونہی اس نے قدم رکھا اسے خورشید خان کی یاد آئی ان سے کسی زمانے میں اس کے کاروباری مراسم تھے اس کے سامنے ان کا چہرہ مسکرانے لگا۔ وہ ہمیشہ رنگین دھاری دار تہہ بند کے ساتھ سفید کا مدار کرتے میں ملبوس ہنستے مسکراتے نظر آتے۔

وہ جب بھی اس سے ملنے کو لاہور آتے ان کے ہاتھوں میں ایک خوب صورت منقش حصہ گردش کرتا نظر آتا' حصہ کے گرد بل کھاتا ایک پائپ لپیٹا ہوتا جسے وہ بوقت ضرورت کھول کر' منہ میں دبا لیتے اور لمبے لمبے کش لینے لگتے۔ کش لیتے وقت حصے سے کبوتر کی غٹرغوں جیسی آواز نکلتی جسے سن کر وہ بہت محفوظ ہوتے۔

حصے کی نگہداشت کے لیے ایک خادم ان کے ہمراہ ہوتا جو حصہ کی چلم سرد ہونے پر اسے تازہ دم رکھتا۔ خان صاحب کا حقہ کے ساتھ خادم رکھنے کا انداز ان کی رنگین مزاجی کو آشکار کرتا تھا۔ جمال نے ایک سرد آہ کھینچی کہ آج اس کی خان صاحب سے ملاقات نہ ہو پائے گی کہ وہ کچھ عرصہ قبل اللہ کو پیارے ہوگئے تھے' وہ سوچنے لگا کہ اب خان صاحب کہاں دیکھنے کو ملیں گے نہ ان کی باتیں سنیں گے مگر وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

خورشید خان کا خیال اسے چند ثانیے کے لیے آیا تھا' پھر اس کی سوچ کا دائرہ اپنے مقصد کی طرف گھوم گیا' وہ سوچ کی کڑیاں ملانے لگا۔

خان پور اتر کر وہ ایسی جگہ کا متلاشی ہوا' جہاں وہ ایک منفرد چائے کی کینٹین بنا سکے' چھ گھنٹے کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر اس کو ایک پسند کی جگہ مل ہی گئی۔

خان پور بائی پاس روڈ پر واقع اٹک پٹرولیم کے ساتھ کچھ نئی دکانیں تعمیر ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک دکان کے سامنے شیشم کا ایک قد آور درخت سایہ فگن تھا۔ یہ لوکیشن اس کے مقصد اور ذوق کے عین مطابق تھی' چنانچہ اس نے یہ دکان مناسب کرایہ پر حاصل کرلی۔ یہ عجیب بات ہے کہ چائے کی کینٹین کا خیال اس کے ذہن میں اس وقت ابھرا تھا جب وہ بھرپور کاروبار کررہا تھا اور اسے زندگی کی ہر آسائش میسر تھی لیکن نامعلوم اس کے ذہن پر ایک اعلیٰ کینٹین کا تصور کیوں چھایا رہتا' ایسی کینٹین جو مختصر لیکن منفرد فرنیچر کی حامل ہو' نفیس کراکری سے آراستہ ہو۔

جس میں ایک اعلیٰ ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ پچاس کی دہائی کے پرانے یادگار گیتوں کا اہتمام ہو' اب اس کا یہ خوابیدہ خیال کچھ ہی دنوں بعد پورا ہونے کو تھا اس نے چند دنوں میں اس دکان کو پسند کے مطابق کینٹین کی شکل دے دی اور اس پر گرین کیفے کا بورڈ آویزاں کردیا۔ حسن اتفاق اسے عقب میں دو کمروں پر مشتمل ایک گھر بھی مل گیا' اب اس کا سیٹ اپ مکمل تھا۔ اس نے اچھے دنوں میں کچھ پیسے پس انداز کرلیے تھے جو اس آڑے وقت میں اس کے کام آرہے تھے۔

جمال نے ماہ جولائی کی ایک خوش گوار شام کو گرین کیفے کا آغاز کردیا' حالانکہ اس روز تیز گرد آلود ہوا چل رہی تھی لیکن موسم میں یکسر تبدیلی آنے سے فضا خوش رنگ ہوچکی تھی۔ خان پور اور اس کے مضافات کے افراد نے اسے صاف ستھری اور یونیک کینٹین کو بہت پسند کیا' پہلے ہی

روز رات گئے تک رونق رہتی' آنا جانا لگا رہا اور خان پور کی فضا میں پہلی بار روح میں اتر جانے والے بھولے بسرے گیت' تانیں بکھیرتے رہے۔

وہ صبح کو جب کیفے جانے کے لیے گھر سے نکلتا' گیارہ بج رہے ہوتے گھر سے نکلتے وقت' غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ سامنے والے گھر کی طرف اٹھ جاتی۔ وہ دیکھتا گھر کی ایک کھڑکی کا پٹ کچھ ثانیے کے لیے کھلتا ہے' کوئی اسے جھانکتا ہے پھر بند ہو جاتا ہے۔

یہ ایک معمول کی بات ہو چلی تھی' جوں جوں وقت گزر رہا تھا' اس کا تجسس بڑھ رہا تھا۔ وہ کون ہے جو اسے دیکھتا ہے اسے سوچتا ہے یہ ایک پہیلی تھی جس میں وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔ کچھ ثانیے کے لیے کھڑکی کا کھلنا اور پھر بند ہو جانا' معنی خیز تھا۔ وہ بہت حساس واقع ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرتے اسے گھنٹوں گزر جاتے۔ وہ فارغ اوقات میں گھر میں رکھی گئی' ایک کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا۔

عرصہ چھ سال سے اس کی لکھی ہوئی کہانیاں اور افسانے ایک مقبول پرچے میں شائع ہو رہے تھے جن پر اسے معقول معاوضہ بھی مل جاتا تھا۔

بسا اوقات وہ سوچتا وہ اس شہر میں ایک اجنبی ہے' نو وارد ہے۔ کوئی اس سے شناسا نہیں پھر وہ اس عقدہ لاینحل کو کیسے حل کرے وہ سراپا سوال بن گیا تھا۔

گرین کیفے گو اس کے ذوق کے مطابق بن نہ پائی تھی پھر بھی قریب قریب تھی۔ اسے دیکھ کر پاکیزگی کا احساس ہوتا' دل کھل اٹھتا تھا۔ کاروباری ضرورت کے ساتھ محرومی ذوق اسے

> **اہمیت**
> اپنی زندگی میں ہر کسی کو اہمیت دو جو اچھا ہوگا وہ خوشی دے گا جو برا ہوگا وہ سبق دے گا۔
>
> **امید**
> امید کم رکھو مایوسی کم ملے گی کیوں کہ انسان دکھ نہیں دیتے بلکہ انسانوں سے وابستہ امیدیں دکھ دیتی ہیں۔
>
> اعجاز توقیر...... گجرات

اس جانب لے آیا تھا' ایک صاف ستھری آئیڈیل لوکیشن پر۔ تازہ گرم پانی' تازہ پتی' تازہ دودھ سے تیار کردہ خوش گوار مہکتی چائے کو نفیس پیالی میں سرو کرنے کا شوق' پرانے مدھر گیتوں کو شب کی گہری خاموش فضاؤں میں سننے کا شوق' یہ سب پگلے پن کی باتیں تھیں مگر وہ کر رہا تھا۔

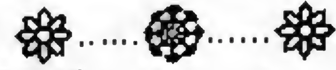
بسا اوقات وہ سوچتا کہ وہ اپنا آراستہ گھر چھوڑ کر پردیس میں کیوں آن بسا ہے' اس نے آخر اداسیوں کو کیوں گلے لگا لیا ہے۔ اس نے کیفے پر بیٹھنے کا وقت شب بارہ بجے تک مقرر کر رکھا تھا لیکن بعض اوقات اسے کسٹمر کی وجہ سے دیر تک بیٹھنا پڑتا اور کچھ لمحات ایسے بھی آتے کہ وہ خود ان گیتوں میں ایسے کھو جاتا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔

آغاز میں تو اس کے پاس چند مخصوص افراد ہی آیا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' نفس چائے کے قدردان اور پرانے گیتوں کے رسیا افراد کا تناسب بڑھنے لگا تھا پھر ایسا ہونے لگا کہ اس کے پاس جگہ کم پڑ جاتی لیکن چائے پینے والے اپنی اپنی پیالی تھام کر شیشم کے زیر سایہ رکھی گئی نشستوں پر جا بیٹھتے اور چائے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ پرانے مدھر گیت سن کر اپنی بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے اور

کچھ کیفے کے بند ہونے کے منتظر رہتے' انہیں خامشی شب میں تیز ہوا سے جنم لینے والی شیشم کے پتوں کی مترنم سرسراہٹ اٹھنے نہ دیتی۔

آخر میں ٹھیک بارہ بجے' خاموش فضاؤں میں ایک مدھر گیت اپنا جادو جگاتا۔

سنو چھوٹی سی گڑیا کی لمبی کہانی
جیسے تاروں کی بات سنے رات سہانی



جمال کو یہاں آئے ہوئے لگ بھگ ایک ماہ ہونے کو تھا' یوں تو ہر نئے دن نئے آنے والے افراد سے اس کی شناسائی بڑھ رہی تھی لیکن آج وہ ایک ایسے نوجوان کے بارے میں سوچنے لگا جو عموماً اس کے ہاں رات کو چائے پینے کے لیے آتا تھا اور جسے وہ سامنے والے گھر میں آتے جاتے دیکھتا تھا لیکن اسے یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس کا ان گھر والوں کے ساتھ کیا سمبندھ ہے۔

وہ ایک خوش وضع اور خوبرو نوجوان تھا' وہ رات کو گیارہ بجے کے قریب آتا چائے پیتا اور آخری گیت سن کر چل دیتا۔ ایک رات وہ بل ادا کرنے کو کاؤنٹر پر اس کے پاس آیا' سلام کہنے اور بل کی ادائی کرنے کے بعد بے تکلف انداز میں مخاطب ہوا۔

''انکل ایک بات تو بتائیں۔''

''کہیے برخوردار! کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

جمال نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ کے پاس پرانے گیتوں کا انمول خزانہ ہے' درد بھرے اداس کر دینے والے گیت لیکن ایک گیت جو سب سے آخر میں سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں کہ آخر اس گیت کو آپ نے سب سے آخر میں کیوں رکھا ہے؟''

نوجوان کے اچانک غیر متوقع سوال نے اسے چونکا دیا' اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر قدرے توقف سے نوجوان کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیٹا! میں اس کا جواب پھر کبھی دوں گا۔''

''ٹھیک ہے انکل...... ویسے انکل میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی اس گیت کے ساتھ گہری وابستگی بلاوجہ نہیں۔'' یہ الفاظ کہہ کر وہ پلٹا اور جمال کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس رات جب وہ بستر پر لیٹا وہ بیتے ہوئے دنوں کے ان جاں گسل لمحات میں کھو گیا جب پندرہ برس قبل ماہ جولائی کے ان ہی دنوں میں اس کی اکلوتی چھ سالہ معصوم بیٹی اچانک بیمار پڑ گئی۔ اسے یاد آنے لگا کہ اس نے اپنی بیمار بیٹی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

نامعلوم اس کو کیا مرض لاحق ہو گیا تھا جو کسی بھی ڈاکٹر کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ بہت بیکل رہتی' اسے پل بھر چین نہیں تھا اس کی بے چینی دور کرنے کو وہ ساری ساری رات جاگتا' اسے گود میں لیتا پیار کرتا۔ اسے خوش کرنے کو دلچسپ کہانیاں سناتا' اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو ممکن بناتا۔

پھر شب کی تنہائی میں اللہ کے حضور گڑگڑا کر اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا لیکن ہر ممکن کوشش کے باوجود وہ اپنی پیاری بیٹی کو زندگی نہ دے سکا۔

زریں جسے وہ پیار سے گڑیا کہا کرتا تھا ایک روز اس سے روٹھ گئی' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا' اس کے آنسو تھمتے نہ تھے۔ معاً اسے بیوی کی

سوزدروں

7 اپریل 1994ء کو میرا جاپان جانا ہوا تھا' میں نے اپنے سفر نامہ میں ایک جگہ ٹوکیو شہر کی ایک خوب صورت شب کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا تھا۔

چائے پینے کے بعد میرے ساتھی شب بخیر کہتے ہوئے اپنے بستر پر چلے گئے' میں کچھ دیر توقف کرنے کے بعد کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا جہاں ٹوکیو شہر کا دیدنی منظر میرا منتظر تھا۔

شیشے کی بلند و بالا عمارتیں حد نگاہ آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔ عمارتوں کی کھڑکیوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی ستاروں کی مانند جھلملا رہی تھی' جیسے ستارے زمین پر اتر آئے ہوں' جیسے وہ ہمارے گردہوں اس منظر نے مجھے ساکت کردیا۔

میں اسی میں کھو گیا آسمان وقت سے جال میں اترتے لمحات' ماضی میں ڈھل رہے تھے دل چاہتا تھا وقت ٹھہر جائے ہر لمحہ رک جائے' یہ منظر جاوداں ہوجائے لیکن یہ سب میرے بس میں نہ تھا۔ تھکن سے آنکھوں میں نیند کا غلبہ تھا لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا میں اس منظر کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

رات بھیگ رہی تھی' دو بج چکے تھے میں ایک نشاط انگیز سے گزررہا تھا' اچانک خیال آیا میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ لاہور سے خریدا تھا جو بریف کیس میں محفوظ تھا۔ بریف کیس میرے سامنے سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا' بریف کیس کھولا اس میں سے سگریٹ کے پیکٹ کو برآمد کیا۔ ساتھ میں ایک خوب صورت پیکنگ میں ایک فینسی گولڈن سگریٹ لائٹر تھا' اسے نکالا۔

یہ خوب صورت لائٹر مجھے Ken Hirata نے گفٹ کیا تھا جو 1990ء میں جاپان سے میرے پاس تشریف لائے تھے اس کو میں نے سنبھال لیا تھا شاید اس وقت کے لیے۔

میں نے گولڈ لیف کا پیکٹ کھولا' انگلی کی ٹھوکر سے ایک سگریٹ نکالا' اسے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر کے ہلکے نیلگوں سے سلگایا' جس نے اس منظر کو اور بھی دل کش بنادیا تھا۔

سلگتے سگریٹ سے نکلتا دھواں کمرے کی فضا میں پھیلنے لگا' اس بل کھاتے' پھیلتے دھوئیں کے پیچ وخم میں ایک موہوم سی شبیہ دھندلائی جواب ایک تصویر بار بند بن چکی تھی۔

جی نے چاہا یہ تصویر تحلیل ہوجائے جسے میں دیکھ نہ پاؤں جسے میں سوچ نہ پاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مجھے گم گشتہ ماضی میں لے چلے اور میں یاس کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

بے اختیار آنکھوں میں نمی تیرنے لگی' کمرے کا منظر دھندلانے لگا' میں نے آنکھیں بند کرلیں کچھ سوچنے لگا۔ بہت تھک گیا تھا' نامعلوم نیند نے کس وقت آلیا' میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔

رواں سال 28 مارچ کی شب' شادی کی ایک پررونق تقریب پر اچانک میرا اس چہرے سے سامنا ہوگیا' جسے کبھی میں نے اپنا بنانے کے بارے میں سوچا تھا۔

جو منفوان شباب میں دھیرے دھیرے میرے دل میں اتر گیا تھا لیکن اب میرا اس پر کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ کسی اور کے نام سے منسوب ہوچکا تھا' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے اپنا رخ بدل لیا لیکن اس لمحے یادوں کے کیواڑ کھل چکے تھے میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔

سویا ہو درد آج پھر جاگ اٹھا تھا' میں نے غیر ارادی طور پر پلٹ کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا اس کا حسن ماند پڑچکا تھا۔ ڈھلتی عمر کے سائے دراز ہوچلے تھے' بالوں میں چاندی اتر آئی تھی پھر بھی وہ ابھی تک جاذب نظر تھی' میں ماضی کے ان نہ بھولنے والے دنوں میں کھو گیا جب مجھے اپنی چاہت میں ناکامی کا سامان ہوا' میں برسوں سنبھل نہ پایا تھا۔

آج یہ چہرہ ویسے ہی مسکرا رہا تھا جیسے وہ آج سے چالیس برس پہلے میری ناکامی پر مسکرادیا تھا۔

وقار الرحمن...... علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور

یاد آئی اس نے سر جھکا لیا آنکھیں بند کرلیں کہ وہ اپنی ناخلف بیوی کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ نفرت کی آگ سے جلنے لگا اسے یاد آیا کہ گڑیا کے رخصت ہونے کے ایک برس بعد ہی وہ کم ظرف زہر میں بجھے ہوئے یہ الفاظ کہہ کر چلی گئی کہ اس کا ایک کنگلے کے ساتھ نباہ نہیں ہوسکتا۔ سوچوں میں مستغرق اس نے ساری رات بستر پر لوٹتے ہوئے گزاری' شب بھر بستر پر پہلو بدلنے سے اس کا بدن دکھنے لگا تھا۔

وہ بمشکل فجر کے وقت اٹھا' وضو کیا اور نماز ادا کی جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اس کے سامنے گڑیا کا چہرہ دھندلانے لگا' چھلکتے آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔

آج اس کا کیفے پر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا وہ ناشتا کیے بغیر بستر پر لیٹ گیا' ابھی وہ بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔

اس نے وقت دیکھا آٹھ پینتالیس ہوئے تھے سوچنے لگا اس وقت کون ہوسکتا ہے اس نے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے اسی نوجوان کو کھڑے پایا۔

''آیئے' صبح صبح کیسے آنا ہوا؟'' وہ اس کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے مخاطب ہوا۔

''انکل میں ذیشان ہوں۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''ہم لوگ آپ کے سامنے والے گھر میں رہتے ہیں۔ آج جب میں تیار ہوکر دفتر جانے کو گھر سے نکلنے لگا تو والدہ کہنے لگیں ''بیٹا سامنے والے گھر سے ہوکر جانا۔ رات گئے دیر تک مجھے وہاں سے کسی کے رونے کی آواز آتی رہی' خدا خیر کرے میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔'' انکل خیریت تو ہے ناں؟'' شان نے فکر مندی سے پوچھا۔

''بہت شکریہ بیٹا! آپ نے میری خیریت دریافت کی' میں ٹھیک ہوں کوئی فکر والی بات نہیں۔ بس تنہائی میں کسی کی یاد آ گئی تھی۔'' جمال نے ذیشان کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا۔

''انکل میں آپ کے پاس ضرور بیٹھتا لیکن اس وقت مجھے دفتر سے دیر ہورہی ہے' چلتا ہوں ان شاء اللہ رات کو آؤں گا۔ ویسے انکل کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتادیجیے۔''

''نہیں نہیں بیٹا اللہ آپ کو سلامت رکھے' مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' جمال نے ممنون ہوتے ہوئے جواب دیا۔

اسے آج معلوم ہوا تھا کہ وہ نوجوان سامنے والے گھر میں رہتا ہے اور اس کا نام ذیشان ہے۔ لیکن ذیشان کو اس بات کا پہلے سے علم تھا کہ جمال اس گھر میں رہتے ہیں۔

شان جاتے جاتے کہہ گیا تھا کہ وہ رات کو آئے گا' اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی جمال نے اپنے آپ کو کیفے پر جانے کے لیے تیار کرلیا۔

آج رات چاند پونم کا کھلا تھا ہر شے چاندنی میں نہائی ہوئی تھی' تیز ہوا سے شیشم کی جھولتی شاخوں اور پتوں سے چھن چھن کر آتی چاندنی زمین پر بکھر رہی تھی۔ سحر انگیز منظر کے باوجود وہ بہت اداس تھا' اسے ہر سمت اداسی چھائی دکھائی دے رہی تھی۔ کیفے پر اداس کیفیت میں بیٹھے آج اس نے اداس گیتوں کا انتخاب کیا تھا۔ ایسے میں اسے خورشید خان کی یاد آئی' وہ سوچنے لگا اگر آج وہ زندہ ہوتے تو وہ اسے یہاں کبھی بھی چائے کا کاروبار کرنے کی اجازت نہ دیتے بلکہ اسے اپنا دست راست بناتے ہمراہ رکھتے۔

جمال خیالوں میں گم تھا کہ شان نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''انکل......''

''جی......'' وہ چونک کر بولا۔

''میں واپسی پر آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے آپ چائے پئیں' کیفے بند ہونے پر ہم ایک ساتھ چلیں گے۔'' جمال نے اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ معمول کے مطابق ٹھیک بارہ بجے شب' بانوس گیت فضاؤں میں بکھرا جس نے جمال کو اور بھی اداس کر دیا تھا۔

❀......❀......❀

کیفے بند ہونے پر وہ باہم گھر کو چل دیئے' چند قدم چلنے کے بعد شان بولا۔

''انکل میں آپ سے ایک بات کہوں؟''

''کہیں۔''

''وہ انکل بات دراصل یہ ہے کہ میری بہن آپ سے ملنے کی خواہاں ہے۔''

''اچھا۔''

''اس کا کہنا ہے کہ آپ کی شخصیت ہو بہو ہمارے بابا سے ملتی ہے۔''

''تو......''

''میری بہن سچ ہی کہتی ہے۔''

''تو......''

''تو پھر انکل اتفاق سے کل اتوار ہے اور میرا آف ڈے ہے' آپ کل ہی ہمارے ہاں آجائیں ناں۔'' شان نے بے تکلفی سے یہاں ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا' میں کل کیفے پر جانے سے پہلے آجاؤں گا۔ مجھے اپنی بیٹی سے مل کر خوشی ہوگی۔'' جمال نے اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

اگلے روز صبح کو جمال نے کیفے پر جانے سے پہلے شان کے گھر کا رخ اختیار کیا' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے جب وہ دروازہ تک پہنچا وہ ششدر رہ گیا۔ اس کے سامنے وہی کھڑکی اچانک کھلی لیکن کچھ ثانیے کے بعد بند ہوگئی' اس کی چھٹی حسن نے کہا یہ سربستہ راز آج ضرور کھل جائے گا۔ اس نے دروازہ پر ہلکے سے دستک دی' تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو سامنے شان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے جمال کو اندر آنے کی دعوت دی' تپاک سے ہاتھ ملایا' پھر باہم لابی سے گزرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئے۔ جمال نے ایک نظر ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا' کمرے میں سادگی تھی لیکن ہر شے قرینے سے رکھی تھی۔

''بیٹھیے۔'' شان نے جمال کو ایک نشست پر بیٹھنے کو کہا اور خود اندر کمرے میں چلا گیا کہ میں گھر والوں کو آپ کی آمد کی اطلاع کر دوں۔ کچھ دیر بعد شان ایک خوب صورت ٹرے میں رکھے دو فینسی گلاسوں میں مشروب لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا' مشروب پیش کرتے ہوئے وہ ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا اس نے جمال کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اس کی خواہش کے احترام میں ان کے ہاں تشریف لے آئے۔

جمال کے استفسار پر شان نے بتایا کہ ہماری فیملی مختصر ہے ہم دو بہن بھائی ہیں جو اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ اس گھر میں مقیم ہیں۔ یہ ہمارا آبائی گھر ہے' ہمارے والد گرامی دو برس قبل اچانک ایک روز ہم سے رخصت ہوگئے وہ

ٹریفک کے ایک حادثہ میں چل بسے تھے۔ وہ ہم سے بہت محبت رکھتے تھے' ہم بھی انہیں دل و جان سے چاہتے تھے لیکن مشیت ایزدی کے سامنے کودم مار سکتا ہے۔

ان کی جدائی ہمارے مقدر میں تھی' قدم قدم پر ہم ان کی کمی محسوس کرتے ہیں یہ کہتے ہوئے شان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

''حوصلہ رکھیں بیٹا! مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن یہ سلسلہ تو ازل سے چلا آ رہا ہے۔'' جمال نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ آنسو پونچھتے ہوئے قدرے توقف سے شان اپنی بات کو آگے بڑھا کر بولا۔

''ایم بی اے کرنے کے بعد میں ایک معروف بینک میں جاب کررہا ہوں اور میری بہن بی اے فائنل میں پڑھ رہی ہے۔ انکل! ہمارے لیے دعا کریں کہ اللہ ہماری والدہ کا سایہ ہم پر قائم ودائم رکھے کہ اب ہم ان کے دم سے زندہ ہیں۔'' باہم گفتگو جاری تھی کہ ایک خوش شکل' دبلی پتلی دھان پان سی لڑکی سر پر دوپٹہ اوڑھے چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

''آداب انکل!'' اس نے آتے ہی دھیرے سے کہا۔

''یہ میری بہن ہے نایاب اختر۔ یہی ہمیں قریب لانے کا سبب بنی ہے۔'' شان نے خوش دلی سے اپنی بہن کا تعارف کروایا۔ نایاب کو دیکھتے ہی جمال بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جمال کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہوکر رہ گئیں۔

بالکل وہی..... وہی معصوم چہرہ' وہی سرخ و سپید رنگت اور ماتھے پر ویسے ہی ننھے ننھے شبنمی قطرے' جیسے اس کی بیٹی کے ماتھے پر دمکتے تھے آبدار موتیوں کی مانند۔

وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا' اسے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی' وہ حسرت سے اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر آج میری بیٹی زندہ ہوتی تو وہ بھی اس عمر کو ہوتی اور ایسے ہی ہوتی جیسے نایاب۔

اس لمحے اسے ایسا لگا جیسے اس کی گڑیا نایاب کے روپ میں اس کے سامنے کھڑی ہے۔ نایاب نے بھی اس حساس لمحے کو محسوس کیا' وہ جمال سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن فطری حجاب مانع تھا پھر بھی دل کی بات زبان پر آئی' لب کھلے' مخاطب ہوئی لیکن انکل کہنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی الفاظ ٹوٹنے لگے تھے پھر ہمت مجمع کر کے بولی۔

''کیا میں آپ کو.....''

''ہاں ہاں کہو بیٹی..... کیا کہنا چاہتی ہو؟'' جمال نے حوصلہ دیا۔

''انکل..... کیا میں آپ کو بابا کہہ سکتی ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی' آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' ان الفاظ کے ساتھ جونہی جمال نے نایاب کو بیٹی کہتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اس نے اپنے دائیں شانے پر شان کے ہاتھ کالمس محسوس کیا۔

ان نشاط انگیز لمحات میں جمال نے بھیگی آنکھوں سے دونوں بہن بھائیوں کو گلے لگاتے ہوئے بانہوں کے حصار میں لے لیا تھا۔

●

پہلا انقلابی

خان شفیق

جہالت نے انسان کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا تھا اور پھر اللہ نے اپنے پیغمبر بھیجے تاکہ وہ انسانوں کو غفلت کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف گامزن کریں۔
ایک باپ کی روداد وہ اپنے بیٹے کو بت تراش بنانا چاہتا ہے لیکن اس کا دل و دماغ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا' وہ بت تراش نہیں بلکہ بت شکن بن جاتا ہے۔

آہستہ آہستہ دن بھر کے تھکے ہارے لوگوں نے بروشا کے نخلستان میں آس پاس کے خیموں سے آکر اکٹھا ہونا شروع کر دیا تھا' دن بھر کی تپش کے بعد اب خنک ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آنے لگے تھے پھر کھجوروں کے درختوں کی اوٹ سے ایسا محسوس ہوا جیسے شب کی تاریکیاں چھٹنے لگی ہوں۔ سنہری کرنوں نے نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا پھر چاند کے طباق جیسے چہرے نے یک جانب سے کچھ اس طرح نمودار ہونا شروع کیا جیسے کوئی حسنِ بے مثال کی حامل دوشیزہ ایک ناز و انداز کے ساتھ اپنے حسن کا جلوہ دکھانے والی ہو۔

''آج شب کی داستان کا موضوع کیا ہوگا۔'' ایک اعرابی نے دوسرے سے سوال کیا۔

''کہانی کا موضوع ابھی تو ہم طوفانِ نوح سے گزر کر عاد کی بستیوں کو کھنڈرات کی شکل میں بدلتے ہوئے دیکھ کر آ رہے ہیں۔''

''ہاں قوم عاد جسے طوفانی ہواؤں نے فضا کی لامتناہی وسعتوں میں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔''

''ہاں کاہن کا انداز بیان' بس یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے' دن بھر کی کلفتیں داستان کے سحر میں ڈوب کر تصورات کی حسین وادی میں راحتوں سے بدل جاتی ہیں۔''

''لو وہ کاہن خنفا اپنے گلے میں چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کی مالا لٹکائے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ میں آبنوس کا عصا لیے آ رہے ہیں۔'' ایک دوسرے اعرابی نے کہا پھر قریب سے ہی گھنٹیوں کا ترنم اجاگر ہو گیا اور تمام ماحول ایک سحر میں ڈوب گیا۔

''کیا احاطے میں بندھی ہوئی بکریوں کو بھی کاہن خنفا کی آمد کا پتا ہو جاتا ہے؟''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' دوسرے شخص نے جواب دیا۔

اور پھر چودھویں شب کا چاند جب روئی کے سفید گالوں کی مانند یہ چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے چاند کے اردگرد منڈلانے لگتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان جانے دیس کی پریاں سفید لبادوں میں ملبوس چاند دیوتا کی پوجا کر رہی ہوں۔'' ایک دوسرے اعرابی نے کہا۔

''کیا تم شاعر ہو' کیا تم نے امراؤالقیس کے اشعار سنے ہیں وہ مثال دینے' تشبیہ اور استعارے دینے میں اپنا جواب آپ تھا۔'' ایک اور اعرابی نے پوچھا اسی دوران کاہن خنفا آہستہ آہستہ اپنے عصاء کا سہارا لیے اس چبوترے پر آ گیا جس کے چاروں طرف کھجور کی درخت جھکے ہوئے تھے۔

''خوش آمدید محترم کاہن خنفا ہم سب آپ کے ہی منتظر تھے۔'' کاہن خنفا نے زبان سے کچھ نہ کہا

صرف اپنا نحیف ہاتھ بلند کیا ایک ہلکی سی مسکراہٹ گھنی داڑھی کے بالوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور پھر غائب ہوگئی پھر ایک نوجوان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ حنفا اپنی داستان کی ابتداء بڑے انوکھے انداز میں کرتا تھا پھر کاہن نے اپنی چھوٹی چھوٹی تیز نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

وہ حسنِ جہاں سوز تھی وہ حسن کا ایک نادر شاہ کار تھی وہ حرکت میں آتی تو بہاریں اجاگر ہو جاتیں اور کیوں نہیں وہ ایک پُر وقار شہزادی تھی جس کے سامنے سر جھک جاتے۔ ایک بادشاہ وقت کی دختر باحیا اور بار ہا ایسا ہوا کہ کنیز اور لونڈیاں جو اس کی خدمت میں حاضر ہوتیں۔ شہزادی ان میں سے کسی ایک کو مخاطب کرتی اور وہ جواب دینے سے عاجز رہتی آخر کیوں ایسا ہوتا تھا میں تمہیں بتاتا ہوں۔ حسن کامل کی موجودگی میں ذہن ایسا گم سم ہو جاتا ہے کہ ہوش وخرد بیگانے ہو جاتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر حنفا چند لمحات کے لیے ٹھہر گیا پھر گہری نگاہوں سے چودھویں شب کے چاند کو دیکھنے لگا اور کہا۔

''کئی روز تک لوگ عمدہ سے عمدہ لباسوں کو زیب تن کیے ایک وسیع میدان کا رخ کرتے رہے۔''

''یہ اتنے لوگ' یہ انبوہ کثیر یہ کہاں کا رخ کر رہا ہے؟'' کسی نے سوال کرنے والے شخص کو دیکھا اور سوچا کہ یہ کوئی اجنبی انسان ہے۔

''ہاں یہاں کے بادشاہ کی دختر جس کا حسن بے مثال ہے' جس کا وقار شاہوں کے وقار کو سہا دیتا ہے۔ وہ کئی روز سے اپنی زندگی کے ساتھی کے انتخابات کے لیے آ رہی ہے اب تک کوئی شہزادہ کوئی جوان حکمران اس کی نگاہوں میں نہیں جچا ہے۔''

''کیا یہ اختیار اسے حاصل ہے؟''

''ہاں بادشاہ وقت کی جانب سے اسے یہ حق دیا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اجنبی خاموش ہوگیا۔

''کیا میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں؟''

اس نے سوچا اور پھر وہ بھی اس ہجوم میں شامل ہوگیا۔ لباس کی عمدگی سے بے پروا' کسی تزئین و آرائش سے مستغنی بس ایک تماشائی کی مانند لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ نوجوان کوئی معمولی انسان تھا اس نے وقت کے عظیم حکمران کے روبرو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی اور اس کی بے پناہ قوتوں کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔'' حنفا یہاں تک بیان کرنے کے بعد ٹھہر گیا جیسے اس داستان کا کوئی اہم موڑ آ گیا ہو۔ ثمر کے اشجار (کھجور) کی چھتریاں ایک جانب جھکی ہوئی تھیں' الف لیلوی انداز کی شب کا سکوت ہر سمت پھیلا ہوا تھا نخلستان کے احاطے سے باہر کی زمین اونچے نیچے ریگ کے تودوں پر مشتمل سنہرے سمندر کی مانند محسوس ہو رہی تھی اور لوگ منتظر تھے کہ حنفا اب کس انداز میں اپنی داستان کو کہاں سے بیان کرتا ہے۔

''یہ نہ سمجھ لینا کہ تمدن اور شہریت صرف آج کی بات ہے' طوفان نوح سے پہلے بھی ایک تہذیب کے طائر نے اپنے پروں کو پھیلایا تھا اور تہذیب کے یہ پھیلے ہوئے پر انسل میں ابلیس کی کارفرمائیاں ہوتی ہیں۔ اے جماعت حنفا شاید تمہیں احساس نہیں کہ انسان کی عقل جب ابلیس کے تابع ہو جاتی ہے تو خوب وزشت کے پیمانے بدل جاتے ہیں لیکن عقل ان ذلالتوں اور گمراہیوں سے نفریں ہوتی ہے وہ اس ذات کی تلاش میں ہوتی ہے جو اس کا خالق ہوتا ہے پھر ایک انقلابی نوجوان اٹھا یہ وہ ہی شخص تھا جو ہجوم میں ایک تماشائی کی حیثیت سے شامل ہوگیا تھا' یہ ہجوم شہزادہ گان جوان حکمرانوں اور طبقہ اعلیٰ پر مشتمل تھا اور پھر وہ لوگ بھی تھے جو محض تماشائی تھے کوئی آس کوئی امید ان کے ذہنوں میں نہیں تھی اور آخر ہوتی بھی کیونکر ظاہر ہے شہزادی کا انتخاب کوئی

حکمراں کوئی شہزادہ ہی ہوگا۔ اس نوجوان نے سب سے پہلے اپنے باپ کو حسین مجسموں کو تراشتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ صنم کدوں میں لوگ ان کی پرستش کیا کرتے تھے اور وہ بت جس کو اس کے باپ نے تراشا تھا وہ بھی اپنی تخلیق کو خالق سمجھ کر پوج رہا تھا یقیناً اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہوگا' آخر ایسا کیوں؟"

"مرحبا...... مرحبا حنفا! تمہارا انداز بیان کیا کوئی ہمسر ہوسکتا ہے تمہارا' اسی دوران زید بن عمرو کی مترنم آواز سنائی دی یہ دیوانہ اسی طرح اشعار گاتا پھرتا تھا۔ خطاب نے اسے مار مار کر ادھ موہ کردیا تھا لیکن اپنی دیوانگی میں اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اسے جسمانی تکلیفوں کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

اسلمت وجھی لمن اسلمت

لہ المزن تحمل عذب زلالہ

ترجمہ: "میں نے اس ذات کے آگے اپنا سر جھکا دیا جس کے آگے صاف اور میٹھا پانی اٹھانے والے بادلوں نے اپنی گردن جھکا دی۔"

زید بن عمرو کی آواز دور ہوتی چلی گئی اور نخلستان میں بیٹھے ہوئے حنفا اس کے سحر میں ڈوب گیا۔

"اس کو اب تک قتل کردیا جاتا لیکن بنوعدی قریش کا بااثر خاندان ہے لہٰذا مشرکین مکہ خاموش رہے۔" ایک نے دوسرے سے کہا۔

"اب آذر کے بیٹے کو اپنے خدا کی تلاش تھی۔" حنفا نے سلسلۂ کلام جاری کیا لیکن اس نوجوان کی پیدائش بھی حیرت انگیز تھی' ایک روز منحاک کے دربار میں تمام امرائے سلطنت موجود تھے اور منحاک نمرود اپنے بیش قیمت جواہرات سے مزین تخت پر جلوہ افروز تھا لیکن خیالوں میں ڈوبا ہوا سوچوں میں کھویا ہوا' امرائے سلطنت چور نگاہوں سے بھی بھی مدار المہام کو دیکھ لیتے اس میں ہی اتنی ہمت و جرأت تھی کہ وہ نمرود منحاک سے ہم کلام ہوسکتا تھا لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

"اے حاضرین دربار تم اس بات سے واقف ہو کہ ہم تمہارے خداوند ہیں اور جن کے ذہنوں نے کسی دوسرے ربّ کے بارے میں سوچا ہوا ان پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ ہم نے آسمان کی بلندیوں میں ایک تیر پھینک کر یہ بتادیا کہ اب وہ خدا موجود نہیں جیسا کہ تمہاری آنکھوں نے دیکھ لیا کہ تیر خون آلود ہوکر واپس زمین پر گرا تھا' بولو جواب دو کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔"

"ہے بے شک ہے ہمارے خداوند۔" حاضرین دربار نے ایک زبان ہوکر جواب دیا لیکن بوڑھا نجومی مزرونی سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"کیا فکر تجھے لاحق ہے اے کہنہ سال مزرونی۔" منحاک نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن مزرونی پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور منحاک نمرود کے جاہ و جلال کے باوجود وہ اپنی سوچوں میں کھویا رہا۔

"آج اس کے سر پر ادبار کے سائے منڈلا رہے ہیں' ہمارے خداوند کی ایک طرح سے خلاف ورزی ہوئی ہے لیکن منحاک نمرود کا ردعمل کچھ دوسرا ہی تھا۔"

"تخلیہ......" اس نے اپنی گرجدار آواز میں کہا اور ہر شخص ماسواء مزرونی وہاں سے رخصت ہوگیا۔

"ادبار کے سائے' آفات کے بادل' اے خداوند کچھ ایسی علامات آسمان کی لامتناہی وسعت میں نمایاں دیکھی ہیں جو خداوند آپ کی آفاقی سلطنت کے لیے براشگون ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو ہمارا اقتدار مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب ہر سمت' ہر مقام پر پھیلا ہوا ہے۔ ہم آسمان کے ربّ کو اپنے تیر سے گھائل کرچکے ہیں پھر کون ہے جو ہماری قلمرو پر اثر انداز ہوسکے' ہم ربّ ہیں اور کون ہے جو ہماری سلطنت پر

ادبار کے سائے ڈال سکے۔"

"خدا کے خلاف ابلیس کھڑا ہوگیا تھا' اے خداوند منحاک یہ عین ممکن ہے کہ آپ کے خلاف بھی......" اتنا کہتے کہتے مزرونی خاموش ہوگیا۔

"پھر دیکھو وہ کون ہے؟" اپنے ستاروں کے علم سے' اپنے سحر سے کام لیتے ہوئے۔

"ادبار کے سائے اے خداوند ادبار کے سائے۔" اتنا کہہ کر حنفا ٹھہر گیا۔ نخلستان میں بیٹھے ہوئے شائقین حنفا کا شوق اور تجسس مچلنے لگا۔ کھجور کے درختوں کی چھتری نما ٹہنیوں سے پورے چاند کی کرنیں ماحول میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سونے کے ذرات کی دھول اڑا رہا ہو اور چکور چی ہو چی ہو کی صدائیں نکالتا ہوا اپنے تصور میں منڈلاتا ہوا اس پورے چاند کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا محترم حنفا! پھر کیا ہوا؟" اب حاضرین سے نہ رہا گیا۔

"اے گروہ حنفا! کیا تم اس حقیقت سے واقف نہیں کہ انسانی فطرت میں عجلت پسندی ہے اور کیا تم اس بات سے بھی آگاہ نہیں کہ انسان ظاہراً محسوس ہونے والی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو بت پرستی کا آغاز نہ ہوتا۔ منحاک نے خود کو خداوند بنالیا وہ قوت اور اقتدار کا حامل تھا اور لوگوں نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔

"مزرونی ادبار کی کون سی علامت تیرے سامنے ابھر کر آ گئی ہے۔" منحاک نے پوچھا۔

"اشارات اور علامات ظاہر کر رہی ہیں کہ کوئی ہستی وجود میں آ چکی ہے جب بھی سات ستاروں کی ترتیب میں تبدیلی ہوتی ہے اس زمین کی سطح پر انقلاب نمودار ہوا ہے۔" یہ سن کر منحاک نمرود فکر میں ڈوب گیا۔

"کیا اس کو روکا جا سکتا ہے؟ کیا قبل از وقت بندش کی جا سکتی ہے۔"

"صرف ایک بندش۔" یہ سن کر نمرود مزرونی کے سامنے مجسم سوال بن گیا۔

"صرف ایک بندش......؟"

"کون سی بندش......؟" منحاک نے بے تابی سے پوچھا۔

"تلاش کرو اس بچے کو جو تمہارے خلاف کھڑا ہوگا۔"

"کہاں...... کس جگہ...... کیسے؟"

"تو خداوند ہے اپنی رعایا کو اپنی ذات کا سجدہ کراتا ہے' آسمان میں تیر چھوڑ کر آسمان کے خدا کو لہولہان کر چکا ہے اور اب مجھ سے پوچھ رہا ہے کہاں' کس جگہ' کیسے......؟" یہ سن کر نمرود منحاک مزرونی کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ستاروں کی محفل میں دیکھ...... دیکھ ان میں سے کون سا ستارہ سب سے زیادہ درخشاں ہے اور اگر تجھے وہ نظر آ جاتا ہے تو سمجھ لے کہ صلبِ بدر سے وہ شکمِ مادر میں آ چکا ہے۔" منحاک غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا اسے انتظار تھا کہ کاہن مزرونی ابھی کچھ اور اسے بتائے گا۔

"اور اگر وہ نظر نہیں آتا تو سمجھ لے کہ ابھی اس کے آنے میں وقت ہے۔"

"کچھ اور علامتیں بھی اس کی آمد کی ہیں۔" نمرود نے پوچھا۔

"علامتیں...... اس کی آمد کی؟" ان الفاظ کو دہرا کر مزرونی کے ہونٹوں پر خفیف سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ نام نہاد احمق انسانوں کا احمق خداوند اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کی آمد کی علامتیں کیا ہیں جب انسان خدا بن جاتا ہے تو یہ پہلی علامت بھی نجات دہندے کی آمد کی ہوتی ہے جب ظلم حد سے سوا ہو جاتا ہے تو یہ مظلوموں کے مددگار کی آمد کی

علامت ہوتی ہے۔ نوحؑ مدت پائے دراز تک ذلالتوں میں ڈوبے ہوئے مغرور خودسر لوگوں کو خدا کا راستہ دکھانے کی کوشش کرتے رہے اور جب تھک گئے تو ان کی زبان سے بے ساختہ بددعا نکل گئی اور پھر سیلاب آیا اور پھر زمین نے پانی اگلنا شروع کر دیا اور پھر آسمان نے پانی انڈیلنا شروع کر دیا۔"

مزرونی سوچوں میں گم تھا اور منحاک سراپا انتظار۔

"مزرونی اب ہم تھک گئے ہیں اور تو اپنے خیالوں میں گم ہے۔" منحاک نے کہا۔

"علامتیں...... اے خداوند تو علامتوں کی بات کرتا ہے کل اسی وقت میں مزرونی اپنے خداوند کو اس کا جواب دوں گا' وہ جواب جو میرے خداوند کو مطمئن کر دے گا۔"

"کل تو ہماری پوجا کا دن ہے' اجتماعی پوجا کا دن اور لوگوں نے انسوبانہ کے بڑے ہال میں جمع ہو جانا ہے۔ کل ہمیں فرصت کہاں ہوگی نصف شب تک ایک جشن بپا ہوگا' رقص و سرود کی محفلیں سجائی جائیں گی' حسین دوشیزائیں ہمارے سامنے رقص کریں گی۔"

"ہاں یہ سب کچھ تو ہے لیکن خداوند تیرے اس بندے کو اس غلام کو ستاروں کی گردش اور ان کی ترتیب کو آج رات دیکھنا ہے۔" مزرونی نے کہا۔

"پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ پرسوں کی نصف شب کے بعد۔" منحاک نے کہا۔ اتنا کہہ کر حنفا سانس لینے کے لیے ٹھہر گیا' چاند کا طباق جیسا چہرہ آسمان کی لامتناہی وسعت میں جلوہ گر تھا۔ پروشا سے نخلستان کے وسط میں جہاں بلند چبوترہ واقع تھا اور ایک جانب ایک چھوٹے سے پتھروں کے بنے ہوئے چولہے میں کھجور اور تھور کی خشک ٹہنیاں جل رہی تھیں اور ایک بڑی سی کیتلی میں قہوہ گرم حالت میں تھا اور چھوٹی چھوٹی پیالیاں ایک مٹی کے بڑے سے طشلے میں ڈھیر تھیں۔

"کیا قہوہ کا ایک دور اور نہ چل جائے۔"

"ہاں ایک دور اور' نصف شب گزر چکی ہے اور ہم لوگوں کی آنکھ نہیں جھپک رہی۔" اجتماع کے ناظم خالد دینار نے کہا۔

"ایک سوال میرے ذہن میں' محترم حنفا گردش کرتا رہتا ہے۔" اسمٰعیل بن زیبان نے کہا۔

"ہاں تیرے ذہن میں ایک سوال جو کبھی میرے ذہن میں بھی بسا ہوا تھا لیکن اب نہیں۔" حنفا قہوے کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

"کیا محترم حنفا آپ میرا مطلب سمجھ گئے؟" زیبان نے پوچھا۔

"ہاں جان گیا تیرے دل کا راز' تو یہ ہی کہنا چاہتا ہے کہ ہم مواحد حنفا جو اپنے باپ کے دین پر قائم ہیں ہم جو باری تعالیٰ کی کائناتی نیابت کے قائل ہیں آخر ہم اتنے بے بس کیوں؟ اتنی قلیل تعداد میں کیوں؟ تو یہ ہی کہنا چاہتا ہے نا؟" اتنا کہہ کر حنفا خاموش ہو گیا۔

"ہر اجتماعی خرابی میں عالمی بھلائی ہوتی ہے جب ساحل سمندر پر جتنا زیادہ گہرا سکوت ہوتا ہے وہ اتنے ہی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے بوقبیس کے سلسلے میں آج گہرا سکوت ہے اور یہ کسی خوشگوار انقلاب کی خبر دے رہا ہے۔ تاریخ اپنا راستہ خود اختیار کرتی ہے اسے دوسروں کی آرزوؤں اور تمناؤں کی ضرورت نہیں ہوتی' بنی اسرائیل عالمی نیابت کے لیے اٹھے تھے لیکن ذلالتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے' دربدر ہوئے خاک بسر ہوئے اور آج نوحہ خواں ہیں۔" حنفا خاموش ہو گیا۔

☆......☆......☆

آج منحاک کی اجتماعی عبادت کا دن ہے آج ہر سمت سرتیں رقصاں ہیں لیکن مزرونی اپنے کمرے میں تنہا سوچ کی گہری جھیل میں ڈوبا ہوا ہے گزشتہ

شب ستاروں کی جو ترتیب اس نے دیکھی ہے وہ اسے پریشان کیے ہوئی تھی بنات النعش' سات ستاروں کی جھرمٹ میں اچانک ایک درخشاں ستارہ نمودار ہوا اور یہ سات ستارے ماند پڑ کر رہ گئے۔

''وہ آچکا ہے...... شکم مادر میں آچکا ہے' قید و بند کے باوجود' اپنی شریک حیات کے ساتھ ہم بستری کی پابندیوں کے باوجود...... کیا فطری تقاضوں پر پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں؟ کیا کسی شے' کسی نفس کی تخلیق کو روکا جاسکتا ہے۔'' یہ ہی مزرونی کی سوچ تھی۔

خداوند منحاک کی عبادت کا دن بڑے شاندار طریقے پر منایا جارہا تھا اور اس سے ایک روز پہلے آذر کو اپنی زوجہ اوشہ سے ملنے کا موقع میسر آچکا تھا اور پھر یہ کہ عورتیں اپنے معصوم اور نوزائیدہ بچوں کو ہلاک کردیں لیکن جو کچھ اس ذات اقدس جو بے شمار کائناتوں کی خالق ہے جب ارادہ کرتی تو کہہ دیتی ہے کہ ہوجا' بس وہ ہوجاتا ہے۔

نمرود منحاک کے میلوں میں' عبادتوں میں' محفلوں میں جو کچھ ہوتا رہتا تھا وہ صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل تھی' ہر دور اور ہر زمانے میں محسوسات کو نظر آنے والی چیزوں کو' چھو جانے والی اشیاء کو جب معبود بنالیا جاتا ہے تو اس کے پس منظر میں انسانوں کی اجتماعی تباہی ہوتی ہے۔''

تیسرے دن جب نمرود منحاک مزرونی سے ملا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ تیری ذات اور تیری سلطنت کا تباہ کرنے والا صلب پدر سے شکم مادر میں آچکا ہے۔

''شکم مادر میں......؟''

''ہاں خداوند' شکم مادر میں...... اے خداوند میں نے سات ستاروں کے جھرمٹ میں دیکھا کہ ایک درخشاں ستارہ اس جھرمٹ کے درمیان نمودار ہوا اور اس کے سامنے تمام ستارے ماند پڑ گئے۔''

''پھر ہمارے لیے اس کی بندش کچھ ایسا مشکل تو نہیں' ہم پہلے ہی یہ احکامات دے چکے ہیں اور اب کچھ گہری ہی نگاہ رکھی جائے گی۔ کسی بھی نوزائیدہ بچے کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔'' مزرونی منحاک نمرود کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''کون سی بات ہماری قدرت سے باہر ہے؟'' منحاک نے فخر سے کہا۔

''اور ان محفلوں میں' ان میلوں میں' ان بت خانوں میں کتنی عورتیں حاملہ ہوچکی ہوں گی۔'' مزرونی نے کہا۔

''ان پیدا ہونے والے بچوں کی مائیں یہ سمجھ لیں کہ ان کی نرینہ اولادیں دنیا میں تو آئیں گی لیکن لمحوں کے لیے سانس لینے کے لیے۔'' مزرونی اس کی حماقت سے پُر باتوں کو سنتا رہا' وہ جانتا تھا اور یقین کی حد تک اس بات کا قائل تھا کہ اس کی بے اندازہ قوت اور طاقت نے اس کے ذہن میں یہ بات پختہ کردی ہے کہ وہ لوگوں کا ربّ ہے اور لوگوں کو اس کے سامنے سجدہ کرنا لازم ہے۔

آنے والی شخصیت آچکی اور جب وقت گزرنے لگا تو اوشہ کو فکر لاحق ہونے لگی کہ وہ اپنے بچے کو کس طرح بچائے' وہ نہیں چاہتی تھی کہ جس طرح اور مائیں اپنے بچوں کے گلے گھونٹ گھونٹ کر ہلاک کررہی تھیں وہ بھی ایسی ہی سنگ دل بن جائے۔ آذر بھی اس بات سے پوری طرح واقف تھا۔ ایک نایاب سنگ تراش ایسا کہ اس کے پتھر کے مجسمے ایسے کہ بس بات کرنے ہی والے ہوں اور پھر نمرود کے کمرہ استراحت کا شمع بردار بھی تھا لیکن وہ ایک باپ بھی تھا کس طرح گوارا کرسکتا تھا کہ اوشہ اس کی اولاد کو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کر ختم کردے اوشہ کے شکم کی حالت بدلتی جارہی تھی اور اسی اعتبار سے اس کا خوف بھی سوا ہوتا جارہا تھا۔ نمرود کی خدائی تھی کہ دہشت اور خوف کے سائے ہر سمت دبیز ہوتے چلے جارہے تھے۔ اوشہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی ہمسایہ

عورتوں سے الگ تھلگ رہتی اس لیے کہ ایک عورت دوسری عورت کے راز کو کسی طور راز میں رہنے دیتی، مبادہ اس راز سے خود اس کی بچت وابستہ نہ ہو۔

حنفا نے ایک گہرا سانس لیا اور بروشا کے نخلستان میں بیٹھے ہوئے سنتِ ابراہیمی کے پیرو کا حنفا پر ایک گہری نظر ڈالی اور کہا۔

''یہ ہماری دوسری نشست ہے۔''

''نعم یا حنفا لیکن دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی جارہی ہے۔''

''میں محترم حنفا ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' مصعب بن عمیر نے کہا۔

''ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اسی دوران زید بن عمرو کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔

واسلمت وجھی لمن اسلمت

لہ الارض تحمل صخرا ثقالا

ترجمہ: ''سر میرا جھک گیا ہے اسی ذات کے آگے

جس نے ان پہاڑوں کو زمین پر نصب کیا تھا

آواز میں سوز تھا' ایک درد تھا' ایک محویت تھی۔

''خطاب نے بارہا اسے مار مار کر ادھ موا کردیا' گھر سے نکال دیا اور اب یونہی دربدر پھرتا رہتا ہے کبھی ضجنان کے جنگل میں' کبھی بوقبیس کے نشیب و فراز میں اور کبھی ام القریٰ کے آس پاس۔'' زہیان نے کہا۔

''یہ مواحد ہے اور گہرائیوں میں ڈوبا ہوا مواحد...... یہ بھی انسانی معاشرت کا ایک المیہ ہے جب کوئی بڑا ذہن کسی قرینے' کسی علاقے میں جنم لیتا ہے وہاں کے لوگ اسے خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ اپنے عمومی ذہن سے اس بڑے ذہن کو کیسے پہچان سکتے ہیں' لہٰذا انکے پاس مخصوص منفی القاب ہوتے ہیں' مجنوں ہے' دیوانہ ہے' عقل سے عاری ہے' تم جو کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے پوچھو۔'' حنفا نے ذبیان سے کہا۔

''محترم حنفا اس بُت پرستی کا آغاز کیسے ہوا؟''

''بُت پرستی کا آغاز...... ذبیان پہلی بات تو یہ کہ انسان ہمیشہ سے ظاہرہ چیزوں سے متاثر ہوتا رہا ہے لیکن عرب کی سرزمین پر اس کا آغاز منفی انداز کی نام نہاد ترقی پسندی ہے۔ عربوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے عرب بائدہ' عرب عاربہ اور مستعربہ' ہم اسمعیل کی اولاد مستعربہ ہیں اور ہم ہی میں ایک شخص عدنان پیدا ہوا اس کی حیثیت ایک سردار کی تھی ایک بار اس نے شام کا سفر کیا اور وہاں لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا' اسے یہ بات کچھ عجیب اور دلچسپ لگی ایک دو بُت اٹھا کر لے آیا اور خانہ کعبہ میں نصب کردیئے یہیں سے اصنام پرستی کا دور شروع ہوگیا۔

''اور پھر نمرود کا کیا ہوا؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہاں نمرود منحاک...... ایک روز نمرود منحاک نے شمر بردار اور بُت تراش آذر سے کہا' آئے دن کے میلوں اور ٹھیلوں میں اپنی پوجا کرانے سے ہم تھک چکے ہیں کوئی تدبیر سوچو۔''

''اے خداوند بہت آسان ترکیب میرے ذہن میں ہے لیکن خداوند میری بھی ایک درخواست ہے۔'' آذر نے کہا'' یہ وہ وقت تھا جب اوشہ کا فرزند ایک غار میں جنم لے چکا تھا اور فرشتے اس کی نہ صرف نگرانی کررہے تھے بلکہ خدائے لمریزل نے اس کی خوراک کا بندوبست کردیا تھا۔''

''کیا آرزو ہے ہم سننے سے پہلے تمہاری درخواست قبول کرتے ہیں' یہ بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا تدبیر ہے۔''

''خداوند آپ جانتے ہیں میں ایک ماہر بُت تراش ہوں اور میرے بنائے ہوئے مجسمے ایسے ہوتے ہیں جیسے بولنے ہی والے ہوں۔''

''ہاں ہم اس بات سے واقف ہیں۔'' نمرود منحاک نے کہا۔

''میں آپ کے مجسمے تراشنا شروع کردیتا ہوں ان مجسموں کو خداوندا آپ ملک اور سلطنت کے بیشتر علاقوں میں وہاں ہال نما کمرے تعمیر کرا کر نصب کرادیں اور خاص خاص موقعوں پر جو آپ کی پوجا تہواروں کے دنوں میں ہوتی ہے اس کے علاوہ ہر ہفتے ان بتوں کی پوجا کا حکم بھی دیں آپ آئے دن کی زحمت سے بچ جائیں گے۔''

''آذر تمہاری یہ معقول تدبیر ہے اور اب ایسا ہی کیا جائے گا اب تم بتاؤ تمہاری درخواست کیا ہے؟''

''کاہن مزرونی نے خداوند اس شخص کے بارے میں کیا کہا ہے جو آپ کے لیے خطرے کا سبب ہوگا۔'' آذر نے پوچھا۔

''وہ ایک دو ہفتے پہلے شکمِ مادر میں آچکا ہے۔'' نمرود متحاک نے مزید کہا۔

''خداوند میں مسلسل تین راتوں تک ایک ہی خواب دیکھتا رہا ہوں جب خداوند آپ کا حکم صادر ہوا کہ ماہیں اپنے نوزائیدہ نرینہ بچوں کو فوراً ختم کر دیں تو مجھے خواب میں نصیحت کی گئی کہ میں اپنے بچے کی پیدائش کے بعد اسے ہلاک نہ ہونے دوں وہ خداوند نمرود متحاک کی سلطنت کے لیے رحمت بنے گا۔'' یہ نصیحت مسلسل تین بار کی گئی لہٰذا اے خداوند آپ کی سلطنت کی بھلائی کے لیے اوشہ اس کی حفاظت بڑی رازداری سے کرتی رہی اور آپ کے لیے جو خطرے کا سبب ہے وہ شکم مادر میں ہے جیسے کہ کاہن مزرونی نے بتایا۔

''تم ہمارے بت تراشو اور ہم تمہاری اس درخواست کو پہلے ہی قبول کرچکے ہیں۔'' اتنا سن کر آذر نمرود متحاک کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا۔

''خداوند حقیقت میں آپ ہمارے خداوند ہیں اور آپ کے مجسمے تو میں ایسے تراشوں گا جو لاثانی ہوں گے۔''

☆☆......☆☆

''آج شب یہ ہماری تیسری نشست ہے' اب چاند گھٹنے لگا ہے۔'' حنفا نے کہا اور پھر چاند کو دیکھ کر کسی خیال کے تحت وہ مسکرانے لگا اور پھر گویا ہوا۔

''ہمارے باپ کی پہلی جستجو' اے گروہ حنفا اپنے رب کی پہچان تھی' چاند کو دیکھا' ستاروں کو دیکھا' سورج کو دیکھا اور جب سب کو ماند پڑتے دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے۔

''میں اپنے چہرے کو اپنے معبود حقیقی کی طرف کرتا ہوں کیونکہ اسی واحد برحق نے زمین و آسمان کو بنایا ہے اور میں اللہ کی ذات میں کسی کا شریک کرنیوالا نہیں ہوں (سورۃ انعام آیت ۸۹) یہ تھا اس جستجو کا جواب کہ من ربی؟ یعنی میرا رب کون ہے اور آذر کے مواحد پسر نے خود اس سوال کا جواب تلاش کرلیا تھا تاریخ اپنے محدود سرچشمے سے اپنا سر نکالتی ہے اور خود اپنا راستہ لامتناہی وسعتیں بنانی بے اندازہ پھیلاؤ کی حامل بنتی ہوئی اپنا سفر جاری رکھتی ہے اور یہ سفر کہاں جاکر ختم ہوگا ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے' عرب بائدہ کے بارے میں ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ سرکش تھے' ظالم تھے' خود سر تھے' انہوں نے اپنی خواہشات کو مذہب کا نام دے کر ہر فعل بد کو اختیار کیا اور پھر کیا ہوا؟ عالمی سطح پر ایک سیلاب آیا اور پھر کیا ہوا' ہواؤں نے زور پکڑا اور پھر کیا ہوا؟ ایک چیخ بلند ہوئی اور ناگاہ وہ بجھ کر رہ گئے آج بھی ان کے محلات' ان کی عشرت گاہیں جزیرہ نما عرب اور شام کے درمیانی عرصے میں کھنڈرات کی صورت میں نشانِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے خدا کسی قوم کے اجتماعی گناہوں کو معاف نہیں کرتا جس عمل کے تسلسل کو انسان تہذیب وتمدن اور ثقافت کا نام دیتا ہے اس نے ایک بار سر نہیں ابھارا ہے۔ کیا تم ان کھنڈرات کو نہیں دیکھتے جو محلات تھے' عشرت گاہیں تھیں حسین میخانے تھے۔ صنم خانے تھے اور جنہیں عاد وثمود کی قوموں نے

"تعمیر کیا تھا۔" حنفا اپنے زورِ کلام میں بہت دور نکل جاتا تھا۔

گھٹتے چاند کی یہ رات بھی سحر انگیز تھی اشجار سرنگوں تھے' فضا میں ٹھہراؤ تھا' سکوت تھا' الاؤ روشن تھا اور کھجور تھور اور پیلو کی خشک لکڑیاں الاؤ میں چیخ رہی تھیں سرد اور انتہائی سرد صحرائی راتیں۔

"پھر اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی یہاں کوئی ایک مرد بھی معبودِ حقیقی کا اقرار کرتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ زندگی کچھ اس طرح رواں دواں تھی جیسے یہ یونہی جاری رہے گی کوئی تبدیلی لوگوں کی زندگی میں نہیں آئے گی۔

"ایک روز وہ اس صنم خانے میں گیا جہاں آذر بتوں کو تراشتا تھا' وہاں بھی نمرود کا ایک مجسمہ نصب تھا وہ بڑی حیرانگی سے یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر خاموشی سے واپس آگئے۔ آذر نے اپنے بیٹے کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا شاید اسے اس بات کا یقین کامل تھا کہ ان کا بیٹا بھی بابل کا مانا ہوا بت تراش بنے گا عام طور پر باپ کے فن یا باپ کے کاروبار کا وارث بیٹا ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا وثوق' ایسا یقین ہوتا ہے جس پر شک و شبہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اور آذر بھی روایتی طور پر اس بات سے متفق تھا اور کیوں نہ ہوتا' سنگ تراش کے بیٹے کو سنگ تراش ہی ہونا چاہیے لیکن ایک روز اس کا یہ یقین چکنا چور ہوگیا جب اس کے پسر نے اس سے کہا۔

"اے میرے پدر محترم آپ کو اور ساری قوم کو بڑی گمراہی میں دیکھتا ہوں (سورۃ انعام آیت 75) یہی مقام تھا جب آذر کا ماتھا ٹھنکا اور وہ سوچنے لگا کیا اس کا پسر وہ ہی شخص ہے جو اس کے خداوند کے زوال کا سبب بنے گا' باپ اور بیٹے کے درمیان یہ تنازعہ بڑھتا ہی گیا اور آذر ایک مستقل الجھن میں مبتلا ہوگیا۔ ابراہیمؑ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ایک بڑے طوفان کی خبر دے رہے تھے۔ ایک جانب بیٹے کی محبت اور دوسری طرف خداوند نمرود منحاک کا خوف اور پھر نمرود کی نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت وہ سوچنے لگا اگر یہ بات نمرود' خاک کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے تو اسے یہ خوف تھا کہ نمرود اس سے یہ سوال کرے گا کیا اسی لیے ہم سے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگی تھی بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اب آذر کو اپنی مکمل تباہی نظر آنے لگی تھی۔ باپ اور بیٹے کے درمیان جو بت خانے میں بات ہوئی تھی' آذر ایک ذرّہ برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا اور پھر اپنے باپ کو قائل کرنے کا عملاً اس مواحدِ اعظم نے ارادہ کرلیا جس کی ذات سے وابستہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طویل سلسلہ جاری ہونے والا تھا۔ اے گروہ حنفا مایوس ہونے کی ناامید ہونے کی ضرورت نہیں' ایسے وقت آتے رہے ہیں جب قوم کے بااثر سرداروں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو دھمکی دی تھی کہ یا تو وہ اپنے دین سے باز آجائیں ورنہ انہیں شہر بدر کردیا جائے گا اور جانتے ہو پھر کیا ہوا ایک بھونچال نے انہیں آن گھیرا اور وہ اوندھے پڑے ہوئے تھے' خدائے واحد کو کسی لشکر کے بھیجنے کی ضرورت نہیں بس ایک سیلاب' بس ایک چیخ' بس ہواؤں کی شدت' بس ایک بھونچال کافی ہوتا ہے۔

"محترم حنفا آپ تاریخ کے صفحات کو اس طرح بیان کررہے ہیں جیسے یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہورہا ہے۔" ابن اشعر نے کہا۔

"ہاں تاریخ کے صفحات' یہ دیدہ بھی ہیں اور نادیدہ بھی۔" حنفا نے اتنا کہہ کر ایک گہرا سانس لیا' سرد رات کا سکوت اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کبھی کبھی آسمانوں پر کوئی ستارہ ٹوٹتا اور روشنی کی ایک لکیر بناتا ہوا خلا کے بے اندازہ پھیلاؤ میں گم ہوجاتا۔

"اور پھر ایسا ہوا کہ سالانہ میلے کا دن آگیا' یہ میلہ کیا تھا گمراہیوں اور ذلالتوں کا ایک ہجوم بے پناہ

تھا، برہنہ رقاصاؤں کا رقص اور نمرود کی تعریف میں بلند ہوتے ہوئے نعرے اور معاشرت کے ضمن میں قوت مردی کے مظاہرے اور حسیناؤں کے وجود کے ایک ایک جوڑ کی نمائش اے گروہ حنفا کسی قوم کے زوال کی ابتدا یہ ہوتی ہے جب روشن خیالی کے نام پر جب تہذیب و ثقافت کے علمبردار ہونے کے نام پر اپنی خواتین کو برہنہ کر کے بازاروں اور میلوں میں ان کی نمائش کرتی ہے۔ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ آزادی دے دی جاتی ہے کہ وہ اپنی جنسی تسکین کے لیے جو چاہیں کرتے پھریں۔ امراء کی خواتین کو یہ کھلی اجازت ہوتی ہے کہ وہ جس کے ساتھ اپنے دامنِ عصمت کو داغدار کرتی پھریں، کسی قوم کے زوال کا وقت وہ ہوتا ہے جب جائز و ناجائز کا فرق مٹ جاتا ہے یہ ہی کچھ نمرود کی خدائی میں ہو رہا تھا اور جب آذر واپس آیا اور کسی نئے بت کو تراشنے کے لیے صنم خانے میں گیا تو وہاں ان مجسموں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اس کی حیرتوں کے سلسلے دراز سے دراز ہوتے چلے گئے۔

''یہ...... یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں، یہ کس کی حرکت ہے اور جب اس نے بڑے بُت کو دیکھا تو وہ صحیح سالم تھا اور تیشہ اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

''یہ کیا...... تیشہ بڑے بت کے کاندھے سے لٹک رہا ہے۔'' پھر اسے خیال آیا یہ حرکت ابراہیم کی تو نہیں۔'' اور یہ سوچ کر وہ کانپ گیا بالآخر یہ بات خداوند نمرود کے پاس ضرور پہنچے گی، اس دوران وہ مواحد اعظم بھی آ گیا جس نے آذر کے گھرانے میں جنم لیا تھا میلے سے ابھی تمام لوگ نہیں لوٹے تھے کہ ایک خبر پھیل گئی۔ کسی نے بڑے بت خانے میں تمام بتوں کو توڑ دیا ہے یہ بڑی سنسنی خیز خبر تھی لوگ بے تحاشا بھاگے اور دیکھا کہ تمام مجسمے ٹوٹے پڑے ہیں، یہ کس کی حرکت ہے؟ نمرود کے ایک اہل کار نے کہا۔

''یہ جرأت کون کرسکتا ہے؟'' دوسرا اہلکار بولا۔

''آذر کہاں ہے اسے بلاؤ؟ ایک تیسرے ذمہ دار اہلکار نے کہا۔''

''ہمارے معبودوں کا آخر کون دشمن نکل آیا اور یہ دیکھ بڑا بت بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں ہے۔''

''ارے ہاں اور اس بات پر تو غور نہیں کیا، تیشہ اس کے کندھے سے لٹکا ہوا ہے۔' اس اثناء میں آذر بھی آ گیا۔ وہ کانپ رہا تھا اور اس کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔

''میں نے آذر کے بیٹے کو اجتماعی پوجا کے موقع پر عبادت گاہ میں کہیں نہیں دیکھا، کہیں یہ اس کی حرکت تو نہیں۔'' ایک شخص نے شبہ ظاہر کیا۔

''لیکن کیوں......؟''

''میں بتاتا ہوں یہ حرکت اس کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی۔'' آذر نے بڑی دلیری سے کہا اور اس طرح اس نے اپنی بچت کا ایک راستہ نکال لیا تھا۔

''کیا......'' سب لوگ حیرت سے آذر کو دیکھنے لگے، آذر نے اپنے وقار اور گھرانے کو بچانے کی خاطر بیٹے کی زندگی داؤں پر لگا دی تھی نتیجہ یہ کہ ایک عدالت نمرود محاک کی سربراہی میں بٹھائی گئی اور اس میں اس مواحد اعظم کو بھی طلب کیا گیا اور پوچھا گیا کہ ان کے معبودوں کو کیا انہوں نے توڑا تھا اور اس مواحدِ اعظم نے جو جواب دیا آج بھی الہامی کتب میں موجود ہے آپؑ نے کہا۔

''یہ بات مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو، اپنے سب سے بڑے معبود سے کیوں نہیں پوچھتے اگر وہ کلام کرنے پر قادر ہیں تو سب کچھ آپ لوگوں کو بتادیں گے (سورۃ الانبیاء 21 آیت 63)

کیا جواب ہوسکتا تھا اس کا سوائے احساسِ شرمندگی کے لیکن اے گروہ حنفا جب وہ کائناتوں کا رب، ہر چھوٹی بڑی چیز کا خالق دلوں پر مہر لگا دیتا ہے تو پھر یہ ہٹ دھرمی کا مرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ نمرود کی عدالت نے فیصلہ کیا کہ ابراہیم کو ایک ایسی وسیع و

عریض آگ میں جلایا جائے کہ اس کی سلطنت کا ہر فرد اس سنگین سزا کو دیکھ لے اور پھر کسی کو خداوند نمرود منحاک کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو بت خانوں میں جو اصنام موجود تھے ان سب کو نمرود کی کسی نہ کسی قوت سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ اس کشادہ میدان میں جو لکڑیاں جمع کی گئی تھیں ان کا اکٹھا کرنا بتوں کے مذہب کا فریضہ قرار دیا گیا تھا اور اس کا ربد کو کار خیر کا نام دے دیا گیا تھا۔

''ابراہیم کو اس کشادہ آگ میں جلایا جائے گا تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ بت شکنی کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' کسی نے کہا۔

''نمرود کی خدائی میں اور اتنا بڑا جرم۔'' اس نوجوان کا انجام یہ ہی ہونا چاہیے اگر اس سے بڑی بھی کوئی سزا ہو سکتی تو وہ سزا اس ان دیکھے خدا پر یقین رکھنے والے آذر کے بیٹے کو دی جاتی تو ہمارا دل ٹھنڈا ہوتا۔'' نمرود کے ایک دوسرے پرستارے نے کہا لیکن مزرونی خاموش تھا' اس کے ذہن میں یہ بات پوری طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ نمرود منحاک خداوند تو بزور طاقت تھا لیکن وہ معبود ہر گز نہیں تھا کیونکہ اس نے بارہا اس بات کو محسوس کیا تھا کہ وہ مزرونی کے سامنے بالکل عاجز نظر آتا تھا۔'' حنفا اتنا کہہ کر سانس لینے کے لیے ٹھہر گیا اور پھر اس نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے حنفا کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اے توحید کے پرستارو! اے خدائے واحد کے سامنے سجدہ کرنے والو شکر کرو کہ مشرکین مکہ نے تمہیں تمہاری حالت پر چھوڑ رکھا ہے بنی اسرائیل کو بھی کسی مسیحا کا انتظار ہے۔ دوسری قومیں بھی کسی ایسے نجات دہندہ کے انتظار میں ہیں جو ضلالت کے ان اندھیروں میں ہدایت کا آفتاب بن کر نمودار ہوگا۔

''پھر ابراہیم کے ساتھ کیا ہوا محترم حنفا!'' کسی نے پوچھا۔

فرق

اللہ اکبر کی منادی نے دربار ایزدی کی حاضری کا اعلان کیا مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی بڑی مشکل سے مجھے اور میرے دوست کو آخری صف میں جگہ ملی دو دن کے بعد دوبارہ اسی مسجد میں نماز پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی لیکن ہم حیران ہوئے کہ پہلی صف میں گنتی کے افراد تھے۔ میرے دوست نے دریافت کیا شاید باقی افراد جہاد افغانستان میں شرکت کے لیے گئے ہیں کیونکہ اس دن ایک افغان مجاہد نے مسجد میں تقریر کی تھی۔

نہیں' اس کی وجہ یہ نہیں برادر بلکہ آج شوال کی دو تاریخ ہے۔ (یعنی کل عید تھی)

حکمت

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس ایک وفد میں چند بوڑھوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ نوجوان اپنے وفد کی نمائندگی میں کچھ کہنے لگا عمر بن عبدالعزیز نے نوجوان کو ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا اور کہا نوجوان تم خاش ہو جاؤ کسی بزرگ کو بولنے کو موقع دو۔ نوجوان نے جواب دیا امیر المومنین عقل و دانش کا تعلق سن و سال سے نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو آج مسند خلافت پر آپ کی جگہ کوئی بوڑھا شخص بیٹھا ہوتا۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا نوجوان تم صحیح کہتے ہو مجھے اپنے غلطی کا احساس ہے ہاں اب تم اپنے وفد کی نمائندگی میں جو کچھ کہنا چاہتے ہو آزادانہ کہو میں سنوں گا۔

مرسلہ: حافظ عثمان غنی..... کراچی

''ابراہیم اپنی جگہ مطمئن تھے وہ اپنے معبود برحق کی رضا پر راضی انہیں اس بات کا یقین تھا کہ جس چوڑے اور بڑے میدان کو گھیر کر لکڑیاں اکٹھی کی جا رہی تھیں اور اس کو مذہبی فریضہ بنا دیا گیا تھا اور ہر شخص اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا' اے گروہ حنفا کنارا اپنی چال چل رہے تھے اور اس معبود حقیقی نے اپنی چال چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ مواحد اعظم اپنی جگہ پرسکون تھا اسے یقین کامل تھا کہ اس نے اپنے حقیقی معبود کو پہچاننے کی کوشش کی تھی اور پہچان لیا تھا اور اب وہ اللہ کا دوست تھا۔

آگ لگانے کے لیے لکڑیوں کو جس طرح پھیلایا جا سکتا ہے' پھیلا دیا جائے۔'' یہ اس وقت کا حکم تھا۔

''ہمارے معبودوں کے منکر کو معلوم تو ہو کہ انہیں نہ ماننے والے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

''اگر ہم ایک خدا کی وجود کو جو ہماری نگاہوں سے بھی اوجھل ہے' تسلیم کر لیتے ہیں تو ہمارا معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور پھر ہمارا خداوند منحاک' خالق سے مخلوق بن جاتا ہے تو اس کی ہیبت' اسکے جلال' اسے کون تسلیم کرے گا' ایک پروہت نما شخصیت نے۔'' اتنا کہہ کر حنفا ٹھہر گیا۔

''کیا مشکیزے میں کچھ پانی ہے۔'' حنفا نے پوچھا۔

''جی محترم حنفا۔'' ذیبان نے کہا اور پھر کوزے میں پانی بھر کر احترام کے ساتھ پیش کر دیا۔

''اے گروہ حنفا شرک' بت پرستی اور خدا سے مدد کے لیے ذریعہ تلاش کرنا' یہ ہمیشہ جاہ پرست گروہ کا مزاج رہا ہے' جاہ پرست گروہ وہ ہے جس نے ہر ذلالت' گمراہی کو مذہب اور مذہبی رسوم کا نام دے دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذہب کے نام پر خود کو ایک بلند مقام پر بٹھا لیا ہے۔'' حنفا نے کہا اور پھر داستان کا آغاز کر دیا۔

آگ' زمین کے ایک بڑے رقبے پر جلا دی گئی اور اس کے شعلوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔

''آج آذر کے بیٹے کو ایک بھاری منجنیق کے ذریعے اس آگ کے دائرے کے درمیان پھینک دیا جائے گا۔'' ایک عورت نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

''اور آج کے بعد کسی فرد کی یہ ہمت نہیں ہوگی جو ہمارے معبودوں اور ہمارے خداوند نمرود منحاک کے خلاف زبان کھول سکے۔'' اس کے شوہر نے کہا۔

اچانک نمرود منحاک کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ رات کی تاریکی میں مزرونی سے خفیہ طور پر ملنے چلا گیا۔ دیکھا کہ مزرونی کسی زائچے پر جھکا ہوا ہے اور وقتاً فوقتاً اپنے کمرے کے دریچے سے ستاروں کو بھی غور سے دیکھ لیتا ہے' کافی دیر تک وہ ایک تاریک جگہ کھڑا ہو کر اس کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

''خداوند آپ......؟''

''ہاں ہم نمرود منحاک۔''

''خدا انسان کے پاس کسی غرض سے چل کر نہیں آتا۔''

''مزرونی تم جانتے ہو' ہم خدا نہیں لیکن ہماری طاقت' ہماری انا ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس قوت اور دولت اور اقتدار کے حامل ہو کر ہم معمولی انسان کہلائیں اور یہ تو ایک سیاسی غرض ہے کہ ہم اپنے مجسموں کو پجوا رہے ہیں اور خود کو خداوند کہلوا رہے ہیں' کیا ایسا نہیں ہے کہ جن کے پاس دولت ہے' لوگ ان کے غلام ہیں ملازم ہیں۔ اپنی ضرورتیں لے کر ان کے پاس آتے ہیں خود کو آقا کہلواتے ہیں اور پھر ہمارے پاس کوئی حساب ہے ہمارے اقتدار اور دولت کا پھر اگر میں لوگوں سے معبود اپنی ذات کو کہلواتا ہوں' اپنے مجسموں کی پرستش کرواتا ہوں تو مزرونی غلط کیا ہے۔''

''اس وقت خداوند یہاں آنے کی غرض۔''

''کیا کہہ رہے ہیں ستارے' کن مدارج میں آ گئے ہیں ستارے' کیا علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔''

''ابھی خداوندان ستاروں کا مشاہدہ کر کے میں نے جو زائچہ بنایا ہے وہ بڑی حیرت انگیز علامات کو ظاہر کر رہا ہے۔''

''وسیع و عریض زمین کے رقبے پر آگ جلانے کے لیے آذر کے بیٹے کو اس میں ڈالنے کے لیے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔''

''میں جن علامات کو دیکھ رہا ہوں' اے خداوند نمرود منحاک وہ مجھے میرے علم سے باہر نظر آ رہی ہیں' کچھ ایسے آثار جو دھندلائے ہوئے ہیں۔''

''مزردنی معلوم کرو ان آثار کے معنی' لوگ جوق در جوق چہار جانب سے یہاں آ کر جمع ہو رہے ہیں۔''

''ایک شخص کے جلانے کے لیے اتنا وسیع زمین کا رقبہ اور اس کے چاروں طرف کھنچا ہوا احاطہ۔''

''ہاں تاکہ میری قلمرو کے ہر فرد کو معلوم ہو جائے کہ ہماری نافرمانی کرنے والے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

''اے خداوند' جب آپ ہی معبود کل ہیں تو ان بتوں کا جواز۔''

''یہ ہماری ہی ہستی کے مختلف پہلو ہیں اور ان پہلوؤں کو پتھر کے جسم دے دیے گئے ہیں۔''

''کوئی دن مقرر کیا ہے آذر کے بیٹے کو اس آگ میں پھینکنے کا۔'' مزردنی نے پوچھا۔

''منجنیق بھی تیار کر لی گئی ہے پانچویں دن یہ تقریب منائی جائے گی' آتش گیر مادے کے پیپے احاطے کے چاروں طرف رکھ دیے گئے ہیں' افتتاح اس تقریب کا ہم کریں گے اور مزردنی اس تقریب سے پہلے ہمیں اطمینان بخش جواب چاہیے۔'' پھر نمرود منحاک چلا گیا۔

☆......☆......☆

آج کی رات پھر ختم ہو رہی ہے صبح کا ستارہ نمودار ہونے والا ہے اب اس داستان کو اس وقت سنایا جائے گا جب آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں شام کے وقت مثل خنجر ہلال نمودار ہوگا' حنفا نے کہا۔

''محترم حنفا ہم کب تک اس عظیم شخصیت کا انتظار کرتے رہیں جس کی مبارک آمد پر ہماری بے بسی کے دن ختم ہوں گے۔'' ذبیان نے کہا۔

''وہ دیکھو صبح کا روشن ستارہ نمودار ہو چکا ہے اور وادیٔ بوقبیس میں سہانی سحر کے آثار پیدا ہو گئے ہیں' تمہیں انتظار ہے ورقہ بن نوفل کو بھی انتظار ہے' قسو بن ساعدۃ العبادی کو بھی انتظار ہے' عمرو بن زید وہ بھی سرگرداں ہے' نوید مسیحا غلط نہیں ہو سکتی۔ فارقلیط' اس تعریف کردہ شخصیت کو آنا ہے۔'' حنفا نے کہا اور پھر یہ محفل برخاست ہو گئی۔

پھر ہلال نمودر ہوا اور پھر بروشا کے نخلستان میں حنفا جمع ہونے لگے اور حنفا اپنی مقررہ جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''یہ آگ تھی' یہ آتش نمرود' چہار سمت شعلوں نے رقص کرنا شروع کر دیا تھا' ایک ہجوم بے اندازہ آج آذر کے فرزند کو اس آتشِ نمرود میں ڈال دیا جائے گا' نمرود ایک بڑے مقام پر براجمان تھا' ہامان اس کی دائیں جانب بیٹھا ہوا تھا اور مزردنی بائیں سمت' اس کے چہرے پر اطمینان تھا تقریباً وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکا تھا کہ جس بات کے صادر ہونے کی توقع کی جا رہی تھی جس کے واقع ہونے کا انتظار تھا اور جس امر کے ہونے کا نمرود منحاک کا یقین کامل تھا' وہ کچھ ایسا نہ ہو سکے گا۔

''بہت مطمئن ہو مزردنی۔'' نمرود منحاک نے اس کے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں مطمئن ہوں خداوند آپ کی شان و شوکت دیکھ کر جاہ و جلال دیکھ کر لوگوں کا ایسا ہجوم دیکھ کر جس کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اور منجنیق پر کھڑے ہوئے اس آذر کے بیٹے کو

دیکھ رہے ہو۔''

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔''

''بلا کا سکون ہے اس کے چہرے پر وہ تعریفی نگاہوں سے ان رقص کرتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا ہے۔''

''ہاں رقص کرتے ہوئے شعلوں کو۔'' مزرونی نے کہا اور پھر پہلا ناقوس بجا اور ہجوم پر ایک سکتہ طاری ہوگیا' ایک گہرا سکوت جیسے کوئی موجود ہی نہیں ہے۔''

''یہ ناقوس بجنے کی پہلی آواز ہے۔'' کسی نے اپنے برابر کھڑے ہوئے شخص سے سرگوشی کی' بالا خانے پر کھڑی ہوئی دختر نمرود اس کی آنکھوں میں اشک ابھر آئے تھے' بہرحال وہ ایک عورت تھی اور دیکھ رہی تھی کہ ایک فرد واحد اور اس کے خلاف پوری نمرود کی طاقت' ہمدردی کا جذبہ اس کے دل میں عود کر آیا تھا آذر نے بھی ایک نظر اپنے بیٹے پر ڈالی۔

''کاش ابراہیم ہمارے معبودوں کے خلاف یہ رویہ اختیار نہ کرتا تو آج اس کا یہ انجام نہ ہوتا لیکن یہ ستون عزم جو بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کی شاندار تاریخ کی وجہ تسمیہ بننے والا تھا جو امام انبیاء کے درجے پر فائز ہونے والا تھا وہ ان رقص کرتے ہوئے شعلوں کو کیا خاطر میں لاتا' پھر دوسرا ناقوس پھونکا گیا اور ہر طرف ایک ہیبت طاری ہوگئی' آسمان پر طیور منڈلا رہے تھے' بادلوں کے چھوٹے سفید ٹکڑے جن کی جانب آتش نمرود کا دھواں بڑھ رہا تھا کچھ دھندلا گئے تھے' شعلوں نے ابتداء میں اس طرح رقص کرنا شروع کیا تھا جیسے وہ حسین رقاصائیں تھیں جنہوں نے شعلہ زدہ لباس پہنے ہوئے تھے اور جو درمیان میں الاؤ روشن تھا۔ وہ ایک ایسی رقاصہ کی مانند تھی جس کے گرد تمام رقاصائیں رقص کررہی تھیں۔ تیسرا ناقوس پھونکا گیا پھر نمرود نے کھڑے ہوکر ابراہیم کو پھینکنے کا اشارہ کیا' منجنیق کا ایک زبردست کھٹکا ہوا اور آپ کا پیکر فضا میں لہراتا ہوا درمیانی الاؤ میں جا گرا اور پھر نمرود کی موافقت میں ایک نعرہ تحسین بلند ہوا جس کی صدا آسمان تک بلند ہوئی۔'' اتنا کہہ کر حنفا ذرا کی ذرا دم لینے کے لیے ٹھہر گیا' پانی اور ابن زبیر نے بڑھ کر پیالے میں پانی بھرا اور حنفا کو احترام کے ساتھ پیش کردیا۔

کھجور' پیلو اور زرقن کی لکڑیاں الاؤ میں چیخ رہی تھیں اور خنک ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے ہر طرف گہرا سکوت تھا۔

تاریخ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ عجیب مناظر سے گزرتی ہے پھر ایک ایسا مقام آجاتا ہے جب آگ گل گلزار ہوجاتی ہے جب بحر احمر سمٹ کر بنی اسرائیل کو راستہ دے دیتا ہے' جب نوح کی کشتی تیرتی ہوئی بل کھاتی ہوئی کوہ جودت پر قرار پاجاتی ہے اور عالم اور ایک عالم زیر آب آجاتا ہے۔ جب اچانک بھونچال آجاتا ہے اور شعیب کی قوم اوندھی بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے جب طوفان خیز آندھیاں اٹھتی ہیں اور قوم عاد کے سر ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائے جاتے ہیں کہ ان کی ناکوں سے ان کے بھیجے بہہ نکلتے ہیں اور پھر جابر قوتیں حیران وششدر رہ جاتی ہیں۔ اے گروہ حنفا اے سنت ابراہیمی کے پیروکارو' اے خدائے لم یزل پر ایمان رکھنے والے مختصر جمعیت کے حامل انسانوں میں آسمان پر بڑا درخشاں ستارہ دیکھ رہا ہوں' کوئی آنے والا ہے ایک ایسا مبشر جو ساری دنیا کو خوشخبری سنائے گا۔'' حیرتوں کے سلسلے دراز ہوتے چلے گئے' نمرود متحاک کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور نمرود کی دختر محل کے بالا خانے پر کھڑی مسکرا رہی تھی قوم کی آنکھیں نمرود متحاک پر تھیں۔

''اے خداوند نمرود یہ سب کیا ہے؟'' اور نمرود ہامان کی جانب مخاطب ہوا۔

''ہامان......''

''خداوند ابراہیم' آگ کی پرستش کرتا تھا اور آگ ایک فرشتہ ہے جو جس کو چاہتی ہے جلاتی اور جس کو چاہتی نہیں جلاتی اسی لمحہ آگ کی ایک چنگاری ہامان کی آنکھ میں اڑ کر پڑ گئی اور وہ تڑپ کر لوٹنے لگا (قصص الانبیاء)

یہ بھی اس خدائے برحق کی مصلحت ومشیت ہے کہ جو خدا کی وحدانیت سے انکار کرتا ہے اے گروہ حنفا خدا اتنا ہی زیادہ اس کو پُرقوت اور طاقت ور بنا دیتا ہے۔ یہ صدیوں کے تواتر میں ہوتا چلا آرہا ہے لیکن جب اس کی پکڑ آتی ہے تو یہ بڑی شدید ہوتی ہے (کلام الٰہی)

نمرود کی رعایا میں ایک انتشار پیدا ہو گیا جس نے چاہا وہ ابراہیم کے رب پر ایمان لے آیا اور جن کے ذہنوں اور دلوں میں انجام اتر جاتا ہے پھر وہ انجام عواقب کی پروا نہیں کرتے یہاں تک کہ نمرود کی دختر بھی ایمان لے آئی۔ ابراہیم نے وہاں سے ہجرت کر لی لیکن وحدانیت کا ایک ایسا ستون قائم کر گئے جو آج بھی مینارۂ نور کی طرح درخشاں ہے۔

اے گروہ حنفا! تم اس مینارۂ نور کی کرنیں ہو' بہت تھوڑے سے ہو جیسے آٹے میں نمک۔ عرب کی اس زمین پر صابی بھی ہیں' آتش پرست بھی ہیں' یثرب میں یہود بھی ہیں انہیں وحدانیت کی تعلیم دی گئی تھی۔ یثرب میں آباد آل ہارون بھٹک گئی اور خدا کو چھوڑ کر ذلالتوں اور گمراہیوں میں ڈوب گئی۔ ان کے فریسیوں کا یہ رویہ ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں اور خود راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور ان کے فریسیوں کو افسوس اس بات کا ہے کہ آخری ہدایت دینے والا بنی اسرائیل میں سے نہیں ہوگا اور انہیں انتظار ہے کہ ان کا نجات دہندہ بنی اسرائیل سے آئے گا' اب ہم حنفا کو یہ انتظار ہے دیکھیے کون آتا ہے' کیا بنی اسرائیل سے یا بنی اسمٰعیل سے اور پھر ابراہیم ہمارے باپ نے بابل' نمرود کی سرزمین سے ہجرت کی۔

☆......☆......☆

وہ حسن جہاز سوز تھی' وہ حسن کا ایک نادر شاہکار تھی' وہ حرکت میں آجاتی تو بہاریں اجاگر ہو جاتیں اور کیوں؟ وہ ایک پر وقار شہزادی دختر باحیا اور بارہا ایسا ہوا کنیز اور لونڈیاں جو اس کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور شہزادی ان میں سے کسی ایک کو مخاطب کرتی اور وہ جواب دینے سے عاجز رہتی۔

''ان الفاظ کو تو حنفا نے پہلے بھی ادا کیا ہے۔'' ایک نے دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔

''خاموش رہو یہ محترم حنفا کا انداز بیان ہے' اب ہمارے باپ ابراہیم کی زندگی کا ایک دوسرا باب شروع ہونے والا ہے۔''

''آخر کیوں ایسا ہوتا تھا میں تمہیں بتاتا ہوں حسن کامل کی موجودگی میں ذہن ایسا گم سم ہو جاتا ہے کہ ہوش وخرد بیگانے ہو جاتے ہیں۔ وحدانیت کا علمبردار' چھوڑ دیا وقتی طور پر اس نے نمرود منحاک کی سرزمین کو اور اس لیے کہ خدا کی وحدانیت کا ایک گہرا تاثر چھوڑ جائے' جابر اور قاہر قوتوں کے دور میں جب حقیقتیں سامنے آتی ہیں تو بے شمار لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جاتے ہیں لیکن وہ خاموش رہتے ہیں اور وقت کا انتظار کرتے ہیں۔ وقت بدلے گا اور حالات بھی بدل جائیں گے۔ نمرود منحاک کی سلطنت میں بے شمار لوگوں نے اس کھلے معجزے کو دیکھا تھا' نمرود نے تو اس لیے ان زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جہنم کی مانند اس آگ کو دیکھنے کے لیے کہ وہ ابراہیم کے دردناک انجام کو آنکھوں سے دیکھ لیں لیکن خدا کہتا ہے ''تم اپنی چال چلو اور میں اپنی چال چلتا ہوں'' (کلام پاک کا حوالہ)

وہاں سے رخصت ہو کر ہمارے باپ حران کی سرزمین کی جانب چلے گئے وہاں دیکھا کہ لوگ عمدہ سے عمدہ لباس پہنے ہوئے ایک جانب جارہے تھے

اور ان کے پیچھے لوگوں کا ایک انبوہ کثیر تھا۔
''لوگ عمدہ لباس پہنے ہوئے مخصوص لوگ اور ان کے پیچھے لوگوں کا ہجوم...... ''یہ کہاں جارہے ہیں؟'' کسی نے اس سوال کرنے والے شخص کو دیکھا اور سوچا یہ کوئی اجنبی ہے یہ سوچ کر وہ شخص اس اجنبی کی طرف بڑھا اور کہا۔
''شاید تم اجنبی ہو۔''
''ہاں۔'' اسے جواب دیا۔
''سنو یہاں کے بادشاہ کی دختر جس کا حسن بے مثال ہے جس کا وقار شہاھوں کے وقار اور مرتبے کو سہا دیتا ہے وہ کئی روز سے اپنی زندگی کے ساتھی کو منتخب کرنے کے لیے آرہی ہے اور یہ جو زرق برق لباس پہنے ہوئے لوگ ہیں ان میں امراء بھی ہیں' دوسرے ملکوں کے شہزادے اور نوجوان حکمران بھی ہیں وہ سب اس حسین ترین شہزادی کے لیے امیدوار ہیں اور ہم بہت سے لوگ یہ دیکھنے جارہے ہیں کہ دیکھیں کہ شہزادی کس کا انتخاب کرتی ہے' کئی دن تو گزر گئے اب تک تو شہزادی نے اپنی زندگی کے ساتھی کے لیے کسی کو پسند نہیں کیا۔''
''کیا یہ اختیار بادشاہ نے اسے دیا ہے؟''
''ہاں' بادشاہ نے اسے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ خود اپنے شریک زندگی کا انتخاب کرے۔'' مقامی شخص نے جواب دیا ابراہیم بھی ان لوگوں کی ساتھ ہو لیے اور ایک کونے میں جا بیٹھے جب دوپہر ہوئی تو شہزادی اپنے ساتھ ملازما میں لے کر' سونے کا تاج سر پر سجا کر' چہرے پر نقاب ڈال کر اور ایک تہرنج زریں جواہرات سے جڑا ہوا ہاتھ میں لے کر ایک سرے سے سب کو دیکھنے لگی۔ حضرت ابراہیم کے قریب آکر ٹھہر گئی اور اس اجنبی شخص کو دیر تک دیکھتی رہی۔
درخشاں پیشانی' بردبار چہرہ' زود رنج آنکھیں' خدا کی خوف میں ڈوبی ہوئی' شہزادی نے ایک عجیب وقار ان کی شخصیت میں محسوس کیا۔ یہ شخص بھی کوئی معمولی شخص تو نہیں تھا جس نے اس وقت کی سب سے بڑی طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی اور خدا نے نمرود منحاک کے مقابلے میں انہیں سرفراز فرمایا تھا۔ شہزادی ان کو دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار ہو کر تہرنج ان کے دامن میں ڈال دیا۔
ایک نعرہ ہائے تحسین بلند ہوا نہ کوئی امیر' نہ کوئی شہزادہ اور نہ ہی کوئی نوجوان حکمران...... ایک اجنبی شخص لیکن اس شخص کو پہچاننے والی آنکھیں پہچان رہی تھیں کہ شہزادی کا انتخاب غلط نہ تھا۔
''شہزادی نے اپنے شریک زندگی کا انتخاب کرلیا۔'' جب یہ خبر بادشاہ وقت اور اس کے وزراء نے سنی تو فوراً اس مقام پر پہنچے جہاں وہ مینارۂ نور کھڑا ہوا تھا۔
''عام اور ایک اجنبی شخص کو شہزادی سارہ نے اپنے دل میں بٹھالیا۔''
''عورتوں میں' محل کی لونڈیوں میں' سرگوشیاں ہونے لگیں لیکن جو کنیزیں شہزادی کے ساتھ تھیں وہ دم بخود تھیں اور حیران تھیں کہ کس کونے سے شہزادی نے یہ جوہر بیش بہا ڈھونڈ نکالا اور چشم فلک نے ایک شاندار تاریخ مرتب کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا' اتنا کہہ کر کاہن حنفا نے گہرا سانس لیا' فضا خاموش تھی' ساکت تھی۔ ستاروں کے قافلے محو سفر تھے' ایک نورانی لکیر کی مانند کہکشاں جانے کہاں جا کر ڈوب گئی تھی۔
''کیا آج قہوے کا دور نہیں چلے گا؟''
''محترم حنفا! ہم آپ کی داستان میں کھو گئے تھے' ابھی تیار کیے دیتے ہیں۔''
''قہوہ تیار ہے۔'' ابو جندل کی بیٹی ایک پرات میں پیالیاں اور قہوے کی کیتلی لے آئی۔ کچھ دیر گہری خاموشی رہی' اشجار سرنگوں تھے اور کہیں دور سے عمر کی آواز سنائی دی۔

وجاہا فلما استوت شدھا
سواءارسی علیھا الجبالا

''کیا یہ دیوانہ اسی طرح تمام رات پھرتا رہتا ہے؟'' ذیبان نے سوال کیا۔

''ہاں' اسی طرح ڈوبا ہوا ہے خدائے واحد کی ذات میں اور اسے کسی بات کا ہوش نہیں۔'' کسی دوسرے نے جواب دیا' حنفا ایک بار پھر حنفا کے مختصر گروہ پر نظر ڈالی اور کہنا شروع کیا۔ بادشاہ وقت نے ایک نظر اس نوجوان پر ڈالی اور پھر اپنی بیٹی پر اور کہا۔

''تمہارا انتخاب اچھا ہے' لیکن نوجوان صاحب دولت معلوم نہیں ہوتا بہر حال جو کچھ بھی ہے درست ہے اور پھر ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیا۔''

''صبح کا ستارہ نمودار ہورہا ہے اور اب محفل کل کے لیے موقوف۔''

☆......☆......☆

فوجی دستے گزر رہے تھے اور ایک بلند جگہ افواج کا کماندار گزرتے ہوئے دستوں کی سلامی لے رہا تھا اور اس کے برابر بادشاہ کا معتمد خاص اسد وان' کماندار سراجونی سے سرگوشی کے انداز میں بات کررہا تھا' تیر کمان بردار دستہ سلامی دیتا ہوا گزر گیا اور پھر دوسرے دستے کے ڈھول کی آوازیں آنے لگیں۔

''تجھ سے اتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی جس کے ازالے کے لیے جواب دینا تیرے لیے فرعون رقیون کو مشکل ہوجائے گا آخر یہ غلطی کیسے سرزد ہوئی' کیا تجھے معلوم نہیں سزا دینے میں فرعون رقیون کتنا جابر ہے۔'' دوسرے دستے کے ڈھول کی آواز اب قریب سے آنے لگی' یہ شمشیر بردار دستہ تھا ڈھول کی آواز کے ساتھ کماندار سراجونی کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

''اور کیا تو اس بات سے واقف نہیں کہ جو حکم تو نے دیا وہ سرحدوں کا معاملہ نہیں بلکہ داخلی معاملہ ہے۔'' اسد وان اس کے دل اور دماغ پر نشتر چبھو رہا تھا۔ سراجونی نے خوفزدہ نگاہوں سے معتمد خاص کو دیکھا' ڈھم ڈھم' ڈھم ہوشیار' حد ادب دستے کے کماندار کی آواز گونجی اور شمشیر بردار دستہ سلامی دیتا ہوا گزرنے لگا۔

''کیا تیرے ذہن میں کوئی ایسا جواب ہے جو فرعون رقیون کو مطمئن کرسکے۔'' کماندار سراجونی نے بے بس نگاہوں سے معتمد خاص کو دیکھا۔

''تو نہیں جانتا فرعون کی قربت جہاں عنایات اور انعامات کا سبب ہے' وہاں موت کی قربت بھی ہے۔'' کماندار سراجونی کے سامنے زمین گردش میں آگئی۔

سفارش

جائز و ناجائز حلال و حرام اور گناہ کا امتیاز اٹھ جانے کی وجہ سے سفارش کرانا اور کرنا ایک فیشن' رسم اور رواج کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ حالانکہ سفارش صرف حق کے لیے جائز ہے ورنہ ناجائز سفارش حرام اور گناہ ہے۔ جن امور حق کے لیے سفارش جائز ہے ان کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ سفارش اس طریق پر کرے کہ مخاطب آزادی میں رائی برابر خلل نہ پڑے' اسے اس کے لیے مجبور نہ کرے۔ اس پر زور نہ دے۔ اس کے قرابت داروں یا دوستوں کو بار بار اس کے پاس نہ بھیجے اور نہ سفارش کرنے کے لیے لوگوں کو رشوت پہنچائے' جیسے بڑے آدمیوں کے عزیز و اقارب ان کے معتقد یا زیر اثر لوگوں سے کام نکلوانے کے لیے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ تحائف دیتے ہیں جو رشوت ہی کی ایک قسم ہے' اس طرح دوسروں کو بدیانتی اور حق تلفی کے لیے مجبور کرنا ہوتا ہے۔

مرسلہ: عمران وقار...... عارف والہ

''موت اور بدترین موت......'' وہ اس بات سے واقف تھا وہ ایک بار پھر رحم طلب نگاہوں سے معتمد خاص کو دیکھنے لگا اب نیزہ بردار دستے کا ڈھول اپنے انداز میں بجنے لگا' دھم دھما دھم' دھم دھم......

''جانتا ہے ہوا کیا ہے' فرعون رقیون نے جتنی بار اس اجنبی کے ناموس پر ہاتھ ڈالنا چاہا اس کے ہاتھ شل ہو کر رہ گئے۔ ایک بار' دو بار' تین بار......''

''پھر؟'' سراجونی نے دھیمی بے ساختہ آواز میں پوچھا۔ ''ہوشیار' حد ادب۔'' نیزہ بردار دستے کی کماندار کی آواز بلند ہوئی اور یہ دستہ بھی گرد اڑاتا ہوا گزر گیا۔

''اس اجنبی اور اس کی حسین ترین شریک حیات کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ ایک آراستہ محل کے کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔'' معتمد نے کہا اور سراجونی کے چہرے پر کسی حد تک اطمینان اور سکون کے آثار ابھر آئے۔

''اب تیرے لیے نجات کی ایک صورت ہے؟''

''کیا......؟'' مسلح افواج کی کماندار نے پوچھا۔

''وہ یہ کہ اجنبی شخص اگر تجھے معاف کر دیتا ہے تو سمجھ لینا کہ تجھے دوبارہ زندگی ملی ہے۔'' دھم...... دھم...... دھم' یہ آخری باری ڈھول کی آواز تھی اور اب شترسواروں کا دستہ گزرنے والا تھا۔

''لیکن میرا جرم؟''

''جرم...... ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تُو نے داخلی معاملے میں دخل دیا اور دوسرا جرم یہ کہ تُو نے یہ اطلاع فراہم کی کہ جو حسین خاتون اس اجنبی شخص کے ساتھ ہے وہ اس کی بہن ہے۔''

''مجھ سے یہی کہا گیا تھا۔'' سراجونی نے کہا۔

''تو اس کی اطلاع کی معنوی حیثیت کو نہیں سمجھا' آخر مسلح افواج کا سربراہ ہے۔''

''معنوی حیثیت'' سراجونی سوچنے لگا اور جب یہ اجنبی رخصت ہونے لگا تو فرعون رقیون نے ایک شاندار تقریب کے ساتھ اپنی دختر ہاجرہ (ا) کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ حضرت ابراہیم تمدن اور تہذیب یافتہ دنیا کے ممالک میں توحید کی دعوت لیے پھرتے رہے لیکن عقل سے عاری مادی تہذیب کے پرستاروں کے کانوں پر جوں نہ رینگی اور اب مواحد اعظم کسی ایسے خطے کی تلاش میں تھے جہاں وحدانیت کی شمع روشن کی جاسکتی تھی' نمرود اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا وہ جو اپنی ذات کو سجدہ کراتا تھا وہ جس نے شہر شہر میں اپنے بت تراش وا کر ان کو پوجنے کا حکم دیا تھا اس کے دربار میں آنے والا اب اسے سجدہ نہیں کرتا تھا بلکہ ہر آنے والے کو حکم یہ تھا کہ اس کے سر پر جوتا مارے' اس لیے کہ ایک مچھر جو اس کے دماغ میں اتر گیا تھا اس کے بھیجے کو کریدتا رہتا تھا' یہ تھا جابروں کے لیے خدائے لم یزل کا انتقام' یہ تھی اس کی قدرت کاملہ کہ اس دور کی دنیا کے سب سے طاقت ور جابر کے سر پر مچھر کے ذریعے جوتے پڑوا رہا تھا۔

''اللہ ہو اکبر۔'' بے اختیار بروشا کے نخلستان میں بیٹھے ہوئے حنفا کی زبانوں سے آواز بلند ہوئی اور حنفا داستان سناتے سناتے ٹھہر گیا۔

''اب انہے دنیا کے ایسے خطے' ایسی سرزمین کی تلاش تھی جیسے متمدن دنیا جس نے عالمی سیلاب کے بعد سر ابھارا تھا پھر خدا کی وحدانیت کی منکر ہوتی جارہی تھی اور خدا اپنی حجت تمام کر رہا تھا۔ اب تک تو حضرت سارہ اور حضرتِ ہاجرہ ایک ساتھ وقت گزارتی رہی تھیں' سارہ کی امیدیں وہ امیدیں' وہ خواہش جو اولاد سے وابستہ ہوتی ہے تشنہ کام کر رہی تھی۔ کون سی عورت ہے جو اپنی گود کو ہرا بھرا دیکھنا نہیں چاہتی' عورت مرد دونوں ہی اولاد کے خواہاں ہوتے ہیں اور یہ خواہش اور یہ آرزو جو اولادِ آدم کے بڑھ جانے کا سبب بنتی ہے پھر شہر اور ملک آباد ہوتے ہیں' بہاریں آتی ہیں محلات تعمیر ہوتے ہیں' تہذیبیں

جگمگاتی ہیں۔ مادی بنیادوں پر قائم تہذیبیں' پھر اولاد آدم کی خودسری بڑھ جاتی ہے اور پھر خزاؤں کا دور شروع ہوجاتا ہے' عاد وثمود کے محلات کھنڈرات میں تبدیل ہوکرنشان عبرت بن جاتے ہیں۔ یہ ہے اس دنیا کی کہانی' اب تک حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ وقت گزارتی رہی تھیں لیکن ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمعیل کی پیدائش نے صورت احوال میں تبدیلی لے آئی' حرماں نصیبی بہرحال ایک خلش کا سبب بن جاتی ہے۔

حضرت سارہ کے دل میں ایک خلش پیدا ہوگئی' میری گود خالی ہے اور ہاجرہ کی گود ہری بھری ہوگئی' عورت کے لیے یہ محروی بہرحال بہت بڑا غم ہوتا ہے' آخرانہوں نے ایک دن کہہ ہی دیا۔

''میرے لیے ہاجرہ اوراس کی موجودگی ناقابل برداشت۔'' یہ ہی وہ الفاظ تھے یہ ہی وہ اظہارنفرت تھا جس نے تاریخ انسانی پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ حضرت ابراہیم نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور سمجھ گئے کہ اللہ کی مشیت کس بات کا مطالبہ کررہی ہے' تھک چکے تھے متمدن دنیا میں تبلیغ کرتے کرتے لیکن مادی تہذیب کی حامل قوموں کا ہمیشہ سے یہ مزاج رہا ہے کہ ان کے بڑے اپنی عقل کو عقل کل سمجھ بیٹھتے ہیں اور قوم ان ہی کے پیچھے چلنے لگتی ہے' ان کی رہنمائی ایسی ہے جیسے کوا کسی گروہ کی رہنمائی کررہا ہو اور پھرانجام ویرانیوں اور پھرانجام تاریکیوں اور پھرانجام دھندلکوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا اگر گروہ حنفا جزیرہ نماعرب اور شام کے درمیان آج بھی ان محلات کے کھنڈرات پھیلے ہوئے ہیں جنہیں پہاڑوں کوتراش کر بنایا گیا تھا اور بزعم خود وہ قوم کہتی تھی کون ہے ہم زیادہ طاقت ور (من اشد منا)۔

''اللہ ہوا کبر'' حنفا نے نعرہ بلند کیا اور صدائے باز گشت ابھری' اللہ ہوا کبر۔

''اے محترم حنفا آپ کا انداز بیان اپنے عروج کو پہنچتا جارہا ہے۔''

''اے لوگو میرا انداز بیان نہیں بلکہ یہ داستان اب ایسے موڑ سے گزررہی ہے جوایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنے جارہے ہیں جو کفروالحاد کے سمندر کے درمیان ایک چٹان کی مانند ہوگی۔

''وقت آگیا تھا مراجعت کا' ہاجرہ اپنے بچے کو لو اور میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟ کس طرف......؟''

''جہاں ہمارا خدا ہمیں لے جائے اور ہمیں

(۱) افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے اکثر مؤرخین بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں کہ حضرت ہاجرہ رقیون کی لونڈی تھیں' یہودی ذہن اپنی بالادستی ثابت کرنے کے لیے توریت میں توردوبدل کرتا ہی رہا ہے مثلاً حضرت اسماعیل کی جگہ قربانی کے لیے حضرت اسحٰق کا نام دے دیا۔ اس لعنت زدہ قوم نے حضرت ابراہیم پر بھی تہام لگائے' سورڈ آف گلوری کا پورا سلسلہ ان کی ذلالتوں سے بھرا ہوا ہے' تاریخ اسلام کے مصنف معین الدین ندوی نے بھی حضرت ہاجرہ کورقیون کی لونڈی قرار دیا۔ قصص الانبیاء کے مصنف نے بھی اس بات کو تسلیم کرلیا اور یہودی پروٹوکولزم کے مترجم نے اپنے ذاتی بیان میں بھی یہی کچھ لکھا' بہرحال یہ سب کچھ غلط ہے حضرت ہاجرہ' حضرت ابراہیم کی لونڈی نہیں شریک حیات تھیں اور ان کا مقام کسی بھی اعتبار سے حضرت سارہ سے کم نہیں تھا بلکہ دونوں خواتین مرتبے کے لحاظ سے برابر تھیں یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں کہ کسی موقع پر یہ تفصیل دے دی جائے گی بہرحال کسوٹی یہ ہے کہ جوقوم حضرت عیسٰی پر الزامات عائد کرتی رہی کہ حضرت جبرائیل سے نالاں ہے جو حضرت موسٰی سے یہ کہتی ہے ''جاؤ موسٰی تم لڑو اور تمہارے خدا لڑے' جو حضرت یعقوب اور اللہ کی کشتی کرا دیتی ہے۔ وہ کیا نہیں کرسکتی' اپنی برتری کے زعم میں بار بار تباہ ہوئی انیسویں صدی کے وسط میں ہٹلر نے جو حال اس کا کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اب یہ خدا کی معتوب قوم ہے۔

یقین ہے کہ وہ جس نے میرے لیے دھکتی ہوئی آگ کو گل وگلزار بنادیا تھاوہ میری زوجہ اور میرے اسمٰعیل کو بے آسرا نہیں رہنے دے گا۔'' اور پھر سفر کا آغاز ہوگیا' یہ کیسا عجیب کارواں تھا جسکی قلت میں کثرت کا راز پنہاں تھا جس کے پس منظر میں قومیں سفر کررہی تھیں جس سفر میں پڑنے والا ہر قدم وحدت کے مینار کی تعمیر کررہا تھا اور سلسلہ ہائے بوقبیس کے گہرے سکوت سے آوازیں بلند ہونے والی تھیں' اللھمہ لبیک لا شریک لک لبیک......
ابراہیمؑ کی زندگی کے یہی مراحل' وہ درخشاں نقوش پا ہیں جو وقت کی ریگ پر تا قیامت جگمگاتے رہیں گے اور وحدانیت کے حامل قافلے ان نقوش پا کا سہارا لے کر سفر کرتے رہیں گے۔

☆......☆......☆

دور دور تک پھیلا ہوا صحرا چٹیل میدان اور بوقبیس کا سلسلہ ہائے کوہ نہ آدمی اور نہ آدم زاد' ہاجرہؑ نے عاجز نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھا یہ کون سا مقام تھا' یہ کون سی سرزمین تھی جہاں مدنظر ایک خاموشی اور سکوت چھایا ہوا تھا' موحد اعظم نے غمزدہ نگاہوں سے اپنی شریک حیات اور معصوم بچے کو دیکھا۔
اس کے ہاتھ سب کے خلاف ہوں گے اور سب کے ہاتھ اسکے خلاف (مراد یہ کہ جیسا کہ ہمارے پیغمبر اقدس نے فرمایا کل کفر ملت واحدہ یعنی تمام کفر ایک قوم ہیں اور مسلمان ایک علیحدہ قوم)
''میں جارہا ہوں اپنے بچے اور تمہیں اس ویران جگہ چھوڑ کر اپنے رب! کے حوالے کر کے۔'' وہ چلا گیا اور اڑتی ہوئی گرد کی دھند میں وہ دور تک اپنے عظیم شوہر کو دیکھتی رہی۔
امتحان کا یہ مرحلہ کیا حوصلہ شکن نہیں تھا لیکن ابراہیمؑ کا کلیجہ بھی کیا کلیجہ تھا کتنا پختہ یقین اسے رب العالمین پر تھا' کیا حوصلہ تھا ہمارے باپ کا' لخت جگر ور فرمانبردار زوجہ اور اس بے بسی کے عالم میں اور توشہ ایک پانی سے بھرا ہوا چھوٹا سا مشکیزہ اور کچھ کھجوریں لیکن چشم فلک مسکرا رہی تھی' یہ تو ہمارا خلیل ہے کیا ہم اس کے خانوادے کو اس طرح بے بسی کے عالم میں رہنے دیں گے؟ ایک اور تاریخ کے ایک عظیم باب کا آغاز ہو چکا تھا ہر بڑی داستان کی ابتداء بڑی سادگی سے ہوتی ہے۔ بڑے انوکھے پن سے ہوتی ہے' بڑے عجیب حالات میں ہوتی ہے۔
توشہ ختم ہوگیا' مشکیزے میں چند گھونٹ پانی رہ گیا اور معصوم اسمٰعیلؑ اپنی ماں کو چاہت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا حالات سے بے خبر' گرد ونواح سے بے خبر' ہر شے سے بے خبر لیکن ہاجرہ کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا پانی ختم ہورہا تھا کھجوریں چند ایک رہ گئیں تھیں اور بظاہر ان کو حاصل کرنے کا کوئی آسرا نظر نہ آتا تھا اور پھر سب کچھ ختم ہوگیا۔ معصوم اسمٰعیلؑ بلک بلک کر رونے لگا' ہاجرہ صفا اور مروا کے درمیان حیران و سرگرداں دوڑتی رہیں۔
''شاید کوئی جاتا ہوا قافلہ نظر آجائے شاید پانی کا کوئی نشان نظر آجائے۔'' یہ بے بسی' یہ مجبوری اور ماں تا کی ہوک' کبھی وہ آسمان کی لامتناہی وسعتوں کو بے بسی کے عالم میں دیکھتی پھر گرد ونواح پر نظر ڈالتی لیکن وہاں تھا کیا؟ بوقبیس کا بے آب وگیاہ سلسلہ اور اس کے دامن میں پھیلا ہوا لق ودق صحرا' اب معصوم اسمٰعیل نے پیاس کی شدت سے بے حال ہو کر ایڑیاں زمین میں رگڑنا شروع کردیں' بے بسی اپنی انتہا پر پہنچ چکی تھی اور جب ساتویں چکر پر واپس لوٹیں تو قدرت کا ملہ حرکت میں آچکی تھی اسمٰعیلؑ نے جہاں ایڑیاں رگڑی تھیں وہاں ایک چشمہ پھوٹ نکلا تھا حیرتوں کے سلسلے دراز ہوتے چلے گئے بے تابی اور مسرت اپنی انتہاہ کو پہنچ گئی۔
''زم زم......'' (رک جا' رک جا)۔'' ہاجرہ نے بے تابی کے عالم میں کہا۔
''اللہ ہو اکبر۔'' گروہِ حنا نے نعرہ بلند کیا۔

"واہ واہ محترم حنفا..... واہ واہ.....' اور حنفا ٹھہر کر لوگوں کو دیکھنے لگا۔

"یہ ایک چشمہ نہیں پھوٹا تھا یہ ایک تہذیب کی نشاندہی تھی جس نے آئندہ چل کر دنیا کی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مرتب کرنے تھے۔"

"لیکن محترم حنفا ہم تو بڑی بے بسی کے عالم میں ہیں۔" ابوجندل نے کہا۔

"کیا تمہاری بے بسی ہاجرہ کی بے بسی سے سوا ہے' انتظار کرو ایک درخشاں ستارہ نمودار ہونے والا ہے۔"

"لیکن یثرب کے یہود کہتے ہیں یہ ستارہ بنی اسرائیل کے آسمان پر نمودار ہوگا۔"

"تاکہ یہ اسے قتل کردیں تاکہ یہ اسے صلیب پر چڑھادیں تاکہ اس کے سر کو کاٹ کر طشت میں سجا کر کسی جابر ملکہ کو پیش کردیں یہ یہود تاریخ کو مسخ کرتے رہے ہیں' یہ اپنی الہامی کتاب کی پیش گوئیوں کو جذب کرتے رہے ہیں' یہ منتخب قوم تھے لیکن بار بار کی تنبیہہ کے باوجود یہ اپنی سرشت سے باز نہ آئے اور پھر مسیح ابن مریم ان کے درمیان آئے لیکن انہوں نے انہیں بھی اپنے زعم میں صلیب پر لٹکوادیا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے' یہ ابھی ایک راز سربستہ ہے انتظار کرو اس مبشر کا جو آنے والا ہے۔

"اصل بات یہ ہے کہ یہود تورات کی ان آیات کی رو سے جو انہوں نے مخصوص مقصد کے تحت حذف کردی ہیں' جانتے ہیں کہ نبی آخر الزماں کا اولاد اسماعیل سے ظہور ہوگا جس کی پیش بندی کے لیے انہوں نے حضرت ہاجرہ پر بہتان باندھے اور حضرت اسحٰق کی حضرت اسماعیل پر فضیلت و برتری قائم کرنے کی کوشش کی۔

"غلط کہتے ہیں' جھوٹ بولتے ہیں' پوچھو ان سے کیا شریعت موسوی میں سود لینا جائز ہے۔ اول تو اصل تورات ان کے پاس ہے ہی نہیں' اس درخشاں ستارے نے بنی اسمٰعیل کے آسمان پر نمودار ہونا ہے۔"

☆......☆......☆

"قافلہ جزیرہ نما عرب کے سنگلاخ صحرا سے گزر رہا تھا' تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے اور مختلف جگاہوں سے بگولے اٹھ رہے تھے اہل قافلہ بڑی کفایت سے پانی استعمال کررہے تھے' ابھی سفر کا بڑا حصہ باقی تھا کہ پانی کی کمی کے آثار ظاہر ہونے لگے میر کارواں قبیلۂ جرہم کا سردار بھی تھا اور یہ پورا قبیلہ سفر میں تھا۔

"ابوعمیر' پانی کے آثار تو دور دور تک ناپید ہیں۔" قبیلے کے سردار مضماض نے اپنے معتمد سے کہا۔

"یا شیخ اس صحرائی علاقے سے تو ہم بارہا گزرے ہیں لیکن اس بار کئی سال بعد گزر ہورہا ہے اور ہمارا قصد شام کی سرزمین پر پہنچنے کا ہے۔"

"ہاں شام کا سرسبز علاقہ لیکن ابھی تک منزل بہت دور ہے دوسری جانب سے کسی قافلے کی آمد کی علامتیں بھی ظاہر نہیں ہورہی ہیں' آنے والے قافلے کے پاس اکثر پانی کی افراط ہوتی ہے۔" مضماض نے کہا۔

"اس بار ہمارا اندازہ کچھ غلط ہوگیا۔" ابوعمیر نے کہا' وقتاً فوقتاً صدائے جرس گونجتی رہی اور قافلہ رواں دواں رہا' ہر فرسخ پر جرس کی آواز' طے شدہ فاصلے کی خبر دیتی تھی' اچانک ابونہر نے آکر اطلاع دی "اے شیخ میں نے فاصلے پر آسمان میں پرندوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ابونہر گو تمہاری نگاہ کمال کی حد تک تیز ہے لیکن اس وقت ہم بوقبیس کے دامن سے گزر رہے ہیں ان ویرانوں میں تو ہم نے پانی کی علامت کبھی نہیں دیکھی۔ آسمان کی جس مخصوص حد میں پرندے منڈلاتے ہیں' اس کے نشیب میں یقیناً کوئی چشمہ ہوتا ہے۔"

''یا شیخ میری نگاہ دھوکہ نہیں کھاتی' کچھ فاصلہ اور طے کریں آپ بھی ان پرندوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھ لیں گے۔'' فاصلہ کچھ اور طے ہوگیا اور پھر مضماض نے آسمان کی دوریوں میں پرندوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا۔

''ماء......'' اس نے نعرہ بلند کیا' اب قافلے کا رخ صفا و مروہ کی جانب ہوگیا۔

''عجیب کرشمہ ہے یہاں تو کبھی پانی نہیں تھا اور اب یہاں چشمہ بہہ رہا ہے۔'' مضماض نے کہا وہ بذاتِ خود وہاں پہنچا اور ایک خاتون اور اس کے فرزند کو وہاں دیکھا۔

''کیا ہم یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔''

''بصد شوق شاید آپ لوگوں کو پانی کی تلاش تھی۔'' خاتون نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں' پانی کی تلاش لیکن اس سے پہلے تو یہاں پانی کا کوئی نشان نہیں تھا۔''

''عطیہ الٰہی' رحمت خداوندی۔'' جواب واضح تھا بہر حال مختلف شرائط کی بنیاد پر بنی جرہم یہاں قیام پذیر ہوگئے۔ وہ چٹیل میدان وہ لق و دق صحرا وہ سلسلہ ہائے کوہسار جس کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا تھا اب مرکز نگاہ بنا جا رہا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سب سے پہلا اور مقدم فرض گمراہ دنیا کو توحید سے آشنا کرنا تھا لیکن ؛عراق و مصر و شام کی متمدن دنیا میں گھوم کر دیکھ چکے تھے کہ یہاں کوئی خدا کا پیغام سننے والا نہ تھا لہٰذا توحید کی اشاعت و تبلیغ کے لیے ریگستانِ عرب کا سادہ صفحہ جو اپنی اصلی فطرت پر اور تمدن کی نقش آرائیوں سے پاک تھا انتخاب کیا اور حضرت اسمٰعیل کے مستقر مکہ میں خدائے واحد کی پرستش کے لیے بے چھت کا ایک چھوٹا سا گھر بنایا اور حضرت اسمٰعیل کو اس کا متولی بنا کر اس گھر کی آبادی و مرکزیت اور نسل اسمٰعیل کی برومندی کے لیے خدا سے دعا کی' روئے زمین پر یہ پہلا گھر ہے جو خالص خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنایا گیا۔

''آج اے گروہِ حنفا یہی بیت اللہ بتوں سے بھرا ہوا ہے' اس لیے کہ رفتہ رفتہ بنی اسمٰعیل گزرے ہوئے وقت کے ساتھ شرک میں مبتلا ہوگئے اگرچہ ان میں کچھ بیدار مغز' افراد بھی پیدا ہوئے لیکن انہوں نے خدا کی وحدانیت پر توجہ نہ دی لیکن مجھے یقین ہے کہ کوئی عظیم شخصیت اولاد ابراہیم میں پیدا ہوگی جو اللہ کے اس گھر کو ان اصنام سے پاک کرے گی' اس لیے کہ خدا لم یزل نے اس مواحد اعظم کی کسی دعا کو رد نہیں کیا' اے گروہِ حنفا تم ابراہیم کے دین کے پیرو ہو' یقیناً خدا تمہیں کشادگی دے گا۔''

اتنا کہہ کر حنفا خاموش ہوگیا' صبح کا ستارہ پھر نمایاں ہوگیا تھا اور پروشا کے نخلستان میں ایک سکوت چھایا ہوا تھا۔

''آج یہ داستان ختم ہوگئی محترم حنفا اور اس کے بعد......'' کسی نے سوال کیا۔

''انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک ہجوم ہے جن کے تذکروں کے لیے اگر اس ضعیف حنفا کو دس زندگیاں بھی مل جائیں تو ناکافی ہوں گی لیکن اب میں اس انتہائی متمدن قوم کی داستان سناؤں گا جس نے ہر ذلالت کو مذہب کا عنوان دے دیا تھا اور پھر وہ خدائے واحد قاہر بن گیا۔



روحانی مسائل

حافظ شبیر احمد

نسیم اختر...... بہاولپور

جواب:۔ فیض محمد پر بندش ہے اولاد کی۔ وظیفہ آپ دونوں کریں۔ صدقہ بھی دیں۔

سورۃ اخلاص، سورۃ فلق، سورۃ الناس 21,21 مرتبہ پڑھیں صبح اور شام۔ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔

دعا کے ساتھ دوا کا بھی استعمال رکھیں، (حکیمی)

عائشہ وفا...... شورکوٹ

جواب:۔ سورۃ قریش، سورۃ اخلاص، سورۃ فلق، سورۃ الناس 11,11 مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کریں اور دکان میں چھڑکیں روزانہ کھولنے کے بعد۔

وظیفہ وہیں بیٹھ کر پڑھیں تصور ہو کہ بندش ختم ہو جائے۔

ن...... منڈھیالہ چھٹہ

جواب:۔ رشتے کے لیے:

بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔

روزگار/ مالی حالات کے لیے:۔

بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ (اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف)

(جن لوگوں کے مسائل ہیں وہ خود پڑھیں، یا گھر کا کوئی فرد)

نانا سورۃ فلق/ سورۃ الناس پڑھا کریں۔

سورۃ رحمان صبح ایک مرتبہ پڑھ کر والد اور بھائی کے لیے دعا کیا کریں۔

شمع پروین...... مقام نامعلوم

جواب:۔ استخارہ خود کریں۔

رشتہ کے لیے:۔

سورۃ فرقان آیت نمبر 74،70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔ ان دونوں میں سے جہاں بہتر ہے وہاں ہو جائے۔

معاشی حالات کے لیے:۔

سورہ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف بعد نماز عشاء۔

روزانہ ایک تسبیح استغفار، ایک تسبیح درود شریف پڑھا کریں۔ مخلوق سے اچھے تعلقات رہیں گے۔

ام معاذ...... کراچی

جواب:۔ بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یاسین پڑھیں۔ عروبہ کے مسئلے کے لیے دعا بھی کریں۔ اللہ آسانیاں فرمائے۔

(۲) سورۃ یسین والا وظیفہ جو بتایا ہے وہی پڑھیں۔ اپنے اور بیٹی دونوں کے لیے۔ دعا بھی کریں۔

م۔ف...... چیچہ وطنی

جواب:۔ (۱) رشتہ ٹھیک ہے استخارہ کرلیں۔

سورۃ اخلاص پانی پر دم کر کے بھائی کو پلائیں، 21 مرتبہ روزانہ۔

(۲) صدقہ دیں اللہ بہتر جانتا ہے۔

سحر محسن...... ننکانہ صاحب

جواب:۔ "یا لطیف یا ودود" 101 مرتبہ 3,3 درود شریف اول و آخر روزانہ پانی پر دم کر کے والد کو پلائیں۔ (نیت بھی کریں)۔

انعم اشرف......سرگودھا

جواب: وظیفہ جاری رکھیں۔ اپنے حق میں بہتری کے لیے دعا کریں۔

زرینہ تبسم......سرگودھا

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ (وظیفہ بہن خود پڑھے) صدقہ بھی دیں۔

ثوبیہ ناز......راولپنڈی

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔ صدقہ دیں (بکرا/مرغی)

سورۃ اخلاص 21 مرتبہ صبح وشام۔ اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف رکاوٹوں کو ختم کرنے کے لیے۔

خدیجہ انعم......واہ کینٹ

جواب:۔ رشتوں کے لیے:۔

بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74،70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتوں کے لیے دعا کریں۔ (وظیفہ بیٹیاں یا آپ خود پڑھیں)

(۲) سورۃ مزمل 3 مرتبہ درود شریف اول وآخر 3,3 مرتبہ جب گھر میں چینی آئے اس پر دم کر دیں۔ (نیت بھی رکھیں) چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔

عین الامین......سرگودھا

جواب:۔ (۱) بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔ جو حق میں بہتر ہو وہی ہوگا۔

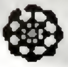
(۲) پڑھنے سے پہلے درود شریف اور سورۃ اخلاص 7,7 مرتبہ۔ ہر نماز کے بعد "یا قوی" 11 مرتبہ سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں۔

عذرا سعید......مقام نا معلوم

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ یاسین ایک مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں۔

روبینہ شاہین......سرگودھا

جواب:۔ "سورۃ عصر" روزانہ صبح وشام 21،21 مرتبہ (پانی پر دم کر کے پلائیں/ خود پڑھیں اور دم کریں)



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے جنوری 2014ء

نام............ والدہ کا نام............ گھر کا مکمل پتا............

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں............

ذوقِ آگہی

عفان احمد

حسد سے بڑا گناہ

حضرت سعدی بیان فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں، میں مدرسۂ نظامیہ بغداد میں پڑھتا اور پڑھاتا تھا میرا ایک ساتھی میرے حسن بیان اور نکتہ آفرینی کے باعث مجھ سے بہت حسد کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے استاد محترم سے کہا کہ فلاں شخص میرے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ وہ میرے کمال کے باعث مجھ سے حسد کرتا ہے۔

استادِ محترم نے یہ بات سنی تو خفگی کا اظہار فرمایا اور کہا۔

"حیرت ہے تو اس کے گناہ سے تو آگاہ ہوگیا کہ وہ حسد کرتا ہے لیکن اپنے بارے میں تو نے یہ نہ سوچا کہ تو بھی غیبت جیسے گناہ کا ارتقاب کر رہا ہے اگر اس حاسد نے دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنایا ہے تو دوسرے راستے سے تو بھی وہیں پہنچ رہا ہے۔"

حکایات: بوستان سعدی

مرسل: اسد ضوان...... کراچی

خطرہ

ایک کسان سے کسی اجنبی نے پوچھا کہ تمہاری گندم کی فصل کیسی ہے؟

میں نے گندم نہیں بوئی۔

کیوں، میں نے تو سنا ہے کہ یہ علاقہ گندم کی فصل کے لیے موزوں ہے۔ اجنبی بولا۔

مجھے خطرہ تھا کہ بارش نہیں ہوگی۔ کسان بولا۔

اچھا، تو تمہاری مکئی کی فصل کیسی ہے؟

میں نے مکئی بھی کاشت نہیں کی، کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ فصل کو کیڑا لگ جائے گا۔

اوہ، آخر تم نے کیا بویا۔

کچھ بھی نہیں کیونکہ میرے خیال میں یہی محفوظ ترین راستہ تھا۔ کسان نے جواب دیا۔

وہ لوگ جنہیں فیصلہ کرنا ہوتا ہے انہیں کچھ نہ کچھ ذہنی دباؤ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے کچھ خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ جو لوگ دلیرانہ فیصلہ نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں اور نہ وہ اپنی صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

انمول موتی

❖ مومن وہ ہے جو خوشحالی میں شکر اور مصیبت پر صبر کرتا ہو۔

❖ کسی تصویر کے اتنا قریب مت جاؤ کہ وہ دھندلی نظر آئے۔

❖ حُسن شکر میں لپٹی زہریلی گولی ہے۔

❖ جب آپ ناکام ہو جائیں تو ناکامی سے ملنے والا سبق نہ بھولیں۔

راشد امین...... کوٹ ادو

اخلاق

سب سے وزنی چیز جو قیامت کے دن مومن کے میزان میں رکھی جائے گی وہ اس کا حُسن اخلاق ہوگا۔

دوست

اپنی زندگی میں ایسے دوستوں کو شامل کرو جو کبھی آئینہ اور کبھی سایہ بن جائیں کیونکہ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا اور سایہ ساتھ نہیں چھوڑتا۔

ارشاد علی...... برنالی

اللہ کے ذمے

حضرت مبارک بن فضالہ ایک روز عباسی بادشاہ المنصور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اس نے ایک مجرم

کو قتل کرنے کا حکم دیا' مبارک فضالہؒ نے کہا۔
''امیر المومنین میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ''قیامت کی دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی سدا دے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے جن لوگوں کا اجر ہو وہ کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت کوئی کھڑا نہ ہوگا' سوائے اس شخص کے جس نے کسی کو معاف کیا ہو۔''
یہ سن کر منصور نے کہا' اس شخص کو آزاد کردو۔''
سائرہ مرواعلی...... مرغائی راجن پور

دو طرح کے آدمی

آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں' اہل نفس خواہشات کے بندے اور اہل اللہ...... خدا کے اطاعت گزار بندے' نفس' دنیا اور شیطان تینوں کافر ہیں۔ جس شخص پر غضب الٰہی ہوتا ہے وہ شخص نفس پرست' شہوت پرست' خواہش پرست' دنیا پرست' حسن پرست' زینت پرست اور شیطان کا ہمجولی بن جاتا ہے۔ ہر وقت اس کی جان لذتِ نفسانی اور معصیت اور گناہ میں غرق رہتی ہے اس کا دل سیاہ اور عشق و محبت اور انوارِ الٰہی سے جدا اور اس کا دل مردہ کی طرح جسدِ گور میں معرفت سے اندھا اور بے نور رہتا ہے۔ نفس کس کو کہتے ہیں؟ نفس وہ ہے کہ جو راہِ خدا سے روکتا ہے اور غیر اللہ کی طرف بلاتا ہے' پس دنیا' نفس اور شیطان ہم آدمیوں کا دشمن ہے۔ نفس شہوت کی وجہ سے غالب اور غصہ کی حالت میں درندہ ہوتا ہے اور گناہ کرنے کی حالت میں نفس طفل (بچہ) بن جاتا ہے' نعمتوں کے کھانے کی حالت میں نفس فرعون بن جاتا ہے اور سخاوت کی حالت میں نفس قارون بن جاتا ہے۔ بھوک کی حالت میں نفس دیوانہ کتا اور شکم سیری کی حالت میں متکبر گدھا ہوتا ہے۔
(اقتباس: از محبت رسول)

انتخاب: امجد علی...... کراچی

کھانے کا اسلامی طریقہ

- پہلے لقمہ پر بسم اللہ' دوسرے سے قبل بسم اللہ الرحمٰن اور تیسرے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھیے۔
- بسمہ اللہ زور سے پڑھیے تا کہ دوسروں کو بھی آواز آجائے۔
- یا واجد...... جو کوئی کھانا کھاتے وقت ہر نوالہ پر پڑھا کرے گا تو ان شاء اللہ اس کے پیٹ میں نور پیدا ہوگا اور بیماری دور ہوگی۔
- مٹی کے برتن میں کھانا افضل ہے۔
- سالن یا چٹنی کی پیالی روٹی پر مت رکھیں۔
- ہاتھ یا چھری کو روٹی سے نہ پونچھیے۔
- زمین پر دستر خوان بچھا کر کھانا سنت ہے
- ٹیک لگا کر' ننگے سر' لیٹے لیٹے یا چوکڑی مار کر کھانا مت کھایئے۔
- اول آخر نمک یا نمکین کھایئے' اس سے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔
- روٹی ایک ہاتھ سے نہ توڑیئے کہ مغروروں کا طریقہ ہے۔
- روٹی الٹے ہاتھ میں پکڑ کر سیدھے ہاتھ سے توڑیئے' سنت ہے۔
- سیدھے ہاتھ سے کھایئے' الٹے ہاتھ سے کھانا' پینا' لینا' دینا شیطان کا طریقہ ہے۔
- کھانا کھانے سے پہلے پھل کھایئے' مفید ہے۔

غلام فاطمہ...... سمبڑیال



خوشبو سخن

عمر اسرار

آنکھیں

آنکھیں تو آئینہ ہوتی ہیں
اس کی آنکھوں میں اپنا عکس
دیکھ کر
میں سدا خوش فہم رہی
کیسے کیسے سپنے سجاتی رہی
آنکھوں کو سچا مان کر
دل میں نہ جھانک پائی
کہ دل تو
مقام محبت ہے
آنکھیں تو آئینہ ہوتی ہیں
اور
ہر دیکھنے والے کو اس میں
اپنا ہی عکس ہی نظر آتا ہے

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

دسمبر

دسمبر کے دنوں میں تم نے مجھ سے یہ کہا تھا
کہ تنہا ہوں مگر پھر بھی
تمہارا ساتھ میں دوں گی
اپنے ہاتھ آنکھوں پہ میری رکھ کے کہا تھا نہ
بھری دنیا سے ٹکرا کر
تمہارا ساتھ میں دوں گی
نہ بدلوں گی کبھی جیسے
یہ موسم بدلتے ہیں
بدلتے موسموں میں بھی
تمہارا ساتھ میں دوں گی
تم عہد کر کے نہیں لوٹے یہ موسم لوٹ آیا ہے
دسمبر میں کہا تھا نہ کہ واپس لوٹ آؤں گی
ابھی تک تم نہیں لوٹے
دسمبر جا رہا ہے پھر
تم واپس لوٹ آؤ نا
دسمبر جا رہا ہے پھر
جاناں
ابھی تک تم نہیں لوٹے

انتخاب: ایم جے قریشی..... ڈی آئی خان

غزل

جتنے اچھے چہرے ہیں
ان پر اتنے پہرے ہیں
دور کیسا آیا ہے
سارے گونگے بہرے ہیں
مرجھائے جو رہتے ہیں
اندر سے وہ گہرے ہیں
جن کو ڈھونڈنے نکلا ہوں
جانے کس جا ٹھہرے ہیں
دل میں رانا رہتے ہیں
جن کے بول سنہرے ہیں

قدیر رانا..... راولپنڈی

غزل

خوشبو کے دیس میں آیا تھا جو مسافر
محبت کا جال ساتھ لایا تھا وہ مسافر
محبت کے لفظ سے بھی تھے ہم نا آشنا
اس لفظ سے واقف کرا گیا وہ مسافر
محبت کی منزل پہ لا کر پھر ہنسا اور
محبت کے سارے خط جلا گیا وہ مسافر
دیں تو کسے دیں الزام محبت میں تڑپنے کا
یہ وفا کی دے گیا سزا وہ مسافر

ہم نے کی ہی کیوں وفا اس سے
جب معلوم تھا ہم کو وہ تو تھا ایک مسافر
کاشف محمود...... اسلام آباد

غزل

روزن دل سے مجھے دیکھے کوئی
کاش میری بات کو سمجھے کوئی
منزل مقصود بھی مل جائے گی
خار زور زیست میں نکلے کوئی
کیا ہے فرق راہزن و راہبر
عقل و بینش سے انہیں پرکھے کوئی
دل میں اٹھتے درد کے طوفان کو
درد مندی سے بھلا روکے کوئی
بن کے آئے کوئی اپنا غمگسار
آنکھ کے آنسو ذرا پونچھے کوئی
یہ بلندی پستیوں کے دم سے ہے
ہاں فراز کوہ سے جھانکے کوئی
بہرے لوگوں کی یہ بستی ہے قمر
کس طرح اپنی زبان کھولے کوئی
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

چہروں پہ حسن پھولوں میں شگفتگی نہ رہی
تیرے بغیر کسی شے میں دلکشی نہ رہی
یہ اپنی دنیا فردوس بریں سے کم نہیں ہے
زمانے میں اگر کہیں پہ بھی بے کسی نہ رہی
ہماری انجمن میں تم یوں آ کے چلے گئے
پھر اس کے بعد جہاں میں روشنی نہ رہی
نہ دوش پینے پہ ہوگا نہ پھر پلانے پہ
لہو کے جام پلاؤ کہ مے کشی نہ رہی
صلہ یہ دیا ہے پھولوں کو ان کی خوشبو کا
کہ مسلے جاتے ہیں جب ان میں تازگی رہی
برسوں سے ہے نظام زندگی برہم سا
تم اپنا طرز وفا یہ لو کہ برھمی نہ رہی
کسی کے دل میں چاہت نہیں ہے جاوید
یہ زیست ہے یوں پھر ایسی زندگی نہ رہی
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

تیرا میرا رشتہ

سنو!
تم
گزرے برسوں کے
ہر لمحہ
ہر پل
سانس
دھڑکن سے زیادہ
قریب رہے ہو
میری آنکھوں نے
فقط تیرے ملن
کے سپنے دیکھے ہیں
تیرا
مجھ سے رشتہ
ایسا ہے
جیسا
پھولوں کا خوشبو
چکور کا چاند
سمندر کا جزیرہ
اور
شمع کا جوت
جلی رہے تو زندگی
بجھ جائے تو موت

زوبیہ جہد...... کھیالی

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے...... جوروجبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ ہورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں. یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے. اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا. دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے. "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے.

"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پرخطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں.

پورن سنگھ نے چنا کی گرفتاری پوشیدہ رکھی تھی۔ اس سے جگا کے متعلق اطلاع فراہم ہونے سے پہلے اگر کوئی غلط شخص اس کی بو پا جاتا تو جگا کی گرفتاری ناممکن ہو جاتی۔ اس نے چنا کو بہلانے کی کئی ترکیبیں آزمائیں لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ چنا کو پولیس سے زیادہ جگا کا ڈر تھا۔ جگا کے ہاتھوں پالا سنگھ کو شکار ہوتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اگر وہ پولیس چوکی سے زندہ رہا ہو جاتا تو بھی جگا کی رائفل اس کا یقیناً تعاقب کرتی۔ جگا اکیلا نہیں ہے اس کے ساتھیوں میں سے کوئی اسے شوٹ کردے گا۔

"پنا سنگھ! تمہاری داشتہ کا بیٹا جس قدر اندازہ تھا اتنا بھولا نہیں ہے۔" پورن سنگھ نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں سمجھتا ہوں اس پر تھرڈ ڈگری آزمانی چاہیے۔"

"نہیں صاحب! اسے کچھ ہو گیا تو اس کی ماں پاگل ہو جائے گی اور میری ترکیب بیکار جائے گی۔" پنا نے عاجزی سے کہا۔ اس سے اطلاع حاصل کرنا میرا کام ہے آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

پورن سنگھ کو طیش آیا مگر ضبط کر گیا۔ ہم سے تم زیادہ چالاک ہو یا کہنا چاہتے ہو بیوقوف؟ اس نے کہنا چاہا مگر ابھی اس شخص سے کام لینا تھا اس لیے اجازت دے دی۔ "دو دن دے رہا ہوں۔ ورنہ ہمیں اس پر تھرڈ ڈگری آزمانا پڑے گی۔"

مگر پنا سنگھ کے دو دن بھی ضائع نہیں ہوئے۔ اس نے چنا کی ماں کے ذریعے چنا سے جگا کے گھر کا پتہ حاصل کرلیا اور پورن سنگھ نے ایک صبح فرید کوٹ پہنچ کر جگا کے مکان کو گھیر لیا۔

جگت کو امرتسر لے جاتے ہوئے راستے میں پورن سنگھ نے دو تین بار یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ "جگا اب بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم غیر مسلح کیوں تھے؟"

"نصیب کی بلہاری ہے۔" جگت نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے نصیب نے ساتھ دیا اس لیے میرا پتہ تمہیں مل گیا۔" راستے بھر جگت کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُمڈتے رہے تھے۔ کرتارا رات کہن لے گیا' اسی صبح پولیس کیسے ٹپک پڑی؟ پھر ذہن میں شک نے سر ابھارا۔ "کیا کرتارا نے ......؟" مگر اس کی روح نے چیخ کر کہا۔ "یہ غلط ہے ......" اس نے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیا۔ کرتارا کبھی ایسا نہیں کر سکتا...... ہاتھ پیر بیڑیوں سے لد گئے' پھر بھی ذہن میں یہی سوال چکر لگا رہا تھا کہ کس کی ترکیب سے میں بے وقوف بنا؟ پھر ہتھکڑی والا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس نے غصے کا اظہار کیا۔ "جس نے غداری کی ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" مگر دوسرے ہی لمحے جیسے کسی نے اس کے اندر سے جواب دیا کہ اب تم خود ہی کہاں زندہ رہو گے؟ سمجھ لو کہ زندگی ختم ہوگئی۔

○......○......○

آسمان پر چاند چمک رہا تھا مگر چندن کور کے دل کے آسمان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صبح جگت ہتھکڑی پہن کر پولیس چیف کے ساتھ رخصت ہوا تھا تو اس نے اپنے دل پر قابو رکھا تھا' مگر جیسے ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا تھا' چندن بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ پورن سنگھ اسے موت کا فرشتہ نظر آیا۔ چندن اچھی طرح جانتی تھی کہ جگت کو اس کے جرائم کی کیا سزا ملے گی؟ وہ منظر اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا جب پورن سنگھ نے جگت کے دونوں بازوؤں پر رسی باندھی تھی۔ رسی کا وہ پھندا اس کے بازوؤں پر سے سرکتا ہوا اس کی گردن تک پہنچ سکتا تھا۔ چندن کا دل گھبرانے لگا۔ برسوں سے دیکھے ہوئے سکھ کے سپنے اسے صرف سپنے ہی نظر آئے جو لمحہ بھر کے بعد آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ بڑبڑانے لگی۔

"دکھ دینے کے لیے تمہیں دنیا میں اور کوئی نہ ملا بھگوان! لمحہ بھر کو سکھ دینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہو اور فوراً ہاتھ کھینچ لیتے ہو۔ دکھ کی ہزاروں آہوں کے بدلے سکھ کا ایک سانس دیتے ہو۔ یہ تمہارا کیسا انصاف ہے بھگوان......؟"

دل بہت زیادہ گھبرانے لگا۔ ابکائیاں آنے لگیں پھر الٹی ہوگئی' تب اسے خیال آیا کہ اس کے پیٹ میں دوسری زندگی جنم لے رہی ہے۔

"اسے میں تکلیف دے رہی ہوں۔ جگت کی ایک ہی تو نشانی ہے' کیا وہ اسے بھی نہ سنبھال سکے گی؟ نو ماہ سے پہلے اگر یہ زندگی ضائع ہوگئی تو پھر میرے پاس زندہ رہنے کا کیا سہارا ہوگا؟ اس کی خاطر مجھے مضبوط دل رکھنا پڑے گا۔" مگر وہ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد ہی جگت کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اسے یاد آجاتے اور وہ بے قرار ہو جاتی۔

"باپ بننے کی خبر پا کر وہ کتنے خوش ہو گئے تھے؟ مجھے اٹھا کر انہوں نے کس طرح ہاتھوں پر گھمایا اور پھر ڈاکہ نہ ڈالنے کا عہد بھی دے دیا۔ ایسا نظر آنے لگا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا مگر اچانک آتش فشاں پھٹ پڑا...... مکان کی دیواریں جیسے اس کی روح کو دبا رہی تھیں...... گھبراہٹ کم کرنے کی غرض سے وہ دو چار بار کھڑکی سے باہر جھانکتی مگر محلے والوں کی گھورتی ہوئی آنکھیں جیسے اس کے دل میں اتر جاتیں اور وہ گھر میں منہ چھپا لیتی' دوپہر اور رات چولہا جلانے کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ اس نے پیٹ میں پلتی ہوئی زندگی کے لیے کچھ منہ میں ڈالنے کے لیے دل بہلایا مگر ہاتھ منہ تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ رات کو سونے کے لیے وہ کروٹیں بدلتی رہی مگر نصف

شب گزرنے تک پلکیں نیند سے روٹھی رہیں۔ سوچا ساس سسر کے پاس پہنچ جاؤں، ساس کی گود میں سر رکھ کر خوب روؤں تاکہ دل ہلکا ہو جائے۔ اس وقت اسے کسی کے پیار بھرے لفظوں کی آرزو تھی۔ مگر اس کے پیروں میں گھر سے باہر جانے کی قوت نہیں تھی۔ ممکن ہے چکر آئیں اور گر جائے اور پیٹ میں پلنے والا مستقبل کا چراغ بجھ جائے......!

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ کوئی دھیمے انداز میں دستک دے رہا تھا۔

''کون ہوگا؟ ممکن ہے وہی آئے ہوں...... پولیس کے قبضے سے فرار ہو کر۔'' اس نے سوچا۔

چندن کھڑی ہوگئی اور لالٹین ہاتھ میں لے کر برآمدے میں آگئی۔ کوئی بغیر بولے صرف دستک دے رہا تھا۔ حلق سوکھ گیا تھا اس لیے اس نے بڑی مشکل سے پوچھا۔ ''کون ہے......؟''

جواب میں کھڑکی پر تین بار دستک ہوئی۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھی۔ دروازے کے قریب جا کر بولی۔ ''کھول رہی ہوں۔'' زنجیر کھلی۔ آنے والے نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔

''اتنی دیر؟'' آواز جانی پہچانی تھی۔ ''ارے بھابی آپ نے تکلیف کی۔'' کرتارا یہ کہتا ہوا اندر آنے کے لیے قدم اٹھا رہا تھا' چندن کے چہرے پر ناراضگی دکھائی دی۔

''بہت تکلیف دے چکے...... اب کیا لینے آئے ہو؟''

کرتارا بوکھلا گیا۔ ''بھابی! بے وقت خلل ڈالا اس لیے اتنی ناراض ہو رہی ہیں؟'' پھر چندن کے چہرے کو دیکھ کر بولا۔ ''آپ تو مجھ پر خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہیں۔'' پھر اس نے پشت پر سے گن اتارتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ لینے نہیں بلکہ دینے آیا ہوں۔''

پھر بھی چندن نے تو پورا دروازہ کھولا نہ ہی راستے سے ہٹی۔

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے دراوزہ بند کرنے جا رہی تھی کہ کرتارا نے روز آزمایا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ''میں کہتی ہوں تم اس مکان میں قدم نہیں رکھو گے۔''

کرتارا کو یہ الفاظ سخت محسوس ہوئے۔ ممکن ہے وہ لوٹ جاتا مگر اسے شک ہوا' ضرور کوئی بات ہوگئی ہے۔ جگت کو گن سپرد کرنی ضروری تھی۔ ''بھابی! میں یہیں کھڑا ہوں۔ آپ جگت کو بلا لیں۔ ایک لفظ بولے بغیر گن لوٹا کر چلا جاؤں گا۔''

اب چندن کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ پھر بھی ناراضگی کم نہ ہوئی۔ ''تم کیوں انجان بننے کی اداکاری کر رہے ہو؟ کل رات آ کر گن لے گئے' صبح پولیس بھیج دی۔ اب تماشہ دیکھنے آئے ہو؟''

''بھابی!'' کرتارا چیخ اٹھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نتھنے پھول گئے۔ وہ سرتاپا لرزنے لگا۔

چندن کور اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ جگت کی گرفتاری کی خبر نے کرتارا کا یہ حال کر دیا۔ یہ دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''بھابی!'' کرتارا نے گن چندن کو دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ایک دوست پر ایسا الزام لگایا؟'' اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ ''آپ اس کا بدلہ لے لیں' اس گن سے مجھے شوٹ کر دیں۔ اس سے آپ کا دکھ کم ہو جائے گا۔''

چندن کور پچھتانے لگی' اس نے یہ کیا کر دیا؟ ''کرتارا بھائی! تمہارے دوست کی گرفتاری نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ صبح سے میں اپنی ذات سے' بھگوان سے اور اب تم سے لڑ رہی ہوں۔'' پھر وہ سر جھکا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ ''اب یاد آیا کہ تم

صرف گن لینے نہیں آئے تھے' انہیں لے جانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے انہیں روکا' میری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔'' یہ کہہ کر چندن دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔

''بھابی! بھابی!'' کرتارا نے اس کے شانے تھام لیے۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟ جگا جیسے بہادر کی بیوی ایسی کمزور نہیں ہوسکتی۔'' پھر شانے پر سے ہاتھ ہٹا کر بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم ماں بننے والی ہو' اس کا خیال رکھو بھابی۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' چندن کور آنسو خشک کرنے لگی۔ ''باپ اپنے بچے کا منہ نہیں دیکھ سکے گا یہ خیال......''

''یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دو بھابی۔'' کرتارا نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''پولیس کے گرفتار کرنے سے کام ختم نہیں ہوجاتا۔ جگا کے جرائم ثابت کرنا کافی کٹھن ہوگا۔ ہم اس کے لیے آخر تک لڑیں گے۔''

''اپنی پریشانی میں' میں آپ سے اندر آنے کے لیے کہنا بھول گئی۔'' چندن کور نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو کرتارا نے اسے روک دیا۔

''نہیں بھابی! میں اندر نہیں آسکتا۔''

''میں نے تمہیں منع کیا تھا' اب کس منہ سے تمہارا استقبال کروں؟''

''نہیں...... یہ بات نہیں۔'' کرتارا اب بالکل ہوشیار ہوگیا تھا۔ ''تم مکان میں تنہا ہو۔ اس وقت میں اندر نہیں آسکتا۔'' کرتارا نے گن پشت پر لٹکالی۔ ''میں اب امرتسر واپس جارہا ہوں۔ پہلے یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ جگا کے متعلق کس نے مخبری کی؟'' اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے دیکھ کر چندن بولی۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' کرتارا نے دیکھا چندن کور کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ ایسی حالت میں اس کا اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

''بھابی! گھر والوں کو گرفتاری کی خبر بھیجی یا نہیں؟'' کرتارا نے پوچھا۔ چندن نے انکار میں سر ہلایا۔ کرتارا کو اب خیال آیا کہ جگا کی گرفتاری کی خبر پوشیدہ رکھی گئی ہے ورنہ اسے کیسے پتہ نہ چلتا؟ ضرور اس میں کوئی راز ہے۔

''گھر والوں کو فرید کوٹ کے پتے کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا؟'' کرتارا نے پوچھا۔ اسے چندن کے یہاں تنہا رہنے سے فکر ہورہی تھی۔

''انہیں پتے کے متعلق معلوم ہے۔ تین دن پہلے انہوں نے مجھ سے خیریت اور خوشخبری کا خط لکھوایا تھا۔ بیساکھی پر وہ لوگ مجھے یہاں سے لینے آئیں گے۔''

کرتارا کے ذہن میں روشنی ہوگئی۔ ''خط لکھوایا تھا؟'' اس نے ہونٹ چبائے۔ ''باپ ہونے کی خوشی میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ وہاں بھی سخت نگرانی کررہی ہوگی۔ یقیناً وہ خط پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔'' پھر وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ''کیسی حماقت ہوگئی۔''

''تب تو انہیں خط ملا ہی نہ ہوگا۔'' چندن نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''میں ان کی راہ دیکھ رہی ہوں۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں' بھابی! چلیں تیار ہوجائیں۔ میں آپ کو الور چھوڑ آؤں گا۔'' چندن کور اس کی صورت دیکھنے لگی۔ ''کیا سوچ رہی ہو بھابی؟'' کرتارا نے گھڑی دیکھی۔ ''گھنٹے بھر میں گاڑی چھوٹ جائے گی۔''

چندن اندر جاکر جلدی سے دو جوڑے کپڑے

کا بنڈل بنا کر آ گئی۔ ''چلو!'' اور دروازہ بند کرتے ہوئے اسے پتہ چلا کہ وہ تالا لانا بھول گئی تھی۔ ''کوئی بات نہیں...... تالا لگانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ گھر میں کوئی چیز ہے ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔ مگر کرتارا نے اسے روکا۔

''نہیں...... تالا لگانے کی ضرورت ہے۔'' اس نے سوچا جگا نے لوٹ کا مال گھر میں ہی کسی جگہ چھپایا ہوگا۔ ''تمہیں خبر نہیں بھابی! اندر بہت بڑا خطرہ ہے۔'' چندن اشارہ سمجھ گئی۔

''مجھ سے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا' مگر تم کہتے ہو تو تالا لگا دیتی ہوں۔''

انجن کی ہلکی سی سیٹی سے چندن کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ الور جا کر وہ کس طرح جگا کے بارے میں بتائے گی؟ اس کی زبان کیسے حرکت کرے گی......؟

O......O......O

ماں جی کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ سوہن سنگھ نے جب سے خط پڑھا تھا اسی وقت سے وہ بڑھاپا بھول گئی تھیں۔ ''میرے بھگوان نے آخر مجھ پر رحم کیا......!''

''جگت کی ماں! تم تو مسرت سے پاگل ہو جاؤ گی۔'' سوہن سنگھ نے مذاق کیا۔

''مجھ سے کہہ رہے ہو تو اپنے آپ کو بھی سنبھالو! دادا بننے کی خوشی میں صبح مٹھائی بانٹی تھی یہ بھول گئے۔ پھر مجھ سے اور مٹھائی منگوانے کو کہا تھا' یہ تو یاد ہے؟''

''یہ تو بھئی عمر کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔'' سوہن سنگھ نے اپنا دفاع کیا۔

''بہو کو بلانے کے لیے فوراً جوتشی کے پاس نیک گھڑی دیکھنے کے لیے دوڑ گئے تھے وہ بھی عمر کی وجہ سے تھا؟'' ماں جی نے انہیں مضبوطی سے جکڑ لیا۔

''ابھی تو تیسرا مہینہ چل رہا ہے اس لیے ابھی سے پوتے کا منہ دیکھنے کی زیادہ جلدی نہ کرو بھئی۔'' سوہن سنگھ بولے۔ اسی طرح کی نوک جھونک میں ماں جی کو جگت یاد آ جاتا اور وہ کچھ اداس ہو جاتیں۔

''اب اسے پتہ چلے گا کہ اولاد کے لیے کیا کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں تو کہہ رہی ہوں وہ سارے دھندے چھوڑ دے اور کھیتی باڑی کرنے لگے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' سوہن سنگھ خاموش رہے۔ جگت نے جوہری بازار میں ڈاکہ ڈالا تھا' یہ بات انہوں نے ماں جی سے پوشیدہ رکھی تھی۔ الور میں وہ نئے تھے لہٰذا جگا ڈاکو کے باپ کے نام سے لوگ انہیں نہیں جانتے تھے۔ ماں جی نے گھر سے باہر جانا بند کر دیا تھا اس لیے گاؤں میں ہونے والی باتوں سے بے خبر تھیں۔ سوہن سنگھ اب اخبارات غور سے پڑھتے اس لیے ماں جی کو شک ہوتا۔

''اپنے جگت کی کوئی خبر تو نہیں آ رہی؟'' تب سوہن سنگھ بات ٹال دیتے۔

''بھئی راجستھان کے اخبارات میں پنجاب کی خبریں نہیں آتیں۔''

خوشخبری آئی تو ماں جی نے ضد کی۔ ''میں گردوارے جا کر پرشاد دے آؤں گی۔'' مگر سوہن سنگھ نے انہیں روک لیا۔

''ایسی جلدی نہ کرو! بہو کو لانے کے بعد اسے درشن کرانے لے جائیں گے۔''

ماں جی کو خط سنانے کے بعد جگت کے باپو سوچ میں پڑ گئے۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ جوہری بازار میں ڈاکہ ڈال کر جگت ولیش کی سرحد پار کر گیا ہوگا۔ خط کے الفاظ چندن کے ہی تھے یہ انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ انہیں یہ بھی شک گزرا کہ اس خط میں پولیس کی چال بازی تو نہیں؟ عجیب عجیب سے

خیالات ذہن میں چکرانے لگے۔ ذہن الجھ گیا تب انہوں نے سب کچھ بھگوان کے بھروسے چھوڑ دیا۔

"فرید کوٹ جاؤں گا تو سب پتہ چل جائے گا۔"

یہ سوچ کر انہوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔

مگر انہیں فرید کوٹ جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کھیت کے قریب کھڑے ہوئے ریڑھے سے چندن کور کو اترتے دیکھا تو ماں جی چیخیں۔ "ارے دیکھیں..... بہو معلوم ہوتی ہے۔"

دوپہر سونے کے بہانے دادا بننے کے خیال کو ذہن سے بہلاتے ہوئے سوہن سنگھ لیٹے ہوئے تھے۔ وہ پھرتی سے بیٹھ گئے۔ "بہو آ رہی ہے؟ یہ ناممکن ہے۔" دونوں پہلو بہ پہلو کھڑے ہو کر چندن کور کو کھیت میں داخل ہوتے دیکھنے لگے۔ "اس کے ساتھ کون جوان ہے؟" وہ بڑبڑائے۔

"تمہارے بیٹے کا کوئی ساتھی ہوگا۔ چھوڑنے آیا ہوگا۔" ماں جی جواب میں بڑبڑائیں پھر دونوں ایک ساتھ سوچنے لگے۔ "بہو جلدی کیوں آئی ہوگی؟"

"ارے ارے..... سنبھل کر چلنا' کہیں پیر غلط پڑ گیا تو....." یہ کہتی ہوئی ماں جی پر مسرت انداز میں بولیں۔ دوڑ کر آتے ہوئے دیکھ کر چندن کو دو باتوں کا یقین ہو گیا۔ خوشخبری کا خط مل گیا ہے اور گرفتاری کی خبر سے وہ لاعلم ہیں۔ بھگوان نے اسے کیسے سخت امتحان میں ڈالا تھا۔

"کرتارا بھائی! ہنستا چہرہ رکھنا۔ انہیں گرفتاری والی بات نہیں بتانی۔" چندن نے جلدی سے اپنے چہرے پر مسرت کا تاثر پیدا کر لیا۔ ساس' بہو نصف راستے میں ملیں۔ چندن پیر چھونے کے لیے جھکی مگر ساس نے اسے جھکنے نہیں دیا۔

"اب تمہیں اتنا جھکنا نہیں چاہیے بہو! پہلی بار کا ہے اس لیے تمہیں پتہ نہیں چلتا۔" یہ کہہ کر اس کی بلائیں لیں۔ پھر بازو تھام کر کافی سنبھل کر اسے لے جانے لگیں۔ ماں جی کو پیچھے آتے ہوئے کرتارا سے اب استقبالیہ الفاظ کہنے یاد آ گئے۔

"آیئے بھائی! راستے میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں ماں جی..... بھابی کو ذرا سی تکلیف نہیں ہوئی۔" کرتارا اماں جی کی فکر سمجھ گیا۔ مجبوراً وہ خوش مزاجی سے بات کر رہا تھا۔ مگر دل رو رہا تھا۔ کرتارا سوچ رہا تھا کہ ماں کو بیٹے کی گرفتاری کی خبر ملے گی تو مسرت کی بجائے کیسا دل تڑپ اٹھے گا؟ سوہن سنگھ نے کرتارا کو چارپائی پر بٹھایا مگر کسی قسم کی جلد بازی نہ دکھانے کا انہوں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ بیٹے کی خبر معلوم کرنے کے لیے ان کا دل تڑپ رہا تھا۔

چندن اندر جا کر پانی کے دو لوٹے بھر رہی تھی' تب ماں جی نے اسے روکا۔ "نہیں' تمہیں ایسی دوڑ دھوپ نہیں کرنی چاہیے۔" ساس کے لاڈ سے چندن کا دل بھر آیا۔

"میں جانتی ہوں' ان دنوں میں عورتوں کو زیادہ کام نہیں کرنا چاہیے۔"

ماں جی نے اس سے پانی کے لوٹے چھین لیے۔ "کچھ آرام کر لو' سفر کی تھکن ہوئی ہوگی۔" پھر کرتارا کو پانی دیتے ہوئے پوچھا۔ "چندن کو بھیجنے کی جگت نے بہت جلدی کی؟ اس کے بابو مہورت دیکھ کر آنے والے تھے۔" کرتارا الجھن میں پڑ گیا۔ کیا جواب دیتا؟ چندن کور سمجھ گئی کہ کرتارا الجھن میں ہے' اس لیے وہ بولی۔

"حالات ایسے ہی تھے اس لیے جلدی آنا پڑا۔" چندن کور کی حاضر جوابی نے کرتارا کو متعجب کر دیا مگر ماں جی یہ سن کر بھی خاموش نہیں ہوئیں۔

"جگت کی کیا خبر لائے ہو بھائی؟" اب کرتارا گھبرا گیا۔ ماں سے کب تک چھپایا جائے گا؟ مگر سچ بات کہنے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سوہن سنگھ اس کی الجھن سمجھ گئے اس لیے درمیان میں بولے۔

"تم اسے تھوڑا آرام کرنے دو! پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

ماں جی پانی کے لوٹے اندر لے جاتی ہوئی بولیں۔ "اچھی بات ہے، میں بہو سے معلوم کرلوں گی۔" خوشی سے ماں جی کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

"جب خط آیا اس وقت تمہارے سسر بازار گئے ہوئے تھے۔ آ کر پڑھا تو ایسی خوشخبری لانے والے ڈاکیے کو بخشش نہ دینے کا مجھے افسوس ہوا پھر بھی میں نے کہا، کیا؟ خبر ہے چندن؟ ان سے میں نے کہا، آپ فوراً ڈاک خانے جائیں اور سوا روپیہ بخشش دے آئیں۔" انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کا ایک ایک لفظ بہو کے دل پر زخم لگا رہا تھا۔ "اور تمہارے سسر تو مجھے طعنے دیتے رہے کہ میں دادی بننے والی ہوں اس لیے مسرت سے پاگل ہو جاؤں گی۔ ان مردوں کو ہم عورتوں کا خیال کیسے آ سکتا ہے؟ کتنے سالوں بعد گھر میں پالنا بندھے گا۔ گھر سونا سونا ہو رہا تھا۔ ارے زندگی سونی ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہو گیا۔ پھر چندن کو خاموش دیکھ کر بولیں۔ "صرف ہوں ہاں کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ کیا چپ رہنے کی قسم کھالی ہے؟" پھر خود ہی چندن کا جواب دے دیا۔ "پہلی بار ہے لہٰذا شرم آ رہی ہوگی۔ مگر مجھ سے شرمانا کیسا؟ میں تو تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔"

شام تک چندن اپنے دل پر جبر کیے رہی مگر جب ساس نے مٹھائی تقسیم کرنے کی بات کی تو اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ کرتارا تو نہانے دھونے کے بہانے کنویں پر چلا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بھابی کہاں تک بات چھپا میں گی؟ آخر انہیں سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔

"بہو اتنا رونا کس بات پر آ رہا ہے؟" ماں جی کو اپنے دل میں خوف سا محسوس ہوا۔ "تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟ تمہیں میرے بیٹے کی قسم ہے اگر نہ بتاؤ۔" کنارے کے بند توڑ کر دریا کا سیلاب جس طرح بہنے لگتا ہے اسی طرح چندن کے آنسو امڈ نے لگے۔ سسکیاں، آہیں، آنسو...... ماں جی کا دل بیٹھنے لگا۔ سوہن سنگھ اندر دوڑ آئے۔

"کیا ہوا......؟" ماں جی چندن کی پشت پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔ "بتاؤ تو سہی، کیا ہوا ہے؟ جگت سے جھگڑا کر کے تو نہیں آئیں؟" مگر چندن آنسو اور سسکیاں روک نہ سکی۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکی، سوہن سنگھ نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"کچھ تو بولو! ہمارے دل بیٹھ رہے ہیں۔"

"یہ کچھ نہیں بتا سکیں گی۔ میں بتاتا ہوں۔" یہ سن کر دونوں چونکے۔ کرتارا کھلے ہوئے بھیگے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا سامنے کھڑا تھا۔ پہلی بار دونوں نے اس کے چہرے پر درد کی جھلک دیکھی۔

"جگت گرفتار ہو گیا ہے۔" کئی بار دل میں دہرایا ہوا جملہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

ماں جی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چیخیں۔ "نہیں، نہیں......" پھر منہ چھپا کر روتی ہوئی چندن سے لپٹ گئیں۔ "ہائے رے کم نصیبی......"

سوہن سنگھ ساس بہو کو روتا چھوڑ کر باہر آ گئے۔ انہیں تفصیل سے بات سننی تھی۔ گرفتار ہونے سے پہلے جگت زخمی ہوا ہوگا یہ شک انہیں ستانے لگا۔ جگت

کی ماں کے آنسو اچانک تھم گئے۔ انہیں یاد آیا کہ انہوں نے آخری بار بیٹے کو بددعا دی تھی۔ "پھانسی پر چڑھ جا! تاکہ ہم سب کو چھٹکارا ملے۔" اب ان کی نگاہوں میں پھانسی کا پھندہ گھومنے لگا۔ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر بھی ان کے ذہن سے وہ منظر اوجھل نہ ہوسکا۔

O.....O.....O

اسی وقت سچ مچ جگت رسی سے لٹک رہا تھا۔ مگر پھانسی کے تختے پر نہیں، بلکہ درخت کی شاخ سے بندھی ہوئی رسی کے سہارے اوندھے منہ لٹک رہا تھا۔ "جھڑیالہ کے جوہری بازار میں لے جارہے ہیں۔" یہ کہہ کر پولیس چیف اسے لایا تھا۔ وہ جھڑیالہ تو لے آیا مگر جوہری بازار میں نہیں ایک ویران جنگل میں جہاں جگا پر دل کھول کر ظلم کیا جاسکتا تھا...... جگا کتنا چالاک ہے؟ اس کا پورن سنگھ کو پہلے قدم پر ہی تجربہ ہوچکا تھا۔ وہ اسے فرید کوٹ سے گرفتار کرکے لے جارہا تھا اس وقت جگت نے ضد کی۔ "مجھے گرفتار کیا گیا ہے اس کے متعلق یہاں کے پولیس تھانے میں رپورٹ ہونی چاہیے۔"

پورن سنگھ کو تعجب ہوا۔ "ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ امرتسر میں رپورٹ کردیں گے۔"

"تم غیر قانونی کام کرو گے تو فائدہ نہ ہوگا پورن سنگھ۔" جگت نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"تو تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"دھمکی دینے کی مجھے عادت ہے۔" جگت نے بے پروائی کا اظہار کیا۔ "پولیس کی بددیانتی کا پہلے بھی مجھے تجربہ ہوچکا تھا۔" پورن سنگھ کو سخت غصہ آیا مگر اسے بات ماننی پڑی۔ ممکن ہے وہ جگا کو پیش رکھنا چاہتا ہو یا پھر اس کے ساتھی ابھی آزاد ہیں ان کا اسے ڈر لگا ہو۔ فرید کوٹ کے تھانے پر رپورٹ کرا کر امرتسر کے لیے روانہ ہوئے تو اس نے پوچھا۔

"جگا! تم نے اس کے لیے کیوں ضد کی تھی؟"

جگت ہنس دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ مجھے زندہ پکڑ کر تم نے دردسری مول لے لی ہے۔ میرے جرائم ثابت کرنا تمہیں بھاری پڑجائیں گے۔ لہٰذا شوٹ ایٹ سائٹ کے آرڈر کا فائدہ اٹھا کر تم مجھے راستے میں شوٹ کردیتے پھر یہ ظاہر کرنا معمولی بات ہوتی کہ جگت پولیس فائرنگ سے ہلاک ہوگیا۔" اس نے پورن سنگھ کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ "اب فرید کوٹ تھانے میں رپورٹ ہونے کے بعد ایسا کرنا تمہارے لیے مشکل ہے۔" پورن سنگھ متعجب ہوگیا۔ واقعی اسے یہی خیال آیا تھا پھر بھی اس نے جگت سے کہا۔

"جگا! تم بہت چالاکی دکھا رہے ہو۔"

امرتسر لاکر ایک دن تو اس نے جگا کو منانے کی کوشش کی۔

"اپنے جرائم قبول کرلو، تمہیں کم سزا ہو میں اس کے لیے کوشش کروں گا۔ جوہری بازار کے ڈاکے کا اقرار کرلو! اپنے ساتھیوں کے نام بتاؤ، ٹھکانے بتاؤ، پھر میں سب ٹھیک کرلوں گا۔" جگت نے کسی قسم کا جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دن گزارنا چاہتا تھا تاکہ ہوشیار کلکتہ کے باہر چلا جائے۔ یہ ضروری تھا، مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کی گرفتاری ابھی چھپائی گئی ہے۔ پورن سنگھ نے رام سنگھ کو دہلی سے بلاکر یہ خبر دی۔ وہ بہت خوش ہوا۔

"وہ بیوقوف اب پنجے میں آیا ہے۔" اس نے پورن سنگھ کو پانی پر چڑھایا۔ "اسے پٹانے سے کام نہیں بنے گا۔ اچھی طرح مارو سالے کو...... عدالت میں پیش کرنے کے بعد ہم انگلی تک نہیں

لگا سکیں گے۔'' یہی وجہ تھی کہ پورن سنگھ اسے جھڑیالہ لے آیا تھا۔

''شام تک تمہیں قبول کرنا پڑے گا۔''

''اور اگر نہ کروں پھر؟'' جگت نے پوچھا۔ اس کا جواب دینے کی بجائے چیف نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا۔

''اسے اوندھے منہ لٹکاؤ۔'' پیر باندھنے کے لیے چار آدمی ٹوٹ پڑے۔ اسے گرایا گیا مگر وہ بپھر گیا۔

''تمہیں میں بتاؤں گا کہ کس طرح قبضے میں کیا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک کو دور اچھال پھینکا۔ پورن سنگھ نے وزن دار جوتے کی دو چار ٹھوکریں پشت پر ماریں۔

''اب تمہاری داداگیری نہیں چلے گی۔''

بمشکل پیر جکڑنے کے بعد اسے سوکھے درخت کی موٹی شاخ سے لٹکا دیا گیا۔ پورن سنگھ کو یقین تھا گرمیوں کے دہکتے ہوئے سورج اور گرم ہوا کے جھونکوں کے مقابلے میں وہ زیادہ جم نہیں سکے گا۔

''اگر لٹکانا ہے تو پھانسی پر لٹکا دو کمینو۔'' یہ کہتے ہوئے جگت نے دانت پیس لیے۔ نصف گھنٹے کے بعد جگت کے جسم میں سخت درد ہونے لگا جیسے جسم کی ایک ایک رگ ٹوٹ رہی ہو۔ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ پسلیاں چٹخنے لگیں۔ پیاس کے مارے حلق سوکھ گیا۔ سانس لیتے وقت سینے میں درد ہونے لگا۔ پسینے کا ریلا جسم پر بہنے لگا۔

''کیوں...... بڑی پیاس لگی ہے؟'' پورن سنگھ ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ چھاؤں کی خاطر ایک پولیس والا چھتری تھام کر اس کے برابر کھڑا ہوا تھا۔ ''پانی نہیں تو شراب پیو گے؟''

جگت نے سوکھے لبوں پر زبان پھیری۔ پسینے کا کھارا پن زبان پر محسوس ہوا۔ اس نے تھوکنے کی کوشش کی مگر تھوک حلق میں سوکھ چکا تھا۔ ایک ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں بوتل تھام کر پورن سنگھ شراب کی دھار پیالے میں ڈالتا ہوا جگت کو دیکھنے لگا۔ جگت کی آنکھوں میں پیاس کے شعلے دہک رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ بوتل میز پر رکھ کر پیالہ ہونٹوں سے لگا کر اس طرح آواز کے ساتھ چسکیاں لینے لگا جیسے بڑا لطف آ رہا ہو۔ وہ جگا کو تڑپتا دیکھ کر لطف لے رہا تھا۔

''بڑی مزے دار شراب ہے۔''

دھوپ میں دہکتے ہوئے جگت کے چہرے پر غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسے پورن سنگھ کی گردن دبا دینے کی خواہش ہوئی۔ اسے مزید ستانے کی خاطر پورن سنگھ نے اپنے جوتے پر تھوڑی سی شراب ٹپکائی اور پیر اس کی جانب بڑھایا۔ ''لو...... چاٹ لو! پیاس بجھ جائے گی۔'' بپھرے ہوئے جگت نے جسم کو جھٹکا دیا اور لٹکتے ہوئے ہاتھ کا جھپٹا مار کر پورن سنگھ کا پیر پکڑ لیا اور دانت پیس کر پیر کو بل دیا۔ پورن سنگھ چیخ مار کر کرسی سے الٹ گیا۔ شراب کا پیالہ اور بوتل گر گئے۔ جگت کی پشت پر دو چار رائفل کے بٹ مارے گئے تو اس نے پورن سنگھ کا پیر چھوڑا۔ الٹے ہوئے چیف کو پولیس والوں نے اٹھا کر کھڑا کیا تو جگت قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ پورن سنگھ کو تاؤ آ گیا' اسے جگت کو شوٹ کر دینے کی خواہش ہوئی مگر اس طرح ملزم پر ظلم ہونے کا ثبوت مل جانے کی صورت میں کیس کمزور ہو جانے کا ڈر بھی تھا۔ اس نے دھمکی کے ذریعے غصے کا اظہار کیا۔

''تمہارے جیسے نالائق پر رحم کھانا بھی گناہ ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے اقرار کے بغیر میں تمہیں پھانسی پر نہیں لٹکا سکوں گا؟'' پھر ہاتھ کی مٹھیاں کس

کر بولا۔ ''چنا کو سرکاری گواہ بنا کر آسانی سے کام کرلوں گا۔'' چنا کا نام سن کر جگت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے ہونٹ کاٹ لیے۔ اس نے سوچا وہ بیوقوف غدار نکلا مگر اس نے کچھ نہ بولنا مناسب سمجھا ممکن ہے پورن سنگھ دھوکہ دے کر اس سے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو۔

شام جگت کو جب اتارا گیا تو اس کے سینے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ پورن سنگھ نے جگت کی نبض پر ہاتھ رکھا' اسے فکر ہوئی۔ ''اگر یہ ختم ہوگیا تو......؟'' وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔

O......O......O

''آؤ چنا!'' پورن سنگھ کے کمرے میں چنا کو لایا گیا تو چیف نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''تم نے پتہ بتایا تھا اسی لیے جگا گرفتار ہوگیا۔'' چنا یہ الفاظ سن کر اس طرح بھڑک کر پیچھے ہٹ گیا جیسے اس کے پاؤں سے سانپ لپٹ گیا ہو۔ پورن سنگھ مسکرا دیا۔ ''کیوں...... چونک گئے؟''

پھر اس نے دونوں پولیس والوں کو باہر بھیج دیا۔ اب دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔ چیف غور سے چنا کو دیکھ رہا تھا۔ چنا نے نظریں جھکالیں۔ ''دیکھو چنا! تم جوان ہو' نادان ہو' تمہارے سامنے زندگی پڑی ہوئی ہے' اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ضائع کرنے سے پچھتانے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' مگر چنا نے نظریں نہیں ہٹائیں۔ وہ اب پچھتا رہا تھا کیونکہ اسے دھوکہ دیا گیا تھا۔ اب چیف کوئی دوسرا داؤ چل رہا تھا۔ اس سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

''بیوہ ماں کے تم اکلوتے بیٹے ہو۔ مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ جگا کے ساتھ تم غلط راہ پر چلے گئے مگر عدالت کو تم پر رحم نہیں آئے گا۔'' پھر بھی چنا خاموش رہا۔ پورن سنگھ اب اپنی آواز میں ٹھہراؤ نہیں رکھ سکا۔ ''مختصراً کہے دیتا ہوں۔ سرکاری گواہ بن جاؤ۔ چھوٹ جاؤ گے۔'' چنا کی گردن جھٹکے سے اوپر اٹھ گئی۔ پورن سنگھ اس کی حرکت کو سمجھ نہیں سکا مگر اتنی امید ہوگئی کہ اس پر اس کی بات کا اثر ضرور ہوا ہے۔ ''تمہیں جگا سے ڈر لگ رہا ہے؟'' پورن سنگھ نے پوچھا۔ جواب میں چنا نے نظریں جھکالیں۔ پورن سنگھ میز پر ہاتھ مار کر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ''اب وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ کچھ دنوں بعد پھانسی پر لٹک جائے گا۔'' پھانسی کا نام سن کر چنا لرز گیا۔ پورن سنگھ یہ دیکھ کر پر جوش انداز میں بولا۔ ''ہمارا ساتھ نہ دیا تو تمہیں پھانسی پانے میں جگا کا ساتھ دینا پڑے گا۔'' پورن سنگھ نے میز پر سے پنسل اٹھا کر سفید کاغذ پر پھانسی کا پھندا بنایا۔ ''تم لاکھ گڑگڑاؤ گے مگر پھر کچھ نہیں ہوگا۔'' پورن سنگھ جواب کا منتظر تھا۔ یہ سوچ کر چنا حلق تر کرتا ہوا بولا۔

''مگر صاحب! مجھے سوچنے کے لیے وقت دیں۔'' تجربہ کار چیف نے محسوس کیا نصف کام ہوگیا۔ آدمی سوچنے کا وقت مانگے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ کچھ نرم ہوا ہے۔

''سوچنے کا وقت نہیں دوں گا۔ البتہ تمہیں جو کچھ قبول کرنا ہے اسے یاد کرنے کا وقت دے رہا ہوں۔ صرف دو دن کے لیے۔'' چنا کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پورن سنگھ نے تالی بجائی' دو پولیس والے آ کر چنا کو لے گئے۔ ''اسے کوئی تکلیف نہ ہو' یہ خیال رکھنا۔'' یہ چنا نے جاتے جاتے سنا۔ ''پیاس بجھانے کے لیے پینے کا انتظام بھی کردینا۔ درمیان میں چلتے ہوئے چنا پر دونوں پولیس والوں کو رشک آنے لگا۔

''سالے کے مزے ہوگئے۔'' ایک سپاہی

بڑبڑایا۔ تنہا ہونے کے بعد پورن سنگھ نے سرخ پنسل لے کر کاغذ پر مزید کچھ بنایا۔ پھانسی کے پھندے میں ایک آدمی کی پھنسی ہوئی گردن بنائی' پھر اس کے جبڑے بھینچ گئے' وہ بڑبڑایا۔

''اب تمہاری موت کا راستہ صاف ہوگیا جگا۔''

پولیس حوالات کی تنگ کوٹھڑی میں بیٹھا جگت زنجیر کو گھور رہا تھا۔ اس بندھن سے کس طرح آزاد ہوا جائے؟ یہ خیالات اس کے ذہن میں گردش کررہے تھے۔ اسے سخت نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ اسے درخت سے الٹا لٹکا کر اس پر کیئے گئے ظلم کی تکلیف اسے دکھ پہنچا رہی تھی۔ اب بھی جسم میں درد ہو رہا تھا۔ ساری رات اس نے کراہتے ہوئے گزاری تھی۔ نیم بے ہوشی میں گالیاں بھی بکتا رہا تھا پھر بھی اطمینان تھا کہ امتحان سے پار اتر گیا۔ پورن سنگھ اس کے ساتھیوں کے نام جاننا چاہتا تھا۔ مال کہاں چھپایا ہوا ہے؟ اس کے متعلق اگلوانا چاہتا تھا۔ مگر وہ مضبوط رہا اس نے بار بار یہی کہا۔

''میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم سے جو ہو کرلو' میں برداشت کروں گا۔''

صبح اسے عدالت میں پیش کرنا تھا۔ ثبوت جمع کرنے کے لیے پورن سنگھ نے دس دن کا ریمانڈ لے لیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جگا کو پھانسی گھر تک پہنچا دے گا۔ کیونکہ چنا اس کے ہاتھ میں ترپ کارڈ تھا۔

''چنا......!'' غصے سے جگت نے دانت پیس لیے۔ آج عدالت میں وہ جگت سے آنکھیں نہیں ملا سکا تھا۔ ''بیوقوف! تجھے یار سے زیادہ جان پیاری تھی مگر تو اس طرح میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔ اس وقت تو پولیس کے پہلو میں گھر کر یہاں سے چلا جائے گا' میرے باہر آنے کے بعد تیری زندگی کتنے دن رہے گی؟ میں پھانسی پانے سے پہلے تجھے ختم کردوں گا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''جگا! کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔''

یہ سن کر وہ چونکا۔ سپاہی دور کھڑا رہ کر بات کررہا تھا۔ جگت کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلے اسے قریب جانے سے ڈرا رہے تھے پھر چیف نے بھی تاکید کی تھی کہ خبردار جگا سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ بدمعاش بہت چالاک ہے۔ باتوں میں پھنسا کر رائفل چھین لے گا۔

''کوئی ملنے آیا ہے؟ جگت نے سوچا۔ باپو نانا یا کرتارا ہوا تو اچھا ہے۔ دو تین کام سپرد کرنے ہیں مگر وہ تو کوئی انجان ہستی تھی۔ پورن سنگھ اسے لے کر آرہا تھا۔

''یہ رہا تمہارا موکل اور جگا! یہ ہیں تمہارے وکیل۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''جگا! تمہارے گھر والوں کو وکیل صاحب کی جیب تر کرنے کی حماقت سوجھی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''وکیل صاحب! تم لاکھ کوشش کروگے مگر کیس ہار جاؤ گے۔ اب تو اسے بھگوان بھی نہیں بچاسکتے۔ وہ یہ کہتا ہوا لوٹ گیا۔ وکیل نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ جگت کو غور سے سرتاپا گھورنے لگا۔

''جگت سنگھ!'' ایک نرم آواز سنائی دی۔ جگت کو اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے پر تعجب ہوا۔ وہ ابھی پورن سنگھ کے الفاظ کے اثر سے آزاد نہیں ہوا تھا جیسے وکیل نے پولیس چیف کے الفاظ سنے ہی نہ ہوں' وہ اسی طرح پرسکون تھا۔ ''تمہاری صفائی کے لیے مجھے تمہارا وکیل بنایا گیا ہے۔'' سپاہی کے دور جانے کے بعد وکیل نے بات شروع کی۔

''کس نے......؟''

''کرتارا نے۔'' پھر فوراً بولا۔ ''مس. کا نام درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔ میں تمہارے گھر والوں

کی جانب سے مقرر کیا گیا ہوں تمہارے وکیل کی حیثیت سے۔" کرتارا نے کام شروع کر دیا یہ سن کر جگت خوش ہوا۔ "پولیس چیف کون سے ثبوت پر اتنا اترا رہا ہے؟" وکیل نے پوچھا۔

"میرا ایک ساتھی غداری کر گیا ہے...... چنا۔" جگت کچھ دیر رکا پھر آہستہ سے بولا۔ "مگر اس کی فکر نہیں وہ ثبوت فراہم کرنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ وکیل سکتے میں آ گیا۔ جگت ہنسا۔ "میرا حساب صاف رہتا ہے وکیل صاحب اس نے مجھ سے غداری کی لہٰذا بدلہ لینا ضروری ہے۔"

پھر کچھ پوچھ گچھ کرنے کے بعد وکیل نے کاغذ پر نوٹ بنایا۔ "ابھی تو صرف معلومات کی خاطر پوچھ رہا ہوں۔ کیس داخل ہونے کے بعد چارج شیٹ پڑھ کر ہی آگے کام شروع کروں گا۔" جگت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قانون کی الجھنوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وکیل نے آس پاس نظر کر کے پوچھا۔

"کرتارا سے کچھ کہنا ہے؟" جگت سوچ میں ڈوبا ہوا اسے دیکھنے لگا۔ اس لیے مزید بولا۔ "اس نے معلوم کیا ہے کہ فرید کوٹ والا مکان واپس کر دے؟" جگت چونکا کرتارا نے کیا پچھوایا ہے؟ وہ سمجھ گیا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مال کہاں چھپایا ہے؟ مگر وکیل پر اعتماد کیا جائے یا نہیں؟ ممکن ہے پورن سنگھ نے اس کی معرفت معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس نے چہرے پر بغیر کوئی تاثر پیدا کیے کہا۔

"اس گھر میں اب کیا رہا ہے؟ مگر باپ بننے والا ہوں یہ خبر میں نے وہیں سنی تھی۔ اس لیے کسی کو نہ دے تو بہتر ہے۔" وکیل آگے کچھ پوچھے گا یا نہیں یہ دیکھنے کے لیے وہ کچھ دیر رکا۔ مگر وکیل نے تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ "اور ہاں! آنگن میں جو پھولوں کا پودا بویا ہے اسے پانی دیتے رہنے کے متعلق ضرور کہنا۔" وکیل مسکرا دیا۔ بدلہ لینے کی خاطر قتل کرنے والا یہ شخص پھولوں کے پودے کی کیسی فکر کر رہا ہے۔

"بہتر ہے...... میں کہہ دوں گا۔" یہ کہہ کر وکیل جانے لگا تو جگت پھر بولا۔

"ایک بات اور......" وکیل قریب آ گیا۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ "کرتارا سے چنا کی بات کہنا۔ اس نے بے ایمانی کی ہے۔" وکیل کے کچھ دور جانے کے بعد جگا بولا۔ "گھر والوں سے کہنا میری فکر نہ کریں۔" اس بار آواز میں نرمی تھی۔ یہ بات وکیل نے بھی نوٹ کی۔



پھولوں کے پودے کو پانی دینے کے بارے میں جگت کی تاکید وکیل سے سن کر پہلے تو کرتارا بھی کچھ نہیں سمجھا۔

"ابھی جان بچانے کی فکر کر بھائی۔ عورت کے پیٹ میں جو پھول پل رہا ہے وہ کھلنے سے پہلے مرجھا نہ جائے۔" مگر دو تین بار اس بات پر سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں روشنی ہو گئی۔ "کہیں جگا نے اس طرح کوئی پیغام تو نہیں دیا؟" یہ خیال آتے ہی وہ فرید کوٹ پہنچ گیا۔ سنسان اندھیرے میں اس نے پھولوں کا پودا اکھاڑ دیا۔ دو تین فٹ زمین کھود ڈالی اور اس نے جو اندازہ لگایا تھا وہ درست نکلا۔ سونے چاندی کے زیورات کا بنڈل جوہری کی لوٹ کا مال وہ مسرت آمیز لہجے میں بڑبڑایا۔

"تمہاری عقل کی داد دیتا ہوں جگا! اب میرے بازوؤں کی طاقت دگنی ہو گئی۔" عدالت میں آخر تک لڑنے کا ذریعہ ہاتھ آ گیا تھا۔

ایک کام نمٹ گیا اس لیے کرتارا نے دوسرا کام

ہاتھ میں لیا۔ اب اسے چنا کو ختم کرنا تھا مگر وہ ابھی پولیس کے قبضے میں تھا۔ اسے پولیس کے قبضے سے باہر نکالنے کی کوئی سبیل کرنی تھی۔



پنا سنگھ ہوٹل میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ کرتارا برابر کی کرسی پر آ کر بیٹھا مگر اسے ہوش نہیں تھا۔

"اے چھوکرا! دو چائے لاؤ۔" کرتارا نے آرڈر دیا تب بھی پنا سنگھ نے گردن نہیں اٹھائی۔ چائے کے دو کپ میز پر رکھے گئے۔ کرتارا نے ایک کپ اس کی جانب دھکیلا۔ "لو چائے پیو۔ دماغ تازہ ہوگا۔" پنا سنگھ چونک گیا۔ یہ کون شخص ہے؟ بہت یاد کیا مگر سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے کپ سامنے دیکھ کر تجسس کا اظہار کیا تو کرتارا ہنسا۔

"بغیر جان پہچان کے کیوں چائے پلا رہا ہوں۔ یہ پوچھنا چاہتے ہو؟" پھر چائے کا کپ اٹھا کر بولا۔ "چائے پیتے ہوئے ہم لوگ ایک دوسرے کا تعارف کرائیں گے۔" پنا سنگھ کی سمجھ میں اس کا ڈھنگ نہ آیا مگر اس نے چائے پینے سے انکار نہیں کیا۔ کرتارا نے بغیر تمہید کے بات شروع کی۔ "چنا تمہاری معشوق کا بیٹا ہوتا ہے؟" پنا سنگھ کے ہاتھ میں کپ لرزنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ بات کرنے والا شخص جگا کا آدمی ہے۔ گھبرا کر بھاگ نکلنے کا خیال آیا مگر اس میں خطرہ تھا۔ وہ بمشکل چائے کے دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر بولا۔

"اس نے نادانی کی۔ میں نے بہت سمجھایا کہ مضبوط رہنا..... تمہیں کچھ نہیں ہوگا پھر بھی ڈر کر پولیس کے سامنے سب کچھ اگل دیا۔"

کرتارا کو اتنی جلدی نتیجے کی امید نہیں تھی۔ وہ ہوشیار ہوگیا۔ "یعنی تمہیں پتہ تھا کہ وہ جگا کا ساتھی تھا؟"

"ہاں! اس کی ماں نے مجھے کہہ دیا تھا۔" پھر فوراً ہی بات بنائی۔ "چنا کی گرفتاری کے بعد مجھے پتہ چلا تھا۔"

"ہم....." کرتارا نے چائے کا کپ خالی کیا۔ "وہ شاید یہی سمجھ رہا ہے کہ جگا کے خلاف گواہی دے کر زندہ بھی رہے گا۔" پنا سنگھ اس دھمکی کو سمجھ نہ سکتا اتنا بےوقوف بھی نہیں تھا۔

"اپنے کیے کو خود بھگتے گا مجھے کیا؟ میں اس کا سگا باپ نہیں ہوں۔"

"میرا ایک کام کرے گا؟" کرتارا اب مطلب کی بات پر آ گیا۔ "اس سے جا کر کہہ دو کہ منہ بند رکھے۔ ورنہ....."

"سمجھ گیا۔" پنا سنگھ یہی چاہتا تھا۔ "میں آج ہی ملنے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا۔

کرتارا نے اسے گھورا۔ "تو اگر کوئی چال بازی کرے گا' اس صورت میں موت سے ہی ملاقات ہوگی۔ سمجھا؟ پولیس کو مخبری کرنے سے تجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے جگا کا ساتھی بتانے جائے گا تو لوگ تیرا مذاق اڑائیں گے۔"

"مجھے تمہاری بات میں چالاکی دکھانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟" پنا سنگھ نے کہا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ وہ دل میں بہت خوش تھا کہ اب چنا سرکاری گواہ بن کر بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس سے پہلے وہ لوگ اسے ختم کر دیں گے۔



"پنا سنگھ تمہاری داشتہ کا بیٹا اگر گواہ بننے سے انکار کرے گا تو میں اسے پیٹ ڈالوں گا۔" پورن سنگھ نے جھنجلا کر کہا۔

"صاحب! مجھ سے یا آپ سے بہتر یہ کام اس کی ماں کر سکے گی۔" پنا سنگھ نے مختلف قسم کی چال،

آزمائی۔ "بس تم اسے تھوڑے دن ضمانت پر رہا کردو۔"

"ضمانت پر؟" پولیس چیف کو غصہ آ گیا۔ "میرے ہاتھ میں یہی ترپ کارڈ ہے اسے بھی گنوا دوں؟ جگا کے ساتھی اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیں گے۔ یہ تمہیں پتہ ہے؟"

پنا سنگھ کو یہی تو کرنا تھا مگر پولیس چیف کو منائے کس طرح؟ ذہن پر زور دیا اور ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے ایک داؤ اور پھینکا۔ "صاحب ایسا ہوسکتا ہے یا نہیں؟" پورن سنگھ متجسس نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے پنا سنگھ کی چالاکی پر اعتماد تھا۔

"کیا ہونے کا پوچھ رہے ہو؟" وہ جلدی سے بولا۔

"چنا کو ضمانت پر رہا کردو، جگا کے ساتھی اسے ختم کرنے کے لیے اس کا تعاقب کریں گے۔ اس میں دوگنا فائدہ ہے۔ دوسرے دو چار بھی ہاتھ لگ جائیں گے۔ پھر اکیلے چنا پر آپ کو آسرا نہیں کرنا پڑے گا۔ جیسے وہ رہا ہو کر باہر آئے آپ چار پانچ آدمی اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا دو، وہ کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا ہے؟ سچ مچ اس کا ارادہ کیا ہے؟ سب پتہ چل جائے گا۔" اس ترکیب پر پورن سنگھ کا دل داد دینے کو چاہنے لگا۔ اسے خود یہ ترکیب کیوں نہیں سوجھی؟ اپنی مسرت کو دبا کر اس نے صرف اتنا کہا۔

"مجھے اس بات میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر بھی سوچوں گا۔"

پنا سنگھ سمجھ گیا کہ بات صاحب کے حلق سے نیچے اتر گئی ہے۔ مگر اپنے برے ارادے کی بو نہ آئے اس لیے راز کی بات کہہ دینی پڑی۔ "چنا کی ماں کو تیسرا مہینہ چل رہا ہے صاحب! بیٹا کچھ دن گھر رہے گا تو اس کے دل کو بھی مسرت ہوگی۔"

پورن سنگھ نے خوش انداز میں اس کی پشت تھپتھپائی۔ "تم بڑے پکے نکلے یار... اب بے چاری تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکے گی۔" دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔

O......O......O

ضامن کی درخواست کے متعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ نے اختلاف نہیں کیا اور عدالت نے ضمانت کی درخواست منظور کرلی۔ چنا کو سخت تعجب ہوا، ماں نے ضمانت کے پانچ ہزار روپے کہاں سے لاکر دیئے؟ پنا سنگھ نے مدد کی بھی تو کیوں؟ اسے اتنی رقم کوئی قرض نہیں دے گا۔ پنا کے خلاف اس کی نفرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی دوران پورن سنگھ نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

"تمہاری ماں پر رحم کھا کر میں نے تمہیں ضمانت پر رہا ہونے دیا ہے یہ یاد رکھنا۔" پولیس چیف نے اپنے ذہن میں گونجتی ہوئی بات اس سے کہہ دی۔ "تمہاری ماں صدمہ جھیلنے کی قوت نہیں رکھتی۔ اسے کچھ ہوگیا تو دو زندگیاں تباہ ہوجائیں گی۔ اس کا پاپ تیرے سر ہوگا۔"

"دو زندگیاں......"

"تمہیں پتہ نہیں؟ وہ بے چاری دو جان سے ہے۔"

یہ سن کر چنا کو آگ لگ گئی۔ اب ماں کا منہ بھی نہیں دیکھا جائے گا۔ اس کا دماغ پکنے لگا۔

"جاؤ! تمہیں ہم پولیس جیپ میں گھر بھیج رہے ہیں۔" پورن سنگھ نے اسے خیالات سے بیدار کیا۔ "واپس آؤ گے تو سرکاری گواہ بننے کی خوشخبری سنانا۔" چنا نے جس طرح پولیس چیف کی جانب دیکھا اس سے پورن سنگھ الجھن میں پڑ گیا۔ اس شخص

کے ذہن میں کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟'' پولیس تھانے سے باہر آنے سے پہلے اسے جگت کی کوٹھڑی کے سامنے سے گزرنا تھا۔

''سالے..... بے ایمان! میں تمہاری کھال اتار دوں گا۔'' یہ سن کر وہ لرز گیا۔ بمشکل اس نے جگت کی جانب دیکھا اس کی آنکھوں سے غصہ اور نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔ چنا سر جھکا کر جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ اس نے جاتے ہوئے دو چار فحش گالیاں سنیں۔ پولیس جیپ اسے گھر تک چھوڑ گئی۔ اس سے لپٹ جانے کے لیے چوکھٹ میں کھڑی آنسو بہاتی ہوئی ماں کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے چنا سب کچھ بھول گیا۔ چاروں جانب سے نفرت ملی تھی مگر ماں کی ممتا میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے سینے پر سر رکھ کر جی ہلکا کرنے کو جی چاہا۔

''ماں.....'' کہتا ہوا وہ جھپٹا۔ پرم جیت نے بیٹے کو سینے سے لگالیا۔

''بیٹا تم ٹھیک تو ہو؟'' کچھ دیر ماں بیٹے کے درمیان پیار کا مقدس بادل چھا گیا۔ مگر جیسے ہی چنا کا ہاتھ پرم جیت کے پیٹ پر لگا اس کے ذہن میں نفرت کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ جھٹکے کے ساتھ ماں سے الگ ہو گیا۔ ماں کو اس کی یہ حرکت بیہودہ محسوس ہوئی ممکن ہے جوان بیٹے کو ماں سے لپٹ جانے میں شرم محسوس ہوئی ہو یہ سمجھ کر وہ خاموش رہی۔ چنا سنگھ جان بوجھ کر گھر پر نہیں رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ چنا جیسے ہی ضمانت پر رہا ہو کر آئے گا کرتارا کے آدمی اسے ختم کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔ پرم جیت کو اس نے سمجھایا تھا کہ وہ یہاں ہوگا تو ماں بیٹے کو تکلیف ہوگی' چنا کو ماں کی یہ بات صحیح معلوم ہوئی۔

''اور آج رات چھت پر سونا.....'' اس طرح اشارے میں پرم جیت نے پنا کو سمجھایا تھا مگر رات گھر آ کر پنا کو معلوم ہوا کہ چنا سارا دن گھر میں بند رہا تھا۔ باہر برآمدے میں اس نے پرم جیت سے کہا۔

''اسے ذرا باہر کھلے میں گھومنے دینا تھا۔'' پھر پوچھا۔ ''اس سے میرے متعلق بات کی تھی؟ اسے ضمانت پر رہا کرانے کے سلسلے میں مجھے کس قدر تکلیف ہوئی تھی۔ اب مجھے گھور کر نہ دیکھے۔ یہ بھی کہہ دینا۔'' پھر آواز میں مصنوعی ہمدردی پیدا کر کے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ''کل باہر جا کر موج کرے۔ پکچر وغیرہ دیکھے۔ گھر میں گھسے رہنے سے ذہن پر شیطان سوار ہو جاتا ہے۔'' اس سے ملنے کے لیے چنا کمرے سے باہر نہیں آیا یہ دیکھ کر پنا سنگھ سمجھ گیا کہ اس سے چنا کو کس قدر نفرت ہے مگر اب اسے چنا کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ کل تو وہ ٹھکانے لگ جائے گا۔ کوئی گیت گنگناتا ہوا پنا سنگھ چھت پر سونے چلا گیا۔



چنا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ آج کی رات تو وہ سونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہی ایک رات اس کے پاس تھی۔ اس کی خاطر تو اس نے کمرے میں سونے کا انتظام کر رکھا تھا مگر ماں کو ابھی نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟ وہ پہلو بدل رہی ہے۔ نصف رات کے بعد گرمی کی شدت کم ہوئی تو چنا نے دیکھا' کہ اس کی ماں اب سوگئی تھی۔ وہ آہستگی سے بستر سے اٹھا' بے آواز چلتے ہوئے لکڑی کی الماری کے قریب گیا اور اسے کھول کر اندر سے کرپان نکالی۔ میان سے نکلی ہوئی کرپان کی چمکتی ہوئی دھار دیکھنے لگا۔ جسم پر پسینہ بہنے لگا تھا اس کا خیال آتے ہی اس نے اپنے کرتے کی آستین سے منہ صاف کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے میان گر پڑی۔

چنا چونک گیا۔ ماں جاگ تو نہیں گئی؟ یہ دیکھنے کے لیے وہ اس کے قریب چلا گیا پھر اطمینان کی سانس لے کر ماں کے پیٹ کو پھولتے پچکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ چنا نے دانت پیس لیے۔

"اس پیٹ میں اس کمینے کا بیج پرورش پا رہا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ پھر نظر گھومتی ہوئی ماں کے چہرے پر جم گئی۔ وہ کچھ ٹھٹکا ہوا۔ بلی کے سے قدموں سے چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا' زنجیر کھولی تو کرپان والا ہاتھ ذرا سا کپکپایا' ماں پر آخری نظر ڈال کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ آس پاس نظر گھمائی' پچھلی شب کی ٹھنڈی ہوا میں سب گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے سوچا دروازے کو باہر سے بند کر کے زنجیر چڑھا دے تاکہ ماں بیدار ہو کر بھی درمیان میں نہ آ سکے۔ چھت پر جانے والی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے چہرے سے نفرت ٹپک رہی تھی۔ بس اب تھوڑی دیر بعد کھیل ختم ہو جائے گا۔ چھت کی کھلی فضا میں وہ چند لمحے کھڑا رہا۔ کچھ دور چارپائی پر پنا سنگھ سویا ہوا تھا۔ صرف پندرہ قدم کا فاصلہ تھا۔ اس کی زندگی کا بھی اتنا ہی فاصلہ تھا۔ کرپان کی دھار پر ایک نظر ڈال کر وہ آگے بڑھا۔ چت سوئے ہوئے پنا سنگھ کی لنگی ران تک اونچی ہوئی تھی۔ چنا کے ذہن میں ایک خطرناک خیال نے جنم لیا۔

"اس کی مردانگی کی بنیاد ختم کر دوں پھر ساری زندگی جنسی محرومی سے تڑپتا رہے گا۔ یہ اسی سزا کے لائق ہے۔" پھر خیال بدل گیا۔ "نہیں...... اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے' ورنہ میری ماں کو زندگی بھر ستائے گا۔" چنا کچھ جھکا۔ پنا سنگھ خراٹے لے رہا تھا۔ کرپان کے دستے پر مضبوطی سے انگلیاں گاڑ کر چنا نے ہاتھ بلند کیا۔ "چرار" کی آواز ہوئی' پنا سنگھ نے ذرا سی حرکت کی اور چارپائی کی آواز گونجی۔ چنا ڈر گیا۔ وہ پہلو بدل جاتا تو وار کامیاب نہیں ہوگا۔ پھرتی سے اس نے بایاں ہاتھ چنا سنگھ کے منہ پر رکھ دیا اور دائیں ہاتھ سے کرپان اس کے کھلے ہوئے پیٹ میں گھونپ دی۔ پنا سنگھ ہلکی چیخ مارتا ہوا بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو چنا نے پیٹ میں سے کرپان نکال کر پھر وار کیا...... پھر وہ مسلسل وار کرتا گیا۔ آنکھیں بند کر کے پاگلوں کی طرح اس نے کرپان سے چنا سنگھ کا پیٹ پھاڑ دیا...... چوتھے وار پر چنا ہانپ گیا۔ گرما گرم خون سے کلائیوں تک اس کے ہاتھ بھر گئے۔ آخری بار تڑپ کر پنا سنگھ ٹھنڈا ہو گیا۔ خون چارپائی سے نیچے بہہ رہا تھا' پسینے سے تر اور خون سے بھرا ہوا چنا لحہ بھر پنا سنگھ کی لاش کو حقارت سے دیکھتا رہا' پھر ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور وہاں سے فرار ہونے لگا۔ سیڑھیاں اترتے ہی وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔

"چنا......!" کمرے کا دروازہ پیٹتی ہوئی ماں رونے والے لہجے میں بولی۔ "چنا! تم کہاں گئے؟" مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی ابھی دوسرا اہم کام باقی تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ مٹھیاں کستا ہوا چنا دوڑا۔ اسے ہوش نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے...... وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھاگ رہا تھا۔ گلی کے کتے بھونکنے لگے مگر اس نے کوئی پروا نہیں کی۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ دوڑتا رہا۔ ایک کھنڈر نما مندر کے عقب میں آ کر وہ رک گیا۔ سینے میں دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور مندر کے عقب والی زمین کھودنے لگا۔ تھوڑی زمین کھودنے کے بعد اس کے ہاتھ رک گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے یہ جگہ پہلے بھی کھودی ہو...... اب اسے یاد آیا کہ یہاں

نشانی کے لیے رکھا ہوا بڑا پتھر ہٹ گیا تھا۔ باقی زمین کھودتے ہوئے اس کے ذہن میں طوفان اٹھا۔

کیا پنا سنگھ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ مال یہیں چھپایا گیا ہے؟ ماں کہہ رہی تھی کہ ایک رات میں پنا سنگھ نے ضمانت کے لیے پانچ ہزار روپے لا دیئے تھے۔ میں یہاں بار بار دیکھنے کے لیے آتا تھا' ممکن ہے چھپ چھپا کر میرا تعاقب کرتا رہا ہو اور اسے پتہ چل گیا ہو...... پوری کھدائی کے بعد بھی اسے زیورات کا ڈبہ نہیں ملا تو چنا کا دماغ گھومنے لگا۔ اسی لمحے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ چار آدمی اسے گھیر کر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر چنا لرز گیا۔ یقیناً موت سر پر کھڑی تھی' وہ سوچنے لگا جگا نے اسے ختم کرنے کا اتنی جلدی انتظام کر لیا......؟

ٹارچ کی روشنی جب خون آلود لباس پر پڑی تو ٹارچ تھامنے والے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ارے...... یہ تو کسی کا قتل کر کے بھاگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ گرفتار کر لو اسے۔'' چنا سمجھ گیا کہ سادہ لباس میں پولیس اس کا تعاقب کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی ہے۔ دو آدمیوں نے چنا کو بازوؤں سے تھام لیا۔ ایک نے ہتھکڑی پہنا دی۔ چوتھے کو وہیں رہنے کا کہہ کر تین آدمی چنا کو تھانے لے گئے۔

''صاحب! اس نے پنا سنگھ کو قتل کر دیا۔'' یہ سن کر پورن سنگھ غصے میں سرخ ہو گیا۔

''سالے! تم نے یہ کیا کر دیا؟'' گرج کر اس نے چنا کے جبڑے پر چانٹا جڑ دیا۔

''ہا...... ہا...... ہا'' چنا نے لمبا قہقہہ لگایا۔ ''اب تم مجھے سرکاری گواہ نہیں بنا سکو گے۔ جگا کے خلاف مجھے گواہی نہیں دینی پڑے گی۔ ہا...... ہا...... ہا۔''

''جاؤ...... سالے کو کوٹھڑی میں بند کر دو۔'' پورن سنگھ کی آواز پھٹ گئی۔

سحر کے وقت ہونے والا شور سن کر جگا بیدار ہو گیا۔ چنا کو اپنی کوٹھڑی کے قریب لے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟'' اس نے آنکھیں ملیں۔ اسی وقت آواز آئی۔

''پاپا جی! بدلہ لے کر آیا ہوں۔ تمہارا پتہ پنا نے پولیس کو بتایا تھا۔'' پھر دونوں ہتھیلیاں جگت کو دکھاتا ہوا چلایا۔ ''دیکھو! میرے ہاتھ بھی خون سے رنگ گئے ہیں۔ اب میں بھی تمہارے ساتھ پھانسی پر لٹک جاؤں گا۔'' اس کی حالت دیکھ کر جگت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چنا پر غصے کی بجائے اب جگت کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات تھے۔

O......O......O

صدمہ پہنچانے والی خبر سنانے کے لیے لوگ اتنی جلدی دکھاتے ہیں جیسے خوشخبری لے کر آئے ہوں۔ جگت کے نانا ابھی بستر سے اٹھے ہی تھے کہ کھڑکی میں اوتار سنگھ دکھائی دیا۔

''کیا کر رہے ہو نارائن سنگھ!؟'' اس کے وقت بے وقت گھر میں آنے کی بات گاؤں میں مشہور تھی۔ ''سوچا اسی طرف سے جا رہا ہوں تو خیریت پوچھتا چلوں۔''

''اور بدلے میں چائے کا کپ پیتے جاؤ۔'' نانا دل ہی دل میں بڑبڑائے مگر چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر کے استقبالیہ لہجے میں بولے۔ ''آؤ آؤ...... ابھی سو کر اٹھا ہوں۔''

کرنال گاؤں میں لوگ یہی جانتے تھے کہ صبح کے وقت غلط آدمی کا منہ دیکھا تو سارا دن خراب گزرے گا۔ حالانکہ اسی گاؤں کے لوگ ادھر ادھر

سے آنے والے لوگوں سے ملنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ ہر گھر کی خبر رکھنے والے پہچانے شخص کو دیکھ کر آدمی کے دل میں غیبت کا خیال آتا ہی ہے۔ اوتار سنگھ کا نانا کے گھر آنا جانا بڑھ گیا تھا' ہزارہ کی شادی کی دو تین جگہ بات چل رہی تھی اس میں اوتار سنگھ کی نانا کو ضرورت تھی۔ "سچ بات یہ ہے کہ خبر معلوم کرنے نہیں خبر دینے آیا ہوں۔" چارپائی کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے اس نے بات کی ابتدا کی۔

"تم ہمیشہ خبر دینے ہی آتے ہو۔" نانا مذاق کے ڈھنگ میں بولے۔ ان کو خیال تک نہیں تھا کہ یہ دشمن صدمہ پہنچانے آیا ہے۔

"گاؤں میں اخبارات دیر سے آتے ہیں۔ اس لیے تم کو خبر نہیں ہوئی۔" اخبار کی بات سے نانا سمجھ گئے کہ اوتار سنگھ باہر کی خبر لایا ہے۔ "تمہارا نواسہ گرفتار ہو گیا ہے۔" اوتار سنگھ نے پردا کیے بغیر کہا کہ اس خبر کا نانا پر کیا اثر ہوگا؟ "سب سے پہلے مجھے اطلاع ملی اور اس کے متعلق بتانے کے لیے سب سے پہلے میں آیا۔" اس دوران داڑھی سہلاتے ہوئے نانا کا ہاتھ جھٹکے سے نیچے آ گیا۔ چارپائی کو زور سے دبا کر صدمہ جھیل لینے کی کوشش کرتے ہوئے ان کو پسینا آ گیا۔ کپکپاتے ہونٹوں سے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ زبان پر جم گئے۔ سینے میں اٹھتے ہوئے درد کو چھپانے کے لیے دایاں ہاتھ انہوں نے سینے پر رکھ لیا۔ پھر وہ چارپائی پر الٹے گر پڑے۔

اوتار سنگھ بوکھلا کر چیخا۔ ہزارہ نہاتا ہوا بھیگے جسم سے باہر آ گیا۔ "کیا ہوا بابو کو؟"

اوتار سنگھ نے گھبراہٹ میں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "کون جانے؟"

دونوں نے نانا کو سیدھا لٹایا۔ "بابو! بابو!" گھبراتے ہوئے ہزارہ نے نانا کے چہرے سے پسینہ صاف کیا اور بائیں سینے پر ہاتھ رکھا۔ نانا کے ہونٹ ہلے۔

"جگت.....!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔ ہزارہ کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اوتار سنگھ کی طرف دیکھا۔

"چاچا! تم نے بابو کو بھانجے کی کوئی خبر تو نہیں سنائی؟" اوتار سنگھ اس کی تیز نظروں کی تاب نہ لا سکا اور گناہگار کی طرح سر جھکا لیا۔ ہزارہ نے دانت پیس لیے۔ "تمہیں پتہ ہے کہ ان کے سینے میں درد اٹھتا ہے۔ ایسی بری خبر دینے کی تم کو کیا جلدی تھی؟" اس کی آواز سے غصہ اچانک ختم ہو گیا۔ وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے کل سے اس بات کا پتہ تھا۔ پھر بھی خاموش رہا۔" یہ کہتے ہوئے ہزارہ نے آنکھیں خشک کر لیں۔ یہ سن کر اوتار سنگھ جھینپ گیا۔

"تمہیں پتہ تھا؟" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

"اب چاچا' جا کر ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔" ہزارہ پھر گرم ہو گیا۔ اوتار سنگھ میکانکی انداز میں کھڑا ہو گیا تو ہزارہ نے کہا۔ "سیدھے ڈاکٹر کے پاس جانا' راستے میں ڈھنڈورا پیٹنے نہ رکنا' سمجھے؟" اوتار سنگھ غصہ ضبط کر کے باہر چلا گیا۔

"انہیں سخت صدمہ پہنچا ہے۔" ڈاکٹر نے ہارٹ اٹیک کا سادہ زبان میں ترجمہ کیا۔ "عمر کی وجہ سے دل کمزور ہو جاتا ہے۔ زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں' البتہ دھیان رکھنا پڑے گا۔"

"اوتار چاچا نے آتے ہی بھانجے کی خبر دی۔ اس سے صدمہ ہوا ہوگا۔" ہزارہ نے بتایا۔

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔" پھر مزید بولا۔ "کچھ لوگ اجڈ ٹائپ کے ہوتے ہیں'

وہ میرے پاس پچھتاوے کا اظہار کر رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نارائن سنگھ کو کچھ ہوگیا تو بدنامی میرے سر آئے گی۔ ہزارہ مجھے گاؤں میں نہیں رہنے دے گا۔"

ہزارہ نے ڈاکٹر کی بات سن کر دانت پیسے اور کہا۔ "گاؤں میں کیا؟ زندہ نہیں رہنے دوں گا۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

"انجکشن دیا ہے۔ اب آرام ہو جائے گا۔ انہیں اٹھنے بیٹھنے نہ دینا۔" دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "میں لڑکے کے ہاتھ دوا بھیج دیتا ہوں۔"

ڈھلتی دوپہر جگت کے باپو نے دروازے پر دستک دی۔ ہزارہ کی سگائی کے متعلق خط لکھ کر نانا نے ان کو بلایا تھا۔ مگر جگت کی گرفتاری نے پیروں سے طاقت چھین لی تھی پھر بھی دل میں فیصلہ کیا کہ اگر کرنال خبر نہ پہنچی ہو تو فوراً ہزارہ کا رشتہ کر دیں گے۔ اس کے بعد اگر جگت کی گرفتاری کا پتہ چلے تو پروا نہیں۔ مگر گاؤں میں داخل ہوتے ہی جان پہچان والے لوگوں کی ہمدردانہ نظریں چغلی کھا رہی تھیں کہ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ ہزارہ نے دروازہ کھولا تو اس کے پھیکے چہرے کو دیکھ کر سوہن سنگھ سمجھ گئے کہ سالے اور سسر کو پتہ چل گیا ہے۔

"باپو کو صدمہ پہنچ گیا ہے۔" ہزارہ نے جھک کر قدم چھوتے ہوئے کہا۔ سوہن سنگھ خاموشی سے اندر آ گئے۔ بستر پر پڑے ہوئے نانا نے آنکھوں کی گردش کے ذریعے ان کا استقبال کیا۔ سسر اور داماد نے دل مضبوط کرنے کے لیے کچھ وقت لیا۔

"طبیعت بگڑ گئی ہے۔" نانا نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اور جلدی سے بولے۔ "عمر کسی کی شرم نہیں رکھتی۔" سوہن سنگھ سمجھ گئے کہ سخت ارادے کے اس شخص کا زخمی دل اندر سے تڑپ رہا ہے۔ گھر میں بہو آئے گی تو عمر کا وزن کم ہو جائے گا۔ انہوں نے نانا کو اطمینان دلایا۔

"جگت کی ماں نے مجھے ہزارہ کی سگائی کے لیے بھیجا ہے۔"

نانا بھی سمجھ گئے کہ داماد بیٹے کی گرفتاری کا دکھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"گھر میں بہو لانے کی تمنا اب نہیں رہی سوہن سنگھ؟" بولنے میں تکلیف کے سبب نانا نے رک کر کہا۔ "ایک بہو کو گھر میں لا کر اس کی زندگی ہم نے جہنم بنا دی۔"

"یہ تو ہم سمجھتے ہیں مگر بھگوان اتنا ظالم نہیں ہے۔" سوہن سنگھ بولے۔

"یہ دل بہلانے کی بات ہے۔" نانا بولے۔

"بہو کو تیسرا مہینہ جا رہا ہے۔" سوہن سنگھ نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ تب نانا مسرت کے جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ لمحے بھر کے لیے ان کے بوڑھے چہرے پر روشنی پھیل گئی مگر پھر لیٹ گئے۔ ایک آہ بھری۔

"کچھ دن پہلے یہ خبر ملتی تو سارے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کرتا۔" انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بھگوان بھی کیسا مذاق کرتا ہے۔ ایک آنکھ سے رونا اور دوسری سے ہنسنا' ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

بہت دیر تک داماد اور سسر خاموش رہے۔ ہزارہ بہنوئی کے لیے لسی لایا تو سوہن سنگھ نے کہا۔ "ہزارہ! گھر میں پالنا بندھنے والا ہے' اس کی خوشخبری دینے آیا ہوں۔" پھر سالے اور سسر کا غم ہلکا کرنے کی خاطر لسی کا پورا پیالہ ایک سانس میں پی گئے۔

"چندن کور کو اب زیادہ سنبھلنا پڑے گا۔" نانا نے کہا۔ انہیں ڈر تھا کہ جگت کی گرفتاری بہو کا دل توڑ

دے گی تو ہمیشہ کے لیے بٹی کے گھر سے بچے کے قدم روٹھ جائیں گے۔" مایا سے کہنا! بہو کی پوری حفاظت کرے۔ اسے ذرا سا صدمہ پہنچنے نہ دے۔"

"وہ بیچاری تو ہمیں صدمہ نہ ہو اس کی فکر کرتی ہے۔" سوہن سنگھ نے نانا کو مضبوط کرنے کے لیے کہا۔ "ہم اگر ضبط نہ کر سکے تو وہ یقیناً اندر سے ٹوٹ جائے گی۔"

اب نانا اپنے سابقہ مزاج پر لوٹ آئے۔ "ارے ہم اس طرح ہار ماننے والے نہیں، جگت کو عدالت میں مجرم ثابت کرنے میں پولیس کا ناک میں دم آ جائے گا۔" حالانکہ انہیں یہ افسوس تھا کہ یہاں کی بجائے اگر شیخوپورہ میں جگت پکڑا جاتا تو وہ بہت کچھ کر گزرتے۔ وہاں خاصی جان پہچان تھی۔ "اس کی صفائی کی تیاری کی یا نہیں؟" نانا نے گفتگو جاری رکھی۔ "پیسے خرچ کرنے میں پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔"

"یہ کام جگت کے دوست کرتارا نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ جوان بہت چالاک ہے اور پہنچا ہوا بھی۔ وہ تو یہاں تک تیار ہے کہ جگت کو جیل سے اٹھا لائے گا۔"

"میں اس اہم وقت پر بستر پر پڑ گیا ہوں۔" نانا نے فکرمندی سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ مقدمہ چلنے میں دن لگ جائیں گے۔" سوہن سنگھ نے اطمینان دلایا۔ "اس وقت تک تو آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

رات کا کھانا کھاتے ہوئے سوہن سنگھ نے جگت کی گرفتاری کی بات تفصیل سے بتائی۔ "وہ فرید کوٹ کے جس گھر سے پکڑا گیا تھا ہم نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب کورٹ کے چکر لگانے پڑیں گے۔ راجستھان سے پنجاب تک جانے میں کافی وقت صرف ہوگا۔ جگت نے بھی کہا ہے کہ اس کے پہلے بچے کا جنم اسی گھر میں ہونا چاہیے۔ نانا نے آہ بھری۔

"پہلا اور آخری بچہ......!"

O......O......O

جگت کے خلاف ایک نہیں بلکہ نصف درجن مقدمات مختلف عدالتوں میں داخل کیے گئے۔

"پورن سنگھ! جگت ان میں سے تین مقدمات میں ضرور پھنس جائے گا۔" سرکاری وکیل نے یقین دلایا تھا۔ پورن سنگھ یہ چاہتا تھا کہ امرتسر آنے سے پہلے شیخوپورہ میں جگا کے ہاتھوں کیے گئے جرائم بھی ان مقدمات میں شامل ہو جائیں، مگر سرکاری وکیل نے ان پر بھروسہ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

"اس میں قانونی الجھن پڑ جائے گی۔ وہاں دوسری حکومت ہے۔ وہ لوگ یہ مطالبہ کریں گے کہ ہمارا مجرم ہے اس لیے ہمارے حوالے کیا جائے۔ اس چکر میں ہم الجھ جائیں گے اور جگا فرار ہو جائے گا۔" اس کی دوسری مضبوط دلیل یہ تھی کہ وہ جرائم ثابت کرنا ان کے لیے مشکل ہوگا۔ گواہ کہاں سے لائیں گے؟ شیخوپورہ چھوڑ کر آئے ہوئے لوگ ادھر ادھر بکھر گئے ہیں۔ کتنے زندہ ہوں گے؟ اور کتنے قومی بلووں میں مارے گئے ہوں گے، کون جانے؟

"مگر ہمارے پاس اس کا پورا ریکارڈ ہے۔" پورن سنگھ کو جگا سے دشمنی ہو گئی تھی۔ "یہاں سے وہاں کے جرائم زیادہ خطرناک ہیں۔"

"ان کا ہم برابر استعمال کریں گے۔" وکیل نے اپنی چالاکی دکھائی۔ "وہ ڈاکو کتنا خطرناک مجرم ہے؟ یہ بیان کرنے کے لیے وہ مسالہ میں پوری طرح استعمال کروں گا۔ اس بات میں تمہیں مجھے مشورہ نہیں دینا پڑے گا۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" پورن سنگھ نے مسرت کا اظہار کیا پھر بھی اسے پورا اطمینان نہیں تھا۔ "ان میں سے

کتنے مقدمات میں پھانسی یقینی ہے؟

وکیل ہنس دیا۔ ''تم اسے کتنی بار پھانسی دلانا چاہتے ہو؟''

پورن سنگھ اس کا طنز سمجھ گیا اس لیے بوکھلا کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے پھانسی تو یقینی ہے؟''

وکیل نے پریقین انداز میں سر ہلایا پھر آہستہ سے بولا۔ ''بالکل یقینی ہے۔ اس کے علاوہ کہ کوئی معجزہ نہ ہو جائے یا فیصلے سے پہلے آزاد نہ ہو جائے۔''

یہ سن کر پورن سنگھ کو صدمہ ہوا۔ مگر وہ مسکرا کر بولا۔ ''اس کا میں نے مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسی کوشش کرے گا تو مارا جائے گا۔''

''میرے کہنے کا مطلب اور ہے۔'' وکیل نے دوسرا اشارہ کیا۔ ''جیل میں خودکشی کرنے کی سہولت نہ مل جائے۔''

''یہ بات ناممکن ہے۔'' پورن سنگھ رعب سے بولا۔ ''جگا کو میں جانتا ہوں۔ وہ خودکشی کرنے سے پھانسی پانا بہتر سمجھے گا۔''

''پھر تو وہ بہادر ہے۔'' وکیل نے آخری ضرب لگائی۔

O.....O.....O

جگت کو تھانے میں رکھنے کے خطرے سے پورن سنگھ اچھی طرح واقف تھا۔ پہلے وہ شیخوپورہ کی عدالت سے فرار ہو چکا تھا یہ وہ جانتا تھا' مقدمے لمبے عرصے تک چلنے والے تھے اس لیے اس نے جگا کی ذمہ داری جیل والوں پر ڈال دی۔ انڈر ٹرائیل قیدی کی حیثیت سے جگت امرتسر جیل میں بند ہو چکا تھا۔ جیل سوپر نے پہلے دن جیل کے حکام کو خبردار کر دیا تھا۔

''دیکھنا! یہ شخص ہماری عزت خراب کر سکتا ہے۔ اس کی کڑی نگرانی رکھی جائے۔''

عدالت میں مقدمات چلنے تک جگت ملزم کی حیثیت سے تھا' مجرم نہیں۔ جیل میں ہونے کے باوجود اسے قیدی کا لباس نہیں ملا تھا۔ مزدوری نہیں کرنی تھی اس لیے دوسرے قیدیوں سے ملنا جلنا ہو نہیں سکتا تھا۔ جیل سے فرار ہونے کے لیے کسی نہ کسی کو تو ساتھ ملانا ہی پڑتا ہے۔ سنتریوں کو بھی رشوت دینی پڑتی ہے۔ فی الحال تو ایسا کوئی موقع ملنے کے حالات نہیں تھے۔ عدالت اور جیل کے درمیان کافی چکر لگانے تھے۔ اس دوران کوئی موقع فراہم ہو تو فرار ممکن ہو سکتا تھا مگر اس کے لیے باہر کی مدد ضروری تھی۔ جگت نے ایک آہ بھری' پہلے جیسے ساتھی کہاں تھے؟ ہنومان اسے رہا کرانے کے چکر میں مارا گیا۔ یہ یاد آتے ہی اس کا دل بھر آیا۔ بچن بھی نہیں ہے۔ اور ہوشیار کو خود اس نے خود سے دور کر دیا تھا۔

''وہ سنگا پور پہنچ چکا ہو تو اچھا ہے۔'' جگت نے سوچا۔

پورن سنگھ نے جگت سے جرائم قبول کرانے کے سلسلے میں آخر تک کوشش کی تھی۔ ''اپنے اہم ساتھیوں کے نام بتا دو! میں تمہیں پھانسی سے بچا لوں گا۔''

جگت کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''بچانے والا اوپر بیٹھا ہے۔ ساتھیوں سے غداری کر کے اوپر والے کی عدالت کا مجرم نہیں بنوں گا۔''

''تم اپنے بچے کا منہ دیکھنے کے لیے بھی زندہ نہیں رہو گے۔'' پولیس چیف تنگ آ کر بولا۔

''بچے کا منہ دیکھنے کے لیے اپنے ساتھیوں سے غداری کروں تو وہ بڑا ہو کر میرا چہرہ دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔'' جگت نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''ڈاکو

کتنے مقدمات میں پھانسی یقینی ہے؟"
وکیل ہنس دیا۔ "تم اسے کتنی بار پھانسی دلانا چاہتے ہو؟"
پورن سنگھ اس کا طنز سمجھ گیا اس لیے بوکھلا کر بولا۔ "میرا مطلب ہے پھانسی تو یقینی ہے؟"
وکیل نے پریقین انداز میں سر ہلایا پھر آہستہ سے بولا۔ "بالکل یقینی ہے۔ اس کے علاوہ کہ کوئی معجزہ نہ ہو جائے یا فیصلے سے پہلے آزاد نہ ہو جائے۔"
یہ سن کر پورن سنگھ کو صدمہ ہوا۔ مگر وہ مسکرا کر بولا۔ "اس کا میں نے مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسی کوشش کرے گا تو مارا جائے گا۔"
"میرے کہنے کا مطلب اور ہے۔" وکیل نے دوسرا اشارہ کیا۔ "جیل میں خودکشی کرنے کی سہولت نہ مل جائے۔"
"یہ بات ناممکن ہے۔" پورن سنگھ رعب سے بولا۔ "جگا کو میں جانتا ہوں۔ وہ خودکشی کرنے سے پھانسی پانا بہتر سمجھے گا۔"
"پھر تو وہ بہادر ہے۔" وکیل نے آخری ضرب لگائی۔

○......○......○

جگت کو تھانے میں رکھنے کے خطرے سے پورن سنگھ اچھی طرح واقف تھا۔ پہلے وہ شیخوپورہ کی عدالت سے فرار ہو چکا تھا یہ وہ جانتا تھا' مقدمے لمبے عرصے تک چلنے والے تھے اس لیے اس نے جگا کی ذمہ داری جیل والوں پر ڈال دی۔ انڈر ٹرائیل قیدی کی حیثیت سے جگہ امرتسر جیل میں بند ہو چکا تھا۔ جیل سوپر نے پہلے دن جیل کے حکام کو خبردار کر دیا تھا۔
"دیکھنا! یہ شخص ہماری عزت خراب کر سکتا ہے۔ اس کی کڑی نگرانی رکھی جائے۔"
عدالت میں مقدمات چلنے تک جگت ملزم کی حیثیت سے تھا' مجرم نہیں۔ جیل میں ہونے کے باوجود اسے قیدی کا لباس نہیں ملا تھا۔ مزدوری نہیں کرنی تھی اس لیے دوسرے قیدیوں سے ملنا جلنا ہو نہیں سکتا تھا۔ جیل سے فرار ہونے کے لیے کسی نہ کسی کو تو ساتھ ملانا ہی پڑتا ہے۔ سنتریوں کو بھی رشوت دینی پڑتی ہے۔ فی الحال تو ایسا کوئی موقع ملنے کے حالات نہیں تھے۔ عدالت اور جیل کے درمیان کافی چکر لگانے تھے۔ اس دوران کوئی موقع فراہم ہو تو فرار ممکن ہو سکتا تھا مگر اس کے لیے باہر کی مدد ضروری تھی۔ جگت نے ایک آہ بھری' پہلے جیسے ساتھی کہاں تھے؟ ہنومان اسے رہا کرانے کے چکر میں مارا گیا۔ یہ یاد آتے ہی اس کا دل بھر آیا۔ بچن بھی نہیں ہے۔ اور ہوشیار کو خود اس نے خود سے دور کر دیا تھا۔
"وہ سنگاپور پہنچ چکا ہو تو اچھا ہے۔" جگت نے سوچا۔
پورن سنگھ نے جگت سے جرائم قبول کرانے کے سلسلے میں آخر تک کوشش کی تھی۔ "اپنے اہم ساتھیوں کے نام بتا دو! میں تمہیں پھانسی سے بچا لوں گا۔"
جگت کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "بچانے والا اوپر بیٹھا ہے۔ ساتھیوں سے غداری کر کے اوپر والے کی عدالت کا مجرم نہیں بنوں گا۔"
"تم اپنے بچے کا منہ دیکھنے کے لیے بھی زندہ نہیں رہو گے۔" پولیس چیف تنگ آ کر بولا۔
"بچے کا منہ دیکھنے کے لیے اپنے ساتھیوں سے غداری کروں تو وہ بڑا ہو کر میرا چہرہ دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔" جگت نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "ڈاکو

کا امتحان نہیں ہوتا۔"

"پھانسی پر چڑھو گے تو امتحان بھی ہو جائے گا۔" پورن سنگھ نے ہونٹ چبا کر غصے کا اظہار کیا۔

"پھانسی ...... پھانسی ...... پھانسی۔" جگت بپھر گیا۔ "یہ ایک ہی بات ہزار مرتبہ کیوں دہرا رہے ہو؟ جو ہو سکے کر لینا۔" جگت کی بات کے جواب میں وزن دار جوتے پٹختا پورن سنگھ چلا گیا۔

O......O......O

جھڑیالہ کے جوہری بازار لوٹنے کا مقدمہ شروع ہوا تو عدالت بھر گئی تھی۔ جگت کو پولیس وین میں مسلح پہرے کے ساتھ لایا جاتا البتہ چنا کے لیے اس قدر حفاظت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ جیل میں الگ الگ رہتے ہوئے چنا اور جگت عدالت میں پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے تھے۔ چنا اب پہلے جیسا بھولا یا ڈرپوک نہیں رہا تھا۔ پنا سنگھ کے قتل کے بعد اس کی حالت بدل گئی تھی جگت کو اس کا ثبوت مل گیا۔

"چنا! فرار ہونے کا موقع تلاش کرنا ہے۔" یہ کہنے کے بعد جگت کو اس کے چہرے پر حیرت یا خوف کے آثار نظر نہ آئے۔ وہ صرف آہستہ سے ہنسا تھا۔

"تمہارے لیے جو کچھ ہوگا کر گزروں گا۔"

"میرے لیے؟" جگت نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "بلکہ ہم دونوں کے لیے۔"

کسی کا دھیان ان کی طرف نہ ہو جائے اس لیے چنا کچھ دیر خاموش رہا۔ وہ دونوں بے پروائی سے بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے جیسے انہیں مقدمے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چنا نے پنا سنگھ کے قتل کی تفصیل جگت کو بتا دی۔ پھر آہ بھر کر بولا۔

"میں رہا ہوا تو میرے ہاتھوں دوسرا قتل ہوگا۔ اس نالائق پنا سنگھ کا بیج میری ماں کے پیٹ میں پرورش پا رہا ہے۔" جگت نے بھری عدالت کے آخر میں بیٹھی ہوئی پرم جیت کی جانب دیکھا۔ اس عورت کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

جگت کی گولی سے جس کا بازو زخمی ہو گیا تھا وہ ہنس راج جوہری گواہ کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا تو جگت کو اس پر ہنسی آ گئی۔ شانے کے پاس سے کٹے ہوئے ہاتھ کی آستین پنکھے کی طرح ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

"شیخی مارنے کا نتیجہ۔" اس نے کٹے ہاتھ کو دیکھ کر کہا۔ پھر اس کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔ "اب میرے خلاف گواہی دینے آیا ہے۔ اگر آزاد ہوا تو اس کی زبان کاٹ دوں گا۔"

O......O......O

سب سے پہلا فیصلہ جوہری بازار کی لوٹ کا ہونے والا تھا۔ جگت کے گھر کے سب لوگ چار ماہ سے بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک طرف چندن کور کے پیٹ میں ممتا کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا تو دوسری جانب اس کا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ پیٹ کے خلا میں بچہ گھومتا تو اس کے دل میں چھپا ہوا خوف خوشی کو دکھ میں بدل دیتا۔ پھر بھی ساس بہو اپنے دکھ کو چھپا کر ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ سوہن سنگھ کے عدالت سے لوٹنے کے انتظار میں پورا دن گزار دیتیں۔ ماں جی نے شوہر سے کہا ہوا تھا۔ "سب سچ باتیں کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو بات بہو برداشت نہ کر سکے وہ نہ کہنا۔" موہن سنگھ عدالت میں موافقت کی باتیں کر کے ان کا دل بہلاتے ہوئے اپنی ذات کو دھوکہ دے رہے تھے۔

''ماں جی کل فیصلہ ہونے والا ہے۔'' چندن کور بجھے ہوئے دل سے بولی۔ ''ہم مندر جا کر سر جھکا کر دعا مانگ آئیں۔'' گاؤں کے گردوارے جانے کا ارادہ تو ماں نے بہت عرصے سے کر رکھا تھا مگر امرتسر کے بڑے گردوارے تک جانے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔

''چندن! ان دنوں میں تمہیں سفر کی تکلیف برداشت نہیں ہوگی۔'' مگر بہو کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر ماں کا دل بھی بجھ گیا۔ ہر ایک سکھ اس مندر کی دعا پر پورا یقین رکھتا تھا۔ سکھ کے علاوہ دوسری قوم کے لوگ بھی امرتسر کے گولڈن ٹمپل کے تالاب میں ڈبکی مار کر من کی مراد پوری کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ ماں جی نے سوچا کہ بہو کی یہ خواہش پوری نہ کی اور جگت کے کیس کا غلط فیصلہ ہوا تو زندگی بھر افسوس رہے گا۔ ''بہتر ہے بہو! تمہارے سسر کے ساتھ کل ہم جائیں گے۔ آنے والے بچے کو بھی دعا کی ضرورت ہے۔''

O.....O.....O

گولڈن ٹمپل کے تالاب میں نہا کر ساس بہو نے جگت کی حفاظت کے لیے سچے دل سے دعا کی۔ ''ہمارے خاندان کی حفاظت کرنا ست سری اکال۔''

نہانے کے بعد لباس تبدیل کر کے ساس بہو گرو گرنتھ صاحب کے سامنے سر جھکانے کے لیے گردوارے گئیں۔ لوگوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی جس میں عورتیں زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ دوپٹے سے سر ڈھانپ کر آنکھیں جھکائے چندن کور اور ماں جی نے ہر داس کی پرارتھنا میں دل لگایا۔ قطار میں کھڑی عورتیں گرو گرنتھ کو سر جھکا کر اور پھول رکھ کر واپس ہٹ جاتی تھیں۔ یقین اور بھگتی کا ماحول آدمی کے بے قرار دل کو سکون بخش رہا تھا۔ گرنتھ صاحب پڑھتے ہوئے گرو کی لمبی سفید داڑھی ہوا میں پھر پھڑا رہی تھی۔ ان کے حسین چہرے پر رحم اور ہمدردی کی روشنی جھلک رہی تھی۔ ان کی میٹھی آواز میں اعتقاد اور ایمان کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ اونچے تختے پر ریشمی کپڑا بچھا ہوا تھا جس پر گرو گرنتھ کھلا رکھا تھا۔ عبادت کرنے والے ریشمی کپڑے پر پھول رکھ کر پریقین انداز میں سر جھکاتے جا رہے تھے۔ پھر چندن کور کی باری آ گئی۔ دونوں ہتھیلیوں کے پھول اس نے ریشمی کپڑے پر رکھ دیئے' پھر دعا مانگی۔

''میری کوکھ بھری ہے تو اب اس پر رحم بھی کرنا۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ قائم رکھنا پربھو۔'' چندن کور کے آنسو ریشمی کپڑے پر گرنے لگے۔ وہ اپنی دعا میں اتنی محو تھی کہ برابر سر ٹیک کر سسکیاں لیتی ہوئی عورت کی جانب پہلے تو اس کی توجہ نہیں گئی۔ مگر سسکیوں کے ساتھ کہے جانے والے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تو دل کے تار جھنجنا اٹھے۔ وہ جانی پہچانی آواز گرو گرنتھ صاحب کے حضور عاجزی کر رہی تھی۔

''ست سری اکال! ان کی گردن میں بندھے ہوئے تعویذ کی لاج رکھنا۔ چاہے اس کے بدلے میری ساری زندگی لے لینا' مگر ان کی حفاظت کرنا مالک۔''

چندن کور نے جلدی سے کھڑی ہو کر پیچھے کھڑی ساس کے لیے جگہ بنائی۔ بھیگی ہوئی آنکھیں دوپٹے سے خشک کر کے وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔ چہرہ دیکھنے کے بعد اس کے سینے میں طوفان اٹھنے لگا۔ چند لمحے تک اس کا جسم جھنجنا تا رہا۔ پھر لرزتے ہونٹوں سے آواز نکلی۔

''ویرو.....!''

اس عورت نے چونک کر نظر اٹھائی۔ چندن کور کو دیکھتے ہی اس کے پھیکے چہرے پر چمک آ گئی۔ چندن کور کہنا چاہتی تھی۔ "ویرو! اب تک تم کہاں تھیں؟ تم نے اپنی کیا حالت بنالی؟" مگر اسی لمحے ساس چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے پہلے چندن کی جانب، پھر ویرو کو جلدی سے دیکھا۔ ویرو کے ہاتھ بلند ہو کر نمسکار کے انداز میں جڑ گئے۔ آنکھوں سے پیار کے چشمے پھوٹے۔ وہ جڑے ہوئے ہاتھ پرنام کر رہے تھے یا معافی مانگ رہے تھے؟ اس سے پہلے کہ ماں جی کچھ کہیں، ویرو تیزی سے چلتی ہوئی باہر جانے لگی۔ چندن کور یہ برداشت نہ کر سکی، وہ اس کے پیچھے تیز قدموں سے چلنے لگی۔ ماں جی جھکی ہوئی پشت سے اس کے پیچھے بڑھیں۔

"بہو! رک جا، کہیں سنگ مرمر کے فرش پر پاؤں نہ پھسل جائے مگر چندن کی رفتار کم نہ ہوئی۔ مندر کے دروازے کے قریب اس نے ویرو کا بازو تھام لیا۔

"ویرو! تم اس طرح کہاں فرار ہو رہی ہو؟" ویرو خوفزدہ نظروں سے آس پاس دیکھ رہی تھی۔ اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے ایک مرد کو دیکھ کر چندن کے ہاتھ سے بازو چھڑا لیا۔

"مجھے جانے دو چندن!" چندن کور اسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی تھی مگر اسی لمحے اس مرد کی بھاری آواز سنائی دی۔

"اری جلد کر..... بیٹے کی دعا مانگنے میں اتنی دیر کر دی۔ رکشہ کھڑا ہے، لدھیانہ کی بس چلی جائے گی۔"

"میں جا رہی ہوں....." ویرو درد بھری آواز میں بولی پھر چندن کور کے پیٹ پر پیار بھری نظر ڈال کر بولی۔ "بچے کو میری طرف سے پیار کرنا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ لڑکھڑاتی چال سے وہ اس مرد کی جانب بڑھ گئی۔ اسی لمحے ماں جی بھی ہانپتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔ انہوں نے رکشے میں بیٹھی ویرو کو غور سے دیکھتے ہوئے بہو سے کہا۔

"پاگل کی طرح دوڑ پڑیں۔ پیٹ میں بچہ ہے، اس کا خیال بھی نہیں آیا؟" تیزی سے دوڑتے ہوئے رکشے کے پیچھے نظر جما کر چندن نے آہ بھری۔

"اطمینان سے ملاقات بھی نہ ہوئی۔

"جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا۔" ماں جی نے سخت لہجے میں کہنا چاہا مگر آواز بھیگ گئی۔ "اسی کی وجہ سے میرا بیٹا پھر ڈاکو بنا اور آج یہ سب دیکھنے کا وقت آیا۔"

"ماں جی! وہ تمہارے بیٹے کی حفاظت کی دعا مانگنے آئی تھی۔" چندن کور کی نظریں اب بھی اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جس سے رکشہ گیا تھا۔ "میں نے صاف صاف سنا تھا وہ اپنی زندگی کے بدلے ان کی زندگی کی دعا کر رہی تھی۔" کچھ دیر ساس بہو خاموش رہیں۔ چندن کور کو اب خیال آیا کہ اس نے ویرو کا پتہ ٹھکانہ نہیں لیا۔ وہ شخص لدھیانہ کی بس کے لیے جلدی کر رہا تھا، کیا وہ لدھیانہ میں رہتی ہو گی؟ دروازے سے باہر نکل کر اس نے ساس سے پوچھا۔

"ماں جی! ہم بس میں فرید کوٹ جائیں تو جلدی پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں..... ہمیں ایسی جلدی نہیں ہے۔ بس کے سفر میں تمہیں تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ آرام سے ٹرین میں جائیں گے۔"

چندن کور کو چپ رہنا پڑا۔ ٹرین کے سفر کے دوران وہ ویرو کے خیالات میں گم رہی۔ ماں جی جگت کے فیصلے کے خیالات میں ڈوب گئیں۔

اور اسی وقت عدالت میں جوہری بازار کیس

کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا......!

موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے زوردار تھپیڑوں سے برسات کی رات بڑی خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ ماں جی اور چندن کور کے دل میں چلتے ہوئے جھکڑوں کو باہر کے طوفان نے اور زیادہ تیز کر دیا تھا۔ خوف خوف اور خوف ان کی روحوں پر مسلط تھا۔ ابھی جگت کے باپو آئیں گے۔ فیصلے کے بارے میں بتائیں گے۔ انہیں سوہن سنگھ کا انتظار تھا۔ باہر بادل گرجے۔ بجلی کا جھماکا ہوا...... ساس بہو لرز گئیں۔ ہوا کے تھپیڑوں سے کھڑکی بار بار ہل رہی تھی جس سے ساس بہو چونک اٹھیں۔ نہ جانے کیوں بدنصیبی کھڑکی کے راستے داخل ہونے کی جلدی کر رہی تھی۔

''ایسے طوفان میں شاید تمہارے سسر نہ آئیں۔'' ماں جی بہلانے کے لیے چندن کور سے کہہ رہی تھیں۔ ''امرتسر تک گئے ہوں گے۔''

''ہم......'' چندن کور صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ دل میں تو اسے یقین تھا کہ ان دونوں کا ساری رات تڑپنا سسر پسند نہیں کریں گے۔ اس سے پہلے کہ صبح کے اخبارات میں فیصلہ شائع ہو جائے وہ گھر آنا مناسب سمجھیں گے۔ کچھ دیر بعد دروازے کی زنجیر کھڑکی...... چندن کور نے ماں جی کی جانب دیکھا' پھر کھڑی ہونے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔ ماں جی نے جلدی سے کہا۔

''تم رہنے دو! میں جا رہی ہوں۔'' پھر یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ باہر کیچڑ ہے۔ پیر رپٹ جائے گا۔'' چندن کور بیٹھی رہی۔

فانوس کی روشنی بلند کر کے ماں جی برآمدے میں آ گئیں۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں چندن سسر کے چہرے سے بات سمجھ نہ جائے اور اسے صدمہ پہنچے اور وہ دروازے پر ہی ڈھیر ہو جائے۔ یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ باردانے کا تھیلا اوڑھ کر وہ کھڑکی کے قریب گئیں۔ لرزتے دل سے اور کپکپاتے ہاتھوں سے زنجیر کھولی۔ سوہن سنگھ دروازہ کھول کر اندر آئے۔ کھلی ہوئی چھتری میں ان کا منہ چھپا ہوا تھا اس لیے ماں جی جو جاننا چاہتی تھیں وہ نہ جان سکیں۔

''بہت بارش ہے۔'' یہ کہہ کر جگت کے باپو نے دروازے کی کھڑکی کی زنجیر چڑھا دی اور اندر آ گئے۔ ''بہو جاگ رہی ہے؟'' انہوں نے پوچھا مگر پھر خود ہی جھینپ گئے۔ ماں جی نے شکایتی نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

''دکھ کے بادل گرج کر برسنے والے ہوں تو نیند کیسے آتی ہے؟''

چندن کور کان لگا کر دیوار سے ٹیک لگائے کمرے میں بیٹھی رہی۔ بڑھے ہوئے پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کیے وہ دعا مانگ رہی تھی۔ پیٹ میں بچہ حرکت کر رہا تھا جس سے دل دھڑک رہا تھا۔ سسر نے کمرے میں قدم رکھا تو اس کی بند آنکھیں کھل گئیں۔ سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا' سوہن سنگھ نے صافہ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔

''برسات کی وجہ سے گاڑی ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔'' انہوں نے چارپائی پر بیٹھ کر بھیگے ہوئے ہاتھ اور منہ صاف کیا۔ ''دوپہر سے برس رہا ہے۔'' بھیگا ہوا لباس اتارتے ہوئے بولے۔ ''پہلے تو رک جانے کے لیے سوچا......'' ساس بہو کی آنکھیں' ان کے ہلتے ہوئے ہونٹوں پر جمی رہیں۔ غیر ضروری باتیں ان کی بے قراری بڑھا رہی تھیں۔ شاید سوہن سنگھ صدمہ پہنچانے والی بات آہستہ آہستہ کہنا چاہتے تھے۔

"کیوں تڑپا رہے ہو؟" ماں جی کہنا چاہتی تھیں مگر لبوں سے صرف اتنا نکلا۔ "کیا ہوا......؟"

اب سوہن سنگھ نے ان کی جانب دیکھا پھر آہستہ آہستہ کچھ کہنے کی بجائے جلدی سے بولے۔ "بچ گئے......!" دونوں کے دل ٹھنڈے ہو گئے۔ جگت کے باپو نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "پھانسی سے بچ گئے مگر دس سال کی ہو گئی۔" چندن کور اور ماں جی کے دل پر زخم لگا۔ ان دونوں کے منہ سے آہ نکل گئی۔ سوہن سنگھ نے دو تین منٹ اور گزار دیئے' پھر کہنا شروع کیا۔ "اس ہاتھ کٹے ہنس راج کی گواہی پولیس کو نقصان پہنچا گئی۔ اس بیوقوف نے جگت کی اونچائی چھ فٹ بتائی تھی۔ ہمارے وکیل نے کراس کرتے ہوئے پوچھا جس شخص کو تم نے گولی چلاتے ہوئے بتایا ہے وہ تمہارے سامنے کھڑا ہے' اس کی اونچائی پانچ فٹ سات انچ ہے تو جوہری ہکلایا اور بولا کہ صاحب! اس وقت وہ مجھے موت کا فرشتہ نظر آیا تھا اس لیے زیادہ اونچا نظر آیا ہوگا۔ بس اس کی یہ غلطی بھاری پڑ گئی۔ قتل عمد جرم ثابت نہ ہو سکا تو مسلح ڈاکے کی سزا ہوئی۔" وہ سب کچھ ایک سانس میں بتا گئے اور قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ساس بہو نے ساتھ نہ دیا تو جھینپ کر سر جھکا لیا۔

"جگت سے کچھ بات ہوئی؟" ماں جی نے سوچا بہو کا رونا ضروری ہے۔ سینے سے سسکی نکلے تو بہتر ہے تاکہ اسے صدمہ نہ بیٹھ جائے۔ سوہن سنگھ اشارہ سمجھ گئے۔

"ارے وہ تو سزا سن کر بے پرواہی سے ہنسا۔" پھر جو جگت نے کہا بھی نہیں تھا وہ بھی کہہ گئے۔ "مجھے ہمت دو...... باپو! تم نہ گھبرانا۔ مجھے پھانسی پر چڑھانا کھیل نہیں ہے۔"

"اس نے ایسا کہا؟" ماں جی کی آواز پہلی بار کھلی۔

"ہاں بھئی۔" سوہن سنگھ چندن کور کو دیکھ کر بولے۔ "اس نے بہو کو پیغام بھی بھیجا ہے۔" یہ سن کر چندن کور چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ سوہن سنگھ کو یہ انداز پسند آیا۔ وہ بولے۔ "اس نے کہا تھا کہ بہو سے کہنا تم بہادر کی بیوی ہو تمہیں یہ ثابت کر دکھانا ہے۔" چندن کور کی آنکھیں بہنے لگیں۔ آنسوؤں کے ساتھ سسکیاں سنائی دیں۔ ساس اس کے قریب آ گئیں۔ اسے سینے سے لگایا تو چندن کور بلک بلک کر رونے لگی۔ ماں جی کا ہاتھ اس کی پشت پر گردش کرنے لگا۔

O......O......O

صدموں کا سلسلہ چل نکلا۔ سر پر لٹکتی ہوئی تلواریں ایک کے بعد ایک گرنے لگیں۔ جوہری کو ضرب لگا کر ڈاکہ ڈالا اس کا فیصلہ سات سال قید کی صورت میں ہوا۔

"دس اور سات سترہ ہوئے۔" مجرم کے کٹہرے میں کھڑا ہوا جگت بلند آواز میں بولا۔ پولیس چیف اور وکیل آنکھیں نکال کر جیسے کہہ رہے تھے بیٹا! ابھی رک جاؤ۔ تمہاری گردن ہمارے پنجے میں ہے۔"

"چنا......!" جگت نے چنا کو مخاطب کیا۔ "یہ دونوں آنکھیں نکال کر ہمیں ڈرانا چاہتے ہیں۔ ان سے کہہ دو جتنی سزا ہو سکے اتنی کرا دیں۔ یہ ہمارے چہروں پر اسی طرح سکون دیکھیں گے۔" پھر جگت نے اپنے وکیل سے پوچھا۔ "ہمیں اپیل کرنی ہے؟"

پہلے فیصلے کے وقت بھی جگت نے کہا تھا۔ "اپیل میں سزا کے دو سال کم ہو جائیں گے اور کیا ہوگا؟ دو سال ادھر یا ادھر اس میں ہمارا کیا فائدہ ہوتا ہے؟" شانے اچکا کر وکیل نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔ ایسا بے پروا موکل اسے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ بڑے

بڑے مجرموں کے کیس لڑ چکا تھا۔ خود کو بچا لینے کے لیے سخت سے سخت دل لوگ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے تھے۔

''صاحب! مجھے بچالو۔'' اور جگا تھا کہ سزا سن کر نہ ہی جذبات میں آتا تھا اور نہ ہی خوفزدہ ہوتا تھا۔ اس نے بڑا عجیب اور بے پروا مزاج پایا تھا۔

کرتارا عدالت میں برابر حاضر ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کیس میں ملوث دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جگت کے چھپائے ہوئے مال کے اس نے رات بھر میں تیس ہزار نقد بنالیے تھے۔ وکیل کی فیس اور دوسرے خرچ میں نصف رقم ختم ہو چکی تھی اور ابھی دو بڑے مقدمے نصف راستے میں تھے۔ ان پر کتنا روپیہ خرچ ہوگا؟ اس سے وہ لاعلم تھا۔ جگت کے باپو پر مقدمہ لڑنے کا بوجھ نہ پڑے اس لیے وہ روپیہ سنبھال کر خرچ کر رہا تھا۔ یہی بات تھی کہ دس سال اور سات سال کے فیصلے کے خلاف اوپر والی کورٹ میں اپیل نہ کرنے کے جگت کے مشورے کو اس نے بددلی سے قبول کرلیا تھا۔

مجرموں کے کٹہرے سے جگت اور چنا کو پولیس باہر لے جا رہی تھی تو اس نے کن انکھیوں سے جگت کی جانب دیکھا۔ جگت نے اسے دیکھ کر دائیں ہاتھ کی مٹھی زور سے کس لی پھر پہلی انگلی بلند کر کے دانت پیستے ہوئے اشارہ کیا۔ کرتارا سمجھ گیا کہ جگت اسے اپنی گن یاد کرا رہا ہے۔ وہ تیزی سے عدالت کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا 'کیا وہ اپنی گن واپس مانگ رہا ہے؟ مگر کیوں؟ اس خیال نے اسے بے چین کر دیا۔ جیل سے فرار ہونے کے لیے ایسا خطرناک ارادہ کر رہا ہے؟ اس خیال نے اسے لرزا دیا۔ عدالت کے برآمدے میں مسلح پولیس والے جگت کو لے جا رہے تھے تو کرتارا ہاتھ میں اخبار تھام کر کھڑا ہوا تھا جیسے ہی جگت قریب سے گزرا وہ بلند آواز میں اخبار پڑھنے لگا۔

''جلدی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ انسان کو انتظار کرنا چاہیے۔'' جگت نے یہ سنا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا پولیس والا بھی یہ الفاظ سن کر چونکا۔ اس نے کرتارا کی جانب دیکھا۔ کرتارا منہ پھیلا کر ہنسا۔

''یہ ہمارے وزیراعظم کی تقریر ہے۔ پرجا کو کیسے سبق دے رہے ہیں۔'' جگت کو کرتارا کی چالاکی پسند آئی مگر مشورہ اچھا نہ لگا۔

O.....O.....O

بٹالہ کے بیوپاری کو بیچ بازار لوٹنے کے بعد جگا اپنی ٹولی کے ساتھ فرار ہو رہا تھا تو اس کے ہاتھوں تعاقب کرتے ہوئے گاؤں والوں میں سے ایک شوٹ ہو گیا تھا۔ اس طرح لوٹ اور قتل کے دوہرے جرم کا مقدمہ شروع ہوا۔ پورن سنگھ اور سرکاری وکیل اس کیس پر پورا بھروسہ رکھتے تھے۔ ڈاکے کے فوراً بعد جگت کا مخبر گرفتار ہو گیا تھا جسے پولیس نے سرکاری گواہ بنالیا تھا۔

''صاحب! کیس کے بعد جگا مجھے خوار نہ کرے یہ خیال رکھنا۔'' مخبر بار بار پولیس کے سامنے گڑگڑاتا۔ ''میرے بیوی بچے محتاج ہو جائیں گے۔''

''تم خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو بشن سنگھ!'' پورن سنگھ نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ''کیس ختم ہونے کے بعد جگا زندہ ہی نہیں رہے گا۔'' مگر کیس کے خاتمے تک پورن سنگھ بشن سنگھ کی پوری حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ جگا کا کوئی ساتھی اس تک پہنچ نہ سکے اسے دھمکا کر گواہی دینے سے روکا نہ جائے اسے اس کے لیے سخت انتظام کرنا پڑا تھا۔ چنا کے بارے میں وہ غافل رہا جس سے جوہری بازار کے کیس کا فیصلہ صرف دس سال کی سزا پر ختم ہو گیا تھا۔

بشن گواہ کے کٹہرے میں کھڑا ہوا تو جگت نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ دوسرے لمحے بشن سنگھ نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے بعد وہ جگت سے آنکھیں نہیں ملا سکا۔

"مجرم کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے شخص کو تم پہچانتے ہو؟" تب بشن سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ کون ہے؟" ایسا سوال ہوا تو بھی اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "جگا...... جگا ڈاکو۔"

وکیل صفائی نے اختلاف کیا۔ "حضور والا! فریادی کا گواہ مجرم کو دیکھے بغیر جواب دے رہا ہے۔ یہ اس طرح جواب دے رہا ہے جیسے اسے سکھا کر لایا گیا ہو۔"

"حضور والا!" سرکاری وکیل گرم ہو گیا۔ "اس کے لیے مجرم ذمہ دار ہے۔ وہ وہاں کھڑا گواہ کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

جج نے جگت سے کہا۔ "عدالت کے کام میں اس طرح دخل دینا جرم ہے۔ یہ اب خیال رکھنا۔" پھر بھی بشن سنگھ نظریں نہ اٹھا سکا۔ پورن سنگھ نے ہونٹ کاٹے۔

"بیوقوف اتنا ڈر رہا ہے کس لیے؟ بیڑیوں سے جکڑا ہوا جگا اسے کھا تو نہیں جائے گا۔"

دوسرے دن کھلتی ہوئی عدالت کے وقت پولیس چیف کو اس کا جواب مل گیا۔ دونوں مجرموں کو عدالت میں لائے جانے کے بعد وہ سیڑھیوں کے قریب کھڑا بشن کو لے کر آنے والی جیپ کا انتظار کر رہا تھا۔ کیس سننے کے لیے گاؤں کے لوگوں کی بڑی بھیڑ جمی ہوئی تھی جس سے عدالت کے میدان کا دروازہ بند کرنا پڑا تھا۔ بشن کو لے کر آنے والی جیپ دروازے کے قریب آ گئی۔ دروازہ کھولا گیا۔ اسی لمحے ایک سکھ نوجوان پہلو سے کرپان نکال کر جیپ کی جانب جھپٹا۔ پورن سنگھ یہ دیکھ کر تیزی سے دوڑا۔ کھلی کرپان لے کر قریب آتے ہوئے سکھ کو دیکھ کر بشن سنگھ گھبرا گیا اور جیپ سے کود کر عدالت کے میدان میں بھاگنے لگا۔ دس پندرہ قدم دوڑا ہو گا کہ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ قلابازی کھا کر گرا۔ وہ نوجوان پرجوش انداز میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ پورن سنگھ اور تین پولیس والے اسے گرفتار کرنے کے لیے جھپٹ رہے تھے۔ وہ اس نوجوان کی کھلی کرپان کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ نوجوان کو سر پر دیکھ کر بشن سنگھ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ نوجوان کے غضب ناک چہرے نے اسے ادھ موا کر دیا۔ چمکتی ہوئی کرپان کی دھار سے اسے اپنی موت نظر آ رہی تھی۔

"بے ایمان! جگا کے خلاف گواہی دے رہا ہے۔" یہ کہہ کر نوجوان نے اس کے سینے میں کرپان اتارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ خوف سے کپکپاتے ہوئے بشن سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں۔ آخری لمحے کی تکلیف کے خوف سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ مگر کرپان سینے تک نہیں پہنچی۔ ایک دھماکا ہوا۔ عدالت کی پرانی عمارت ہل کر رہ گئی۔ نوجوان کے ہاتھ سے کرپان دور جا گری۔ پہلو کے آر پار اترتی ہوئی گولی نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ بشن نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو نزدیک پڑے ہوئے نوجوان کا جسم خون میں لت پت نظر آیا۔ پولیس چیف ہاتھ میں پستول تھام کر اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ آٹھ دس پولیس والے رائفلیں لیے گھیرا ڈال کر کھڑے ہوئے تھے۔

"وہ ختم ہو گیا۔" پورن سنگھ نے افسوس کا اظہار کیا۔ پھر بشن سنگھ کو دھمکایا۔ "بیوقوف! اٹھ تو کھڑا

ہو جا۔'' مگر خوف زدہ بشن سنگھ میں اتنی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ اسے کھڑا ہونے کے لیے دو پولیس والوں کا سہارا لینا پڑا۔

''تم اسے پہچانتے ہو؟'' پورن سنگھ نے پوچھا۔

آستین سے پسینہ خشک کرتے ہوئے بشن نے سر ہلایا۔ ''یہ جگا کا ساتھی سرجیت تھا۔''

''اوہ......!'' پورن نے مٹھیاں کس لیں۔ ''یہ زندہ ہاتھ آتا تو اچھا تھا۔'' بشن کو حیرت ہوئی وہ جج گیا تھا۔ اس کی مسرت کی بجائے صاحب اس کی موت پر افسوس کر رہا تھا۔ عدالت کے باہر اور اندر کے لوگ کچھ دیر پہلے دیکھے ہوئے سنسنی خیز منظر کے خوف سے ابھی آزاد نہیں ہوئے تھے۔ چیمبر چھوڑ کر آئے ہوئے جج سے وکیل سرکار نے کہا۔

''گواہ کو قتل کرنے کے لیے دن دیہاڑے حملہ ہوا۔'' جج کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کچھ بڑبڑایا اور چلا گیا۔

دور کھڑے ہوئے کرتارا اور سوہن سنگھ کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس حادثے نے اس کا کیس خراب کر دیا اس کا افسوس ان کے چہروں سے ظاہر تھا۔ دھماکے سے چونکتے ہوئے جگت کو جب سرجیت سنگھ کی قربانی کا پتہ چلا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کے لبوں پر ہمیشہ جھلکتی ہوئی بے پرواہی اور مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ بائیس سالہ نوجوان سرجیت اس کی خاطر مارا گیا وہ اس کے لیے اپنے آپ کو مجرم گردانے لگا۔ اسے اب کیس میں دلچسپی نہیں رہی۔ فیصلہ سنایا گیا تو وہ گم صم اور اداس نظر آیا۔ سزا سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا' بھری عدالت سکتے میں آگئی۔

''یہ کیسا شخص ہے......؟''

O.....O.....O

صبح سے چندن کور کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا تھا۔ ماں جی ہانپتی کانپتی ہوئی چکر لگا رہی تھیں۔ دایہ نے کہا تھا کہ ابھی آٹھ دس دن لگیں گے اس لیے ان کی بے چینی بڑھ گئی۔ دس دن سے وہ روز گردوارے جا رہی تھیں۔ وہ دعا کرتیں کہ زچگی کے بعد فیصلہ سنایا جائے تو اچھا ہے تاکہ چندن کے وجود میں پرورش پانے والے بچے پر ماں کے صدمے سے کوئی اثر نہ پڑے۔ جگت کے باپو نے ایک بار کہا تھا کہ بہو کو کہیں دور لے جائیں۔ زچگی کے بعد ہی بہو کو فیصلے کا پتہ چلے کچھ ایسا انتظام کرنا چاہیے۔ ماں جی سمجھ گئیں کہ اس بار بازی ہارنے کا خطرہ ہے۔ جگت کے باپو کو پہلے بھی انہوں نے اس قدر اداس نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی چندن کور کو دور بھیجنے والی بات انہیں پسند نہیں آئی۔

''بہو بڑی سمجھدار ہے۔ اسے پتہ چل جائے گا کہ ہم کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ پھر دل ہی دل میں تڑپتی رہے گی اور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

اسی بحث و مباحثے میں فیصلے کی رات آگئی۔ رات انجن کی سیٹی سے لرز گئی۔ سیٹی مار کر انجن چیخا۔ ماں کا دل خوف سے کانپ اٹھا۔ یہ سوچ کر چندن کور لحاف اوڑھ کر سوگئی ہے' وہ بیدار نہ ہو جائے تو اچھا ہے وہ چارپائی کے قریب جا کر دیکھ آئیں۔ پھر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی رہیں جس سے آنے والے کو کوٹھڑی نہ کھٹکھٹانی پڑے اور بہو کی نیند ٹوٹ نہ جائے۔ انہیں کافی دیر کھڑا رہنا پڑا۔

''کیا وہ نہیں آئے ہوں گے؟'' مگر اسی لمحے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ''نہیں......وہ تانگے میں نہیں آئیں گے۔ اسٹیشن گھر سے دور نہیں ہے۔ مگر تانگہ کیوں رک رہا ہے؟'' تانگہ کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھہرو جیجا جی! آپ کو اتار رہا ہوں۔'' یہ تو ہزارہ کی آواز تھی۔ ماں جی لرز گئیں۔ کیا وہ اپنے بہنوئی کو چھوڑنے آیا ہے؟'' وہ سوچنے لگیں۔ ضبط نہ ہوا تو جلدی سے انہوں نے دروازہ کھولا۔ ہزارہ جگت کے باپو کا بازو تھام کر کھڑا ہوا تھا۔ بجھا ہوا چہرہ' رو رو کر سرخ اور سوجھی ہوئی آنکھیں' لڑکھڑاتے قدم۔ سب کچھ سمجھ میں آ رہا تھا...... پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لالٹین تھامے ہوئے ماں جی کا ہاتھ کپکپانے لگا۔ ہزارہ نے انہیں چونکایا۔

''بہن! مضبوط رہنا۔ چندن کور کے لیے بھی ہمت رکھنا۔'' ماں جی فوراً ہوشیار ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بیٹے کا چاہے کچھ ہو اب جو آنے والا ہے اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ خاندان کا دیا جلنے سے پہلے کہیں بجھ نہ جائے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سوہن سنگھ نے چوکھٹ پار کی۔ ان کی نظر برآمدے کی جانب گئی۔ بہو وہاں نہیں' یہ دیکھ کر انہیں اطمینان ہوا۔

''وہ سو گئی ہے۔ ذرا بھی آواز نہ کرنا۔'' ماں جی نے دونوں کو ہوشیار کیا اور آہستہ سے کھڑکی بند کر دی۔ برآمدے میں سوہن سنگھ بیٹھ گئے۔ ہزارہ ان کی پشت پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' ماں جی پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔ دونوں ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک جواب نہ ملا تو وہ بے چین ہو گئیں۔ ''مجھے بتاؤ!'' پھر بھی خاموشی رہی تو وہ جوش میں بولیں۔ ''پھانسی ہو گئی؟'' ہزارہ نے آنکھوں سے اثبات میں جواب دیا' پھر گردن جھکا لی۔ اس سے پہلے کہ ماں جی کی چیخ بلند ہو' کمرے سے چیخ سنائی دی۔ تینوں اندر دوڑ گئے۔ بہو چارپائی پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''میرا نصیب پھوٹ گیا...... مجھے بھی پھانسی پر چڑھا دو۔''

''بہو...... بہو...... کہتے ہوئے ماں جی نے اس کے شانے تھام لیے۔ ''بیٹا! تم پورے مہینے سے ہو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اسے طاقت لگا کر لٹا دیا۔ چندن کور اپنی تڑپ کو روک نہ سکی۔ ماں جی نے شانے تھام رکھے تھے اس لیے وہ زور زور سے اچھل کر پیر پٹخنے لگی۔

''ہزارہ! اس کے پیر پکڑ لو۔'' ماں جی نے چیخ کر کہا۔ ہزارہ چارپائی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھانجی بہو کے جسم کو چھوتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوئی۔ ماں جی گرجیں۔ ''میں کہتی ہوں اس کے پیر تھام لے۔'' ہزارہ نے ایک دم چندن کے پیر پکڑ لیے۔ چندن کور بری طرح رو رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ اور پھر وہ تھک گئی۔ اچانک اس کے سینے میں درد اٹھا۔ پھر پیٹ میں تکلیف بڑھنے لگی۔

''اوہ ماں! مجھے کچھ ہو رہا ہے۔'' اس کے ہاتھ پیر بھیگنے لگے۔ چہرے پر پسینہ چھوٹنے لگا۔ ماں جی چونک گئیں۔ اب کیا کرنا چاہیے؟'' جاؤ! دائی کو بلا لاؤ۔'' جگت کے باپو سے انہوں نے کہا۔ وہ ابھی صدمے سے نہ سنبھل پائے تھے۔ وہ احمقوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ ماں جی بولیں۔

''جاؤ...... جلدی جاؤ! بہو کا وقت ہو گیا ہے۔'' سوہن سنگھ نے کھونٹی پر سے لالٹین لی تو ماں جی نے بہو سے کہا۔

''چندن! اس وقت ذرا ہمت سے کام لینا۔'' پھر حکم دینے والے لہجے میں بولیں۔ ''اگر پاگل پن کیا تو تمہیں میرے بیٹے کی قسم ہے۔''

سحر کے وقت چندن کو چھٹکارا ملا۔ آخری نصف گھنٹہ بہت درد سہنا پڑا۔ سوہن سنگھ اور ہزارہ باہر

برآمدے میں بیٹھے بے چین انداز میں گھڑیاں گن رہے تھے۔ کمرے میں ماں جی اور دایہ نئی زندگی کی منتظر تھیں چندن کور بلکنے لگی۔

''بھگوان! تم مجھے اوپر بلالو۔ اب میرا کام پورا ہوگیا۔'' اور بچے کے رونے کی پہلی آواز سنائی دی..... جس کا چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان انتظار تھا اس نے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ سوہن سنگھ اور ہزارہ کے چہرے پر مسرت کی ہلکی لکیریں نظر آ ئیں۔ اسی لمحے ماں جی نے خبر دی۔

''بیٹا ہوا ہے.....!''

مسرت کے آنسو چھلک پڑے۔ سوہن سنگھ کے رخسار بھیگ گئے۔ ''بہو کیسی ہے؟''

''سب ٹھیک ہے۔ کسی قسم کی فکر کی بات نہیں۔''

خاندان کا دیپ جلا۔ اس کی خوشی میں تھالی نہیں بجی پیڑے نہیں تقسیم ہوئے مبارکبادیں نہیں دی گئیں پھر بھی سب ایک طرح سے راحت محسوس کررہے تھے۔ ایک زبردست امتحان سے پار اترنے کی راحت تھی۔ صبح ہوئی تو ماں جی نے ہزارہ کو یاد دلایا۔

''بھائی اب تم جاؤ۔ وہاں باپو فکر کررہے ہوں گے۔ پہلے خوشخبری دینا پھر پوچھیں تو فیصلے کے بارے میں بتادینا۔''

اس ساری گڑبڑ میں ہزارہ نانا کو بھول گیا تھا۔ اسے ڈر لگا۔ جلدی سے اس نے جوتے پہنے۔

''میں جارہا ہوں یہاں سے جیپ کرائے پر حاصل کرکے بھاگتا ہوں۔ باہر کے کسی شخص سے انہیں فیصلہ کی خبر نہ ملے میں ایسا انتظام کرکے آیا ہوں۔ پھر بھی کیا خبر؟''

○.....○.....○

جیپ گھر کے قریب پہنچی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

آنگن میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے سب نے ہزارہ کی جانب ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ ایک نے کہا۔

''آ گیا..... مگر اسے دیر ہوگئی۔'' ہزارہ سکتے میں آ گیا آنگن میں چارپائی پر نانا کا جسم پڑا ہوا تھا۔ برابر میں گھی کا دیا جل رہا تھا۔

''باپو.....!'' اس کی آواز پھٹ گئی۔ وہ دوڑ کر نانا کے سینے پر گرا۔ وہ بلک بلک کر روتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''آپ نے کیوں جلدی کی؟ میرے لوٹنے تک تو ٹھہرنا تھا۔ یہ خبر سن کر تمہارا دل ٹھنڈا ہوتا کہ بھانجے کے گھر بیٹا ہوا ہے۔'' لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''قدرت بھی کیسا کھیل کھیلتی ہے۔ باپ کو سزائے موت اور اسی دن اس کے گھر بیٹے کا جنم اور اسی دوران نانا پرلوک سدھار گئے۔'' کوئی بولا۔ دو تین آدمیوں نے مل کر ہزارہ کو خاموش کیا۔

''بارہ بجے تک تو انہیں کچھ نہیں تھا پھر خود ہی کھڑے ہوگئے برابر والے لڑکے کو دوڑایا۔ ''جا! اوتار سنگھ کو بلالا۔ اوتار بیچارہ کیا کرتا؟ نانا نے زبردستی کرکے پوچھا کیا فیصلہ ہوا؟ اگر نہیں بتایا کہ اخبار میں کیا چھپا ہے تو اس کلہاڑی سے تیرا سر پھاڑ دوں گا۔ بے چارہ ڈر گیا۔ کہہ دیا پھانسی ہوگئی اور یہ کہہ کر بھاگ گیا۔ تمہارے باپو یہیں گر گئے۔ ڈاکٹر آیا مگر دیر ہوچکی تھی۔''

اس کے بعد نانا کی آخری رسم کی تیاریاں ہونے لگیں.....!

○.....○.....○

جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہونے کے بعد جگت کو دونوں خبریں ایک ساتھ ملیں۔ وہ بیٹے کا باپ بن چکا ہے۔ اور اس کی پھانسی کی خبر سن کر نانا

کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ نہ ہی نوزائیدہ بیٹے کا چہرہ دیکھنے کے لیے وہ موجود تھا اور نہ ہی وہ نانا کی ارتھی کو کندھا دینے والوں میں شامل تھا۔ اسے بیٹے کی پیدائش پر خوش ہونا تھا' اسے دل کھول کر رونا تھا نانا کی موت پر۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکا۔ کوٹھڑی کے ایک کونے سے آتی ہوئی پیشاب کی بدبو اسے بدحواس کر رہی تھی۔ کچھ ہونے والا ہے...... اس احساس نے اسے دو راتیں سونے نہیں دیا۔ صبح کے وقت بمشکل اس کی آنکھ لگی تھی۔ گھنٹے دو گھنٹے سویا تھا کہ کسی کی چیخ نے اسے بیدار کر دیا۔ پیروں کی بیڑیاں کھڑکھڑاتا ہوا وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ فولادی سلاخیں تھام کر غور سے سننے لگا۔

''مجھے مرنا نہیں ہے...... مجھے جینے دو۔'' کوئی گڑگڑا رہا تھا۔ وہ کوئی قیدی تھا۔ ''میرے گھر چھوٹا سا بچہ ہے...... بوڑھی ماں ہے' ان کی خاطر......'' مگر اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''زبردستی اٹھا کر لے چلو۔'' کسی کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔ وہ آواز جیل سوپر کی تھی۔ جگت سمجھ گیا کسی قیدی کو پھانسی کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ شور قریب کا تھا اس لیے ظاہر تھا کہ وہ قیدی کسی قریبی کوٹھڑی کا ہے۔ اب بہت سے قدموں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ درمیان میں قیدی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی اس کی جدوجہد جاری تھی۔

''بے چارہ......!'' بڑبڑا کر جگت نے آنکھیں پھیلائیں۔ چار آدمی اسے لٹکا کر لے جاتے نظر آئے۔ اسی لمحے قیدی نے گھونسہ مار کر ایک میٹ سے اپنا پیر چھڑا لیا۔ میٹ کو غالباً کسی غلط جگہ گھونسہ لگ گیا اس لیے وہ قدرے دوہرا ہو گیا۔ سوپر چلایا۔

''سالے! سیدھی طرح مرنا ہے یا مار کھا کر مرے گا؟'' ایک میٹ نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ غصے میں بھر کر قیدی نے اس کا ہاتھ مروڑ دیا۔ وہ چیخ اٹھا۔

''ارے بیوقوف!'' جگت چیخا۔ مرنا ہی ہے تو کیوں بے عزتی سے مر رہا ہے؟ جیتے جی کیوں چار آدمیوں سے اپنے جسم کو اٹھوا رہا ہے؟''

ڈپٹی سوپر نے کھڑے کھڑے جگت کو آنکھیں دکھائیں۔ ''تم خاموش رہو!''

جگت بپھر گیا۔ اس نے زبان پر دانت رکھ کر دو سلاخوں کے درمیان سے ڈپٹی سوپر پر تھوکا۔ کوٹھڑی کا چوکیدار گھبراہٹ میں کوٹھڑی کی جانب جھپٹا۔ ''صاحب پر تھوکتا ہے؟''

صاحب اس وقت جلدی میں تھا اس لیے بکتا جھکتا چلا گیا۔ ''پھانسی ہو جانے دے' پھر تیری خبر لوں گا۔''

صاحب کے جانے کے بعد چوکیدار نے غصے سے کہا۔ ''آٹھ سو بیالیس! تم کیوں دوسروں کے درمیان دخل دیتے ہو؟''

''یار! پھانسی پر چڑھنا ہی ہے تو ڈرنا کیسا؟''

''پھر تہا شور کیوں کر رہا تھا؟'' چوکیدار نے پوچھا۔

''مرد کی طرح ہنستے ہوئے پھانسی کے لیے بڑھنا چاہیے۔'' جگا بولا۔

''یہ گھڑی ایسی ہی ہوتی ہے جگا' کہ اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔'' چوکیدار نے پہلی بار اسے نام لے کر مخاطب کیا۔ جگت کو اس کی اپنائیت پسند آئی۔

''کسے قتل کیا تھا اس نے؟''

''اپنی بیوی کو۔'' چوکیدار دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔ ''بیوی پر اسے شک تھا۔ کلہاڑی سے سر پھاڑ دیا۔ عدالت میں اقرار کیا۔ پھانسی کی سزا سن کر ہنستا

رہا۔ ارے کل تک خوش مزاج ہی تھا مگر اس وقت جی چھوڑ گیا۔ مرنا کسے اچھا لگتا ہے بھائی؟"

"مرنا تو اسے بھی اچھا نہیں لگتا۔" جگت نے سوچا مگر پسند ناپسند کا سوال نہیں تھا۔ مگر اس طرح بزدل بننے سے کیا ہو سکتا تھا؟

"کھڑاک۔" ایک آواز سنائی دی۔ چوکیدار نے آہ بھری۔ "چھوٹ گیا بیچارہ زندگی کی قید سے۔" جگت سمجھ گیا پیر کے نیچے سے تختے ہٹ گئے ہوں گے اور سیاہ نقاب پہنے ہوئے قیدی رسی سے لٹک رہا ہوگا۔ ممکن ہے کچھ تڑپا ہو' پھانسی کی کھولی دیکھنے کی خواہش پر وہ خود مسکرایا اور سوچنے لگا۔ "کچھ دنوں بعد میرا بھی جانا ہوگا' تب دیکھ لوں گا۔" مگر اسی وقت ذہنی جھٹکا لگا۔ "مجھے کیوں پھانسی پانی چاہیے؟ میں اس سے پہلے فرار ہو جاؤں گا۔"

کچھ دیر بعد وزن دار جوتوں کی آواز آئی۔ چوکیدار شانے پر رائفل رکھ کر سلیوٹ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ جگت سمجھ گیا غصہ نکالنے کے لیے ڈپٹی سوپر اس کی طرف آ رہا ہے۔ اس کا غضب ناک چہرہ بتا رہا تھا کہ ایک قیدی کو ابھی پھانسی دینے کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔

"سالے بدمعاش! کیا بکواس کر رہا تھا؟ بول......!" نتھنے پھلاتے ہوئے اس نے کہا مگر جگت اس کے غصے کی پروا نہ کرتا ہوا مسکرایا۔ "یہ جیل ہے تمہارے باپ کی دھرم شالا نہیں۔"

یہ سن کر جگت گرم ہو گیا۔ "ابے باپ کا نام نہ لینا۔ سمجھے؟" اس نے سلاخوں کے درمیان سے اسے گھورا۔ ڈپٹی سوپر اس کے جواب سے اور بھڑک گیا۔ آج تک کسی قیدی نے اس کے سامنے ایسی بات نہیں کی تھی۔ اس نے سوچا اسے مزہ چکھانا پڑے گا مگر وہ سلاخوں کے پیچھے تھا کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں کستے ہوئے اس نے چوکیدار کی جانب دیکھا' اس کے شانے پر رکھی ہوئی رائفل پر اس کی نظر گئی۔ چوکیدار کی موجودگی میں اس کے صاحب کی توہین ہوئی اس سے وہ شرمندہ ہوا۔ ڈپٹی سوپر نے جلدی سے اس کے شانے سے رائفل اتار لی اور رائفل کا کندہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر نال دروازے کی سلاخ میں جگت کی جانب جھٹکے سے ماری۔ جگت ہوشیار تھا۔ وہ دروازے سے دو قدم دور ہٹ گیا ورنہ نالی زور سے پیٹ میں لگتی۔ دانت پیستے ہوئے چھوٹے سوپر نے دوسری بار نال سے اندر دھکا مارا۔ غصے میں انسان اکثر اپنی عقل کھو بیٹھتا ہے۔ جگت کو بھی نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے نال پر جھپٹا مار کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور رائفل کھینچنے لگا۔ چھوٹا سوپر چونکا۔ وہ چیخ اٹھا۔

"چوکیدار!" اسے ڈر لگا کہ قیدی رائفل چھین لے گا تو ضرور کسی شوٹ کر دے گا۔ اس شخص میں اتنا زور ہوگا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی ہتھیلی پسینے سے تر ہونے لگی اور بندوق کا کنارہ سرکنے لگا۔ جگت نے دانت پیس کر زور آزمایا۔ اب ایک زوردار جھٹکے کی ضرورت تھی اس کے بعد رائفل اس کے قبضے میں آ جاتی' مگر چوکیدار نے جھپٹ کر رائفل کا کندہ پکڑ لیا۔ بڑی خطرناک صورت حال ہو گئی تھی۔ رائفل کے لیے دونوں طرف سے زور ہونے لگا۔ چھوٹے سوپر کے پیر لرزنے لگے۔ ان کی چیخ سن کر ایک اور چوکیدار آ گیا۔ اب دو سے تین ہو گئے اور جگت کے ہاتھ سے نال سرک گئی یا پھر اس نے شرارتاً اچانک چھوڑ دی۔ مخالف سمت سے زور کرتے ہوئے چھوٹے سوپر اور دونوں چوکیدار رائفل کے ساتھ نیچے گرے۔ وہ برآمدے کی دیوار سے ٹکرا کر اوپر تلے ڈھیر ہو گئے تھے۔ چھوٹا سوپر

دونوں چوکیداروں کے بوجھ تلے دب گیا۔
"ارے بیوقوف! کھڑے ہوجاؤ" ہانپتے ہوئے وہ چیخا۔ جگت قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ سوپر کو ایسا صدمہ ہوا جیسے وہ گرا نہ ہو بلکہ جگت نے اسے مارا ہو۔ وہ لباس ٹھیک کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیشانی سے پسینے کا ریلا بہہ رہا تھا۔ اس کے کولہوں پر کافی چوٹ لگی تھی۔ اس نے وہاں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کچھ دیر تک درد سے آنکھیں بند کرلیں۔ چوکیدار صاحب کی حالت پر ہنس نہ سکا۔ کیونکہ جو کچھ ہونے والا تھا اگر ہوجاتا تو ضرور ایک آدھ جان ضائع ہوجاتی۔ رائفل لوڈ تھی۔ خطرناک ڈاکو کیا کر بیٹھے کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ چھوٹا سوپر دل میں سمجھ گیا کہ اس نے حماقت کی تھی اور قیدی اندازے سے زیادہ استاد ثابت ہوا تھا۔ وہ اس صدمے سے ابھی آزاد نہیں ہوا تھا مگر اپنی اکڑ قائم رکھنے کی خاطر اس نے کہا۔
"تیری یہ مجال جیل کے قانون کی تجھے شاید خبر نہیں۔ میں تیری ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔" وہ غراتا ہوا باہر چلا گیا اور چوکیدار کو سختی سے تاکید کی۔ "دو دن کے لیے اس کی روٹی پانی بند، خبردار اس پر ذرا سا بھی رحم نہ کرنا۔"
سلام کر کے چوکیدار احمقوں کی طرح جگت کو دیکھنے لگا۔ اس شخص پر کسی دھمکی کا اثر نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں جگا کے لیے چھپا خطرہ جھلکنے لگا۔
"یہ تو کسی اور مصیبت میں ڈال دے گا۔" چوکیدار سوچنے لگا۔
"میری روٹی پانی بند کروگے تو میں کل عدالت نہیں جاؤں گا۔" جگت نے بھی دھمکی دی۔ "اپنے صاحب کو کہہ دینا۔" اور جگت کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔
دوپہر سب کے ساتھ اسے بھی روٹی دی گئی۔

جگت نے فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ روٹی لے لی۔ "صاحب نے منع کیا تھا اس کے باوجود تم مجھے کھانا دینے آگئے؟"
میٹ متجسس نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ پھر چپ چاپ چلا گیا۔ جگت سمجھ گیا کہ صبح کے جھگڑے کا ساری جیل میں پتہ چل گیا ہے۔ روٹی کھاتے ہوئے اسے یہ خیال بھی گزرا کہ رائفل قبضے میں آجاتی تو وہ کیا کرتا؟ اسے کچھ ڈر سا لگا کہ اس کے اس اقدام کا پھانسی کی اپیل پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا؟ ایسا کرنا بہتر نہیں تھا۔
دوپہر کے بعد بیٹے کے جنم اور نانا کی موت کی خبر ملی تھی۔ اس کے ذہن میں صبح والا منظر تازہ ہو گیا۔ اسے گھر کی یاد ستانے لگی صبح اگر وہ سوپر سے سخت بات نہ کہتا تو اس پر اتنا سخت ضابطہ نہ لگا جاتا اور فرار ہونے کا پروگرام بنانے کی سہولت ملتی۔

O......O......O

امرتسر مہاجر چھاؤنی میں کیے جانے والے دو قتل کا کیس چل رہا تھا۔ الزام تو جگا اور چنا دونوں پر تھا کیونکہ قتل کے بعد دونوں جیپ میں جاتے دیکھے گئے تھے۔ قتل کے وقت چنا کے مل میں ہونے کے ثبوت ملنے پر اس سے الزام ہٹالیا گیا۔ وکیل سرکار نے جگت کو پھنسانے کے لیے ترکیب لگائی۔
"قتل کر کے فرار ہوتے وقت تمہارے ساتھ چنا نہیں تھا تو اور کون تھا؟" جگت کہنا چاہتا تھا کہ "یہ میں نہیں بتاؤں گا" اس کا کیس لڑتے ہوئے اس کے وکیل کو ڈر لگا کہ ابھی بک دے گا مگر آخری لمحے جگت ہوشیار ہو گیا۔
"اس کا مجھے کیا پتہ؟ قتل کے وقت میں وہاں تھا ہی نہیں۔" وکیل سرکار نے ہونٹ کاٹ لیے۔ بدمعاش بہت پکا ہے۔ اس نے سوچا۔

''اگر تم وہاں نہیں تھے تو کہاں تھے؟'' جگت دو چار لمحے سوچ میں ڈوب گیا۔ ہوٹل میں تھا یہ کہتا تو اپنا دفاع ہوگا مگر کرتارا کا خیال آیا۔ قتل سے پہلے کرتارا اس سے ہوٹل ملنے آیا تھا اس کا اگر پولیس کو پتہ چل گیا تو وہ بھی پھنس جائے گا۔ ''جھوٹا جواب دینے کے لیے بہت سوچنا پڑتا ہے۔'' وکیل نے چوٹ کی۔ تاکہ وہ جذبات میں آجائے مگر اتنے کیس لڑ کر جگت اب کافی ہوشیار ہو چکا تھا۔ پھنس نہ جائے اس نے ایسا جواب دیا۔

''مجھے یاد نہیں۔'' اس نے کہا۔ وکیل سرکار نے میز پر ہاتھ مارا۔

''حضور والا ملزم جھوٹ بول رہا ہے۔'' اسی لمحے برابر کھڑے ہوئے رام سنگھ چوہدری نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ جگت نے رام سنگھ کو گھورا۔ رام سنگھ پرانی دشمنی کا حساب بے باق کرنے آیا تھا۔ اس کے بعد پوچھے گئے سوال پر جگت سمجھ گیا۔

''جن دو آدمیوں کو قتل کیا گیا ہے ان میں سے ایک تمہارے پرانے دشمن موہن سنگھ کا رشتے دار تھا یہ تو تم جانتے ہوگے۔'' پھر کچھ دیر رک کر تیز آواز میں وکیل بولا۔ ''جس کی عورت ویرو کو تم نے اغوا کیا تھا' یہ یاد ہے؟''

ویرو کا نام سن کر جگت کے ذہن میں شعلہ بھڑکا۔ اس کو اس طرح درمیان میں لانے کی ضرورت کیا تھی؟ رام سنگھ چوہدری اس کی بے چینی پر خوش ہو رہا تھا۔ جگت کا جی اس کی گردن دبانے کو چاہا۔ وکیل صفائی فوراً کھڑا ہوگیا۔

''حضور والا! اس سوال کا کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ ملزم اس کا جواب دینے کا پابند نہیں۔'' مگر جج نے اختلاف منظور نہیں کیا۔ اس لیے وکیل سرکار کا جوش بڑھا۔

''حضور والا! یہ پوائنٹ غور کرنے کے قابل ہے۔ جن کا قتل ہوا ہے ان میں سے ایک شخص موہن سنگھ کا رشتے دار ہے اور دوسرا دوست۔''

''نہیں' نہیں ......'' جگت کا ذہن بے قابو ہوگیا اور غلطی کر گیا۔ وہ کٹہرے پر ہاتھ کی مٹھیاں مار کر گرجا۔ ''وہ بدمعاش تھا۔ ویرو کی عزت لینے کے لیے دوستی کا داؤ کھیل رہا تھا۔'' جج کی آنکھیں پھیل گئیں۔ سرکاری وکیل خوش ہوگیا اور وکیل صفائی کا چہرہ اتر گیا۔

''صاحب! اس بات کو نوٹ کیا جائے۔'' سرکاری وکیل نے موقع حاصل کرلیا۔ ''رنبیر سنگھ کو قتل کرنے کے بعد بھی اس کے خلاف ملزم کا جوش ذرا بھی کم نہیں ہوا۔ اس کے الفاظ ثابت کررہے ہیں کہ ویرو کی عزت لوٹنے کی خواہش رکھنے والے رنبیر سے اس نے بدلہ لیا ہے۔''

بس...... اس کے بعد جگت کا دفاع کمزور ہوتا چلا گیا۔ موہن سنگھ کے رشتے دار نے مرتے وقت ''جگا'' کہا تھا اس کے بہت گواہ ملے۔ رنبیر سنگھ نے چھاؤنی ہی سے رام سنگھ چوہدری کو جگا کے متعلق اطلاع فراہم کرنے والا خط لکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا قتل بھی ایک ثبوت ہی تھا۔ ان دو قتل کے بعد امرتسر کے علاقے میں ڈکیتی شروع ہوگئی اس کے ثبوت فراہم ہو ہی چکے تھے اس لیے زیادہ ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔

O......O......O

جیل والوں کی جانب سے منظوری ملی تو طویل عرصے سے روٹھا ہوا تبسم چندن کور کے لبوں پر پھیل گیا۔ ''بیٹا! چھ ماہ میں پہلی بار تمہارے باپ کو اپنے فرزند کا منہ دیکھنے کو ملے گا۔'' پھر کچھ دیر کے لیے اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس کی جگہ اداسی نے لے

لی۔ ''شاید پہلی اور آخری بار! میرے لعل! تم کیسا نصیب لے کر آئے ہو کہ باپ سے جیل میں ملاقات ہو رہی ہے۔ بیٹا اپنی ننھی آنکھوں میں اس کی تصویر اتار لینا۔ پھر مجھے تمہاری آنکھوں میں ہی اس کا چہرہ دیکھنا پڑے گا۔'' چندن کور نے بچے کو کاجل لگایا' رخسار پر سیاہ تل لگا کر وہ بولی۔ ''پہلی بار تمہیں باہر لے جا رہی ہوں۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔''

ساس بہو چھ ماہ کے بچے کو لے کر امرتسر جیل پہنچ گئیں۔ ملاقاتیوں کی بھیڑ جمی ہوئی تھی۔ سزا پانے والوں کے سب رشتے دار بھی اس طرح چہرے لٹکائے بیٹھے ہوئے تھے جیسے خود بھی مجرم ہوں۔ اندر اندر باتیں ہو رہی تھیں۔

''اندر تمہارا کون ہے؟ کیوں اندر کیا؟ کتنی سزا ہوئی؟ پہلی بار ملاقات کے لیے آئی ہو؟'' پھر کوئی اپنا تجربہ سناتا۔ ''میاں ملاقات کا تو نام ہے۔ ابھی دو باتیں ہوئی نہیں اور دس منٹ ختم۔ اپنا آدمی نظر کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے پھر دو ماہ تک صرف دس منٹ کی ملاقات کے لیے طویل انتظار۔'' بچے کو دودھ پلانے کے لیے پشت پھیر کر بیٹھی ہوئی چندن سے برابر والی عورت نے پوچھا۔ ''تمہارا کون ہے؟'' تب وہ چونکی۔ اس نے دودھ پیتے بچے کی جانب دیکھا۔

''اس کے باپو۔''

''کیا سزا ہوئی؟'' دوسرے سوال کے لیے چندن تیار نہیں تھی۔ اگر پھانسی کہتی ہے تو فوراً ہی وہ عورت آہ بھر کر کہے گی۔ ''بے چارہ اناتھ ہو جائے گا۔'' کوئی اس کے بیٹے کو بے چارہ کہے' یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ کیا جواب دیا جائے؟ وہ اس الجھن میں پڑ گئی' تب ماں جی نے راہ نکالی۔

''ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ کیس چل رہا ہے۔'' چندن کو اطمینان ہوا۔ ایک طرح ماں جی نے سچ ہی کہا تھا۔ ابھی اوپر والی عدالت نے پھانسی کی سزا منظور کہاں کی تھی؟ ممکن ہے فیصلہ بدل جائے۔ اسی اعتماد پر تو سب لوگ جی رہے تھے۔ ملاقات کے لیے نام لکھنے والے کارکن کو جب معلوم ہوا کہ جگا سے اس کی ماں اور بیوی دونوں ملنا چاہتی ہیں تو اپنی طرف سے جیل کا قانون بیان کیا۔

''دو میں سے ایک جا سکے گی۔ بولو! کون ملنا چاہتا ہے؟''

ساس بہو ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ چندن نے پہل کی۔ ''ماں تم ہی ان سے مل آؤ۔''

''نہیں بہو...... میں تو پھر بھی مل لوں گی۔ بیٹے کو لے کر تم جاؤ...... تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اسے اطمینان اور ٹھنڈک ہو گی۔'' تھوڑی ضد بحث کے بعد چندن کور نرم پڑ گئی۔

''بہتر ماں! جیسی آپ کی مرضی۔ ہمیشہ آپ نے میرے سکھ کی سوچی ہے۔''

ماں جی نے آہ بھری اور دل میں بولیں۔ ''بہو بیٹی! ہم تمہیں سکھ کہاں دے سکے ہیں؟...... تمہارے دکھ کے خیال سے ہمارا دل مچل رہا ہے۔''

(باقی آئندہ)

